بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اگست 2016
سالگرہ نمبر
ماہنامہ شعاع
MONTHLY SHUAA Regd. No SC-52 AUGUST 2016
قیمت -/60 روپے

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زر سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

اگست 2016
جلد 30 شمارہ 12
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 91 بی-1-ای، سی ای ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسیہ جمیل

اگست کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اگست کا مہینہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ نے برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو کامیابی سے ہمکنار کیا اور انہیں ایک آزاد، خود مختار علیحدہ پاک وطن عطا کیا۔ اللہ پاکستان کو ہمیشہ قائم و کامیاب رکھے۔ آمین۔

شعاع کے قارئین کو یوم آزادی مبارک۔

یہ مہینہ اس لحاظ سے بھی ہمارے لیے خوشی کا باعث ہے کہ اکتیس سال پہلے اسی مہینے سے شعاع کا اجراء عمل میں آیا تھا۔

اگست 1985ء کو جس پرچے کی داغ بیل محمود ریاض صاحب نے ڈالی تھی، آج وہ ترقی و کامیابی کے جس مقام پر ہے۔ اس میں بلاشبہ اللہ کی مہربانی کے ساتھ ساتھ محنتی، مخلص کارکنان کا بہت بڑا حصہ ہے جنہوں نے شعاع کو معیار کے اس مقام تک پہنچانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

پھر ہماری مصنفات جن کی گراں قدر تحریروں نے شعور و آگاہی عطا کی اور قارئین کی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ہم اپنے قارئین کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے ہماری کاوشوں کو سراہا۔ ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اور اس کے ہر سلسلے کو اپنی ذہانت اور بھرپور شرکت سے کامیاب بنایا۔

پروردگار سے دعا ہے کہ شعاع یوں ہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ اس کے مصنفین اور قارئین یوں ہی اس کے ہم قدم رہیں اور محبتوں کا یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہے۔ آمین۔

محمود خاور کی برسی،

محمود خاور کو ہم سے بچھڑے سترہ برس بیت گئے۔ انہوں نے بچوں کے لیے سینکڑوں کتابیں لکھیں۔ ان کا شمار بچوں کے مقبول ادیبوں میں ہوتا ہے۔ شعاع کے لیے کالم بھی لکھتے رہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں۔ 20 اگست کو ان کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- سیدھی بات کتوادی۔ سائرہ رضا کا مکمل ناول،
- آزمائش محبت۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول،
- پہال ساز۔ ایمل رضا کا مکمل ناول،
- عفت سحر طاہر اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- صائمہ اکرم کے ناولٹ سیاہ حاشیہ کی آخری قسط،
- مریم بنت ارشاد، نیر فہیم خان، تنزیلہ ناہرہ اور شبنم گل کے افسانے،
- نکھرے نکھرے گلاب سارے۔ قارئین سے خصوصی سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

اگست کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

طائران خوش نوا ہیں گیت گانے کے لیے
پھول پیدا کر دیے ہیں مسکرانے کے لیے

ہر جگہ فرماں روائی ہے خدائے پاک کی
ہیں سلاطینِ زمانہ سر جھکانے کے لیے

روشنی کے واسطے پیدا کیے شمس و قمر
آسماں پر ہیں کواکب جھلملانے کے لیے

کر دیا احسان ہم پر ربِ کائنات نے
انؐ کو بھیجا عاصیوں کو بخشوانے کے لیے

ہمسر و ہمتا نہیں ہے عالمِ امکان میں
ایک تو ہی تو خدا ہے سب زمانے کے لیے

مہربانی ہے تری ہم پر خدائے ذوالجلال
مل گیا ہم کو ترا در سر جھکانے کے لیے

بادلوں کو وہ سمندر سے اٹھاتا ہے قمرؔ
مینہ برساتا ہے پھر فصلیں اگانے کے لیے

ریاض حسین قمر

ہر شکل میں اُن کے ہی انوار نظر آئے
ہم نے تو جدھر دیکھا سرکار نظر آئے

نیند آئے تصور میں اور جاگ اٹھے قسمت
میں سب سے کہوں مجھ کو سرکار نظر آئے

کیا شان نرالی ہے دربارِ محمدؐ کی
اس در کے سب ہی منگتے سردار نظر آئے

جن راہوں کو نسبت ہے سرکار کے قدموں سے
ان راہوں کے سب ذرے گلزار نظر آئے

ابوبکرؓ و عمرؓ پیارے، عثمانؓ و علیؓ پیارے
ہر اک سے جدا گانہ یہ چار نظر آئے

جو کاسۂ دل لے کر پھرتے ہیں مدینے میں
ان منگتوں میں یہ منگتا ہر بار نظر آئے

ہر سال ہی جاتے ہیں زوارِ حرم جتنے
ان لوگوں میں زاہدؔ بھی سرکار نظر آئے

زاہد قاسمی

سورہ اخلاص

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بے شک یہ (سورہ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔"

ایک اور روایت میں ہے۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ سے فرمایا۔

"کیا تم میں سے کوئی اس بات سے عاجز ہے کہ ایک رات میں تہائی ـــــ قرآن پڑھے؟"

یہ بات صحابہ رضی اللہ عنھم کو گراں معلوم ہوئی اور انہوں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم میں سے کون اس کی طاقت رکھتا ہے۔" (کوئی نہیں رکھتا۔)

"تو آپ نے فرمایا۔" (قل ھواللہ احد اللہ الصمد) (آخر تک) تہائی قرآن ہے۔

(بخاری)

فائدہ

سورہ اخلاص ایک مرتبہ پڑھ لینا اجر و ثواب میں ایک تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔ اس سورت میں اللہ کی توحید کا بیان اور اس کے کسی ہم سر کے ہونے کی نفی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنی توحید کا بیان کتنا پسند ہے اور اسی حساب سے اس کو شرک سے کتنی نفرت ہے۔ اسی لیے اس نے شرک کو ناقابل معافی گناہ قرار دیا ہے۔

تہائی قرآن

حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً "یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔"

(بخاری)

معوذتین

"کیا تجھے نہیں معلوم کہ کچھ آیات اس رات میں ایسی نازل کی گئی ہیں جن کی مثل پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں؟ (وہ) قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ہیں۔"

(مسلم)

الم تر کیا تو نے نہیں دیکھا یا تجھے معلوم نہیں۔ کلمہ تعجب ہے۔ "ان کی مثل نہیں دیکھی گئیں۔" کا مطلب ہے کہ کوئی سورت ان کے علاوہ ایسی ہو کہ سب کی سب تعویذ ہو یعنی پناہ طلب کرنے پر مشتمل ہو۔ یہ چیز صرف ان دو سورتوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے انہیں معوذتین کہتے ہیں۔ پناہ دینے والیں کیونکہ ان کے ذریعے سے پناہ طلب کی جاتی ہے۔

2- انسانوں کی طرح جنات میں بھی اچھے اور برے دونوں قسم کے جن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی طاقت بھی عطا فرمائی ہے کہ وہ انسانوں کو اگر نقصان پہنچانا چاہیں تو اللہ کی مشیت سے پہنچا سکتے ہیں۔ بنا بریں شرارتی جن بعض دفعہ انسانوں کو تنگ کرتے اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوتے ہیں۔ اسی طرح نظر کا لگنا بھی برحق ہے، جس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کو بغض و حسد کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے بد اثرات دوسرے شخص تک بھی پہنچ جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ نقصان یا کسی حادثے

اور تکلیف سے دوچار ہوجاتا ہے اور بعض دفعہ نظر محبت سے بھی ایسا ہوجاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنات اور نظربد دونوں سے اپنے الفاظ میں پناہ مانگا کرتے تھے۔ "میں تیرے ذریعے سے پناہ مانگتا ہوں جنوں سے انسانوں کی نظر سے۔" وغیرہ۔ جب (قل اعوذ برب الفلق) اور "قل اعوذ برب الناس" نازل ہوئیں تو پھر آپ نے اپنے الفاظ کی بجائے ان سورتوں کے ذریعے سے پناہ طلب کرنا شروع کردی' کیونکہ یہ سورتیں اسی مقصد کے لیے نازل کی گئی تھیں۔

3۔ ان کو **معوذتین** بھی اسی لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں سورتیں 'اللہ کے حکم سے' اپنے پڑھنے والوں کو جنات اور نظربد سے بچاتی ہیں۔ **معوذتین** کے معنی ہیں 'پناہ دینے والی دو سورتیں۔ اس لیے ان مقاصد کے لیے ان سورتوں کا پڑھنا بہت مفید ہے' ان کے ذریعے سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔

سورہ ملک

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قرآن مجید کی ایک تیس آیتوں والی سورت ایسی ہے جس نے ایک آدمی کی (اللہ کے ہاں) سفارش کی' یہاں تک کہ اس کی بخشش کردی گئی اور وہ سورت تبارک الذی بیدہ الملک ہے۔"

(ابوداؤد' ترمذی)

نیت کا درجہ

حضرت ابو کبشہ عمر بن سعد انماری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

"میں تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں اور ایک بات تمہیں بتاتا ہوں' اسے یاد رکھو! کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ اور جس پر ظلم کیا جائے' وہ اس پر صبر کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی عزت میں اضافہ فرماتا ہے۔ اور جو شخص مانگنے کا دروازہ کھولتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر فقر و محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ (آپ نے فقر فرمایا یا اس جیسا ہی کوئی اور کلمہ۔) اور ایک بات میں تمہیں بتاتا ہوں' پس اسے یاد رکھو! (فرمایا) دنیا میں چار قسم کے لوگ ہیں۔

ایک وہ بندہ جسے اللہ نے مال اور علم عطا کیا' پھر وہ ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتا ہے اور رشتے داروں سے حسن سلوک (صلہ رحمی) کرتا ہے اور ان میں جو اللہ کا حق ہے اسے پہچانتا (اور اسے ادا کرتا) ہے' تو یہ شخص جنت کے سب سے افضل درجوں میں ہوگا۔

اور (دوسرا) وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم تو دیا مگر مال نہیں دیا' پس وہ سچی نیت رکھتا اور کہتا ہے: اگر میرے پاس مال ہوتا تو یقیناً "میں بھی فلاں آدمی کی طرح عمل (خرچ) کرتا۔ پس (جب) اس کی نیت یہ ہے تو اس کا اور پہلے شخص کا اجر برابر ہے۔

اور (تیسرا) بندہ وہ ہے جسے اللہ نے مال دیا اور علم نہیں دیا' پس وہ بغیر علم کے اندھا دھند طریقے سے خرچ کرتا ہے۔ اس کے بارے میں نہ تو وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے اور نہ اس میں وہ رشتے داروں کے حقوق ادا کرتا ہے اور نہ اللہ کا کوئی حق اس میں پہچانتا ہے۔ یہ سب سے بدترمرتبے والا ہے۔

اور (چوتھا) وہ بندہ ہے جسے اللہ نے مال دیا نہ علم' لیکن وہ کہتا ہے کہ اگر میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں آدمی کی طرح عمل (اندھا دھند خرچ) کرتا۔ پس (جب) اس کی نیت یہ ہے تو ان دونوں اور (اس کا تیسرے بندے) کا گناہ برابر ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل: 1۔ اس میں اچھی یا بری نیت سے مراد پختہ نیت' یعنی عزم (پکا ارادہ) ہے' کیونکہ عزم ہی پر ثواب یا عتاب ہے۔

2۔ اس میں مال کی فضیلت بھی ہے بشرطیکہ اس میں حدود شرعیہ کا خیال رکھا جائے اور مال کی مذمت اور اس کی خطرناکی کا بیان بھی' جب کہ اس میں اللہ کی ہدایات کو ملحوظ نہ رکھا جائے۔ اسی طرح علم شریعت کی فضیلت ہے اگر اس کے مطابق عمل کیا جائے اور

جہل کی مذمت اور اس کے نقصانات کا بیان کہ یہ جہالت انسان کو محارم میں مبتلا کر دیتی ہے۔

گن گن کر نہ رکھو

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "بندھن باندھ کر نہ رکھو (بلکہ خرچ کرتی رہو) ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم پر بندھن باندھے گا (یعنی تمہیں نہیں دے گا)۔"

ایک دوسری روایت میں ہے۔ "خرچ کرو اور گن گن کر نہ رکھو ورنہ اللہ بھی تمہیں گن گن کر دے گا اور سینت سینت کر نہ رکھو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ فرمائے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ: 1۔ اس میں اللہ تعالیٰ کے ایک اصول کا تذکرہ ہے اور وہ یہ کہ وہ جزا جنس عمل سے ہی دیتا ہے' یعنی جیسا عمل ویسا ہی بدلہ۔ بے حساب اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو بے حساب ہی بدلہ دے گا' گن گن کر خرچ کرو گے تو وہ بھی گن گن کر ہی دے گا۔ سینت کر رکھو گے' خرچ نہ کرو گے تو وہ بھی دینا بند کر دے گا۔ اس میں اللہ کی راہ میں خوب خرچ کرنے کی ترغیب اور بخل اور امساک پر سخت وعید و تہدید ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "بخیل اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں ان کے بدن پر سینے سے ہنسلی تک لوہے کی زرہیں ہیں۔ پس خرچ کرنے والا خرچ کرتا ہے تو یہ زرہ اس کے بدن پر دراز اور لمبی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کے پوروں کو چھپا لیتی ہے اور اس کے نشان قدم کو ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ اور بخیل چونکہ کچھ بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا اس لیے زرہ کا ہر حلقہ اپنی جگہ پر چمٹ جاتا ہے۔ پس وہ اسے ڈھیلا کرتا ہے لیکن وہ ڈھیلا نہیں ہوتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ اس تشبیہ کا مطلب ہے کہ صدقہ انسان کو اس طرح چھپا لیتا ہے جیسے ایک پوری زرہ جو پیروں تک ہو' اس کے بدن کو حتیٰ کہ اس کے قدم اور نشان قدم کو بھی چھپا لیتی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں صدقہ کرنے والے کے لیے خوش خبری ہے کہ اس کے مال میں برکت اور اس کی حفاظت و صیانت ہو گی' اس لیے کہ صدقے سے بلائیں ٹل جاتی ہیں' جبکہ بخیل کے لیے وعید ہے کہ پردہ پوشی کے بجائے اس کی پردہ دری ہو گی اور وہ بلاؤں کا نشانہ ہو گا۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سخی آدمی جب صدقہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لیے سینہ فراخ ہو جاتا ہے اور وہ خوشی خوشی کشادہ دستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس جب بخیل کے سامنے خرچ کرنے کا معاملہ آتا ہے تو اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنا ہاتھ بند کر لیتا ہے۔ اس میں سخی کے لیے بشارت اور بخیل کے لیے وعید ہے۔

حلال کمائی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص پاکیزہ (حلال کی) کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرتا ہے' اور اللہ تعالیٰ صدقہ قبول ہی پاکیزہ کمائی کا کرتا ہے' تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے دائیں ہاتھ میں لیتا ہے' پھر وہ اسے صاحب صدقہ کے لیے بڑھاتا رہتا ہے' جیسے تم میں سے ایک شخص اپنے بچھیرے کو پالتا اور بڑھاتا ہے یہاں تک کہ (وہ کھجور برابر صدقہ) پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: 1۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت' ہاتھ کا ذکر ہے۔ اس پر بغیر تاویل اور تشبیہ کے ایمان رکھنا ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ کے بھی ہاتھ ہیں' جس طرح کہ اس کی شان کے لائق ہیں۔ ہم اسے کسی کے ساتھ تشبیہ نہیں دے سکتے نہ اس کی کیفیت ہی بیان کر سکتے ہیں اور نہ یہ تاویل ہی جائز ہے

کہ ہاتھ میں لینا' قبول کرنے سے کنایہ ہے وغیرہ۔
2۔ اس حدیث سے واضح ہے کہ حرام آمدنی سے کیے گئے صدقے کی اللہ کے ہاں کوئی اہمیت نہیں اور حلال کمائی سے کیا گیا کھجور کے برابر بھی صدقہ اجر و ثواب میں پہاڑ کے طرح ہو جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک دفعہ ایک آدمی ایک صحرا میں چلا جا رہا تھا کہ اس نے بدلی سے ایک آواز سنی۔ فلاں کے باغ کو سیراب کر۔ پس بادل کا یہ ٹکڑا الگ ہوا اور اس نے اپنا پانی ایک سیاہ سنگلاخ زمین میں برسا دیا' پس ان نالوں میں سے ایک نالے نے سارا پانی اپنے اندر جمع کر لیا (اور پانی چلنے لگا۔) یہ شخص بھی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلا (آگے جا کر ایک مقام پر دیکھا) کہ ایک آدمی اپنے باغ میں کھڑا' اپنے کسی (اوزار) سے اپنے باغ کو پانی لگا رہا ہے۔ اس نے اس سے پوچھا" اے اللہ کے بندے! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے وہی نام بتلایا جو اس نے بدلی میں سے سنا تھا۔ پس باغبان نے اس سے کہا۔
"اے اللہ کے بندے! تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے؟
اس نے کہا۔ میں نے اس بادل میں سے جس کا یہ پانی (یہاں بہتا ہوا آیا) ہے' ایک آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو سیراب کر۔ اور یہ وہی نام ہے جو تو نے اپنا بتلایا ہے۔ تو اس باغ میں ایسا کون سا عمل کرتا ہے۔ (کہ تیرے باغ کی سیرابی کے لیے اللہ نے بادل کو حکم دیا؟)
اس باغ والے نے کہا" جب تو یہ کہہ رہا ہے تو (میں بتا دیتا ہوں کہ) میں اس باغ کی پیداوار کا اندازہ لگاتا ہوں اور اس میں سے تیسرا حصہ صدقہ کرتا ہوں' تیسرا حصہ میری اور میرے اہل و عیال کی خوراک ہو جاتا ہے اور اس کا تیسرا حصہ اس باغ پر دوبارہ لگا دیتا ہوں۔" (مسلم)
فائدہ : اس میں بھی صدقہ و خیرات کی فضیلت کے علاوہ کشف و کرامت کا بیان ہے کہ ایک انسان نے بادل سے آواز سن لی جو ایک خرق عادت بات ہے' لیکن یہ کشف و کرامت یا معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ کوئی شخص یہ دعوا نہیں کر سکتا کہ وہ جب چاہے کشف و کرامت کے ذریعے سے کوئی انھونا کام کر کے دکھا سکتا ہے' جیسا کہ بعض لوگ ایسا دعویٰ کرتے اور اس کی بنیاد پر سادہ لوح عوام کو لوٹتے اور انہیں گمراہ کرتے ہیں۔

دو رخ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تم لوگوں کو کانوں کی طرح پاؤ گے۔ ان میں جو لوگ جاہلیت میں بہتر تھے' اسلام میں بھی بہتر ہیں' جب کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔ اور اس حکمرانی کے معاملے میں تم ان لوگوں کو سب سے بہتر پاؤ گے جو اس کو سب سے زیادہ ناپسند کرتے ہوں گے۔ اور تم لوگوں میں سب سے بدتر دو رخے شخص کو پاؤ گے۔ جو ان (لوگوں) کے پاس ایک رخ (چہرہ) لے کر جائے اور ان کے پاس دوسرا رخ۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ کانوں کی طرح کا مطلب ہے کہ ان کی بھی کوئی اصل ہو گی جس کی طرف وہ منسوب ہوں گے اور جو ان کے لیے ذریعہ افتخار ہو گی۔ اچھی اصل' یعنی شرف و مجد رکھنے والے قبیلے جس طرح زمانہ جاہلیت میں ممتاز تھے' اسلام چونکہ خود بھی شرافت و کرامت کا حامل مذہب ہے' اس لیے قبول اسلام کے بعد بھی ممتاز قبیلوں کے لوگ شرف افضل میں نمایاں ہی رہیں گے۔ ان کی قدر و منزلت میں کوئی کمی نہیں ہو گی بشرطیکہ وہ دین کی صحیح سمجھ حاصل کر لیں اور اس کی پابندی کو اپنا شعار بنا لیں۔

2۔ جو لوگ عہدہ و منصب کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ وہ اس کی ذمہ داریوں سے لرزاں رہتے ہیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اگر اختیار و اقتدار آ جائے تو یہ

عوام کے لیے بہتر ثابت ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو پوری دیانت داری سے ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنے مفادات کو نہیں دیکھتے۔ ملک و قوم کے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کی حدوں کو توڑتے نہیں بلکہ ان کو قائم کرتے ہیں۔

3۔ دو رخے شخص سے مراد ایسا آدمی ہے جو ایک گروہ کے پاس جائے تو اسے باور کرائے کہ وہ اس کا خیر خواہ اور ساتھی ہے اور دوسرے کا مخالف۔ لیکن جب دوسرے گروہ کے پاس جائے تو وہاں بھی یہی تاثر دے۔ یہ بدترین آدمی ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ شخص سب سے بہتر ہے کہ وہ ہر گروہ کے پاس جائے اور اپنی طاقت کے مطابق ہر ایک کی اصلاح کی کوشش کرے۔

جھوٹ کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "جس چیز کا علم نہیں، اس کے پیچھے مت پڑو۔" (الاسراء۔36)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ایک نگران فرشتہ تیار رہتا ہے۔" (ق۔18)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بلاشبہ سچائی، نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور یقیناً" آدمی سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں صدیق (راست باز) لکھ دیا جاتا ہے۔ اور بلاشبہ جھوٹ نافرمانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور نافرمانی جہنم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اور یقیناً" آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے ہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان جیسا رویہ اختیار کرتا ہے، وہ اس کا وصف خاص بن جاتا ہے جس سے وہ مشہور ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو اچھی باتیں اور اچھا رویہ ہی اپنانا چاہیے تاکہ لوگوں کی زبانوں پر بھی اس کی تعریف کے چرچے ہوں اور اللہ کے ہاں بھی اس کا اچھا مقام ہو۔

2۔ سچائی، نجات کا اور جھوٹ تباہی کا راستہ ہے۔

خالص منافق

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"چار خصلتیں ہیں، جس میں وہ ہوں گی، وہ خالص منافق ہوگا۔ اور جس کے اندر ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی، یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے (وہ خصلتیں یہ ہیں) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب جھگڑے تو بد زبانی کرے۔"

(بخاری و مسلم)

جھوٹی گواہی

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو انہوں نے نہیں دیکھی۔"

(بخاری)

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی چیز کے متعلق کہے کہ میں نے اسے دیکھا ہے جسے اس نے نہیں دیکھا۔

فائدہ :

1۔ اس میں بھی دروغ گوئی کی مذمت ہے، ایسا دعویٰ خواب کے بارے میں ہو یا حالت بیداری میں، دونوں صورتوں میں بڑا جھوٹ ہے۔

اس بات کی ترغیب کا بیان کہ انسان جو کہے اور نقل کرے اس کی تحقیق کرلے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "انسان جو لفظ بھی بولتا ہے تو اس کے پاس ہی ایک نگران فرشتہ تیار ہوتا ہے۔" (ق۔18)

پہلی نظر، پہلا لفظ، پہلی محبت، پہلی خوشی، پہلا غم اور پہلی تخلیق اپنے اندر خمار، سرشاری اور فخرو انبساط رکھتی ہے۔
جنم دن کسی ادارے کا ہو یا کسی فرد کا اس سے وابستہ لوگوں کے لیے خوشی کا سامان ہوتا ہے۔
خواتین ڈائجسٹ بہنوں کے لیے اپنی نوعیت کا پہلا ماہنامہ تھا۔ شعاع کا اجرا اسی سلسلے کی کڑی تھی، لیکن شعاع نے نئی راہیں تلاشیں اور کئی روشن روایات کی بنیاد رکھی۔ زندگی کو وسیع تناظر میں دیکھا، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی نشان دہی کے ساتھ مسرتوں کے چراغ روشن کیے۔ یاس کی گہری تاریکیوں میں امید کی روشن کرنیں اجاگر کیں۔ شعاع نے بہت جلد قارئین کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔ یہ قارئین کی محبتیں ہیں کہ شعاع کا شمار آج مقبول ترین پرچوں میں ہوتا ہے۔
قارئین سے ہمارا پہلا سوال ان کے جنم دن کے حوالے سے ہے۔
شعاع میں شائع ہونے والی تحریریں دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مقصدیت کی حامل بھی ہوتی ہیں۔ یہ ہماری مصنفین کی فطری دانش، مشاہدہ، سوچ، مثبت انداز فکر کی عکاس ہوتی ہیں۔ کچھ جملے اتنی گہرائی اور سچائی لیے ہوتے ہیں کہ دل و ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔ دوسرا سوال اسی حوالے سے ہے۔
کوئی بھی تصویر یا تحریر خواہ اچھی ہو یا بری، ہمارے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔ ہماری سوچ پر اثر انداز ہوتی ہے اور کبھی کبھی اس کی اثر پذیری ہماری زندگی، ہمارے انداز فکر کو یکسر تبدیل کر دیتی ہے۔ قارئین سے تیسرا سوال ہم نے اسی تناظر میں کیا ہے۔

(1) کیا آپ سالگرہ مناتی ہیں؟ تحفہ دینے اور لینے کی روایت کیسی لگتی ہے؟
(2) کہانی کار کہانی لکھتے ہوئے کبھی کبھی ایسے جملے لکھ جاتا ہے جو آفاقی سچائی کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی جملہ جو آپ نے شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں میں پڑھا۔
(3) شعاع میں شائع ہونے والی کوئی تحریر جس نے آپ کی شخصیت یا زندگی میں تبدیلی پیدا کی ہو؟
آئیے دیکھتے ہیں کہ ہماری قارئین نے ان سوالات کے کیا جوابات دیے ہیں۔

نکھر گئے گلاب سارے

ادارہ

عطیہ خالد

1۔ سالگرہ تو کبھی نہیں منائی، البتہ شادی کی سالگرہ پر تحفہ لینا اور دینا دونوں بہت پسند ہیں، خواہ ایک پھول یا ایک حرف محبت ہی کیوں نہ ہو۔
2۔ ناول ربّ البشر میں سمیرا احمد نے لکھا ہے۔
"عدینہ کے کردار کے ذریعے "کہ ایک اللہ، میرا اعمال نامہ۔ میرے ہر سوال کا جواب.... معافی طلب کرنے کا یہ قرینہ یہ ڈھب! میرے خدایا!"
3۔ ان تحریروں سے بہت کچھ سیکھا اور آج تک سیکھ رہے ہیں۔ لیکن شعاع نے میری دو تحریریں شائع کر کے تقریباً" پانچ سال سے ایک کمرے تک محدود زندگی کو ہوا، روشنی اور تازگی بہم پہنچائی ہے۔ زندگی بدل گئی ہے یقیناً"۔

حرا قریشی..... بلال کالونی، ملتان

1۔ سالگرہ منانے کا کوئی ذکر جیسا کہ اسلام میں نہیں ہے تو یہ ضروری امر بھی نہیں۔ بظاہر تو ایک مل بیٹھنے کا بہانا بن جاتا ہے۔ روز روزنہ ملنے والے اس دن آکر تحائف دے کر محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ تو جناب جب حرا کی سالگرہ پندرہ اکتوبر کو آتی ہے تو احباب وشنز اور دعائیں خوب بھیجتے ہیں۔ خصوصاً" مابدولت اور

فری تو یہ دن خصوصی یاد رکھتے ہیں۔ سب ہی تقریباً" وش کرتے ہیں۔

پروین شاکر کی کوئی بھی کتاب میں نے اپنے پیسوں سے نہیں خریدی کیونکہ اکثر آنے والی سالگراہوں پر رگ جاں کی جانب سے ان کی شاعری کا مجموعہ کلام مجھے میرے ذوق کے مطابق مل جاتا ہے۔ ان پر لکھے لفظ بھی گراں قدر سرمائے کی مانند ہیں اور ان قیمتی وراثتوں کو 'سرمائے کو حرا — کو سنبھالنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ آپ بھی پڑھیے... سارے تو نہیں ایک لکھ رہی ہوں جو سب پر بھاری ہے۔ "خوشبو" جو 2014ء میں وصول کی اس کے پہلے صفحے پر خوش خط الفاظ میں لکھا ہے۔

"عزیزم حرا قریشی کے نام

"میری زندگی کے قیمتی ترین لوگوں میں سے ایک' جو میرے لیے ریڑھ کی ہڈی کے مترادف ہیں۔"

جب 2013ء میں اپنی پیاری سی بھانجی نور کی جانب سے تحفہ ملا تو خوشی پنکھ لگائے چہار سو چھپانے لگی جو اس نے خصوصاً" اپنی مما کے ساتھ جا کر یا کے لیے خریدا۔ وہ تحفہ اعتبار ساجد کی کتاب "تمہیں کتنا چاہتے ہیں" تھی۔ پھر میرے لیے تو انمول ہوئی ناں! چھوٹے بھائی' بڑے اور منجھلے بھائی بھی اپنے مطابق چاہتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ جو محبتوں کے گلے میں جمع ہوتی رہتی ہے۔

2۔ میرے نزدیک ایک کہانی کار کا رتبہ بہت بلند ہے۔ مجھے قلم کار کے ہاتھ اس زمین سے لگتے ہیں جہاں سے قاری کو مٹی یا خالی آب نہیں بلکہ خزانہ ملتا ہے۔ جو اپنی ہر نئی اچھوتی تحریر سے قاری کے ذہن کے اندر حکمت کا بحر اعظم دریافت کرتا ہے۔ ایسی ہی حکمت کے موتی میں نے کچھ مختلف رائٹرز کی تحریروں سے چنے ہیں۔

"اس نے کہا تھا وہ پھول' پودوں کی دوست ہے۔ انسانوں کو دکھ بانٹنے کے لیے انسان مل جاتے ہیں مگر ان کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ جب انسان چھوڑ جاتے ہیں ناں تو یہ سہارے دیتے ہیں.... میں سہارے اکٹھے کر رہی ہوں۔"

(بنت سحر کی تحریر "اب کے برس" سے لی گئی سطریں)

"بے شک عبادتوں کی قبولیت ہماری نیت اور ایمان کی سچائی میں مضمر ہے' لیکن تمہاری نیکی کا حصہ بھی اس ثواب میں ضرور شامل ہو گا۔ خوش رہو' اللہ تمہیں کسی خوشی سے محروم نہیں کرے گا۔"

(فرح بخاری کی تحریر "ضرورت" سے لی گئی سطریں)

"جب بہار آتی ہے تو بنجر مٹی میں بھی جان آ جاتی ہے۔ خود رو پودے بنا کسی آبیاری کے زمین کا سینہ چیر کر باہر آ جاتے ہیں۔"

(حیا بخاری کی تحریر "بہار دستک دے رہی ہے" سے)

"برسنے والے بادل سے بھلا کب کوئی یہ بات پوچھتا ہے کہ برس جانے کے بعد وہ خود کس قدر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔"

(ایمل رضا کی تحریر "تعویذ حب سے")

"ایک سن کر چار سنانا آسان ہوتا ہے۔ ضبط کرنا تحمل سے کام لینا، صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ سولہ سال تعلیم حاصل کرکے اگر اتنا بھی نہ سیکھا تو ہم میں اور اس گدھے میں کوئی فرق نہیں، جس پر کتابیں لاد دی جاتی ہیں مگر وہ سیکھتا کچھ بھی نہیں۔"

(نعیمہ ناز کی تحریر "رنگ خوشبو سے بھرے آنگن")

"مومن کی زندگی میں چلنا لکھا ہے۔ موت تک کی مسافت ہے، آرام نہیں۔ آرام اور سکون دنیا میں اس کے لیے تباہی ہیں۔"

(عتیقہ ایوب کی تحریر "زندگی تیرے تعاقب میں" سے)

صائمہ اکرم چوہدری کی سیاہ حاشیہ میں تو کئی ایسی سطریں موجود ہیں جو براہ راست دل پہ لگتی ہیں۔

3- ایسی تو کوئی تحریر نہیں جس نے شخصیت یا زیست پر گہرے اثرات ثبت کیے ہوں، جو تغیرات کا سبب بنے۔ بہرکیف سیاہ حاشیہ ایک ایسی شعاع میں زیر اشاعت تحریر ہے جس نے ضرور اکثر قارئین کی شخصیت پر اثر ڈالا ہوگا۔

سوچتے بھی شعاع سے وابستہ افراد کے خوابوں کی تعبیروں پر ترقیوں کے ستون کھڑے ہیں، رب سوہنا انہیں جاوداں رکھے۔ ثبات محبتوں کو عطا ہو۔ فاتح و تسخیر ہونے کی سند بخشے۔ آمین

مسرت الطاف احمد..... کراچی

1- مجھے برتھ ڈے سلیبریٹ کرنے کا جنون کی حد تک شوق ہے ہر سال اپنا برتھ ڈے۔ بہت اہتمام سے سیلبریٹ کرتی ہوں، بہت بار کالج میں فرینڈز کے ساتھ دھوم دھام سے اپنا برتھ ڈے سلیبریٹ کیا۔ اس دن بہت انجوائے کرتی ہوں، تحفہ دینے اور لینے سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی روایت ہے جو اپنے اندر بڑی چاہت اور پُر خلوص جذبہ رکھتا ہے۔ گفٹ دینے والے کے دل میں دوسرے کے لیے بڑی محبت اور اپنائیت ہوتی ہے۔ سب فرینڈز کے گفٹس آج بھی میں نے بہت ہی سنبھال کے رکھے ہیں۔

2- ایسے بہت سے جملے ہیں جو شعاع کی زینت رہے جس نے مجھے بہت انسپائر کیا اور سوچنے پر مجبور کیا "یہ جملہ غریق رحمت سے ہے"

"تو کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ شکوہ کیا ہی نہ جائے مگر یہ شکوہ یہ کیا ہی کب جاتا ہے یہ تو خود بخود بے دھیانی میں دل میں ابل پڑتا ہے اور انسان حیران رہ جاتا ہے کہ کیا اس کی اتنی بساط تھی کہ وہ اس لم یزل کے سامنے کچھ

کہہ سکے۔ انسان صرف مان جانے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے سوائے مان جانا چاہیے۔ اسی میں بہتری ہے۔"

3۔ شعاع کی ایسی بہت سی تحریریں ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اور جس نے میری زندگی میں مثبت تبدیلی پیدا کی ہے اور میری شخصیت میں خوداعتمادی' کچھ کر دکھانے کی لگن پیدا کی ہے "اندر کی آواز" ایک ایسی تحریر ہے جسے پڑھنے کے بعد میں نے جاب کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی طرح سیاہ حاشیہ بہت ہی اسٹرانگ اور سبق آموز تحریر تھی "غریق رحمت" بہت زیادہ متاثر کن تحریر تھی۔

میں اپنی رائٹرز کی شکر گزار ہوں جو اپنی خوب صورت کاوشوں سے اس کو سجاتی ہیں۔ شعاع ایک ایسا چراغ ہے۔ جو ہر طرف اپنی روشنی پھیلا رہا ہے۔

عائشہ انصاری.... حیدر آباد

1۔ جی ہاں لیکن صرف اس حد تک کہ گھر میں کیک منگوالیا اور کچھ اچھا پکا لیا۔ لیکن اس سال تو میں نے کیک خود بنایا اور خوب داد سمیٹی۔ (جی ہاں)

تحفہ دینے اور لینے کی روایت سنت ہے' لیکن صد افسوس کہ روایت اب زحمت بنتی جارہی ہے۔ جس میں لوگ خوب جمع تفریق' حاصل ضرب اور خاص طور پہ لینے یا دینے والے کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہیں۔ دکھاوے اور بدلے نے اس خوب صورت روایت کو "کاروبار" بنادیا ہے۔

2۔ فی الحال تو جو ذہن میں آرہا ہے وہی لکھ رہی ہوں۔ سوچ کے گھوڑے زیادہ نہیں دوڑاؤں گی' کیونکہ چاند رات ہے اور رات آدھی بیت چکی ہے۔ ایسے میں اگر گھر کے کسی فرد نے دیکھ لیا تو وہ یقیناً "مجھے پاگل سمجھے گا۔

"ہم مشرقی لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں دادا! بیٹیوں کی رخصتی کے خیال سے ہی گھنٹوں روتے رہتے ہیں اور ان کے دل کے ارمانوں کی رخصتی پر ایک آنسو نہیں بہاتے..... ہمیں یہ مان رہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارا سرنیچا نہیں کرتی اور ہم یہ غرور حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم نے اولاد کی خوشیوں کو نیچا ہونے نہیں دیا۔

دادا ہمارے سروں پر خاندان کی عزت کی پگڑیاں سجائی جاتی ہیں اور ہمارے دل کے تخت سونے رہ جاتے ہیں اور کوئی ان پر آہ بھی نہیں بھرتا.... مشرقی عورت ارتقاء کا ذریعہ کیوں ہے.... خود ارتقاء کیوں نہیں؟.... یہ سوال میں نے خود سے کئی بار پوچھا اور خود کو یہ بھی بتاتے پایا کہ مشرق ایک گنجان خطہ ہے۔ فلسفیوں کے ان فلسفوں سے بھرا ہوا جن کے پیندے میں تعصب ہوتا ہے اور کنارے پر منافقت۔"

(یارم.... سمیرا احمد)

"مصحف" نے میری شخصیت اور زندگی میں

تبدیلی پیدا کی۔ مجھے قرآن پاک سے بہت قریب کر دیا اور میں نمرہ احمد کی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے ہمیں قرآن پاک سے حقیقی معنوں میں متعارف کرایا اور پردے کی خوب صورتی اجاگر کی، جس پر "ماڈرن" زمانے کی گرد جم چکی تھی۔ اور دوسری عمیرہ احمد جنھوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ کا بہترین تصور دیا۔

تسنیم کوثر..... کراچی

1 ہمارے ہاں سالگرہ منانے کا کوئی رواج نہیں ہے

اور نہ ہی اسے ہم پسند کرتے ہیں۔ البتہ تحفہ دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کی۔ آپ یقین کریں تحفہ دینے اور لینے کی روایت ہم بہت پسند کرتے ہیں اور اس پر پوری طرح سے عمل بھی کرتے ہیں۔

2 بھئی کچھ یوں ہے کہ ہم اتنے زیادہ ڈائجسٹ وغیرہ پڑھتے ہیں تو کچھ زیادہ یاد نہیں رہتا کہ کہاں کیا پڑھا۔ دماغ یاد رکھنے سے انکار کر دیتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شعاع کی کہانیاں اکثر دل پر اثر کرتی ہیں۔ زیادہ دور نہیں اسی عید نمبر جولائی کے شعاع میں بنت سحر کا افسانہ امید دستک کے اینڈ کے الفاظ "مجھے اب پتا چلا انسانوں کی نسبت اللہ سے تعلق جوڑنا آسان ہے۔ کیونکہ اللہ دھتکارتا نہیں ہے۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھاؤ تو وہ خود بڑھ کر تھام لیتا ہے۔"

3۔ شعاع میں شائع ہونے والی تحریر نے ہماری شخصیت میں کیا اثر ڈالا تو جناب ایسا تو کوئی خاص کچھ نہیں ہوا، وقتی طور پر کوئی بھی افسانہ ناول پڑھ کر اس کے سحر میں کھو جانا اور بات ہے۔ لیکن جب ہم شعاع میں کوئی اچھی بات، دینی بات اسلامی بات مثلاً "پیارے نبی کی پیاری باتیں" پڑھتے ہیں یا پھر باتوں سے خوشبو آئے پڑھتے ہیں تو دل پر ایک اچھا اثر پڑتا ہے اور اتنی اچھی اور عمدہ باتیں پڑھنے سے شخصیت میں، دل میں زندگی میں کچھ تو تبدیلی آتی ہی ہے۔

عروج راؤ..... لودھراں

1۔ سالگرہ کا دن بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے سب کاوش اور خاص طور پر اماں کی طرف سے ہر دفعہ ایک سرپرائز گفٹ کا ملنا بہت ہی خوش کرتا ہے۔

2۔ صدف آصف کا ایک ناولٹ شعاع میں چھپا تھا "دل و نظر کے آئینے میں" جو مجھے بہت پسند ہے، اس میں تلخ سچائیوں پر مبنی ایک جملہ جو ہمیشہ میرے دماغ میں گونجتا ہے۔

"کسی کی برائیوں کا کھاتہ کھولنے سے پہلے اپنی نیکیوں کا حساب کتاب ضروری ہے۔ یہ نہ ہو کہ دوسروں کی فکر میں ہم اپنا سب کھو بیٹھیں۔"

3۔ شعاع اور خواتین میں شائع ہونے والی ساری تحریریں۔ انسان کے دل کو چھو جاتی ہے۔ عمیرہ ہو یا

نمرہ سائرہ رضا ہو یا ایمل رضا' صدف آصف ہو یا امت العزیز' ساری رائٹر بہنوں کی کہانیوں میں ہمارے لیے کچھ نہ کچھ ایسا ہوتا ہے جو زندگی کو نئے رنگ دیتا ہے۔

زاہدہ پروین..... تحصیل سلانوالی' ضلع سرگودھا

سروے کے سوالات پہلی شعاع میں ہوتے ہیں مجھے نہیں پتا تھا۔ میں تو ہمیشہ سروے پڑھتے ہوئے سوچتی تھی کہ ان سب کو کون بتاتا ہے جو یہ شامل ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ راز بھی پا ہی لیا ہم نے اور پھر عید کے تینوں دن سروے کے سوالات کے جوابات سوچتے گزری اور آج عید کے تیسرے دن رات کو ہمت کر ہی لی لکھنے کی' سو آپ بھی تھوڑی ہمت کرکے شامل کر لیجیے گا' کیونکہ بہت شوق تھا مجھے شعاع' خواتین کے کسی سروے میں حصہ لینے کا۔ زیادہ اصرار نہیں کروں گی کیونکہ مجھے پتا ہے آپ معیاری چیز کبھی ردی میں نہیں جانے دیتیں' لہٰذا یہی کہوں گی کہ اگر قابل اشاعت ہوئے تو ضرور ہو جائیں گے۔

1- سالگرہ منانا مجھے بہت پسند ہے اور تحفے لینا دینا بھی اکیس اکتوبر 2015ء کو میری کولیگز جو کہ میری بہت پیاری سہیلیاں ہیں' انہوں نے بہت پیار سے مجھے تحفے دیے اور بریک میں ہم نے کیک بھی کھایا پھر میرے بھائی ضیا نے مجھے بہت پیارا رنگ گفٹ کیا لہٰذا یہ سالگرہ میری زندگی کی یادگار بلکہ خوب صورت یادگار ہے۔

2- آفاقی جملہ تو جناب بہت سارے ہوں گے۔ ہاں جی ہوں گے' کیونکہ مجھے یاد نہیں لیکن سائرہ رضا کے ناول ''دل دھڑکتا ہے'' کا ایک جملہ جو کہ مہینے کے گزر جانے کے باوجود بھی پتا نہیں کیوں اکثر یاد آتا ہے کہ۔

''لڑکیاں تو بہت عام سی یا شاید ایک جیسی ہوتی ہیں

یہ تو مائیں ہوتی ہیں جو کہ اپنی بیٹیوں کو پریاں بناتی ہیں''

3- مصحف پڑھ کر ترجمہ قرآن پاک جو کہ بہت

اگست 2016ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "آبِ حیات" عمیرہ احمد کا ناول،
- "نمل" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "شبِ آرزو" نور فاطمہ کا مکمل ناول،
- "میری زیست کا حاصل" عائشہ ناز علی کا مکمل ناول،
- صدف آصف اور سحرش بانو کے ناولٹ،
- عطیہ خالد، تسنیم علوی، ہاجرہ ریحان، بنت سحر، شازیہ الطاف ہاشمی اور صباحت یاسمین کے افسانے،
- معروف نیوز اینکر "محمد جنید" سے ملاقات،
- معروف نعت خواں "سارہ رضا" سے باتیں،
- "حرفِ سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ"،
- "کرن کرن روشنی" احادیث کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے

اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا اگست 2016 کا شمارہ آج ہی خرید لیں۔

سالوں سے صرف سوچ تھی اس پر عمل ہو گیا اور جنت کے پتے پڑھ کر میں جو پہلے صرف پردے میں خود کو محفوظ اور آرام دہ محسوس کرتی تھی اب فخر بھی محسوس کرتی ہوں کیوں کہ مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ پردہ ہماری مجبوری نہیں بلکہ ہمارے سکون کے لیے ہے۔

طحہ مصطفیٰ..... فاروق آباد

شعاع کو 31 سال پورے کرنے پر مبارک باد۔

1۔ اپنی سالگرہ بہت جوش و خروش سے مناتی ہوں۔ گفٹ لیے بغیر ہی سب کو ٹریٹ دینی پڑتی ہے۔ اچھا خاصا بجٹ خراب ہوتا ہے۔ ابو جی نے جب میں سات سال کی تھی تب میری سالگرہ منائی تھی باداموں والے کیک کے ساتھ مجھے وہ سالگرہ کبھی نہیں بھولتی۔

تحفے دینے کی روایت مجھے بہت پسند ہے اور میں فیملی کزنز اور اکلوتی دوست ہیں میری 4 نہیں لازمی برتھ ڈے گفٹ دیتی ہوں۔

2 ایسے تو بہت سے جملے ہیں جو مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے مگر سب سے اہم اور یاد رہنے والے جملے۔

عمیرہ احمد کے پیر کامل سے۔

"ہم کیا ہیں، ہماری محبتیں کیا ہیں۔ کیا چاہتے ہیں، کیا پاتے ہیں"

نمرہ احمد کے جنت کے پتے سے "جنت کے پتے ہر وہ چیز ہوتے ہیں جو انسان رسوا ہونے کے بعد خود کو ڈھکنے اور دوبارہ عزت حاصل کرنے کے لیے اوڑھتا ہے۔"

نمرہ احمد کے ناول "مصحف" سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ جو انہوں نے اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی وفات کے موقع پر کہے تھے۔

"آنکھ آنسو بہاتی ہے۔
اور دل غمگین ہے۔
مگر.....
ہم زبان سے وہی کہیں گے جس پر ہمارا رب راضی ہو۔"

"امام شافعی کہتے ہیں آزمائش جب جب بہت تنگ ہوتی ہے وہیں سے کھل جاتی ہے۔

ایمل رضا کے تعویذ حب سے

"ایسا کیوں ہوتا ہے؟ قدرت کے نظام میں ان گنت سوالیہ نشان کیوں ہیں۔ قدرت کے نظام میں اتنے ہی جواب کیوں نہیں ہیں۔"

3۔ فرزانہ کھل کا مارچ 2016ء میں شائع ہونے والا "محبت مانگتی ہے جو" اس ناول کے اینڈ نے مجھے بہت رلایا۔ اسے پڑھنے کے بعد مجھے سمجھ آیا کہ ہر چیز کو حاصل کر لینا سب کچھ نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حق میں بڑا مہربان ہے۔ اس لیے انسان کو عقل و فہم سے فیصلے کرنے چاہیے جیسے عشنا نے کیا۔ عورت اپنا مقام و مرتبہ خود بناتی ہے۔ اس لیے مجھے یہ ناول بہت بھایا۔

شعاع کے ساتھ

ادارہ

ملالہ اسلم۔۔۔ خانیوال

1۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا؟ اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ لکھیں؟

اگر بات ہو شعاع سے وابستگی کی تو پانچ سال پیچھے جانا پڑے گا۔ آپی فوزیہ چاچو یاسین کی بیٹی (آپی ذکیہ) سے لے کر پڑھتی تھی تب تو ہم بہت چھوٹے تھے جناب۔ اس دن بھی میرا خیال ہے 'خواتین کے شمارے میں نمرہ احمد کے ناول "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" کی دوسری قسط تھی۔ جو مجھے بہت اچھی لگی۔ نایاب جیلانی کو بھی میں نے پہلی بار پڑھا تھا۔ مجھے آج بھی ان کا ناول "آدھا سچ" یاد ہے۔ رسالے پڑھنا مما کی طبیعت پر سخت گراں گزرتا تھا تب ہی آپی چاہتے ہوئے بھی نہیں خرید سکتی تھیں۔ 8th کلاس تک میرا اکیڈمک ریکارڈ فرسٹ پوزیشن تک رہا جب میں میٹرک تک پہنچی مجھے اس کا چسکہ بری طرح لگ چکا تھا تب ہی میں اسکول سے آتے جاتے منتھلی خریدار بن گئی۔ پہلے پہل چھپا کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ پوسٹ بھی کرواتی تھی 'مگر اب سب کے سامنے پڑھتی ہوں اور آپی مہوش (ذکیہ کی بڑی بہن) کو بھی دینے لگی ہوں۔ آپی کی شادی کے بعد انہیں بھی میں دینے لگی 'مگر کبھی کبھار دل خون کے آنسو روتا ہے جب ہم بے بسی سے اس کی مما کے ہاتھوں درگت بنتے دیکھتے ہیں۔ بس جی دعا ہے کہ ہمارا ناتا 'شعاع' خواتین سے (ظالم سماج) کی وجہ سے کبھی نہ ٹوٹے (آمین)۔

2۔ صبح سے رات تک کتنے کام نمٹاتی ہیں اور مصروفیات میں مطالعہ کا وقت کیسے نکالتی ہیں؟

میرا دن بھی ہر اچھے مسلمان کی طرح نماز سے شروع ہوتا ہے 'مگر کبھی کبھی لاپروائی ہو بھی جائے تو بابا جانی اپنی خدمات ضرور پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابا اور اپنی چائے بناتی ہوں۔ چھوٹے بھیا نے مدرسے اور بہنوں نے اسکول جانا ہوتا ہے۔ آپی کی شادی کے بعد میری مما نے کھانا بنانے کی ذمہ داری مابدولت کے نازک کندھوں پر ڈال دی ہے۔ آپی کے ہوتے ہوئے تو کبھی اس بچی نے ہل کر پانی بھی نہیں پیا تھا اور اب۔۔۔ خیر ناشتے کے بعد جلدی جلدی کچن صاف کرکے (چونکہ ٹیچر ہوں) اسکول جاتی ہوں۔ اسکول سے آکر تھوڑا ریسٹ کرنے کے بعد (کمپیوٹر کورس) کے لیے سینٹر جاتی ہوں۔ ایکچوئلی میٹرک کے پیپرز کے بعد آج کل فری ہوں۔ شام کا کھانا خود تیار کرتی ہوں۔ بستر چھوٹی بہنیں ڈال دیتی ہیں اس کے بعد میرا ٹائم فری ہوتا ہے۔

3۔ شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں جو ایک خوب صورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں اور وہ تحریر جسے پڑھ کر دل الجھا' کسی کردار میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آئی؟

یہ تو فیکٹ ہے افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا۔ ایسی تو بہت سی تحریریں ہیں جو ہم بھلا نہیں سکتے اور ایسی بہت سی تحریریں ہوتی ہیں جو بھی بھی ہمارے ذہنوں سے محو نہیں ہوتیں۔ ان فیکٹ

کچھ کردار اور واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ پر نقش ہو جاتے ہیں۔ عمیرہ آپی کا "پیر کامل" راحت جبیں کا "زرد موسم" نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" اور "مصحف" ہی کافی ہے۔ نایاب جیلانی کا "مقدمہ دل" جو خواتین 2015ء اگست کے شمارے میں پڑھا تھا' دلچسپ لگا۔ سمیرا احمید آج کل چھائی ہوئی ہیں'

سائرہ رضا' عنیزہ سید' آسیہ رزاقی ان کی ہر تحریر ایسا ہی سحر پھونکتی ہے دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔

4۔ اپنی خوبیاں اور خامیاں بتایئے' وہ تعریفی جملہ جسے سن کر خوشی ہوئی؟

خوبیاں اور خامیاں تو دوسرے ہی بتا سکتے ہیں سر محسن نے کہا تھا۔

"آپ بہت اچھی ڈیبٹو اور کانفیڈنٹ ہو مزید محنت کرو اور بہت آگے جاؤ گی۔" مہک کے بقول "تم ایک فرینڈلی اور مخلص لڑکی ہو۔" اس نے ایک بار کہا تھا "میری دوست ایک بریلینٹ لڑکی ہے۔" خیر ہر انسان مکمل تو نہیں ہوتا میرے نزدیک' میری سب سے بڑی خوبی مخلص ہوں اور سب سے بڑی خامی غصہ اور بد گمانی ہے۔

پسندیدہ شعر' اقتباس' پسندیدہ کتاب؟

سردیوں کا موسم بہت پسند ہے۔ پسندیدہ اقتباس بہت سے ہیں اس وقت ایک سلیکٹ کرنا مشکل ہے۔

پسندیدہ کتاب "ابھی بلا ٹلی نہیں" عرفان احمد خان کی اور نسیم سحر قریشی کی "بڑا آدمی" پسندیدہ شعر

تم موم سے اک محل بنانے تو لگے ہو
سورج بھی نکلتا ہے ادھر ذہن میں رکھنا

نزہت مبشر۔۔۔ فیصل آباد

1۔ شعاع سے وابستگی کو کتنا عرصہ گزرا' اس حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ ہو تو لکھیں؟

شعاع سے دوستی نجانے کب ہوئی تھی جب سے ہوش سنبھالا ہے شعاع پڑھ رہی ہوں۔ یعنی ہجولی ہی کہہ لیں۔ گھر سے ہی یہ لت لگی۔ امی پڑھتی تھیں تو ہم سب بھی پڑھنے لگے۔ وراثتاً" یہ شوق ملا جو قائم و دائم ہے۔ شادی سے پہلے مستقل سلسلوں میں بھی بڑی مستقل مزاجی سے شامل ہوتی تھی' مگر شادی کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا' مگر پڑھنا نہیں چھوڑا۔ میری بڑی بہن افسانے لکھا کرتی تھیں خواتین ڈائجسٹ اور شعاع میں تو جب انہیں لکھنے سے کسی نے نہیں روکا تو مجھے پڑھنے سے کس نے روکنا تھا۔

(آپ کو فرحت ظفر' نزہت ظفر۔۔۔ جڑانوالہ۔۔۔ یاد ہیں آپی؟ میں وہی ہوں)

2۔ صبح سے رات تک کتنے کام نمٹاتی ہیں اور مصروفیات میں مطالعہ کا وقت کیسے نکالتی ہیں؟

صبح کا آغاز الارم سے ہی ہوتا ہے۔ عام سی روٹین ہے جیسی سب ہاؤس وائف ہوتی ہیں۔ ویسی ہی ہوں' مگر دو سال سے ذرا فراغت بڑھ گئی ہے۔ پہلے ہم جوائنٹ فیملی میں رہتے تھے تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ دو سال ہو گئے اپنے گھر میں تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ مبشر کے ساتھ ہی ناشتا کر کے کچن سمیٹ لیتی ہوں۔ دس بجے تک صفائی کا کام بھی ختم ہو جاتا ہے۔ گیس کی لوڈ شیڈنگ ہونے کی وجہ سے جب گیس آتی ہے تب سالن بناتی ہوں۔ مبشر رات کو واپس آتے ہیں تو صبح سے رات تک میں تقریباً" فارغ ہوتی ہوں۔ سارا دن یا تو پرانے رسالے' کتابیں پڑھتی ہوں یا پھر فیس بک۔۔۔ زندہ باد۔۔۔ ٹی وی زیادہ نہیں دیکھتی۔ آٹھ بجے دیکھنا شروع کرتی ہوں۔ مبشر آتے ہیں تو ہم دونوں کھانا کھا کے فارغ ہوتے ہیں۔ جب نیند آجائے تو سو جاتی ہوں۔ کبھی مہمان آجائیں یا ہم نے کہیں جانا ہو تو روٹین بدل جاتی ہے ورنہ بے رنگ سے دن گزر رہے ہیں۔

3۔ شعاع کی وہ کون سی تحریریں ہیں' جو ایک خوب صورت یاد بن کر دل پر نقش ہیں اور وہ تحریر جسے پڑھ کر دل الجھا' کسی کردار میں اپنی شخصیت کی جھلک نظر آئی؟

ثمرہ بخاری کا افسانہ ہے "روشنی کو آنے دو"۔ اس میں زریں کا کردار پڑھ کر یوں لگا جیسے ثمرہ بخاری نے میری آپ بیتی ہی لکھی ہے۔

پسندیدہ تحریریں تو بے حساب ہیں۔ آج کل عنیزہ

سید کا ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم"۔ "شب گزیدہ" "سفال گر" "دل من مسافر من" "جنت کے پتے" "مصحف" "امر بیل" "پیر کامل" "حاصل" "ایمان امید اور محبت" "دیوار شب" "جو بچے ہیں سنگ" "زرد موسم" "زمین کے آنسو" "سرسوں کے پھول" "محبت خواب سفر اور پھلاں دے رنگ کالے خاص الخاص ہیں۔

رائٹرز بھی تقریباً" سب ہی پسند ہیں، مگر خاص طور پر عنیزہ سید، عالیہ بخاری، آسیہ رزاقی، ثمرہ بخاری، سائرہ رضا، راحت جبیں، رفعت ناہید سجاد، سعدیہ عزیز، رخسانہ نگار، فائزہ افتخار، بشریٰ سعید، نمرہ احمد، تنزیلہ ریاض، فرحت اشتیاق، نمرہ احمد اور عمیرہ احمد، قانتہ رابعہ کے افسانے بہت اچھے ہوتے ہیں اور ثمینہ عظمت کے بھی۔ نئی رائٹرز بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔

کیا آپ کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کا ادراک ہے، وہ تعریفی جملہ جسے سن کر خوشی ہوئی؟

خوبیاں... سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں۔ نرم دل ہوں۔ کمپرومائز کرلیتی ہوں۔ بے جا خواہشات نہیں ہیں۔ قناعت پسند کہہ لیں۔ سب بڑی خامی تو غصہ ہے۔ حساسیت بھی خاصی ہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونا آتا ہے۔ پوزیسیو بھی ہوں کچھ معاملات میں۔ متعلقہ افراد بہتر طور پر خامیاں گنوا سکتے ہیں، مگر میں نے کسی سے پوچھا نہیں... پردے میں رہنے دو، پردہ نہ اٹھاؤ۔

اپنا پسندیدہ شعر، لطیفہ، پسندیدہ اقتباس، پسندیدہ کتاب؟

لطیفے مجھے پسند نہیں۔ میری کولیگ روبینہ سنایا کرتی تھی اور بس اس کو ہی ہنسانا آتا تھا۔ پڑھ لیتی ہوں، مگر یاد نہیں رہتے۔

شعر بہت سے پسند ہیں۔

نہ میں حسین نہ وہ خوب صورت مگر پھر بھی
جو ہمیں ایک ساتھ دیکھے وہ دیکھتا ہی رہ جائے

کتابیں بے حساب پڑھی ہیں، مگر سب سے خوب صورت کتاب "آواز دوست" ہے۔ مختار مسعود کی اس تصنیف کا ہر جملہ دل میں اترتا ہے۔ اسی میں سے ایک جملہ ہے۔

"قحط الرجال میں مردم شماری ہو تو بے شمار اور مردم شناسی ہو تو نایاب۔"

محسن عباس سے ملاقات

شاہین رشید

محسن عباس حیدر

لگن سچی ہو تو انسان اپنی منزل پا ہی لیتا ہے۔ "محسن عباس حیدر" اپنے گھر فیصل آباد سے نکلے تو گھر والوں کو کہہ کر نکلے کہ کشتیاں جلا کر جا رہا ہوں۔ کچھ بن کے ہی آوں گا... اور پھر اس بندے نے اپنا وعدہ پورا کیا اور آج "محسن عباس حیدر" وہ مقام حاصل کر چکے ہیں جس کا انہوں نے خواب دیکھا تھا۔

"کیسے ہیں محسن عباس؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس مذاق رات ہے آج کل تو... کیونکہ آپ کو پتا ہی ہے کہ ہفتے میں تین دن پروگرام ہوتا ہے۔ تو اس میں ماشاءاللہ کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔"

"اگر مذاق رات میں آپ نہ ہوں تو کیا پروگرام کامیاب ہو گا؟"

قہقہہ "یہ اچھی بات کہی آپ نے، بے شک ہر انسان کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے۔ مگر ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔ پروگرام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔"

"اللہ زندگی رکھے آپ کی اور اسی طرح پروگرام کرتے رہیں۔ آپ گھر سے نکلے تھے کشتیاں جلا کر... پھر کامیابی نے فوراً قدم چومے یا ٹائم لگا؟"

"کسی بھی کام کی شروعات اتنی آسان کہاں ہوتی ہے اور کامیابی بھی تو وہ ہی دیرپا ہوتی ہے جو بہت جدوجہد کے بعد ملے تو الحمدللہ میں بھی کامیاب ہوا مگر تھوڑی دیر لگی اور آج میں اپنی محنت کا پھل کھا رہا ہوں۔"

"کیا سوچ کر آئے تھے کہ شوبز کی کس فیلڈ میں جانا ہے؟"

"میں نے کسی ایک فیلڈ میں جانے کا نہیں سوچا تھا بلکہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ مجھے شوبز کے ہر شعبے میں کام کرنا ہے۔ مجھے اداکاری بھی کرنی ہے۔ مجھے ہوسٹنگ بھی کرنی ہے۔ مجھے گانا بھی گانا ہے۔ ڈبنگ بھی کروانی ہے... اور میرے شوق و جذبے کو دیکھ کر میرے رب نے میرا ساتھ دیا اور مجھے ہر شعبے میں کامیابی سے ہمکنار کیا... کیونکہ ہم نے کیا بننا ہے یہ اوپر والے کو پتا ہوتا ہے۔ وہ تو بس ہمارے شوق اور لگن کو دیکھتا ہے۔"

"کیا حالات رہے جب آپ کراچی آئے؟"

"جب گھر سے چلنے لگا تھا تو کبھی ایسا لگتا تھا کہ جب میں کہیں آڈیشن دینے جاؤں گا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاؤں گا اور کبھی لگتا تھا کہ نہیں میں تو اپنا وقت ضائع کرنے جا رہا ہوں۔ اتنا آسان کام نہیں ہے کہیں پہ بھی اپنی

جگہ بنانا... اور سچ تو یہ ہے کہ دوسرے والا خیال صحیح ثابت ہوا کہ اتنا آسان نہیں ہوتا اپنی جگہ بنانا۔"

"پھر...؟"

"جب میں فیصل آباد اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھا کراچی آنے کے لیے تو سارے راستے سوچتا آیا کہ میں کراچی جاؤں گا تو "ناپا" میں داخلہ لوں گا۔ میوزک سیکھوں گا' گلوکاری سیکھوں گا پھر میری آواز کی سب واہ واہ کریں گے۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ کراچی آیا اور ایک کے بعد ایک مسائل سامنے آئے تو میں نے سوچا۔ "بیٹا یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے تھے۔"

"ہوا کیا؟"

"ہونا کیا تھا... غلط توقعات لے کر آگیا تھا۔ دن رات محنت کرتا' پیدل چلتا... ادھر جا ادھر جا... مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ گھر سے جو رقم لے کر آیا تھا' وہ بھی ختم ہو رہی تھی۔ کراچی آکر ایک کمرہ کرائے پہ لیا جو کہ پانچ ہزار ماہانہ پہ تھا... محنت مزدوری کر کے بہ مشکل پچیس سو یا تین ہزار کماتا تھا اور کرایہ پانچ ہزار دیتا تھا... کب تک گھر والوں سے لیتا... اول تو میں ان کو کچھ بتاتا ہی نہیں تھا۔ مگر گھر والے بڑے حساس ہوتے ہیں۔ اندازہ لگا لیتے تھے کہ مجھے کوئی مشکل درپیش ہے... خیر بس اللہ کو رحم آگیا... اور اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ ہی لیا اور اپنی رحمت کے دروازے مجھ پر کھول دیے۔"

"بریک تھرو کیسے ملا؟"

"کیریئر کی ابتداء ایف ایم۔ 107 سے کی اور ایک پروگرام "بی فار بھنگڑا" کیا جو کہ بہت پسند کیا گیا۔ بس اس پروگرام نے نہ صرف شہرت دی بلکہ اسے سن کر "فور مین شو" کے لوگوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور یوں سلسلہ چل پڑا... اور حالات بہتر سے بہتر اور پھر بہترین ہو گئے۔"

"مذاق رات میں کس طرح آئے؟"

"مذاق رات" میں اس طرح سے آیا کہ ایف ایم 107 میں تو کام کر ہی رہا تھا' ساتھ میں ٹی وی کا بھی

ایک شو کر رہا تھا۔ "پی این این" بھی کر رہا تھا اور دیگر کام بھی کرتے ہوئے تقریباً" دس سال ہو چکے تھے کہ ایک دن "دنیا نیوز" سے فون آیا کہ ہم سے ملاقات کریں۔ دراصل جن صاحب نے مجھے بلایا تھا انہوں نے میرے کچھ پروگرامز "دنیا نیوز" کی مینجمنٹ کو دکھائے بھی اور ریڈیو کے کچھ پروگرام سنوائے بھی... جس کی وجہ سے مذاق رات کی مینجمنٹ نے مجھے بلایا اور یوں میرا انتخاب بہ حیثیت "ڈی جے" کے ہو گیا۔"

"گڈ... پھر دیگر سرگرمیاں تو چھوڑنی ہی پڑی ہوں گی؟"

"ایف ایم۔ 107 چھوڑا... کیونکہ یہ پروگرام لاہور سے ہوتا ہے اور مجھے مستقل لاہور آنا پڑا۔ تین دن کے اس پروگرام نے مجھے اتنا مصروف کر دیا کہ پھر دیگر سرگرمیاں ماند پڑنے لگیں..."

"ایسا تو خیر نہیں ہے... ماشاء اللہ سے فلم میں کام کر کے اور کمرشلز میں کام کر کے آپ مسلسل اپنی صلاحیتوں کا اعتراف کروا رہے ہیں۔"

"یہ سب اللہ تعالیٰ کی مہربانی' میرے والدین کی

دعاؤں کا ثمر ہے۔ میری والدہ جن کا کچھ ہی عرصہ قبل انتقال ہوا ہے میری کامیابیوں پہ بہت خوش ہوا کرتی تھیں اور بہت دعائیں دیا کرتی تھیں ۔۔۔ تو بس اللہ تعالیٰ عزت کی روزی روٹی دیے رکھے۔ (آمین)"

"فلم کا پلیٹ فارم کس نے فراہم کیا؟"

"نبیل قریشی نے ۔۔۔ یہ میرا بہت اچھا دوست ہے اور اس کے ساتھ "جیو" میں "آج" میں میں نے کافی کام کیا ہے۔ پھر اس نے میرا ایک گانا "بے پرواہ ڈھولا" بھی ڈائریکٹ کیا ۔۔۔ تو میں اس کے اور یہ میرے مزاج سے واقف تھا ۔۔۔ نبیل کری ایٹو مائنڈ کا بندہ ہے۔ اس کے پاس بہت خوب صورت آئیڈیاز ہیں مگر پیسے کی کمی کی وجہ سے اسے ہم عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تھے۔ بس ڈسکس کر کے ہی خوش ہو جایا کرتے تھے۔ نبیل کراچی میں اپنے کام میں مصروف رہا اور میں لاہور میں "مذاق رات" میں مصروف ہو گیا۔ ایک دن نبیل کا میرے پاس فون آیا کہ ہمیں ایک بہت اچھی پروڈیوسر مل گئی ہے اور میں اس کے ساتھ ایک فلم کرنے لگا ہوں اور اس فلم میں تمہیں بھی کام کرنا ہے۔ تمہارا کردار تمہاری شخصیت کے مطابق میں نے لکھا ہے۔ بس تم کسی بھی طریقے سے ٹائم نکال کر کراچی آجاؤ ۔۔۔ خوشی بھی بہت ہوئی اور اپنے آپ پر فخر بھی کہ نبیل نے مجھے اس قابل سمجھا اور پروڈیوسر نے بھی ایک نئے بندے کو لینے کا رسک لیا ۔۔۔"

"پھر آپ نے مایوس بھی تو نہیں کیا نا؟"

"مگر یہ تو بعد کی باتیں تھیں ۔۔۔ پہلے تو اس نے اور پروڈیوسر نے رسک لیا ہی نا ۔۔۔ اور اس فلم میں جاوید شیخ اور سلمان شاہد جیسے موسٹ سینئرز فنکار بھی کام کر رہے تھے فہد مصطفیٰ کا بھی بڑا نام ہے، وہ بھی فلم کا حصہ تھے ۔۔۔ بس اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھی اور فلم بہت کامیاب ہوئی۔ "نامعلوم افراد" آج بھی لوگوں میں زیر تبصرہ ہے۔"

"سنی سنائی بات ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا کہ محسن کو چانس نبیل نے دوستی کی بنا پر دیا؟"

"بالکل ٹھیک سنا ۔۔۔ مگر میرا خیال ہے کہ فلم کی کامیابی کے بعد اور میرے رول کو جس طرح پذیرائی ملی اس کے بعد ان صاحب کو اور ان لوگوں کو جو اعتراض کر رہے تھے یقیناً" شرمندگی ہوئی ہو گی۔ نبیل کے بارے میں میں آپ کو بتاؤں کہ نبیل بہت پروفیشنل بندہ ہے اور کام کے سلسلے میں وہ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتا ۔۔۔ اگر دوستی کی بنا پر کام ہونے لگیں تو پھر اس انڈسٹری کا اللہ ہی حافظ ہے ۔۔۔ سب کو اس انڈسٹری میں نام بھی کمانا ہوتا ہے اور پیسہ بھی ۔۔۔ دوستی اور سفارش سے پیٹ نہیں بھرا جا سکتا۔"

"کردار تو بہت اچھا ملا ۔۔۔ آپ نے انصاف بھی کیا ۔۔۔ کیا نبیل نے معاوضے کے سلسلے میں آپ کو خوش کیا؟"

"بالکل جی ۔۔۔ بہت خوش کیا۔ اگر وہ پیسہ بچانا چاہتا تو کراچی کے کسی بھی فنکار کو یہ کردار دے سکتا تھا۔ مگر اس نے مجھ پر بھروسا کیا اور مجھے تمام سہولتیں دیں۔ لاہور سے بلوایا اور میرے تمام اخراجات بھی برداشت کیے اور بہت اچھا معاوضہ بھی دیا ۔۔۔ اور میں خوش ہوں کہ میری وجہ سے نبیل کا سر نہیں جھکا ۔۔۔"

"اور وہ لوگ جو بڑی بڑی باتیں بناتے تھے ان کے سر جھکے یا نہیں؟"

ہنستے ہوئے "جی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے سب کے منہ بند کر دیے ۔۔۔ کیونکہ اس فلم کے پانچ ایوارڈ مجھے ملے اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ جب تک تمہارا حاسد نہیں ہو گا تم ترقی نہیں کر سکو گے۔" بس اسی وجہ سے میں نے اپنے لیے چیلنج سمجھ کر اس آفر کو قبول کیا۔"

"ہمارے یہاں چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں لوگ۔ آپ بھی اب ماشاء اللہ کامیاب انسان ہیں۔ آفرز میں اضافہ تو ہوا ہو گا؟"

"بالکل ٹھیک بات کہی آپ نے ورنہ میں تو وہ انسان ہوں جو جہاں "سی وی" لے کر جاتا تھا، وہ دھتکارا جاتا تھا۔ مگر آج میں ایک باصلاحیت انسان

کہلاتا ہوں... تو جناب آفرز تو بہت ہیں مگر بہت احتیاط کے ساتھ آفرز قبول کروں گا... ویسے تو خیر مذاق رات سے ہی اتنا ٹائم نہیں ملتا کہ کچھ اور کرسکوں۔"

"باتیں تو کافی ہو گئیں... کچھ اپنے اور فیملی کے بارے میں بتائیں۔"

"جی... بالکل مگر کیا بتاؤں 'زیادہ ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ بس اتنا ہی بتاؤں گا کہ فیصل آباد سے تعلق ہے اور میری پیدائش 18 اگست 1986ء کو فیصل آباد میں ہی ہوئی۔"

"اس فیلڈ میں صرف آپ ہی ہیں اپنے خاندان میں؟"

"جی... میں ہی باغی ہوں"... ساری کشتیاں جلا کر آیا۔ جب فیصل آباد سے چلا تھا تو کافی ینگ تھا اور بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور کراچی سپنوں کا شہر لگتا تھا۔ آٹھ سال اکیلا رہا اور کسی کے ساتھ روم شیئر نہیں کیا۔"

"روم شیئر کیوں نہیں کیا... اکیلے رہنے سے آپ بری عادت میں بھی مبتلا ہو سکتے تھے؟"

"روم شیئر اس لیے نہیں کیا کہ میں بری عادت میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا... کیونکہ جب کوئی کسی کو کمزور دیکھتا ہے تو پھر اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس لیے میں اکیلا رہا... میں اپنی ماں اور بہنوں کے سر جھکانا نہیں چاہتا... اس لیے اپنے آپ کو بہت بچا کر رکھا۔"

"مزاجاً" کیسے ہیں؟"

"بھئی 'یہ سوال تو آپ کو میرے اردگرد کے لوگوں سے پوچھنا چاہیے 'لیکن خیر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ نرم گرم تو ہر انسان ہوتا ہے 'لیکن جس مزاج کا بندہ میں ہوں اس میں میں اچھوں کے ساتھ اچھا اور بروں کے ساتھ برا ہوں۔ جو اچھا ہے اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار ہوں کیونکہ اس انڈسٹری میں رہ کر میں نے یہی سیکھا ہے اور میری فیملی کی تربیت بھی یہی ہے مگر جو برا ہے ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا بلکہ ان کی سوچ سے زیادہ برا بن کے دکھاتا ہوں۔"

"میڈیا کے اکثر لوگ میں نے ایسے دیکھے ہیں جو

اسکرین پہ کچھ اور ہوتے ہیں اور آف اسکرین کچھ اور ہوتے ہیں... آپ کیسے ہیں؟"

"میں بھی آن اسکرین کچھ اور ہوں اور آف اسکرین کچھ اور... کیونکہ جب آن اسکرین ہوتا ہوں تو اپنی ڈیوٹی اور نوکری کر رہا ہوتا ہوں۔ لوگوں کو انٹرٹین کرنا میرا کام ہے 'میری جاب ہے۔ مگر آف دی اسکرین جو میں آپ کو نظر آرہا ہوں وہی ہوں۔"

"کھانے میں ابھی بھی آپ کی پسندیدہ بھنڈیاں ہیں؟"

ہنستے ہوئے... جی بھنڈیاں ابھی بھی میری پسندیدہ ہیں۔ ویسے اچھا خاصا خوش خوراک ہوں۔ جب تک صحت ہے کھانے میں پرہیز نہیں کروں گا۔"

"اللہ آپ کو ہمیشہ صحت مند رکھے اور آپ کھاتے پیتے رہیں۔" اس دعا کے ساتھ ہی ہم نے محسن عباس حیدر سے اجازت چاہی۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

ثنا فخر

"رمضان المبارک میں ڈراما ثواب بہت مقبول ہوا مگر اسے دوبارہ چلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"ضروری نہیں کہ جو ڈراما ایک بار آن ایئر ہو وہ دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ اچھی چیز کو بار بار چلانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ "ثواب" پہلے "ہم ستارے" سے چلا تھا اب "ہم" سے چلا پہلے بھی لوگوں نے بہت پسند کیا اور دوبارہ بھی.... اور پھر ایک ہی ادارے کا ڈراما تھا لہٰذا کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"آپ شوبز کے ہر شعبے میں بہت کامیاب ہیں؟ کہاں اچھا لگا اور کہاں مزہ نہیں آیا؟"

"میرے خیال میں ایک اچھا آرٹسٹ وہی ہوتا ہے جو جس فیلڈ کو اپنائے اس کے تمام شعبوں میں مہارت بھی رکھے۔ میں نے سب شعبوں میں کام کیا ہے اور چاہے اداکاری ہو۔ ماڈلنگ ہو' ہوسٹنگ ہو' ہر ایک میں انجوائے کیا ہے۔"

"آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ایک ہوسٹ اچھا فنکار نہیں بن سکتا' لیکن ایک فنکار اچھا ہوسٹ بن سکتا ہے.... تو اس سے کیا مراد ہے۔"

"یہ میرا تجربہ ہے کہ جس بندی یا بندے نے ساری زندگی یا بیشتر وقت ہوسٹنگ میں گزارا ہو وہ میرے خیال میں اتنی اچھی اداکاری نہیں کر سکیں گے جتنی ان کو کرنی چاہیے۔ لیکن کچھ پتا بھی نہیں ہوتا کہ انسان کے اندر کیا کیا صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔"

"آج کل دو چار ڈراموں میں کام کرنے والی فنکارائیں بھی "بالی ووڈ" کو پیاری ہو جاتی ہیں.... کیا آپ کو آفر نہیں آئی؟"

"میں بالی ووڈ کو پیاری نہیں ہونا چاہتی.... حالانکہ مجھے بھی کافی آفرز ہوئی ہیں لیکن میں نے تمام آفرز کو مسترد کر دیا ہے۔ کیونکہ مجھے اپنے ملک میں ہی اتنی عزت اور اتنا کام ملا ہے کہ مجھے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے.... اور ویسے بھی میں ایک ہاؤس وائف ہوں' ماں ہوں' میری گھریلو ذمہ داریاں ہیں۔ ہر وقت گھر سے باہر تو نہیں رہ سکتی۔ میں اپنے ملک میں اور اپنے حال میں بہت خوش ہوں۔"

"مگر لوگ تو منتظر رہتے ہیں؟"

"ہاں.... رہتے ہوں گے۔ لیکن میں فلم انڈسٹری کو اپنی فیملی لائف پر ترجیح نہیں دوں گی.... مجھے رشتوں

کی اہمیت کا احساس ہے۔ پیسے کی خاطر میں اپنی فیملی لائف ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔"

"اپنے نئے کام کے بارے میں بتائیں کہ کیا کیا کر رہی ہیں؟"

"ٹی وی پہ تو کام کر ہی رہی ہوں۔ ہوسٹنگ بھی کر رہی ہوں اور دو فلمیں "زہر عشق" اور "راستہ" مکمل ہونے والی ہیں۔ مزید آفرز بھی ہیں۔ لیکن ان کے اسکرپٹ ابھی پڑھے نہیں ہیں۔ تو پڑھ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گی اور میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتی ہوں کہ بیک وقت فلم 'ٹی وی ہوسٹنگ اور فیشن انڈسٹری میں کام کر رہی ہوں۔ کچھ ہی عرصہ قبل لندن میں ہونے والے پاکستان فیشن ویک میں حصہ لیا' جبکہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر منعقد ہونے والے فیشن شو میں ماڈلنگ بھی کی.... اور سب نے پسند کیا۔"

"لوگ حقیقت میں فنکاروں کو پسند کرتے ہیں یا منہ دیکھے کی باتیں ہوتی ہیں؟"

"تجزیہ کرنا تو بہت مشکل کام ہے۔ مگر لوگ پسند کرتے ہیں تو آج ہم اس مقام پر ہیں۔ کیونکہ فنکار کی ترقی میں لوگوں کی پسند نہ پسند بہت کاؤنٹ کرتی ہے.... باقی سب ڈبل چہرے لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ اصل چہرہ کون سا ہے۔"

"اب تو ہمارے ملک میں بھی فلمیں بننے لگی ہیں... کیا ہم ان کا مقابلہ ماضی کی فلموں سے کر سکتے ہیں؟"

"دیکھیں ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں.... ماضی والی فلمیں بالکل اسی انداز میں اب بنائی جائیں تو شاید اتنی کامیاب نہ ہوں۔ لیکن ان ہی فلموں کا ری مکس ہو تو لوگ پسند کرتے ہیں جیسے کہ کچھ عرصہ پہلے کیا گیا۔ آج کے دور میں بننے والی فلمیں موجودہ دور کی عکاس بھی ہیں اور جدید ٹیکنالوجی سے فیض یاب بھی۔"

آپ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں؟ بتاتی ہیں کہ کیا کرنا ہے؟ کس طرح کرنا ہے.... گائیڈ کرتی ہیں، یا ان پر تنقید کرتی ہیں؟"

"میں کسی کے کام پر تنقید نہیں کرتی' کیونکہ میرے نزدیک یہ میرا کام نہیں ہے.... بلکہ کون اچھا کر رہا ہے' کون برا' اس کا فیصلہ ناظرین کرتے ہیں.... لیکن یہ ضرور ہے کہ اچھے کام کی میں تعریف ضرور کرتی ہوں تاکہ نوجوانوں اور نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو اور انہیں نہ صرف گائیڈ کرتی ہوں بلکہ انہیں اچھے اچھے مشورے بھی دیتی ہوں۔"

"اور جو نئے ڈائریکٹرز آ رہے ہیں۔ ان کے کام سے مطمئن ہیں آپ؟"

"مطمئن تو خیر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن برا بھی نہیں کہہ سکتے' اچھا کام ہو رہا ہے اور کافی باصلاحیت لوگ آ گئے ہیں اس فیلڈ میں۔ البتہ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی ہے کہ آج کل کے ہدایت کاروں میں خود نمائی بھی بہت ہے۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ انہیں بھی فنکاروں کی طرح ہی شہرت ملے۔"

"تو کیا یہ ان کا حق نہیں ہے؟"

"حق ہے' بالکل ہے.... اگر وہ اچھا کام کریں گے تو انہیں مقبول ہونے کے لیے جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا کام انہیں مقبول کرے گا۔"

"ہمارے ڈراموں میں عورت کو جس طرح پورٹریٹ کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں آپ کچھ کہیں گی؟"

"ڈراموں میں جو دکھایا جا رہا ہے وہ سو فیصد تو درست نہیں ہے لیکن کافی حد تک درست ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی عورت وہ مقام حاصل نہیں کر سکی جو اس کا حق ہے۔ آج بھی عورت ظلم و ستم سہہ کر خاموش رہتی ہے۔ اور بولتی اس لیے نہیں کہ اس کا گھر نہ برباد ہو جائے۔ بس یہی خاموشی مرد کو اور زیادہ شیر بناتی ہے.... ایسے ڈرامے بننے چاہئیں جس میں عورت اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھا سکے۔"

سونیا حسین

"کیا حال ہے.... کم کم نظر آ رہی ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے... کم کم تو نہیں... جب ڈرامے آن ایئر ہوتے ہیں تو ایک ساتھ ہی ہو جاتے ہیں... ویسے بھی تھوڑی چوزی ہوں... ہر کردار قبول نہیں کرتی..."

"مثلاً" کون سے قبول کرتی ہیں اور کون سے نہیں؟"

"میں ہمیشہ وہ کردار قبول کرتی ہوں جو میرے نزدیک میرے لیے چیلنجنگ ہوتے ہیں۔ ورنہ عام کردار جیسے ساس بہو کے جھگڑے والے کردار تو وہ روز آفر ہو رہے ہوتے ہیں۔ انہیں تو ہرگز قبول نہیں کرتی۔"

"آج کل زیادہ تر ڈراموں میں "عورت" بے چاری ہے اس بارے میں کچھ نہیں کہیں گی؟"

"یہ سب کچھ ریٹنگ کے چکر میں ہو رہا ہے۔ اب لوگ سہل پسند ہو گئے ہیں۔ شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں... محنت سے گھبراتے ہیں... جو ٹاپک ایک بار ہٹ ہو جاتا ہے اسی کو دہراتے رہتے ہیں۔ مختلف انداز میں۔"

"آپ بھی تو اس فیلڈ کا حصہ ہیں؟"

"بالکل ہوں... یہ نہیں کہوں گی کہ کام بہت برا ہو رہا ہے۔ کام اچھا بھی ہو رہا ہے اور میں اس اچھے کام کا حصہ ہوں... اور ویسے بھی ہمیں تو کام کرنا ہے۔ اس لیے تھوڑا بہت کمپرومائز کرنا پڑتا ہے... ورنہ آپ کو تو پتا ہی ہے... یہاں آنکھ او جھل پہاڑ او جھل والی بات ہوتی ہے... ہاں جب میں اس فیلڈ میں آئی تو ضرور نیا تجربہ کروں گی۔ ویسے جب لوگ ایک جیسی کہانیوں سے اکتا جائیں گے اور ریٹنگ خود بہ خود کم ہونے لگے گی تو پھر لوگ خود ہی نئے موضوعات کو لے کر آئیں گے۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اب مجھ سمیت ساری ہی ہنستی مسکراتی اور شوخ و چنچل ہیروئنز ڈراموں میں روتی ہوئی ہی نظر آتی ہیں اور لوگ سچ مچ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔"

"سونیا! آپ نے فلم میں بھی انٹری دے دی ہے اس کے بارے میں کچھ کہیں گی؟"

"فلم میں انٹری دینا ایک اچھا تجربہ تھا "معور" میں انٹری دی، چھوٹا سا رول تھا... جو کہ پسند کیا گیا... اور اب عمران ملک کی فلم میں کام کر رہی ہوں... اور میرا لیڈنگ رول ہے۔"

"اچھا... گڈ... رول کے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"اس فلم میں میں ایک خاتون صحافی کا رول کر رہی ہوں اور یہ رول سچ مچ میری حقیقی زندگی کے بھی قریب ہے... کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہوا ہے کہ میں اس فیلڈ میں اداکارہ بننے نہیں بلکہ "اینکر" بننے آئی تھی... مگر سب نے کہا کہ آپ میں اداکاری کے جراثیم زیادہ ہیں... پھر اللہ کا شکر ہے کہ کامیابیاں بھی ملتی چلی گئیں تو میں نے اس میں قدم جما لیے... ویسے اس فلم کی اسٹوری ایک لو اسٹوری ہے۔"

"اور یہاں سے کامیابی کے بعد؟"

"آپ یقین کریں۔ مجھے بھارتی فلموں میں کام کرنے کی آفرز آچکی ہیں... اور میں کام کرنا بھی چاہتی ہوں... مگر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ جب لوگ مجھے دیکھیں گے تو وہ کہیں گے کہ یہ پاکستانی ہے اس لیے میں وہی کردار کروں گی جس سے میرا اور میرے ملک کا امیج خراب نہ ہو۔"

"اب تک کیے گئے کرداروں میں پسندیدہ کردار؟"

"سب ہی اچھے ہیں... کیونکہ میں بہت سوچ سمجھ کر اچھے کردار لیتی ہوں۔ اس لیے مجھے اپنے کیے گئے سارے ہی کردار بہت پسند ہیں مگر پھر بھی اگر نمبر دوں تو "نازو" سیریل میں میں نے ذہنی معذور لڑکی کا رول کیا تھا جو کہ مجھے بہت پسند ہے... کیونکہ میں نے محنت کی تھی اور اس میں میں (سونیا حسین) نظر نہیں آ رہی تھی... اور ایک کردار نشے کی عادی لڑکی کا کیا تھا۔

Do Not be jealous میں... وہ بھی مجھے بہت پسند ہے۔"

"چلیں جی بہت شکریہ سونیا۔ پھر بات کریں گے۔"

☆

نبیلہ عزیز

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔
ولید' ماورا کے سامنے والے صوفے پہ گم صم اور ساکت سا بیٹھا ماورا سے سنی ہوئی داستان پر یقین کرنے اور نہ کرنے کے بیچ ڈول رہا تھا۔
کیوں کہ جو کچھ وہ بتا چکی تھی' وہ قابل فراموش تو نہیں تھا۔
رضا حیدر... علی مرتضیٰ کے قاتل تھے... عافیہ بیگم اور ماورا مرتضیٰ کے مجرم تھے اور قاتل اور مقتول کی اولادیں محبت میں گرفتار تھیں۔
معاملہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا' سب عقل اور سمجھ سے باہر کی باتیں تھیں۔ ولید کی پُرسوچ آنکھیں پٹپٹا رہی تھیں۔
"بتاؤ ولید! میرا ساتھ دو گے؟ مجھے تیمور حیدر واپس چاہیے... ہر حال میں..." ماورا التجا بھی کر رہی تھی تو ایک ضد' ایک ہٹ دھرمی کے ساتھ۔

بتیسویں قسط

"ارے ڈونٹ وری' اٹھا لو... سمجھو تمہارا اپنا ہی ہے۔" مونس مرزا نے اس کی ہمت بڑھائی۔ عزت نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
وہ آخر کیا کرتی...؟ مجبوری میں گدھے کو باپ بنانے والا کام کر رہی تھی۔ اور جب گدھے کو باپ کہنے کے لیے منہ کھول ہی لیا تھا تو پھر کہہ دینے میں جھجک ہی کیا تھی؟

سو اس نے اپنی ازلی خود اعتمادی بحال کرتے ہوئے اس کی ہتھیلی سے موبائل اٹھالیا تھا' لیکن پھر بھی اس قدر احتیاط سے اٹھایا تھا کہ اپنی انگلیوں کی پوریں بھی اس کی ہتھیلی سے مس نہیں ہونے دی تھیں۔

اور مونس مرزا اس کی اس حرکت پر مزید مسکرایا تھا۔

"آئی لائک اٹ.....!" اس نے سراہا۔

اور عزت اس کی ستائش سے بے نیاز موبائل کھولنے لگی' لیکن موبائل پر پاس ورڈ تھا' اس لیے اس کے ہاتھ کی حرکت رک گئی تھی۔

"پاس ورڈ.....؟" اس نے مونس مرزا کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تمہیں پاس ورڈ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے.....؟ میرا پاس ورڈ تو تم ہو۔" مونس مرزا حد سے زیادہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"پلیز.....پاس ورڈ بولو۔" وہ بڑے تحمل سے پوچھ رہی تھی۔

"بولا تو ہے۔ بس تھوڑا سا غور کرلو..... میرا پاس ورڈ تم ہو۔" وہ کہتے ہوئے ذرا سا اس کے قریب جھکا تھا۔

"میں.....؟" وہ ٹھٹکی۔ اور پھر اگلے ہی لمحے جیسے سب سمجھ میں آگیا تھا۔

اس نے موبائل کی اسکرین پہ "عزت" کی اسپیلنگ لکھی اور لاک کھل گیا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو مونس مرزا کے موبائل پر اپنے نام کا پاس ورڈ دیکھ کر وہ یقیناً" اس کا موبائل ہی توڑ دیتی' لیکن اس وقت وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اس وقت خود اسے موبائل سے "مطلب" تھا۔ اس لیے اس نے ہر چیز نظر انداز کرتے ہوئے کی پیڈ کھولا تھا۔ اور ابھی وہ نمبر ڈائل کر ہی رہی تھی کہ مونس مرزا کی آواز پہ اس کے ہاتھوں کی حرکت وہیں رک گئی تھی۔

"ولید رحمان کے نمبر کے علاوہ تم دنیا کا کوئی بھی نمبر ڈائل کر سکتی ہو۔" مونس مرزا کی اس قدر پر سکون وارننگ پہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا' لیکن اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور بڑے غیر محسوس طریقے سے ولید کے نمبر کے بجائے تیمور کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

مگر افسوس تیمور کا نمبر بند جا رہا تھا۔

"تیمور بھائی کا نمبر تو آف جا رہا ہے۔" وہ دھیمے سے بڑبڑائی۔

"ہوں.....! تیمور بھائی خود بھی آف جا رہے ہیں۔" مونس مرزا نے مذاق اڑایا۔

عزت کے وجود میں غصے کی لہر دوڑ گئی تھی' لیکن اسے فی الحال ضبط سے کام لینا تھا۔ اس لیے ایک بار پھر نظر انداز کرتے ہوئے ساشا کا نمبر ملایا' اس کے نمبر پہ نیٹ ورک مصروف تھا۔

"اف.....!" عزت دل ہی دل میں زچ ہو کے رہ گئی تھی۔

"اب کیا کروں.....؟" اس نے اپنی سوچ کا گھوڑا دوڑایا۔

"تم جس سے بھی کانٹیکٹ کرنا چاہتی ہو..... مجھے بتاؤ..... میں ڈائریکٹ کانٹیکٹ کروا دیتا ہوں۔ جس سے بات کرنی ہے تمہیں اس کے پاس لے جاتا ہوں۔" مونس مرزا نے اسے ایک اور کھلی آفر دی تھی۔

عزت نے ٹھٹک کر دیکھا' لیکن پھر مونس مرزا کے ساتھ کہیں جانے کا سوچ کر ہی اس نے اپنے ذہن سے اس کی آفر مسترد کر ڈالی تھی۔

"پلیز.....! تھوڑی دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو..... میں اپنی کزن فارہ سے بات کرنا چاہتی ہوں..... اور اس طرح

تو میں ایزی ہو کر بات نہیں کر سکوں گی۔"

اس نے ذرا نارمل طریقے سے مونس مرزا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور نجانے کیوں مونس مرزا کا موڈ ایسا بے نیاز اور لاپروا ہو رہا تھا کہ وہ عزت کی بات مانتے ہوئے کسی اچھے بچے کی طرح سرہلا کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"دس منٹ کافی ہیں نا.....؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کافی ہیں..." عزت نے اثبات میں سرہلایا تھا۔

"اوکے... ٹھیک دس منٹ بعد میں حاضر ہوتا ہوں۔" وہ کہہ کے باہر نکل گیا اور عزت نے بڑی تیزی سے فارہ کا نمبر ڈائل کیا کیونکہ اس کے پاس مہلت کم تھی۔

صد شکر کہ فارہ نے کال ریسیور کرلی تھی۔

"ہیلو...؟" فارہ کی نرم سی آواز ایرپیس سے ابھری تھی۔

"فارہ! میں عزت بات کر رہی ہوں۔ میرے پاس اپنا موبائل نہیں ہے۔ بابا جان نے رات کو ہی مجھ سے موبائل چھین لیا تھا تاکہ میں کسی سے بھی کانٹیکٹ نہ کرسکوں۔ یہ کال میں مونس مرزا کے نمبر سے کر رہی ہوں۔"

عزت چھوٹتے ہی شروع ہوگئی تھی جبکہ فارہ ہکا بکا سی سن رہی تھی کہ وہ یہ سب کیا بول رہی ہے۔

"مگر کیوں.....؟ تم تو دبئی....." فارہ کی سچ مچ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"ہم کل صبح ہی دبئی سے آگئے تھے۔ تم کسی بھی طرح سے تیمور بھائی یا ولید سے کہو وہ مجھ سے کانٹیکٹ کریں... میں پرابلم میں ہوں۔ باقی تفصیل تم ماورا بھابھی سے پوچھ لو... میرے پاس ٹائم کم ہے۔ پلیز میرا میسج ان تک پہنچا دو... ورنہ یہ نہ ہو کہ بابا جان کے غصے کی لپیٹ میں تمیں ہی آجاؤں... اوکے ابھی بند کرتی ہوں۔ اللہ حافظ....."

عزت نے دس منٹ میں بھی ختم نہ ہونے والی بات پانچ منٹ میں ختم کر کے اس کے موبائل سے اپنے ڈائل شدہ تمام نمبرز ڈیلیٹ کردیے تھے اور دس منٹ بعد مونس مرزا دوبارہ وہاں آیا تو عزت اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"تھینک یو...! اس مشکل وقت میں تمہاری یہ ہیلپ ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اس نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کا موبائل اس کی طرف بڑھایا، مونس مرزا مسکرا دیا۔

"اور ان شاء اللہ میں تمہیں بھولنے بھی نہیں دوں گا۔ تم میری ہیلپ ہی نہیں مجھے بھی یاد رکھو گی۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے اسے جانے کے لیے رستہ دیا تھا کیونکہ وہ بیڈ روم میں جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔

"ضرور..." وہ کہہ کے آگے بڑھی۔

"میسج کیا دیا ہے....؟" مونس مرزا نے پیچھے سے آواز دی۔

"کہ ولید رحمان سے کہو، مجھ سے رابطہ کرے۔" عزت نے گردن موڑ کر اسے جواب دیا اور پھر اسے دیکھتی ہوئی باہر نکل گئی تھی اور مونس مرزا لب بھینچ کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼
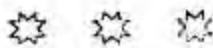
ماورا کی زبانی ساری داستان سن کر فارہ کو بھی چپ لگ گئی تھی۔

وہ بھی حیرت زدہ رہ گئی کہ کیا سے کیا ہو گیا ہے اور ان لوگوں کو خبر ہی نہیں ہے۔
"بولو... چپ کیوں ہو گئی ہو...؟" ماورا نے اسے بولنے پہ اکسایا۔
"بولنے کے لیے کچھ باقی ہے کیا...؟" فارہ نے الٹا اس سے سوال کیا۔
"فارہ پلیز... اب تم مجھے ٹینشن مت دو... میرا دماغ پہلے ہی پھٹ رہا ہے۔ میری سوچ مفلوج ہو چکی ہے... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں۔" ماورا نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اپنے سر کو دبایا اور کنپٹیوں کو سہلانے کی کوشش کی۔
"کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم... لیکن فی الحال تم لوگ عزت کے بارے میں سوچو... جو شیر کی کچھار میں بیٹھی ہے۔ ایک طرف حیدر انکل اور دوسری طرف مونس مرزا اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ ہے بھی اسی کے گھر میں..." فارہ کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"کہاں جا رہی ہو تم...؟" ماورا نے چونک کر دیکھا۔
"تمہاری اپنی طبیعت ٹھیک نہیں... میں گھر چلتی ہوں پھر آؤں گی۔"
فارہ ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی اور اب جانے کے لیے تیار تھی۔
"تو پھر تم ایک کام کرو۔" ماورا کے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا۔
"کیا...؟" فارہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے رکی۔
"تم ساشا سے کہو وہ عزت سے ملنے کے لیے جائے کیونکہ ایک وہی ہے جو اس سے رابطہ رکھ سکتی ہے۔"
ماورا کا آئیڈیا بہترین تھا۔ فارہ کے دل کو لگا تھا۔
"ہوں... ٹھیک ہے... میں ساشا سے کہتی ہوں وہ چلی جائے گی۔" فارہ نے بیگ اٹھاتے ہوئے سر ہلایا۔
"تو مجھے بتا دینا بلکہ تم مجھے بھی ساشا کا نمبر سینڈ کر دو۔" ماورا کو عزت کی فکر تیمور سے بھی زیادہ تھی۔
"اوکے... کر دیتی ہوں... اللہ حافظ...!" فارہ کہہ کے چلی گئی تھی اور ماورا کے پاس پھر سے سوچیں تھیں اور تنہائی تھی۔
"اف تیمور...! کہاں چلے گئے ہو...؟ میں اکیلی سب کیسے ہینڈل کروں...؟ کیسے...؟" وہ سوچتے ہوئے روہانسی سی ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تیمور... تیمور...!" ولید کب سے دیکھ رہا تھا کہ تیمور ایک ہی پوزیشن میں لیٹا بے سدھ سو رہا ہے۔ اس نے کروٹ تک نہیں بدلی تھی۔ اسی لیے ولید کو تشویش ہونے لگی تھی اور جب اس سے رہا نہ گیا تو وہ اٹھ کے اس کے قریب آ گیا۔
دو تین آوازیں دینے کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا سو اسے تیمور کا بازو ہلانا پڑا۔
"تیمور...!" ولید نے اس کا بازو ہلایا، لیکن ساتھ ہی اس کا دماغ بھی ہل گیا تھا۔ تیمور کا بازو آگ کی طرح تپ رہا تھا۔
"او مائی گاڈ... اسے تو بہت تیز بخار ہے۔" ولید کو پریشانی سے جھٹکا لگا۔
"تیمور... تیمور... آنکھیں کھولو... ادھر دیکھو... تیمور...!" ولید نے جھک کر اس کا چہرہ تھپکا۔
لیکن بخار کی شدت اتنی تھی کہ سدھ بدھ کھو بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے... سب خیر تو ہے...؟" زبیدہ خاتون اندر آگئی تھیں۔ انہوں نے ولید کی آواز سن لی تھی۔
"امی...! اسے بہت تیز بخار ہے۔ دوپہر سے ایک ہی پوزیشن میں سو رہا تھا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا..." ولید نے پلٹ کر ماں کو بتایا۔ وہ بھی پریشان ہو گئی تھیں۔
"اوہ... اللہ سب خیر کرے... اب کیا کرنا ہے...؟" انہوں نے متفکر نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا جسے سچ مچ کچھ ہوش نہیں تھا۔
"کرنا کیا ہے... ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا... وحید کہاں ہے؟" ولید کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا۔
"وحید گھر کا کچھ سودا سلف لینے گیا ہے، تم ڈاکٹر کی طرف جاؤ... میں تب تک تیمور کے پٹیاں بھگو کے رکھتی ہوں۔" انہوں نے ولید کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ وہ کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔
"ٹھیک ہے... میں ابھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر کی دوا دینے کے دو گھنٹے بعد بھی اس کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا تو ولید کی پریشانی دگنی ہو گئی تھی اور اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ماورا کا نمبر ملایا تھا۔ کیونکہ وہ ماورا کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"ہیلو ولید... کہاں تھے...؟ میں کب سے تمہیں کال کر رہی ہوں۔ تمہارا نمبر ہی نہیں مل رہا تھا۔" ماورا نے چھوٹتے ہی اپنی پریشانی کہی جب کہ ولید کسی اور ہی پریشانی کا شکار تھا۔
"ولید...! بولو... اب بات کیوں نہیں کر رہے...؟" ماورا نے زچ ہو کر کہا۔
"سوری... میں خود بہت پریشان ہوں... وہ دراصل تیمور کی طبیعت ٹھیک نہیں... اسے بہت تیز بخار ہے اور بخار کی وجہ سے وہ تقریباً "بے ہوش ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں ہے اسی لیے میں نے فون کیا ہے کہ آپ سے پوچھوں کہ اب کیا کروں...؟" ولید نے اپنی پریشانی بیان کی تو ماورا اپنی پریشانی بھول گئی۔
"تو تم مجھے صبح سے اب بتا رہے ہو...؟" اس کا دل چاہا وہ ولید پر چلا اٹھے۔
"صبح سے تو مجھے بھی نہیں پتا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا ہے۔ ڈاکٹر کو لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اگر دو گھنٹے کے بعد بھی بخار نہ اترے تو پھر اسپتال لے کر جانا پڑے گا، لیکن میں آپ کو بتائے بغیر کیسے چلا جاتا...؟" ولید ماورا کی اجازت سے اسے لے کر جانا چاہتا تھا۔
"ولید... پاگل ہو گئے ہو تم...؟ ایک تو مجھے لیٹ بتا رہے ہو اور دوسرا مجھ سے اجازت لے رہے ہو...؟ آخر کیوں...؟ کیا تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہیں...؟ کوئی حق نہیں تمہارا...؟" ماورا کو غصہ آ رہا تھا۔
"سوری... لیکن یہ اسپتال کا مسئلہ ہے... نہ آپ کو پتا ہو نہ اس کے پیرنٹس کو... تو میں کیسے...؟" اس نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
"بھاڑ میں جائیں سب... تم اسے اسپتال لے کر جاؤ... میں بھی آ رہی ہوں۔"
ماورا نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور ولید کو تھوڑی ڈھارس سی مل گئی تھی کہ چلو کوئی تو ساتھ ہے نا... ورنہ اگر کسی کو پتا چلتا تو میڈیا پہ پتا نہیں کیا کیا ایشو بن جاتے...

☆ ☆ ☆
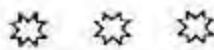
ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ماورا ولید کے بتائے ہوئے اسپتال پہنچ چکی تھی۔ ولید اسے راہداری میں ہی مل گیا تھا۔
"کہاں ہے وہ...؟" ماورا کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت میں بے قراری اور عجلت تھی جیسے وہ پلک جھپکتے میں اڑ کر اس کے پاس پہنچنا چاہتی ہو۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

"ابھی بلڈ ٹیسٹ کے بعد اسے روم میں شفٹ کیا ہے۔ امید ہے جلدی بہتر ہو جائے گا ڈونٹ وری۔ ڈاکٹر کہتے ہیں ٹینشن اور جسمانی تھکن کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔"

ولید نے ماورا کے پریشان ہوائیاں اڑتے چہرے کو اک نظر دیکھتے ہوئے اسے تسلی دینے کے لیے خود ہی بتا دیا کہ کیا مسئلہ ہے۔

"اس کا روم نمبر۔۔۔؟" ماورا نے اپنے اندر کی بے قراری اور عجلت کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے تیمور کا روم نمبر پوچھا۔

"آیئے۔۔۔" ولید نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور ماورا نے قدم آگے بڑھا دیے۔

فرسٹ فلور پہ پہنچ کے ولید کے قدم روم سے باہر ہی رک گئے تھے۔

"آپ جایئے اندر۔۔۔ مجھے اس کی ٹیسٹ رپورٹ ریسیو کرنی ہے۔ تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔" ولید نے اسے اندر جانے کا کہا اور ماورا سر ہلاتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔

وہ سامنے ہی بیڈ پہ بے سدھ پڑا تھا اور اس کی حالت ایسی تھی کہ ماورا کا دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

صرف دو دن میں اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے وہ صدیوں کا بیمار ہو اور اسے دیکھ کر ماورا کو ایسا لگا جیسے اس کے اپنے جسم سے جان نکل گئی ہو، وہ مرے مرے قدموں سے چلتی بیڈ کے قریب آ گئی۔

"تیمور۔۔۔!" اس نے بھرائی ہوئی آواز سے کہتے ہوئے تیمور کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تیمور۔۔۔! آنکھیں کھولو نا۔۔۔ مجھے دیکھو۔۔۔ میں تمہارے لیے آئی ہوں۔۔۔ تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔۔۔ پلیز ایک بار۔۔۔ ایک بار دیکھو تو سہی۔۔۔" وہ اس کے ہاتھ کو سہلا رہی تھی لیکن وہ بے خبر پڑا تھا۔

"تیمور۔۔۔! کیوں پڑے ہو اس طرح۔۔۔ اٹھو۔۔۔ پلیز۔۔۔ تم اس طرح اچھے نہیں لگ رہے۔۔۔ تم تو فریش اچھے لگتے ہو۔۔۔ ہنستے مسکراتے۔۔۔ ایک دم تیار۔۔۔ ویل ڈریسڈ۔۔۔ یہ حال۔۔۔ یہ حلیہ تمہیں سوٹ نہیں کر رہا۔۔۔ کیا بنا رکھا ہے خود کو۔۔۔ دیکھو کپڑے کتنے خراب ہو رہے ہیں۔۔۔ میلے۔۔۔ شکن آلود۔۔۔ پرانے لگ رہے ہیں۔" ماورا اس کی شرٹ کے بٹن اور کالرز کو چھو کے دیکھ رہی تھی قمیص کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں بازو پہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔

شاید اس کا بلڈ لیا گیا تھا بلڈ ٹیسٹ کے لیے۔۔۔ ماورا نے آہستگی سے بینڈیج پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور پھر نرمی سے سہلانے لگی۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور نرس اندر آ گئی نرس اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آپ کون۔۔۔؟" شاید نرس پہلے بھی وزٹ کر چکی تھی اس لیے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔

"میں ان کی وائف ہوں۔" ماورا نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ وائف۔۔۔ پھر تو حق بنتا ہے۔۔۔ ویسے رونے کی ضرورت نہیں ان شاء اللہ جلدی بہتر ہو جائیں گے۔"

نرس کہہ کر اس کا بی پی چیک کرنے لگی اور ماورا گہری سانس کھینچتی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ نظریں مسلسل تیمور کے چہرے کے گرد گھوم رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

صبح صبح ساشا جاگنگ کے لیے نکلی تھی اور پھر وہیں سے گاڑی لے کر سیدھی عزت سے ملنے چلی آئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ مونس مرزا بھی جاگنگ سے واپس آ رہا تھا۔ گیٹ پہ کسی لڑکی کی گاڑی دیکھ کر وہ بھی وہیں رک گیا۔

"کس سے ملنا ہے۔۔۔؟" مونس مرزا اس کی گاڑی کے قریب آیا۔

"عزت سے۔" ساشا نے مختصراً جواب دیا وہ اسے منہ نہیں لگانا چاہتی تھی۔
"آپ غالباً۔" اس نے ذہن پر زور ڈالنا چاہا۔
"ساشا احمد۔ عزت کی کزن۔ اس نے میرے لیے پیغام چھوڑا ہے۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔" ساشا گاڑی سے اتر آئی تھی۔
"ارے۔ اس نے پیغام چھوڑا ہے تو سمجھیں یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ آیئے اندر آیئے۔" مونس مرزا آج کل اچھائی کے ریکارڈ قائم کر رہا تھا۔
چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا اور ساشا اس کے پیچھے پیچھے چلتی اندر آ گئی تھی۔ سامنے ہی رضا حیدر اور قیام مرزا لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ ساشا کو دیکھ کر رضا حیدر کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے تھے، جس سے ظاہر تھا کہ ان کو ساشا کا آنا ناگوار گزرا ہے۔
"السلام علیکم۔!" ساشا نے قریب پہنچ کر ان دونوں کو سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔!" قیام مرزا نے جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے مونس مرزا کی طرف دیکھا۔
"حیدر انکل کی بھانجی ہیں۔ شادی میں دیکھا تھا ان کو فیصل آباد۔ مجھے بھی ابھی یاد آیا ہے۔" مونس نے باپ سے اس کا تعارف کرایا۔
"او اچھا۔" انہوں نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔
"تم یہاں کیوں آئی ہو۔؟" رضا حیدر بولے بھی تھے تو بہت ہی سرد سے لہجے میں۔
"میں عزت سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔" ساشا نے بھی بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا تھا۔
"کیوں۔؟ اس سے کیوں ملنا ہے۔؟" ان کی نظریں تیکھی ہو چکی تھیں۔
"میں تو اس سے ملنے کے لیے پہلے بھی آتی تھی۔ اس میں کیوں کا کیا سوال ہے؟ میں پہلی بار تو نہیں آئی۔؟" وہ بھی اپنے اعتماد کو بحال رکھتے ہوئے ہی یہاں آئی تھی۔
"یہاں تو پہلی بار ہی آئی ہو نا۔!" انہوں نے جیسے چبا کر کہا تھا۔
"یہاں تو آپ بھی پہلی بار ہی آئے ہیں۔" ساشا کا جواب رضا حیدر کو لاجواب کر گیا تھا۔
"ساشا۔!" عزت کی آواز پہ وہ سب ہی چونک گئے تھے۔ وہ ابھی ابھی مرکزی دروازے سے باہر نکلی تھی اور ساشا کو دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔
ساشا بھی ان سب کو نظرانداز کرتی ہوئی عزت کی طرف بڑھ گئی اور عزت اسے بیڈ روم میں لے آئی۔
"اگر انسان خود رابطہ نہ کرے تو کوئی اس کی خبر بھی نہ لے۔" عزت نے شکوہ کیا۔
"ایسی بات نہیں ہے۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ تم دبئی میں ہو اور اس مسئلے کا تو علم ہی نہیں تھا۔ مجھے تو فارہ کی کال آئی اور پھر حاور ابھابھی کی۔ وہ بھی بہت پریشان ہیں۔" ساشا نے تاسف سے کہا۔
"کیوں۔؟" عزت نے بے ساختہ پوچھا۔
"وہ تیمور بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ ولید بھائی کے گھر پہ تھے، وہیں ان کو بخار ہو گیا اور بخار سے ایسے بے سدھ ہوئے کہ انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کرانا پڑا۔ اب وہ اسپتال میں ہی ہیں۔"
"پھر اب۔ اب کیسی طبیعت ہے ان کی۔؟" عزت کے چہرے پہ بھی تفکر کے سائے اتر آئے تھے۔ آخر وہ سب تیمور کے بغیر تھے ہی کیا۔؟ بالکل بے کار۔
"ابھی تو میرا رابطہ نہیں ہوا۔ جیسے ہی ہوا تمہیں بتا دوں گی۔"
"لیکن کیسے بتاؤ گی۔؟ میرے پاس تو کوئی موبائل وغیرہ۔" عزت کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ ساشا نے اپنی

پاکٹ سے ایک چھوٹا سا موبائل نکال کے اس کے سامنے کر دیا تھا۔
"آج کل اس مشین کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔۔۔ میں نے سوچا تمہیں ضرورت ہو گی۔ اس لیے ساتھ لے چلوں۔۔۔" ساشا نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔
"لیکن میں اس کو کیسے۔۔۔؟" عزت کو اگلا خیال گھیر چکا تھا۔
"یہ سائلنٹ موڈ پہ ہے۔۔۔ کریڈٹ بھی ہے۔۔۔ فارہ کا۔۔۔ میرا۔۔۔ ماورا بھابھی کا' تیمور بھائی اور ولید بھائی کا بھی نمبر سیو ہے اور تمہاری ایمرجنسی کے لیے پولیس اسٹیشن کا نمبر بھی ہے۔۔۔ تم کسی بھی ٹائم کسی سے بھی کانٹیکٹ کر سکتی ہو اور ہمیں بھی باخبر رکھ سکتی ہو۔۔۔ یہ موبائل تمہیں سب سے چھپا کر رکھنا ہو گا' ورنہ یہ بھی چھین لیا جائے گا۔۔۔ باقی تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو' مجھے بتا دینا میں پہنچا دوں گی۔ ابھی میں چلتی ہوں۔۔۔ ملاقات مختصر ہی بہتر ہے۔۔۔ طویل ہوئی تو پابندی لگ جائے گی۔" ساشا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"او کے۔۔۔ یہ کام تو تم نے بہت اچھا کیا ہے' لیکن سنو' تم خود بھی چکر لگاتی رہنا۔۔۔ میں اکیلی ہوں یہاں۔۔۔ باہر بھی نہیں جا سکتی۔۔۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔" عزت آزاد پنچھی کی طرح اونچی فضاؤں میں اڑنے کی عادی تھی' یوں قید میں رہ کر جینا کب سیکھا تھا۔۔۔؟ اسی لیے وہ گھبرا چکی تھی۔
"دعائیں دو اپنے بابا جان کو۔۔۔" ساشا نے طنز کیا۔
"ان کا تو نام بھی مت لو۔۔۔ نفرت ہو گئی ہے باپ کے لفظ سے بھی۔۔۔" عزت نے نفرت سے پھنکارتے ہوئے سر جھٹکا۔
"اگر تم لوگوں کو نفرت ہو گئی ہے تو پھر ماورا بھابھی کو کتنی نفرت ہو گی جس کو پیدا ہونے سے پہلے ہی یتیم اور گھر سے بے گھر کر دیا گیا تھا۔۔۔" ساشا نے عزت کو آئینے کا دوسرا رخ دکھایا۔
"ہاں۔۔۔! ٹھیک کہہ رہی ہو۔۔۔ وہ اس سے بھی زیادہ برا سلوک ڈیزرو کرتے ہیں۔" عزت کا غصہ اس کے چہرے سے ہی ظاہر ہو رہا تھا۔
"خیر۔۔۔! اللہ بہتر جاننے والا ہے۔۔۔" ساشا کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ماورا کی وجہ سے ولید ساری رات تیمور کے کمرے میں نہیں آیا تھا۔ البتہ وقتاً" فوقتاً" اس کی خبر لیتا رہا تھا۔
اور ماورا ساری رات اس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ جب اس کا بخار اترا تب وہ کچھ پر سکون ہوئی اور وہیں بیڈ کے قریب کرسی پہ بیٹھے بیٹھے تیمور کے بازو پہ سر رکھے سو گئی۔
فجر کی اذان کے بعد کہیں تیمور کو اپنے دائیں بازو پہ بوجھ اور تھکن محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بازو کو ہلانے کی کوشش کی تھی' لیکن اس کا بازو ہل نہیں سکا تھا اور اسی کوشش میں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔
پہلے تو وہ اسپتال کا کمرہ دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اسٹینڈ پر لٹکی ڈرپ پہ نظر پڑی تھی اور رفتہ رفتہ دوسرے بازو کی طرف دیکھا تو اپنے بازو پہ کسی کا سر دیکھ کر مزید ٹھٹک گیا۔
"کون۔۔۔؟" اس نے بازو کو زور سے کھینچنے کی کوشش کی تھی اور ماورا یک دم ہڑبڑا کے سیدھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند کے بوجھ سے بوجھل ہو رہی تھیں۔
اور تیمور اسے دیکھ کر ساکت و صامت رہ گیا تھا۔
"تیمور۔۔۔! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔۔۔؟" ماورا نے اس کے بازو کو چھوا اور تیمور کو لگا اس کے بازو کو جیسے آگ چھو گئی ہو۔

"ڈونٹ ٹچ می..." اس کا لہجہ سنگ رہا تھا۔
"پلیز تیمور...! آپ کا غصہ بجا ہے... لیکن ایک بار آرام سے بیٹھ کر میری بات تو سن لیں۔" ماورا کے لہجے میں التجائیہ رنگ تھا۔
"مجھے یہاں کون لے کر آیا ہے...؟" اس کی بات کو تیمور نے نظر انداز کر کے پوچھا۔
"ولید...!" ماورا کو بتانا پڑا۔
"تو وہ کہاں ہے...؟ ولید... ولید...! نرس...!" تیمور نے ان کو آوازیں دینا شروع کر دی تھیں۔
"تیمور پلیز... کیا کر رہے ہیں...؟" ماورا روہانسی سی ہو گئی۔
"ولید...! ولید...!" وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ ولید کوریڈور سے اس کی آواز سن کر بھاگتا ہوا اندر آیا تھا۔
"کیا ہوا...؟ سب ٹھیک تو ہے...؟" ولید گھبرایا ہوا تھا۔
"مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو...؟ مجھے گھر لے کر چلو..." وہ جلد سے جلد ماورا مرتضیٰ کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا۔
"تمہاری حالت ہی ایسی تھی کہ لے کر آنا پڑا اور اب ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر تو کہیں نہیں جا سکتے نا...؟" ولید نے ذرا سنبھلتے ہوئے کہا۔
"مجھے کسی بھی ڈاکٹر کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ بلاؤ نرس کو... یہ ڈرپ اتارے... مجھے یہاں سے جانا ہے۔" وہ بالکل جنونی ہو رہا تھا۔
اس کا یہ روپ ولید اور ماورا زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہے تھے' ورنہ وہ ایسا تو نہیں تھا۔
"نہیں جاؤ گے یہاں سے... جب تک ڈاکٹر نہ کہے..." ولید بھی ذرا سختی سے بولا تھا۔
"ولید! اس سے پہلے کہ میں کوئی اور قدم اٹھاؤں... تم نرس کو بلاؤ۔" تیمور کا انداز ضد اور ہٹ دھرمی لیے ہوئے تھا۔
"ایک منٹ... میں ڈاکٹر سے بات کر لوں پھر نرس کو بلاتا ہوں... رکو..." ولید اسے سمجھا کر کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔
"اتنی نفرت ہو گئی ہے مجھ سے کہ جہاں میں موجود ہوں وہاں آپ ٹھہر بھی نہیں سکتے...؟"
"ہاں... ہو گئی ہے نفرت... اس سے بھی زیادہ ہو گئی ہے... اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔" بخار کی وجہ سے شاید اس کا دماغ بھی تپ گیا تھا۔
"لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ مجھے آپ کی نفرت سے بھی زیادہ آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ اتنی کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" ماورا کو اب اظہار میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔
"لیکن اب کی بار میرے پاس دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو تھا سب دے چکا ہوں۔ اب میں کوئی سودا نہیں کر سکتا... خالی ہو چکا ہوں۔" وہ زہرخند ہوا۔
"لیکن اب کی بار میرے پاس دینے کے لیے بہت کچھ ہے... جو ہے سب دے دوں گی۔ اب میں ہر سودا کر سکتی ہوں... دولت' شہرت' عزت اور سب سے بڑی چیز محبت تک... سب دے سکتی ہوں... پہلے آپ نے محبت کو خریدا' اب محبت آپ کو خریدے گی... یہ سودا چلتا رہے گا... عمر بھر... میرے اور آپ کے بیچ..."

ماورا کی بات پہ وہ یک دم پھٹ پڑا تھا۔
"نہیں۔۔۔ اب کچھ بھی نہیں ہوگا۔۔۔ میرے اور تمہارے بیچ جو کچھ بھی تھا' وہ ختم ہو چکا۔"

"ابھی سے ختم کیسے۔۔۔؟ ابھی تو شروع ہوا ہے۔۔۔ اتنی جلدی ہار گئے۔۔۔؟" ماورا اس کے اندر کا غبار اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔
"ہاں۔۔۔ میں اتنی جلدی ہار گیا کیونکہ میرے ساتھ کھیلنے والے کھلاڑی ماہر تھے۔ مجھے وہ داؤ پیچ نہیں آتے تھے جو ان کو آتے تھے۔" وہ زہر زہر ہو رہا تھا۔
"تیمور۔۔۔! آپ جانتے ہیں' میں نے آپ پہ کوئی داؤ پیچ نہیں چلائے۔۔۔ میں نے جو بھی کیا۔۔۔"
"پلیز۔۔۔ تم یہاں سے چلی جاؤ یا میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔" وہ اس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔
"میں آخر کہاں جاؤں۔۔۔؟ میرے تمام راستے تو آپ تک آتے ہیں۔" ماورا اسے چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔
"تو ٹھیک ہے۔۔۔ میں چلا جاتا ہوں۔"
تیمور نے غم و غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لگی ڈرپ یک دم کھینچ ڈالی تھی اور اس کے ساتھ ہی کنولا بھی کھینچ کے نکال دیا تھا اور اتنی بے دردی سے کھینچا تھا کہ اس کی تکلیف دیکھ کر ماورا کی چیخ نکل گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ کی رگ سے خون بہہ نکلا تھا۔
"تیمور۔۔۔!" ماورا نے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ کو دبوچ لیا تھا تاکہ اس کا خون نہ بہے۔
"دور رہو مجھ سے۔۔۔" تیمور نے اپنا ہاتھ اک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا تھا اور اس حرکت سے ان دونوں کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے تھے۔
"نہیں رہوں گی۔۔۔ چاہے مجھے جان سے مار دو۔" ماورا بھی اپنی پوری طاقت سے چیخی تھی اور تیمور نے غصے میں آکر یک دم اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا تھا۔
"جان سے ماروں گا نہیں۔۔۔ خود۔۔۔ مر جاؤں گا۔۔۔ سمجھیں۔۔۔؟"
اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا تھا اور ماورا اس کی آنکھوں میں مچلتی نفرت کی جھلک دیکھ کر جیسے اپنی بگہ سرد سی ہو کے رہ گئی تھی۔
اس کا وجود منجمد ہو چکا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھی جو اس کے چہرے سے بے حد قریب تھیں اور اس کے سانسوں کی گرمی ماورا کو اپنے چہرے پہ محسوس ہو رہی تھی۔ جس سے اس کا چہرہ جل اٹھا تھا اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا تھا۔
"تیمور۔۔۔!" اس کے ہونٹ کپکپائے۔
"بس۔۔۔!" تیمور نے اس کے جبڑے کو اور بھی زور سے بھینچ ڈالا۔
"آآ۔۔۔!" وہ تکلیف سے کراہی۔۔۔

(باقی آئندہ)

صباخان

اس نے بڑی خاموشی سے پلیٹوں کو آہستہ آہستہ دھویا اور ریک پر ٹکا دیا۔ پھر کپڑا لے کر کاؤنٹر صاف کرنے لگی' لیکن اس کی توجہ کچن سے زیادہ لاؤنج سے آنے والی آوازوں پر تھی۔ جو بہت صاف سنائی دے رہی تھیں۔

لاؤنج جو لاؤنج کم اور کمرہ عدالت زیادہ لگ رہا تھا۔ جہاں ملزم ایک تھا' لیکن جج ایک نہیں تھا بلکہ پورا بینچ بیٹھا تھا۔ دادی' خالہ' پھپھو' تائی' امی' دادا' چاچو' چاچی... خالو اور پھوپھا کو بے خبر رکھا گیا تھا' کیونکہ عزت کے معاملے کو آج بھی بیٹی کے سسرال والوں سے چھپا کے رکھا جاتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں غیر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ طعنہ مارنے اور غیر ہونے میں دیر نہیں لگاتے... یہ آرڈر دادا کے تھے اور آج کی عدالت بھی ان کے کہنے پر سجائی گئی تھی۔

اور ملزم کے کٹہرے میں بے چارہ اکلوتا شہیر' اکیلا کھڑا تھا... نہ وکیل... نہ گواہ... نہ حمایتی... بلکہ سارے دلائل اور گواہ اس کے خلاف تھے۔ بقول شاعر...

تمہارا شہر تم ہی مدعی' تم ہی مصنف
ہمیں خبر ہے ہمارا قصور نکلے گا

اور قصور تو واقعی اس کا نکلا تھا۔ صرف قصور نہیں جرم۔ ایسی غلطی جہاں سے واپسی کا کوئی تصور نہیں' بس سمجھو کہ گئے اور پھنس گئے۔ وہی غلطی جو پرویز مشرف نے چیف جسٹس کو ہٹا کے کی تھی اور پھر سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بے چارا شہیر!! ایک لمحے کو دل بہت دکھی ہوا اس کے لیے...

وہ تھا بھی تو سب کا لاڈلا لیکن کیا کر سکتے تھے سب' معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

"برخوردار! اس طرح چپ رہنے سے مسائل حل نہیں ہوتے... ہمیں حتمی فیصلہ چاہیے اور وہ بھی ابھی..." یہ گمبھیر آواز دادا جان کی تھی۔

"لیکن دادا جان! یہ ناانصافی ہے۔" شہیر چیختے ہوئے بولا۔

"کیسی ناانصافی...؟" دادی بھی اسی کے انداز میں بولیں۔ "اور کچھ کرنا باقی ہے ابھی۔"

"مجھے کچھ تو وقت دیں۔" وہ شرمندہ سے لہجے میں بولا۔

"کتنا وقت! ہمارے پاس وقت ہی تو نہیں ہے۔" دادا کی آواز اب بھی گرج دار تھی۔

"کم از کم آج کا دن تو دے دیں۔" اس نے التجا کی۔

"ٹھیک ہے' کل ویسے بھی اتوار ہے۔ دوپہر کے کھانے پر ملاقات ہوگی اور اس وقت تک کوئی گھر سے باہر نہیں جائے گا۔"

"دادا جان! چائے..." دادا جان اٹھنے والے تھے کہ عارفہ چائے کی ٹرے لے کر آگئی۔

"جیتی رہو۔ اس وقت چائے کی بہت طلب ہو رہی تھی۔" دادا جان نے عارفہ کے سر پر ہاتھ پھیرا' جوان کی لاڈلی تھی۔

✲ ✲ ✲

اس نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر اس طرح داخل ہوا کہ کسی کو پتا نہ چلے... نیم تاریک

کمرے میں آہستہ سے اس نے قدم رکھا اور اردگرد نظر دوڑائی' کسی کو دیکھنے کے لیے... کمرے میں عجیب سماں تھا۔ نیم تاریکی' سلوموشن میں چلتا ہوا پنکھا... دھیمے سروں میں محمد رفیع کی آواز میں چلتا ہوا گانا۔ "اپنی آنکھوں میں بسا کر کوئی اقرار کرو۔" اور دروازے کی طرف پشت کیے' رولنگ چیئر پر بیٹھی آنکھیں بند کیے جھولتی ہوئی وہ...

اسے اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا اور چلتا بھی کیسے' وہ اتنے دھیرے سے دبے پاؤں تو آیا تھا اندر... کمرے میں گونجتی کی اتنی تیز خوشبو تھی جیسے پورے کمرے میں پرفیوم کو انڈیلا گیا ہو۔ وہ ——— آکر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے جھول رہی تھی... اس کی بھیگی پلکوں سے لگ رہا تھا کہ وہ روئی ہے۔ اسے بہت افسوس ہوا۔ وہ دبے قدموں اسی طرح واپس جانے لگا۔ جب محمد رفیع کے بول نے اس کے قدم روک لیے۔

میں نے کب تجھ سے زمانے کی خوشی مانگی ہے
اک ذرا سی میرے ہونٹوں نے ہنسی مانگی ہے

اور اس پر نکلتی ہوئی اس کی سسکی جس سے پتا چلا کہ وہ جاگ رہی ہے... لیکن اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے بغیر وہ باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"سوری عارفہ! باتوں میں خیال ہی نہیں رہا وقت کا"

اتنی دیر سے۔ کہہ رہی تھی کہ کچن میں آکر تمہارے ساتھ کچھ پکالوں۔۔۔ لیکن دادا جان کے ڈر کی وجہ سے اٹھی نہیں۔" وہ سلاد کاٹ رہی تھی' جب تائی کچن میں داخل ہوئیں۔

"کوئی بات نہیں تائی! میں سمجھتی ہوں مسئلے کو۔۔۔ آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ ویسے بھی لوگ زیادہ تھے' تو میں نے دوپہر سے تیاری شروع کردی تھی۔ بریانی اور قورمہ بنادیا ہے۔ ساتھ میں ایک سبزی بھی بنائی ہے' میٹھے میں کھیر بناکے فریج میں رکھ چکی ہوں۔ اب بس یہ سلاد اور رائتہ باقی ہے اور نان بازار سے منگوالیں گے۔" تائی نے شکر گزار نظروں سے اسے دیکھا اور ساری ڈشیں چیک کیں جو بہت لذیذ بنی تھیں۔

"ویسے کچن کو صاف دیکھ کر میرے ہاتھ پیر پھول گئے تھے کہ ابھی تک کچھ نہیں بنا۔۔۔ لیکن یہ سب تمہاری سلیقہ مندی ہے کہ کام کرتے ہوئے بھی تم سے کوئی چیز ادھر ادھر یا گندی نہیں ہوتی۔۔۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے' بہت قسمت والی ہے رضیہ جسے تم جیسی بیٹی ملی۔"

"کون ہے قسمت والا۔۔۔؟" شہیر کچن کے دروازے میں آکر کھڑا ہوگیا۔

"رضیہ جسے عارفہ جیسی بیٹی ملی ہے۔ میں نہیں جسے تم جیسا بیٹا ملا۔۔۔ جس کی وجہ سے اتنی بدنامی ہورہی ہے۔" تائی کی آواز بھرا گئی۔

"کیسی بدنامی! یہ سراسر زیادتی ہے اماں کہ آپ خض الزام کو بدنامی کہہ رہی ہیں۔ ابھی جرم مجھ پہ ثابت نہیں ہوا۔" شہیر چڑتے ہوئے بولا۔

"جرم بھی ثابت ہوجائے گا۔ کل کا سورج تو چڑھنے دو۔" تائی تپ کر بولیں۔

"پھر کل رولینا آپ اور مجھے بھی ماردینا۔۔۔ بس آج کے دن جان بخش دیں میری۔" تائی پیر پٹختے ہوئے باہر چلی گئیں۔

"مجھے کھانا نہیں دو۔۔۔ ان لوگوں کے طعنوں میں مجھ سے کھانا نہیں کھایا جائے گا۔"

✡ ✡ ✡

"جاوید منزل۔۔۔" دادا جان کا محل تھا' جسے انہوں نے حق حلال کی کمائی سے بنایا تھا اور اتنی گنجائش رکھی تھی کہ ان کی دو تین نسلیں ان میں بہ آسانی رہ سکیں اور ان کے کسی بیٹے' بہو کو جگہ کی تنگی کی وجہ سے انہیں چھوڑنا نہ پڑے۔ اپنے تین بیٹوں کے ساتھ وہ خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے اور تینوں بیٹیوں کی بھی شادی کرچکے تھے۔ اب تو ان کی اولادیں بھی جوان ہوچکی تھیں۔۔۔ لیکن دادا جان نے ان سب کی ایسی تربیت کی تھی کہ سب میں بہت اتفاق تھا اور ایسا ماحول رکھا کہ کسی کو ایک دوسرے کے خلاف سازش یا بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ حقیقت میں ایک مثالی گھر کے مثالی سربراہ تھے۔

بڑے بیٹے زبیر ان کی بیوی جمیلہ اور دو بچے' شہیر اور فائزہ' دوسرے بیٹے احمد ان کی بیوی رضیہ اور تین بیٹیاں' عارفہ' صاعقہ اور نمل۔۔۔ چھوٹے بیٹے فائق ان کی بیوی عائشہ اور بچے کاشف۔۔۔ شعیب' ہانیہ اور مروا اسی طرح تینوں پھپھیوں کی اولادیں ان کے سمیت جب جمع ہوجاتیں تو گھر میں شادی کا سماں لگنے لگتا۔ دادا جان ہر مہینے دعوت رکھ لیتے اور سب جمع ہوجاتے۔ آس پڑوس میں "جاوید منزل" کو "خوش حال گھرانے" کے نام سے جانا جاتا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ خاموشی سے اس کے سامنے کھانا رکھ رہی تھی کیونکہ غصے میں اسے برتن مارنے کی بری عادت تھی۔

"سنو عارفہ!" وہ فریج سے کھیر نکالتے جارہی تھی جب شہیر نے آواز دی۔

"جی۔۔۔" وہ واپس مڑی۔

"یہ میرے کمرے میں برتھ ڈے گفٹ کس نے رکھا ہے اور وہ بھی بے نام۔"

"مجھے کیا پتا' میں تمہارے کمرے میں تھوڑی جاتی

ہوں۔ ویسے بھی بقول دادی تمہاری روز سالگرہ ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی لڑکی تمہیں گفٹ بھیجتی ہے۔" شہیر نے کھاجانے والی نظروں سے دیکھا۔

"تم سوچ لو کہ یہ ڈیٹ کس کو بتائی تھی تو پتا چل جائے گا۔" عارفہ نے تجویز دی۔

"نہیں یہ میری ایگزیکٹ ڈیٹ ہے۔" اور اگلے لمحے وہ شرمندہ ہوا جیسے خود اعتراف کیا کہ باقی لڑکیوں کو غلط ڈیٹ بتائی ہے۔۔۔ عارفہ نے مسکرا کر کھیر اس کے سامنے رکھ دی۔

"جس دن مجھے اس ڈفر کا پتا چلا قسم سے چھوڑوں گا نہیں۔"

"کس ڈفر کو۔۔۔؟"

"یہ جو بے نام گفٹ بھیجتی ہے۔ اتنا بھی سینس نہیں ہے کہ اندر کوئی کارڈ ہی رکھ دیں۔ جس پر وشز اور نام لکھا ہو۔"

"تو پھینک دو۔ اتنی ٹینشن کیوں لیتے ہو۔۔۔" عارفہ نے تجویز دی۔

"پھینک ہی تو نہیں سکتا۔ ساری میری پسند کی چیزیں ہیں۔"

"چلو پھر دماغ پر زور ڈال کر سوچو کہ یہ تاریخ کس کو بتائی تھی۔۔۔"

"تم بھی ان لوگوں کی طرح مجھ پہ طنز کر رہی ہو۔" شہیر خفا ہوتے ہوئے بولا۔

"طنز۔۔۔!!" عارفہ نے اتنی حیرانی سے کہا کہ شہیر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

شہیر فیملی کا سب سے قابل اور خوب صورت جوان اور دادا دادی کی جان تھا۔۔۔ نہ صرف دادا' دادی بلکہ چچا' پھوپھیاں بھی اس پر جان چھڑکتی تھیں۔۔۔ خاندان کی ساری لڑکیاں اس پہ ایسے بھنبھناتی تھیں جیسے مکھیاں مٹھائی پر اور وہ بھی جتنا قابل پڑھائی میں تھا اس سے زیادہ فلرٹ کرنے میں تھا اور یہ بات سب جانتے بھی تھے۔

لیکن بعض لوگ اتنے خوب صورت اتنے پیارے ہوتے ہیں کہ ان کی ہر غلطی نظر انداز کرنے کو دل کرتا ہے اور یہی معاملہ شہیر کے ساتھ تھا۔۔۔ لیکن اس دفعہ نہیں' وہ کہتے ہیں نا کہ مرض بڑھ جائے تو علاج لازمی ہو جاتا ہے۔۔۔ چاہے کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔۔۔ اور یہی کچھ شہیر کے ساتھ ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اف اتنا کباڑ۔۔۔" وہ پتا نہیں کیا ڈھونڈنے آیا تھا۔ الماری اتنی زور سے کھولی کہ اس کا کمزور لاک ٹوٹ گیا اور اندر سے ساری چیزیں نکل پڑیں۔۔۔ پرانی قمیص پرفیوم کی خالی شیشیاں۔۔۔ پرانے جوتے۔۔۔ کتابیں اسے بہت حیرت ہوئی۔۔۔ ہر قمیص پر عجیب نقش و نگار۔

"اف اماں!" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

یوں تو خاندان کی ساری لڑکیاں شہیر کے معاملے میں بہت تیز تھیں۔۔۔ ایک ریس لگی ہوئی تھی نمبر بڑھانے کی سوائے عارفہ کے کیونکہ اپنی سانولی رنگت اور عام سے نقوش والی عارفہ خاندان کی سب سے کم صورت لڑکی تھی۔۔۔ جس نے خود بھی کبھی ایسی کوشش نہیں کی۔۔۔ اور شہیر نے بھی کبھی آنکھ بھر کر اس کو نہیں دیکھا۔۔۔ اور تیزی میں ناعمہ پھوپھو کی بیٹی مشعل سب سے بازی لے گئی۔۔۔

آخر وہ کٹھن مرحلہ آ گیا۔۔۔ اتوار کے دن دوپہر کے وقت کھانا کھانے کے بعد عدالتی بینچ پھر بیٹھ گیا۔۔۔ اور شہیر بطور ملزم پیش ہوا۔

"یہ سب کیا ہے۔۔۔؟" دادا جان نے چند کاغذات شہیر کی طرف اچھالے۔

"آئی ڈونٹ نو۔" شہیر نے کاغذات آہستہ سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ سب تم نے نہیں لکھا۔" دادا جان برہم انداز میں بولے۔

"نہیں دادا جان! یہ میں نے نہیں لکھا۔" شہیر ایک ایک خط کو دیکھ کر نفی کر رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا کہ میری بیٹی جھوٹ بولتی

ہے.... اس کا کسی اور کے ساتھ چکر ہے۔" اب کے ناعمہ پھپھو روتے ہوئے بولی۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا پھپھو! بس میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ خط میں نے نہیں لکھے۔" شہیر کے انداز میں ملامت یا شرمندگی بالکل نہیں تھی۔

"تو یہ تو سیدھا میری بیٹی پہ الزام ہی ہوا نا! اتنا اچھا رشتہ آیا تھا... اور تمہاری وجہ سے اس نے انکار کر دیا۔ اب تم بھی مکر رہے ہو۔" ناعمہ پھپھو بلیک میلنگ پہ اتر آئیں....

"چپ کرو تم....!" دادا جان ناعمہ پھپھو پہ برہم ہوئے۔ "میں ان والدین کو والدین ہی نہیں مانتا جو اولاد سے بے خبر ہوتے ہیں...."

"میں کیسے مان لوں شہیر کہ یہ خط تمہارے نہیں۔" دادا جان نے شہیر کو مخاطب کیا۔

"یہ میری نوٹ بک ہے.... آپ رائٹنگ چیک کر کے دیکھ لیں.... اگر میچ ہو رہی ہو۔"

"ہوں...." دادا جان دونوں تحریریں دیکھ رہے تھے.... جن میں واضح فرق تھا اور یوں شہیر بچ نکلا.... اس نے ایک لمبی سانس لی۔

"میں جاؤں دادا جان!" وہ اٹھنے لگا۔

"نہیں، بیٹھو یہاں!" دادا جان گرج دار آواز میں بولے اور شہیر دبک کر بیٹھ گیا۔

"اصولاً" .... تمہیں مشعل سے شادی کر لینی چاہیے.... لیکن یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے اس لیے میں زبردستی کا قائل بالکل نہیں ہوں۔" ناعمہ پھپھو کی سانس بحال ہوتے ہوتے پھر رکنے لگی۔

"جس رشتے سے انکار کیا گیا ہے.... ان سے میں خود مل کر ان کو راضی کر لوں گا مگر تمہیں مزید ڈھیل دینے کے حق میں بالکل بھی نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب دادا جان؟" شہیر کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔

"تمہیں اپنی شادی کا فیصلہ کرنا ہوگا ابھی اسی وقت تمہاری پسند پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ چاہے خاندان میں ہو یا خاندان کے باہر اتنی رعایت دے سکتا ہوں۔"

"لیکن دادا جان! میری پڑھائی...."

"کچھ نہیں ہوگا پڑھائی کو.... یہ میرا حتمی فیصلہ ہے.. ایسے حالات دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا میں۔" شہیر سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

سب کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں کہ وہ کس کا نام لے گا.... کافی دیر سوچنے کے بعد اس کے لب ملے....

"عارفہ سے۔" سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔

کچن میں کھڑی عارفہ کے ہاتھ سے پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں جنہیں وہ کیبنٹ میں رکھ رہی تھی.... اور برابر والے کمرے میں بیٹھی ساری لڑکیاں خود پر لعنت بھیج رہی تھیں.... کہ اس قاتل جاں کی محبت پانے کے لیے انہوں نے کیا کیا نہیں کیا۔ سوائے دادا کے جن کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی....

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔" دادا جان نے دوبارہ تصدیق چاہی۔

"جی...." وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ ٹیرس پہ بیٹھی ہوئی تھی جب وہ اسے ڈھونڈتے وہاں آگیا۔

"آپ...." وہ تھوڑی نروس ہوئی۔

"کیوں؟ میں یہاں پہلی بار آیا ہوں جو اتنا حیران ہو رہی ہو۔" وہ ساتھ والی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"آپ کو اپنی پسند کی لڑکی کا نام لینا چاہیے تھا۔" وہ اٹھ کر جنگلے کے پاس کھڑی ہوگئی۔ "ہمدردی میں کیے گئے فیصلے اکثر پچھتاوا بن جاتے ہیں۔"

"کیا کہا؟ میں نے تم سے ہمدردی میں شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" اس نے اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے غصے سے دیکھا۔ ایک ابرو اٹھا کر ماتھے پر بل اور چہرے پہ غصہ لیے بھی وہ اتنا حسین لگ رہا تھا.... کہ اس نے نظریں جھکا لیں۔

"ہمدردی کے لیے اور بھی بہت کام ہیں عارفہ بی بی... شادی اور محبت ہمدردی میں نہیں کی جاتی... اور میں نے اپنی پسند اور اپنی محبت کا نام لیا ہے۔" عارفہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"شہیر اور اس سے محبت!!!"

"تو پھر وہ سب کچھ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو ٹائم پاس تھا... پھر بھی پہل کبھی میں نے نہیں کی ان لوگوں نے کی... میں تو بس خود کو ایجوکیٹ کر رہا تھا۔"

"ایجوکیٹ...؟" وہ بھی فلرٹ سے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"یہ الگ فلاسفی ہے تم نہیں سمجھو گی۔"

"اچھا یہ سارے تعلیمی الفاظ تمہارے فلرٹ کے لیے ایجاد ہوئے ہیں۔"

شہیر کی ہنسی چھوٹ گئی... "اور ایسی کون سی بات ہے جو میں نہیں سمجھوں گی۔"

"تم تو قسم سے ابھی سے بیوی لگ رہی ہو۔" اس کے انداز پہ شہیر نے بے باک تبصرہ کیا جس پر وہ تھوڑی شرمندہ ہوئی۔

"آئی ایم سوری۔"

"نو سوری! سمپل سی بات ہے... جب ہم برائی کو دیکھتے ہیں تو اچھائی کو جان جاتے ہیں... کہ وہ کیا ہوتی ہے۔ رائٹ۔" اس نے تائید میں سر ہلایا "اسی طرح جھوٹی محبت دیکھ کر سچی محبت کی پہچان ہو جاتی ہے... تم مجھ سے محبت کرتی ہو، یہ بات میں شروع سے جانتا تھا۔" اس انکشاف پر عارفہ کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں... وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی... وہ مبہم سا مسکرایا

"وہ ساری لڑکیاں ایکس، وائی، زیڈ بھی مجھ سے محبت کا دعوا کرتی تھیں... اور تم نے کبھی اظہار تک نہیں کیا... کبھی کبھی تمہیں چڑانے کے لیے میں دوسری کزنز کے ساتھ تمہارے سامنے اظہار اور تعریف کرتا تھا تاکہ تم تنگ آکر مجھ سے اظہار کر دو... میں نے دو تین سال اور تنگ کرنا تھا تمہیں اگر مشعل کی وجہ سے پکڑا نہ جاتا... لیکن اس سارے کھیل میں مجھے اندازہ ہوا کہ محبت وہ نہیں ہوتی... جو آج کل کی لڑکیاں کرتی ہیں... چیٹ کرنا، ڈیٹ مارنا، ڈنر کرنا، لانگ ڈرائیو پہ جانا، شاپنگ کرنا، یہ سب ایکٹیویٹیز ہو سکتی ہیں محبت نہیں۔

محبت تو وہ تھی جو تم کرتی تھیں... میرے لیٹ ہونے پر اپنی کھڑکی میں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنا... میرے ہر کام کو بتائے بغیر خود سے کرنا... میرے ایگزام کے دوران تمہاری عبادتوں کا بڑھ جانا... میری پرانی شرٹس پر وشز لکھ کر محفوظ کرنا... میرے کمرے میں بے نام گفٹ رکھنا... اور میرا پرفیوم اپنے کمرے میں اسپرے کر کے میری موجودگی کا احساس کرنا... محمد رفیع کی غزلیں..."

"بس کرو..." اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"مجھ سے اظہار کیوں نہیں کیا؟" وہ اپنی کرسی گھسیٹ کر بالکل سامنے بیٹھ گیا۔ اتنا قریب کہ وہ اس کی سانسیں محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

"وہ... میں خود کو آپ کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔" اس کے ہاتھ اور لب کانپ رہے تھے۔

"چہرے پر میک اپ تھوپنے اور اسٹائلش کپڑے پہننے سے کوئی خوب صورت نہیں ہو جاتا... کوئی میرے دل سے پوچھے کہ تم کتنی خوب صورت ہو... انسان کردار سے اور اخلاق سے خوب صورت ہوتا ہے اور اس لحاظ سے تم فیملی کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔"

کیا انداز تھا... کیا اظہار تھا... وہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی... دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں... یہ اس کا پہلا تجربہ اور یقین تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو...؟" اس نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجا کر کہا جو ایک نقطے پر نہ جانے کتنی دیر سے دھیان لگائے بیٹھی تھی۔

"یہی کہ میری محبت رائیگاں نہیں تھی۔" اس کی ہنسی کے ساتھ آنسو بھی بہہ نکلے۔

"سچی محبتیں کبھی رائیگاں نہیں ہوتیں۔" اس نے اپنی انگلیوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔

مریم بنت ارشاد

شاہ گڑھ کو جاتی خم دار، مگر ویران پگڈنڈی پر سناٹے راج کرتے تھے۔

سر کے متوازی چمکتا سورج آگ کے گولے برساتا تھا۔ اس پُرہول سناٹے میں دم گھونٹتا حبس، جو انسان تو کیا حیوانوں کو بھی منہ کھول کر ہانپنے پر مجبور کرتا تھا۔

شاہ خاور۔ اپنی تابناک شعاعوں سے ہر شے پر سنہری رنگ جماتا تھا۔ جو پارے کی طرح لشک لشک جاتی تھیں۔ گندم کی بالیوں کے سٹے اس سنہرے پن کو اپنے اندر سموئے ساکت نظر آتے تھے۔

ہواؤں نے "شاہ گڑھ" والوں سے بیر باندھ لیا تھا اور اب ان کی جانب آنے سے انکاری تھیں۔ ایسے سارے ساکن ماحول میں اگر کوئی شے حرکت میں تھی تو وہ "میراں" کا دستی پنکھا تھا جسے وہ مسلسل جھل رہی تھی۔

اس سلگتی جان لیوا گرمی میں اس کا دو آتشہ حسن گویا موم کی مانند بہنے پر آمادہ لگتا تھا۔ برگد کے چند چھدرے پتوں سے چھن کر آتی حرارت اس کے گلاب کے سے گلابی عارضوں کو دہکا کر سرخ انار کی مانند سرخ بناتی تھی۔

مساموں سے پسینہ یوں پھوٹتا تھا گویا وہ نکڑ والے جوہڑ کے نیم گدلے پانی میں غوطہ لگا کر آئی ہو۔۔۔ اور نکڑ والا وہ جوہڑ جس کے کنارے دو پستہ قامت مگر چھدرے پتوں والے کیکر ایستادہ تھے، کسی طور بھی، جوہڑ کے نیم گدلے پانی کو اپنے سایوں سے ٹھنڈک فراہم کرنے میں ناکام رہتے تھے تب اس دم گھونٹتے حبس میں مینڈکوں کی آنکھیں جوہڑ کی سطح پر تیرتی تھیں۔

سفید سفید سی بطخیں جو خورشیداں کمہارن نے رکھی ہوئی تھیں، شاہ گڑھ کے چپے چپے کو چھان کر اس میں رینگتے کیڑے مکوڑے تلاش کرتی تھیں، اس سے ان کی گول گول آنکھیں بھی ساکت نظر آتی تھیں اور وہ جوہڑ کے کنارے چپکی بیٹھی تھیں۔

"اماں۔۔۔ اٹھ اماں۔" میراں نے برابر والی چارپائی پر بے خبر سوئی اماں کو جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا ہے میراں؟ کیا آفت آ گئی تجھ پہ۔۔۔؟" اماں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"اماں! آج پندرہ تاریخ ہے اور آج ابوبکر نے آنا ہے۔ بھول گئی ہو کیا؟" میراں نے چمکتی آنکھوں سے اماں کو یاد دلایا۔

اماں کی نیند سے بھری آنکھیں چوپٹ کھلے دروازے کی طرح پوری کی پوری وا ہو گئیں۔

"او۔۔۔! میں تو بھول ہی گئی تھی۔ آج ابوبکر نے شہر سے آنا ہے۔" اماں نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی ماتھے پر مارتے ہوئے کہا۔

"میراں! تو جلدی سے ہانڈی چڑھا، میں تب تک خرشیداں سے دیسی ککڑ لاتی ہوں، دیری نہ کر، چھیتی نال لہسن، پیاز بنا کر آٹا گوندھ لے۔"

اماں تیزی سے چپل پیروں میں پھنساتی میراں کو ہدایت جاری کر کے خرشیداں کے گھر کی طرف ہولی۔

میراں نے تیزی سے سارے کام نبٹائے اور جب وہ تندور پر روٹیاں لگا رہی تھی، تب اماں کا چہیتا بھتیجا شاہ گڑھ کی کچی پگڈنڈی پر چاچا امیر بخش کے تانگے پر بیٹھا، چاچا امیر بخش سے سارے پنڈ والوں کا حال چال دریافت کر رہا تھا۔

چاچا امیر بخش کا مشکی گھوڑا' دلکی چال چلتا شاہ گڑھ کی کچی پگڈنڈی پر سموں سے دھول اڑاتا محو سفر تھا۔
شاہ خاور۔ کی روشنی پھیکی پڑنے لگی اور نیم ملگجا اندھیرا ہر سو پھیل گیا۔
"سلام چاچی!" ابوبکر کی آواز آنگن میں کیا اتری برگد کے پتے ڈالیوں سے اڈ اڈ کر اس پر نثار ہونے لگے۔

ساتھ کھڑے ٹاہلی کے پیڑ نے جھوم کر ہواؤں کے دوش پر سلام کیا اور ساتھ ہی شہتوت کے پتوں سے تالیوں کی گونج اٹھی تھی۔ اور سارے ماحول میں سرائیت کرتی گئی' پیڑوں کے اس شور اور شہتوت کے پتوں کی تالیوں کو میراں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

☆ ☆ ☆

آخری روٹی تندور سے نکال کر چنگیر میں رکھتے ہوئے جب اس نے جھکے سر کو بلند کیا تو اس کے گلاب کے سے گلابی عارض' خون چھلکاتے تھے۔ چہرے کے اطراف سے چپکی چند لٹیں پسینے سے تر تر تھیں۔ اس نے سیاہ ریشم کی سی چمک دار آنکھیں نو وارد پر ٹکائیں۔

تب ہی چار آنکھوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا' جن میں سے دو آنکھیں بے تاثر تھیں۔
"سلام!" سیاہ پشم کی چمکدار آنکھوں پر پلکوں کی جھالریں گریں اور وہ دھیمے لہجے میں سلام کر کے آگے بڑھ گئی۔
اس رات جب ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ابوبکر شاہ گڑھ آتا اور سب سے مل کر جاتا تھا' وہ شب میراں کی شب

ماہتاب ہوتی تھی۔

سپنے گھڑنے میں اور پھر ماہتاب کو اپنے آنگن میں اترتے دیکھنا اسے بہت دلچسپ لگا کرتا تھا۔

تائی حلیمہ ہمیشہ سے کہتی آئی تھیں۔ "میں اپنے ابوبکر کے لیے پڑھی لکھی لڑکی لاؤں گی۔" لیکن میراں بے بس تھی کہ وہ آنکھوں میں اترتے ان گنت ستاروں کو اپنی مانگ میں نہ بھرے۔ یہ اس کی سانسیں تھمنے پر ہی ممکن ہو سکتا تھا سانسیں چلنے پر نہیں....

اسے خوب معلوم تھا کہ وہ نرم خو طبیعت والا شخص اس کے لیے ست رنگ جذبوں سے مزین کوئی خواب نہیں سجاتا' لیکن میراں کو پروا نہ تھی۔

وہ ان راستوں پر گامزن تھی' جن کی منزل ہمیشہ سراب ہوتی ہے۔

سرگی ویلے (صبح سویرے) میراں نے معمول کی طرح لسی بلوئی تھی' لیکن آج معمول سے ہٹ کر وہ ابوبکر کے لیے ادھ رڑھکے کا پیالہ نکالنا نہیں بھولی تھی' جو وہ بہت شوق سے پیتا تھا۔ مکھن کے پیڑے اور دیسی گھی کے پراٹھے وہ ان دنوں میں بہت ہی دل لگا کر بنایا کرتی تھی۔

جو عام دنوں میں اسے بنانا کوفت میں مبتلا کرتا تھا۔ ناشتا بھائیا کے ہاتھ بھیج کر وہ مٹکا اٹھا کر نیلماں کی طرف آگئی۔

"سلام خرشیداں ماسی.... نیلماں کہاں ہے؟ آج اس نے کنویں پہ پانی لینے نئیں جانا؟" میراں نے مٹکے کو نیچے رکھتے ہوئے خرشیداں ماسی سے پوچھا۔

"ادھر ہی تھی ابھی تو' نیلماں او نیلماں۔" ماسی کی آواز چار چفیرے گونجی اور کسی کونے سے نیلماں بھی نکل آئی۔

"آج تو سویرے ہی آگئی ہے میراں' روز مجھے تیری طرف آنا پڑتا ہے۔" نیلماں شرارت سے کہنے لگی۔

"آج ان کا پروہنا آیا ہوا ہے' اسی لیے سویرے آئی ہے۔" ماسی نے لقمہ دیتے ہوئے کہا تو میراں جھینپ گئی۔

"اچھا اٹھ نا اب' پھر سورج زیادہ چڑھ آیا تو....."

"ہاں پتا ہے مہارانی کو گرمی لگنے لگی۔" نیلماں نے میراں کی بات کاٹتے ہوئے مٹکا اٹھایا اور میراں کی تقلید میں چوکھٹ پار کی۔

دونوں لمبی لمبی اوڑھنیوں کا ٹھوڑی سے نیچے تک گھونگٹ نکالے کنویں کی طرف چل دیں۔

"کیسا ہے تمہارا پروہنا؟" نیلماں نے میراں کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

خورشیداں ماسی کی لمبی گردنوں والی درجن بھر بطخیں شور مچاتی حسب معمول ان دونوں کے پیچھے ہولیں۔

"ہش...." میراں نے مڑ کر تعاقب میں آتی بطخوں کو دور کیا تو نیلماں نے حیرت سے اسے دیکھا جو بطخوں کو خود دانہ ڈال کر اپنے پیچھے آنے پر اکساتی تھی۔ آج ان سے دامن بچا رہی تھی۔

"خیر تو ہے میراں....؟" نیلماں نے غور سے میراں کی سیاہ آنکھوں تک رسائی چاہی' لیکن گھونگھٹ کے باعث وہ ان میں امڈتے جذبات کی طغیانی نہ بھانپ سکی۔

"ابا نے شکورے کے ساتھ میرا رشتہ پکا کر دیا ہے۔" میراں نے چلتے ہوئے اسے بتایا۔ نیلماں کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"وہ ساتھ والے پنڈ کا شکورا' اف پر کب؟"

نیلماں کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔

آج نہ ان کے پیچھے شور مچاتی بطخوں کا غول تھا' نہ سر پر دائرے میں گھومتے کبوتر.... گندم کی ڈالیوں کے سٹے بے حس سے لگتے تھے۔ سارے مدار الٹ چکے تھے۔

"کل رسم ہو گی بات پکی ہونے کی' اور بھائیا کی بھی...." میراں ٹوٹے لہجے میں بولتی تھی جیسے سسکیاں اس کے جملوں میں لپٹی جاتی ہوں۔

"تو اپنی اماں کو بتا دے کہ تو ابوبکر....."

"ابا تو کے سے میری گردن کاٹ دے گا۔" میراں

نے خوف سے آنکھیں بند کیں۔

"ابوبکر نے کچھ نئیں کہا تیرے ابے سے؟"

نیلماں نے کریدا۔

"اور تو جانتی ہے نیلماں۔۔۔" میراں دکھ سے بولی "شکورا کوئی کام دھندا نئیں کرتا' بس ابے کی طرح پنج وخت مسیت میں حاضری پوری کرتا ہے' یا وہ ہٹی ہے جس پر ان کے سارے برادری والوں کا حصہ ہے۔ ابا نے اسے اپنی علیحدہ ہٹی بنانے کے پیسے دینے ہیں' ابوبکر سے یہی کہہ رہے تھے کہ وہ ہٹی ڈلوانے میں ان کی مدد کرے' کیونکہ وہ یہ کام سب سے چھپ کر کرنا چاہتے ہیں' چونکہ انہیں وہ شکورا بہت پسند آیا ہے' مسکین سا بندہ ہے' لیکن کام دھندے کا کیا ہے' وہ میں اسے کروا دوں گا۔"

میراں نے کہانی من وعن نیلماں کے سامنے دہرا دی۔ میراں نے زکام زدہ سانس یوں اندر کھینچی گویا وہ اتنا رونا چاہتی ہو کہ اس کے آنسوؤں سے کنویں بھر جائیں۔

بے آواز جھڑی لگ چکی تھی جو گھونگھٹ کی وجہ سے چھپ گئی تھی۔

گھونگھٹ نے بہت بار اس کا بھرم رکھا تھا' لیکن آج جب وہ کنواں بننے پر مصر تھی' وہ اس کا بھرم قائم رکھنے میں بہت کوشش کرتا' نرمی سے سارے آنسو اپنے اندر جذب کرتا جاتا تھا۔

"اچھا تو غم نہ کر' یہی تیرے لیے بہتر ہوگا۔"

نیلماں نے اسے دلاسا دینے کی اپنی سی کوشش کی تھی پر ناکام رہی۔

نیلماں حسرت سے میراں کو تکتی تھی۔ گھونگھٹ کے پیچھے بھی وہ اپنے حسن کی چھب کو مکمل طور پر چھپانے سے قاصر رہتی تھی کہ وہ تصویر جمال دکھتی تھی۔ اس کا حسن ہیر کے حسن کو مات دیتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ نار کی "ماہلو" جو اپنے حسن میں بے مثال لگتی تھی کا عکس لگتی تھی۔

پر اس کی قسمت میں "ماہلو" جیسا دل آویز حسن تو تھا پر وہ امام بخش نہ تھا جو اسے ہر ہفتے سونے کا ایک تحفہ دیتا تھا۔

جو اس ماہلو کو قوس کی شکل بناتی پینگ پر ہلارے لیتا دیکھ کر وہیں پتھر ہو گیا تھا۔ شاید جوہری کوئی نہ تھا جو "میراں" جیسے ہیرے کی قدر جانتا۔

لیکن قدرت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں' جن میں اپنی مرضی سے قطع وبرید نہیں کی جاتی بلکہ سر جھکائے جاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"میراں کے ابا! وٹے سٹے والا معاملہ مجھے بالکل نہیں پسند آیا۔۔۔ میں اپنے پتر کو کسی ہور سے بیاہنا چاہتی ہوں۔ اکو اک تو پتر ہے میرا۔" اماں کو اس فیصلے میں وٹے سٹے کا مسئلہ ہی چبھ رہا تھا' جس سے وہ بے آرامی محسوس کرتی تھیں۔

"بھلے لوک ہے بہت دید والے لوگ ہیں' تو فکریں نہ پال۔۔۔ رب سوہنا کرم کرے گا۔" ابا نے بات ہی لپیٹ دی تھی جیسے بس اب اس موضوع پر اور کوئی بات نہیں ہوگی۔

"کیا تھا جو بھرجائی مان جاتی' میری میراں ان رڑھے میدانوں میں۔۔۔" اماں نے ہوکا بھر کر کہا تھا۔

"چپ کر جا میراں کی ماں۔۔۔! کتنی بار سمجھایا ہے ناشکری نہ کیا کر۔" ابا نے بات کاٹ کر اماں کو ڈپٹا تھا' لیکن اماں کا ہوکا اور ان کی آدھی بات مرغیوں کے ڈربے سے انڈے نکالتی میراں کی سماعت میں پوری کی پوری اتر چکی تھی اور وہ جی جان سے کانپ گئی۔

اوڑھنی کے پلو میں رکھے درجن بھر انڈے اس کے قدموں میں ڈھیر ہوئے تھے۔ کچی زمین پر گرنے سے انڈے ٹوٹ گئے' لیکن میراں کے اندر بہت کچھ ٹوٹا ہوا جڑنے لگا تھا۔ یہ جان کر کہ اس کے اماں ابا بھی ابوبکر کو پسند کرتے ہیں پر کہتے کسی سے کچھ نہیں۔

"چاچا اتنی جلدی مت کرو۔۔۔ کچھ پتا نہیں ان لوگوں کا کیسی طبیعت کے نہیں وہ۔" ابوبکر کی مدھم

آواز میراں کے کانوں میں پڑی۔

وہ چولہے پر دودھ ابال رہی تھی.... تارے آسمان پر جگمگا کر اس اندھیر نگری کے اندھیروں میں روشنی بھرنے کی اپنی سی سعی کرتے تھے یا پھر دیسی گھی سے جلتے وہ چند دیے، جو منڈیر پر جلتے تھے.... وہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی جب اسے ابوبکر کی دھیمی آواز سنائی دی۔ ابا اور وہ چھت پر تھے اور میراں کچے صحن میں دیوار سے لگی بیٹھی تھی۔

دودھ کب سے ابل کر اب کڑھ کڑھ کر بھی گلابی ہونے لگا تھا، لیکن وہ افق پر ماہتاب کی تلاش میں گردابوں میں گھری لگتی تھی.... نہ جانے آج کل اس کے کان اتنے تیز کیوں ہوگئے تھے جو ہر بات سن لیتے تھے، پہلے تو جب، اماں اسے بلاتیں تو ہوش سنبھالنے سے اب تک ان کا میراں سے یہی گلہ رہا تھا کہ وہ اتنا کم کیوں سنتی ہے۔

شاید وہ کچھ بہری ہے.... لیکن اب تو اس کے وہ تمام خواب، پلکوں پر سجے جگنو یک لخت ہی گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں جا بسے تھے، سو وہ ہوش میں ہی رہتی تھی۔

"پتر شک نہ کر.... رب سوہنا کرم کرے گا۔"

"اگر تو کہتا ہے تو میں ویاں کے بعد ہٹی بنوا دوں گا اسے، پر کسی کو بتانا مت، ورنہ میراں کی ماں کو شکورا پہلے ہی زیادہ پسند نئیں پھر تو وہ رولا ہی ڈال دے گی۔" ابا منت طلب لہجے میں بولے تھے۔

"پر چاچا! یہ بھی تو مناسب نہیں کہ وہ کوئی کام نہیں کرتا، کیا خبر بعد میں ہٹی بھی نہ سنبھال سکے، آپ کہیں اور دیکھ لیں۔" ابوبکر نے مناسب لفظوں سے چاچا کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

"جب اپنے سگے رشتے ہی اعتبار نہ دیں، تب غیر جیسا بھی سلوک کریں.... پر خیر مجھے کسی سے گلہ نئیں۔" ابا کی لرزتی آواز اور ابوبکر کا شرمندگی سے سر جھکانا سب کچھ سمجھا گیا تھا۔

مطلب ابوبکر بے بس ہے.... چاچا راضی بہ رضا تھا، ابوبکر ان کے دل کو لگتا تھا۔ ہمیشہ دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا، مہذب اتنا تھا کہ پنڈ کے باقی مردوں کی طرح ہر فقرے کے اول، آخر میں گالیاں نہیں نکالتا تھا۔

بہت ہی بیبا بچہ تھا، شہر میں رہتا تھا، پر ہر مہینے کی پندرہ کو چاچا، چاچی سے ملنے پنڈ آتا اور اپنے اماں، ابا کو بھی کبھی کبھار لے آتا سب کی عزت کرتا.... لیکن ابوبکر نہ سہی کوئی ہور سہی.... ابا بہت قناعت پسند تھے۔

"اماں! وہ شکورا بہت ہی ویلا نکما ہے، ابا نے کیا جان کے اسے اپنی ہیروں جیسی دھی دی ہے اور تو اور ابا اسے اپنے پلے سے ہٹی بھی ڈلوا کر دے رہا ہے۔" میراں کے نکاح سے دو روز قبل بھائیا صدمے سے چور اماں کو بتا رہا تھا اور اماں کے اندر جوار بھاٹے اٹھنے لگے۔

"ارے میں تیرے ابے کو پہلے ہی کہتی تھی، تو نے کیا دیکھ کر اپنی دھی دی ہے، نہ کوئی جائیداد، نہ اوچی برادری.... بس میں کہہ رہی ہوں صغیر۔" اماں جلال سے کہتی بھائیا کے قریب ہوئیں۔ "میں اپنی سوہنی دھی ایسے ناقدروں کو نہیں دے سکتی، جا ان کو پیغام کہلوا دے۔"

بھائیا سر اثبات میں ہلاتا اٹھا تھا۔

لیکن اسے سب سوچ سمجھ کر کرنا تھا، اماں تو جلال میں آکر کہہ رہی ہے کہ میراں کو شکورے سے نہیں بیاہنا۔ ساری برادری اکٹھی ہے، کیا کہیں گے سب لوگ.... بھائیا کا سب سوچ سوچ کر دماغ پولا ہونے لگا تھا۔

وہ ڈیرے پر بہت بے چینی سے دائیں سے بائیں ٹہل رہا تھا۔

"ابا نے ہمیں کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ ابوبکر کے ساتھ مل کر ان پٹری باسوں کو ہزاروں دے آئے تھے، پھر بعد میں ہاتھ ملتے تھے، اگر مجھے پتا نہ چلتا...." بھائیا دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گیا۔

"ابا کو بھی آج ہی شہر جانا تھا.... ٹھیک ہے پھر میں خود ہی کوئی حل نکالتا ہوں۔"

بھائیا ایک نئے عزم سے اٹھ کر ڈیرے کی حدود سے نکل آیا۔

☆ ☆ ☆

گندم کے لانبے سنہروں سٹوں کی جگہ اب کہیں دھان کی سر اٹھاتی کونپلیں تھیں اور کہیں ہریاول سے نچڑتے کپاس کے پودے۔۔۔۔

چہار سو ہریاول اتنی تھی کہ دیکھ دیکھ کر آنکھیں بھی ہری کچور ہونے لگتیں۔

دن کے پہروں میں گرمی دم توڑنے لگی اور اس صبح جب میراں کا نکاح شکورے سے ہونا طے پایا تھا' کچے آنگن میں میراں کے ساتھ ساتھ اس کے پیڑ بھی اداسیوں میں گھرے نظر آتے تھے۔ دھان کی ہری کچور' ہریاول بھی دل کو فرحت بخشنے میں ناکام ہوئی جاتی تھی۔ کچے آنگن میں ساری برادری جمع تھی۔ آنے والے طوفان سے بے خبر سوختے' ہی برات کی آمد کی تیاریاں ہونے لگیں۔

زردے کی دیگیں کھڑکنے لگیں۔۔۔

گوشت بھونا جانے لگا۔۔۔۔

ابا بھی دھی کے فرض سے سبکدوش ہونے پر مطمئن نظر آتے تھے' اماں اور بھائیا کے ارادوں سے بے خبر۔ "ہم باراتیوں کو شاہ گڑھ کی کچی پگڈنڈی پر ہی واپس کردیں گے' ان کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہیے' وہ اسی لائق ہیں۔"

اماں نے دلہن بنی میراں کو ساری حقیقت سے آگاہی کردی تھی' جس کے ہرے دھان کی فصلوں سے کچے زخم پھر سے رسنے لگے تھے۔

"پر اماں میں کس لائق ہوں' یہ نہیں سوچا تو نے۔" میراں بھڑک اٹھی تھی۔ پچھلے کوٹھے کی چوکھٹ پر ایک سایہ سا حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا۔

پھر وہ غائب ہوگیا۔۔۔ لیکن اماں اور میراں اس سائے سے بے خبر اپنی کہہ رہی تھیں۔

"اماں! ساری برادری کتنے ٹھٹھے لگائے گی' یہ نہ کہے گی کہ اگر پہلے ہی چھان پھٹک کروالی ہوتی تو آج یوں جنج واپس نہ موڑنی پڑتی' ساری حیاتی' نئے آنے والے رشتے پہلے اس پرانے رشتے کے ٹوٹنے کو کریدیں گے' پھر جیسے لیں گے۔۔۔ پر یاد رکھیں اس ہیرے جیسی تیری دھی کو بیاہنے کوئی نہ آئے گا۔" وہ گلے میں پڑتے پھندے کو بمشکل حلق سے پیچھے دھکیل رہی تھی۔

"کیا تو بھول گئی ہے ماسی حاجرہ کو' جس نے ساری حیاتی اپنی ماں کی چوکھٹ پر بیٹھے گزار دی کہ اس کی ایک برات واپس چلی گئی تھی' جس میں اس نمانی کا ذرہ بھر بھی قصور نہ تھا۔"

اماں نے جن حقیقتوں سے صرف نظر کیا تھا' وہ میراں نے ایک ہی جھٹکے میں اماں کو دکھادی تھیں۔

اور اماں' وہ یوں سفید پڑنے لگیں جیسے سارے کا سارا خون اس کے جسم سے نچڑ گیا ہو۔

"میں تجھے نکمے کے ساتھ نہیں بیاہوں گی۔" اماں نے زوردار انداز سے کہا۔

"میں ساری حیاتی لوگوں کے طعنے نہیں سن سکتی۔ اماں تو بیاہ دے مجھے اسی سے۔" میراں نے تخت پر پڑے گہنے پہننے شروع کیے' پھر اس نے سارا زیور چڑھا لیا پر اماں کا سکتہ نہ ٹوٹا۔

"اگر تو چاہے تو تائی حلیمہ کی منت کرلے' ساری برادری تیرے ساتھ ہوگی' وہ بھی انکاری نہیں ہوگی' جو بھیڑے وخت میں وہی یار۔۔۔ کام نہ آئی تو پھر فیدہ ایسے سکوں کا۔۔۔ جو صرف تماش بین بنیں۔"

میراں نے آر یا پار ہونے کے لیے بہت عقل سے آخری داؤ کھیلا تھا جو عین نشانے پر لگا تھا۔

اماں خاموشی سے اٹھی۔

یہی بات تھوڑے سے ردوبدل سے اماں نے بھائیا کے کان میں ڈال دی۔

وہ بھی اتھرے بیل کی طرح باگیں تڑوا تڑوا کر جاتا تھا' پر موقع کی نزاکت ایسی حقیقت پر اکتفا کرتی تھی۔

میراں اب متوقع نتیجے پر سب کے ردعمل پر بین رہی تھی۔۔۔ کچے آنگن میں یک لخت ہاہاکار مچ گئی تھی' پیٹر بین ڈالنے لگے تھے' بات سرگوشیوں سے بلند ہوئی

شور میں بدلنے لگی۔

"اگر میرا نکاح ابوبکر سے نہ ہوا تو رب دی سوں نیلماں میں نے باری کے کنویں میں چھلانگ لگا دینی ہے۔" باہر بڑھتے ہوئے شور کو اپنے کانوں میں نہ اترنے کی سعی کرتے وہ دونوں ہاتھ کانوں پر دھر کر اونچا اونچا بولنے لگی۔

"نہ میراں بھیڑے بول مت بول۔" نیلماں تڑپ کر آگے بڑھی۔

آنگن میں اترتا شور اس کو مر جانے پر مجبور کرتا تھا۔ پر ایک آس پر جینے کی کوشش میں غلطاں وہ بہت نڈھال دکھتی تھی۔

اور نیلماں کے کندھے سے لگ کر پھر سے کنواں بن جاتی تھی۔

پھر دھیرے دھیرے بڑھتے ہوئے شور کی جگہ تو تڑیاں، شہنائیاں کو بجنے لگیں اور پھر... متواتر بجتی چلی گئیں۔

✡ ✡ ✡

میراں نے گھبرا کر نیلماں کے کندھے سے سر اٹھایا تب ہی مولوی صاحب کے ساتھ بھائیا اور ابا اندر آئے۔

وہ اس نیم اندھیاری کوٹھری میں ساکت سی گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ ان سب کو اندر آتے دیکھ کر اس کی سانس پھر سے اٹکنے لگی، لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی، سوں کھا چکی تھی۔ ابوبکر کے سوا کسی سے نکاح نہیں کرے گی بلکہ کنویں میں کود جائے گی، اس نے لمبے بنارسی کے گوٹے لگے گھونگھٹ کے پار دیکھنا چاہا تاکہ وہ فرار کا کوئی ایک راستہ نظر میں رکھے تاکہ بھاگنے میں آسانی ہو۔

وہ بے جان ہوتی سانسوں کی ناتوانی پر کڑھنے لگی اور انہیں بمشکل درست کرنے لگی۔ اپنے ہی خیالوں پر عمل پیرا جب وہ بھاگنے کی مکمل تیاری سے سیدھی ہوئی، تب ہی ایک آواز آئی۔ "ابوبکر بن خالد بہ عوض" آگے کے تمام الفاظ اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوتے چلے گئے۔

نشست پر پڑی گٹھڑی رفتہ رفتہ ڈھیلی اور پرسکون ہوتی چلی گئی۔

کہ وہ تمام خواب، سراب نہ رہے تھے بلکہ حقیقت بن کر اس کی اندھیاری آنکھوں میں روشنیوں کے ریلے بن کر اترے تھے۔ اسے خود پہ ناز ہونے لگا۔

بارات کیسے واپس لوٹی... ؟ تائی حلیمہ کیسے مانی... ؟ یہ سب باتیں اب اس کے لیے بے معنی تھیں۔

وہ اپنے ماہتاب کے سنگ دھیمی مسکان سجائے چلتی گئی۔

یک لخت ہی اس کی آنکھوں میں ٹھہرے کنویں خشک پڑنے لگے، شہتوت کے پتوں کی تالیاں، باہر بجتی تو تڑیوں، شہنائیوں کو مات دینے لگیں۔

دن کے ڈھلنے پر نہ جانے کتنے ہی جگنو اس کی چوکھٹ تک آئے تھے۔

آگے روشن راہیں تھیں جنہیں وہ مزید روشن بنانے آگئے تھے۔

✡ ✡ ✡

تائی حلیمہ بہت نرم لہجے میں اس سے بات کرتی تھیں۔ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر انہوں نے نم ناک آنکھوں سے اس کے بھرپور سراپے کو دیکھا تھا۔ رو رو کر سوجی آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں جو اور زیادہ دلکش روپ تھا۔

روٹھی ہوئی مسکراہٹوں نے میراں کا احاطہ کر لیا جو اب اس کے لبوں سے جدا نہ ہوتی تھیں۔ گلاب کی پتی سے لب بھینچ کے پیچھے سفید کورے دانت چمکتے تھے۔ اب مسکراہٹوں کے امین ہونے لگے اور پھر وہ اپنے ماہتاب کے سنگ، سب کی دعاؤں تلے کچے آنگن سے جدا ہو گئی۔

ایمل رضا

ایک بوڑھا وجود برگد کے ذریعے اپنے شکوے اپنے پیاروں تک پہنچا رہا ہے۔
"نانو ہینڈی کرافٹ کا کام کرتی ہیں۔ انار کلی بازار میں وہ ایک دکان بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ نانو یشار اور باسل دونوں بھائیوں کی سرپرست بھی ہیں۔ یشار نفسیات کا ڈاکٹر ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ باسل اس کا چھوٹا بھائی اس کا اسسٹنٹ ہے۔ دونوں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے فرانس جاتے ہیں جہاں ان کی ملاقات زُحل سے ہوتی ہے۔ زُحل اپنے ڈیڈ کی نفسیاتی کیفیت کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ لاتعداد ڈاکٹرز سے علاج کروا چکی ہے اور اب یشار کو آخری امید سمجھ کر اس کے پاس آتی ہے۔ علاج کے دوران باسل اور زُحل کی کئی ملاقاتیں ہوتی ہیں جس کے باعث دونوں میں محبت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔

مکمل ناول

حال کی کھڑکی بند ہوتے ہی ماضی اپنا در وا کرتا ہے جہاں نگار ایک جرأت مند اور نڈر لڑکی موجود ہے۔ یونی ورسٹی کے پہلے دن کے مذاق کی بدمزگی کے بعد اسے اپنے کلاس فیلوز زیان عالم اور اس کے گروپ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے جب زیان عالم یونین کے صدر کی حیثیت سے الیکشن لڑتا ہے تو نگار اس کے مخالف مصباح کو سپورٹ کرتی ہے۔ نگار کی نظر میں زیان عالم ایک برے کردار لڑکا ہے۔ جس کی والدہ گلناب عالم بھی متنازعہ شخصیت کی مالک ہیں۔ ہال میں ہوتی تقریر کے دوران نگار زیان کو اس کی ماں کے گرے ہوئے کردار کا طعنہ دیتی ہے اور زیان بدلے کے طور پر نگار اور حسن کی تصویریں، یونی ورسٹی کے نوٹس بورڈ پر لگا دیتا ہے۔ نگار غصے میں گرم چائے کا کپ زیان کے منہ پر دے مارتی ہے۔ زیان غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ نگار کو اغوا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پروفیسر صغیر ربانی کی وجہ سے ناکام ہو جاتا ہے۔

نگار گھر آتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے ایک رشتہ آیا ہے... زیان عالم کا...

یشار زل کو پاکستان آنے کے لیے کہتا ہے کہ وہ پاکستان آکر اپنے دادا، دادی کی قبریں تلاش کریں۔ زل پاکستان آچکی ہے۔ نانو زل سے کہتی ہیں کہ وہ ان کے گھر رہ لے، جس پر زل نانو کے گھر رہنے لگتی ہے۔ باسل اور زل میں محبت بڑھنے لگتی ہے۔ باسل زل کو شادی کے لیے پرپوز کر دیتا ہے۔

حسن نگار کو چھوڑ کر امریکہ جا چکا ہے۔ نگار یونی ورسٹی کے تمام واقعات اپنے باپ کو بتا دیتی ہے، جسے سمجھ کر وہ گلناب عالم کو زیان عالم کے رشتے کے لیے انکار کر دیتے ہیں۔ نگار کے والد خدا یار کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے، جہاں اتفاق سے زیان عالم موجود ہوتا ہے اور وہ خدا یار کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آخر کار نگار زیان سے شادی کے لیے مان جاتی ہے۔ شادی ہو چکی

ہے۔ دونوں سیر کے لیے سیاحتی مقام پر آئے ہیں۔ نگار زیان کو پسند کرنے لگی ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ زیان کے ساتھ یشب اور سدیم کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ زیان ان دونوں دوستوں کی موجودگی میں نگار کو طلاق دے کر اپنی اصلیت کا نقاب الٹ دیتا ہے۔

تیسری قسط

علی الصبح کا چراغ غلاظت کی سیاہی کی تاب نہ لا سکا اور بجھ گیا۔ زیان کی آواز صورِ اسرافیل کی مانند بلند ہوئی اور کمرے کے درودیوار سمیت پہاڑوں، درختوں اور چرند پرند کو بھی دہلا گئی۔ نگار پھٹی پھٹی آنکھوں سے زیان کو دیکھنے لگی۔ اس کے عین قدموں کے نیچے کی زمین کی ساتوں تہوں میں شدید زلزلہ آیا تھا۔ اور اس زلزلے میں کیسی کیسی تباہ کاریاں پنہاں تھیں۔ وہ جانتی تھی۔ زیان کو دھکا دے کر وہ دروازے کی طرف بھاگی۔ سدیم نے اٹھ کر خود کو دروازے کے راستے میں حائل کیا۔ تین مرد ایک جگہ ایک ہی نیت سے کھڑے ہوں تو دروازوں کو مقفل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جڑ سے تنا بنا اور برگد نے ضعیفی کا سفر طے کیا۔

یشب آگے بڑھا اور اس نے ایک ہی جھٹکے میں اس کا دوپٹہ اس کے جسم سے الگ کر دیا۔

برگد کی لمبی شاخیں نکل آئیں۔ آکاس بیل آسمان تک جا پہنچی اور پہلا سوال اس کی شاخ سے باندھ دیا گیا۔

''انسان کی غرقابی کی ابتدا کیا ہے؟''

کیا یہ تین۔۔۔ شر۔۔۔ شری۔۔۔ شیطان۔''

دوپٹہ فرش پر دور جا گرا۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے وجود کے گرد لپیٹ لیے اور چلا دی۔ ''نہیں۔''

برگد کی دوسری شاخ نے دوسرے سوال کو اپنی شاخ سے بندھتے ہوئے دیکھا۔

''کیا وہ تین ہیں۔۔۔؟ جلد باز، خطا کار، گناہ گار۔۔۔''

سدیم نے اسے بالوں سے کھینچ کر پکڑ لیا۔ وہ چلائی۔

''خدا کے لیے نہیں۔''

زیان نشلی چال چلتا ہوا ٹیبل سے شراب کی ایک بھری بوتل پکڑ کر اس کے قریب آیا۔ نگار کے بے بس وجود پر اوپر سے نیچے تک اس نے ایک وحشیانہ نظر ڈالی اور ہونٹ موڑے اس کے چہرے پر سیٹی کی آواز چھوڑنے لگا۔

''ایسا مت کرو زیان۔۔۔ مجھ پر رحم۔۔۔'' اس کا فقرہ درمیان میں ہی رہ گیا۔ زیان نے غصے سے اسے دیوار کے ساتھ لگایا اور اپنی کہنی کا دباؤ اس کی گردن پر بڑے زور سے ڈالا۔

''میں تو ایک گھٹیا خون ہوں۔۔۔ ایک بدکار عورت کا بدکار بیٹا۔ کیا تمہیں مجھ سے اسی فعل کی امید نہیں تھی۔۔۔ پھر تم مجھ سے رحم کی امید کیونکر کر سکتی ہو۔'' وہ نخوت سے بولا۔

غم کے مارے نگار کی آواز اس کے حلق میں ہی بیٹھ گئی۔ لیکن وہ گردن کو تیزی سے ناں میں ہلائے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنے والے لمحوں کا خوف تھا۔

''چنگیزی نے کہا تھا شراب روح کو جھلساتی ہے۔۔۔ وہ تم سے واقف نہیں تھا۔'' اس نے شراب کی بوتل کو اس کے سامنے لہرایا ''اور تم اس سے۔''

کھلے منہ کی بوتل کو اس نے اس کی پیشانی پر رکھا اور انڈیلنا شروع کر دیا۔ سیال کی دھار نے اس پر پہاڑوں کے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے کے منظر کو واضح کیا۔ اس نے زمین کو جام سفال میں ٹوٹتے، اجڑتے، غرق ہوتے دیکھ لیا۔ اس کا لباس گیلا ہو کر اس کے جسم کے ساتھ آلگا۔ اور بے بسی کے بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں سے

بہہ نکلے۔ گارڈن ہاؤس فانوس سے بھرپور روشن تھا۔ اس کے شیشے کی دیواروں کو بے نقاب ہی رہنے دیا گیا۔ غرقابی ہو تو مکمل ہو۔۔۔ رسوائی ہو تو کامل ہو۔

☼ ☼ ☼

چھت میں نصب شیشوں کو وہ بڑی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ان شیشوں میں بہت کچھ نمایاں تھا۔ ایک شخص کے انتقام کی سلگتی ہوئی آگ۔۔۔ دو دوستوں کی سازش۔۔۔ ہوس اور اس کے آنسو۔

اس نے اللہ کو پکارنا چاہا۔۔۔ لیکن ناکام رہی۔

اس کے دوپٹے میں گرہ باندھ کر اس کے منہ میں ٹھونس دی گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر بندھے تھے۔ انہیں اتنا سا تردد کرنے کی بھی نجانے کیوں ضرورت رہی تھی۔ کیونکہ پہاڑ بے بس تھے۔ جھرنے ادھ موئے اور درخت اپنی اونچائی سمیت زمین میں گڑ۔۔۔ چکے تھے۔ اس دوران وہ ان سے اتنی بار رحم کی فریاد کر چکی تھی کہ اگر وہ یہ سب کسی پتھر سے کہتی تو اس پتھر کو بھی اس پر رحم آجاتا۔ وہ تڑپتے تڑپتے جیسے بے دم ہو گئی۔

"انسان کی جو حد مقرر ہے وہ اس حد کو پھلانگنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ میں انسان کی اس بے تابی سے ڈرتا ہوں۔"

بے پردہ شیشوں کی دیواروں سے باہر سرخ آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ بادل جی جان سے گرج رہے تھے۔ شب یلدا میں بجلی کاملیت سے چمک رہی تھی۔ گونج لحہ بہ لحہ تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ باہر قدرت کے اشاروں کے سارے اہتمام موجود تھے۔ اس نے اپنے بند ہوتے دل کو تھام لیا۔

کیا وہ تین ہیں؟ ابتدا کرنے والے۔۔۔ انتہا تک لے جانے والے۔ "پشت پناہ" "سدیم" "سیاہ کار" "شب" "گدھ ذات" "زیان"۔

دو آنسو نکل کر بہت سے خشک ہو چکے آنسوؤں کے اوپر پھر سے لکیر بناتے چلے گئے۔ اس نے آخری بار چھت کو دیکھا اور خود کو چھت کے پار والے کے سپرد کر دیا۔ اسے اللہ کے ننانوے ناموں اور ان کی ننانوے صفات کے ساتھ اس کی ضرورت آپڑی تھی۔

"مکڑی نوزائیدہ شکار کے گرد جالا بن دے تو آسمان بجلی کی کڑک سے گونج اٹھتا ہے۔" بجلی نے باہر پھر شور مچایا اور اندر زیان عالم کے گلے میں جھولتا مکڑی والا لاکٹ اس کے منہ پر آلگا۔

☼ ☼ ☼

فضا میں شام کی اوس تھی۔ جس نے بڑھتے بڑھتے پھوار اور پھر پانی کے ننھے ننھے قطروں کی صورت اختیار کر لی۔ زل نے نظر اٹھا کر آسمان کے مزاج کو پرکھا اور گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر اس کی آغوش میں چھپ کر کھڑی ہو گئی۔ سردی میں اس کا فی الحال بھیگنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ دوسرا آج وہ نانو کو کوئی اشارہ بھی نہیں دینا چاہتی تھی۔

دو دن پہلے بھی اسی طرح ہوا تھا۔ باسل نے اسے صبح ہی بتا دیا تھا کہ وہ آج اسے اپنے دوستوں سے ملوانا چاہتا ہے۔ شام کو تیار ہوتے وقت جب نانو نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے تو نجانے کیوں وہ سچ نہ بتا سکی۔ اور اس نے کہہ دیا کہ وہ این جی او کے تحت ہونے والے سیمی نار میں شرکت کے لیے جا رہی ہے۔ یہ جھوٹ کار آمد ثابت ہو جاتا اگر شام کے وقت بارش نہ ہو جاتی۔ دوسرا زل اور باسل دونوں اکٹھے ہی گھر کے اندر داخل نہ ہوئے ہوتے۔

"کیا تم دونوں ایک ساتھ کہیں گئے تھے۔" نانو نے حیرت سے دونوں کو ایک ساتھ اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں نانو۔۔۔ میں تو ٹیکسی سے اتر رہی تھی جب باسل بھی آگیا۔" اس کے اس سفید جھوٹ پر باسل پہلے تو حیران رہ گیا پھر ہنستا ہوا اندر چلا گیا۔

"تم بھیگی ہوئی بھی ہو زل۔۔۔ باسل کی طرح کتنا عجیب اتفاق ہے یہ بھی۔۔۔ چلو اندر۔۔۔ سردی نہ لگ جائے۔۔۔ کیا سیمی نار اوپن ہال میں ہو رہا تھا۔"

"نہیں۔۔۔ وہ بس۔" اس سے اپنے جھوٹ کی لاج

نبھانا مشکل ہو گئی۔

"تم ٹیکسی گھر تک کیوں نہیں کرواتیں زمل۔" نانو نے اپنی ہنسی بمشکل دبائی اور زمل کے لیے اپنے کمرے تک جانا محال ہو گیا۔

سارا واقعہ یاد کر کے اسے ہنسی آئی۔ اگر وہ فرانس جا کر اپنی میڈ کو یہ تمام باتیں سنائے تو انہیں اس سے بھی زیادہ ہنسی آئے۔ دنیا میں بعض جگہوں پر ابھی بھی پرانی اور ایسی روایات زندہ تھیں۔ اس کا بچپن سدیم انکل کے ساتھ نہ گزرا ہوتا تو یقیناً" وہ بھی ایسی باتوں پر تعجب کا اظہار کرتی۔ سوچ سوچ کر وہ مسکراتی رہی۔

باسل دور سے بھاگتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ خود بھی بارش سے بچ رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر اس نے ہاتھ میں پکڑے دو بھنے ہوئے بھٹوں میں سے ایک اس کی طرف بڑھایا۔ زمل نے وہ بغیر کور کے ہی پکڑ لیا اور وہ بھٹہ اتنا گرم تھا کہ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

"دھیان سے یار۔" باسل نے بروقت اس کے ہاتھ کے نیچے اپنا ہاتھ رکھا۔ زمل سمٹ کر رہ گئی۔

مردانہ مضبوط ہاتھوں کا لمس جب نازک انگلیوں سے چھوتا ہے تو نہ جانے کیوں دل کے کسی نہاں خانے میں قید انجانے جذبوں کو تقویت دیتا ہے۔ انہیں ٹھوس کر دیتا ہے۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔ یہ لمس زیادہ گرم تھا۔ کہیں اب کی بار وہ خود ہی نہ بکھر کر رہ جائے۔ اسے پھر سے سمیٹنے والوں دونوں ہاتھ بھی یہ ہی ہوں۔ وہ سمٹے .... دوبارہ بکھرے .... اور دوبارہ سمٹے۔

"کیا ہوا؟ ٹرائی تو کرو ...." اسے اس طرح بت بنا دیکھ کر اس نے چٹکی بجا کر اسے چونکایا۔ اور اس نے تقلید میں گرم گرم بھٹے پر اپنے دانت گاڑ دیے۔

"یہ میرا، نانو کا اور ریشار کا فیورٹ پارک ہے۔" وہ دانے ایک ایک کر کے منہ میں ڈالتا ہوا اسے بتانے لگا۔ "یہاں کچھ درخت صدیوں پرانے بھی ہیں۔"

"ہاں .... مجھے یہاں سے قدامت کی بو آ رہی ہے۔"

"ہم اکثر اوقات یہاں آتے رہے ہیں .... نانو صبح کی واک یہیں کیا کرتی تھیں۔ میرے ساتھ .... لیکن جب سے نانو نے اپنی شاپ کھولی ہے۔ تب سے واک والی روٹین تو ختم ہی ہو کر رہ گئی ہے۔"

"نانو بہت محنتی ہیں .... میں نے ان کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا ہے .... اور وہ بہت اچھی بھی ہیں۔"

"پھر تم نے ان سے پرسوں جھوٹ کیوں بولا کہ تم سیمینار میں گئی تھیں۔" وہ شوخی سے پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں .... میں تمہیں انکار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور انہیں سچ بھی نہیں بتانا چاہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہیں میری کسی حرکت سے وہ ناراض ہی نہ ہو جائیں۔ ان کی طرف سے مجھے ہمیشہ ایک ڈر لاحق رہتا ہے۔"

"نانو کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتیں۔" اس نے اسے بتایا۔

"اور مجھ پر ہر وقت احتیاط کا خبط سوار رہتا ہے .... اتنی ساری خوبیاں اور کسی شخصیت میں نہیں ملیں گی مجھے۔"

"تمہیں ان کے جیسی محبت بھی نہیں ملے گی۔" وہ کہہ کر خاموش ہوا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔

"سوائے ایک کے۔" اور مسکراتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے زمل کی طرف دیکھا۔

زمل دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ وہ اس کا اشارہ خوب سمجھ رہی تھی۔ "بارش تیز ہو رہی ہے۔"

بارش تیز نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ویسے ہی قطرہ قطرہ برس رہی تھی۔ اس نے بات بدلنے کی غرض سے کہا تھا۔

"گھبراؤ نہیں .... تمہیں بھیگنے نہیں دوں گا۔" اس نے اپنی جیکٹ اتار کر زمل کو تھما دی۔ "کبھی بھی۔" آہستگی سے کہا گیا۔ بتایا گیا۔ جیسے وعدہ کیا گیا یا کوئی عہد ہی دے دیا گیا۔ یعنی اس کا بات بدلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ زمل حیرت سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ آسمان پر ست رنگی قوس قزح نکل آئی۔

"ہماری میزبانی ایسی ہی ہوتی ہے۔" اس نے جتانے والے انداز سے کہا تو زمل اداس ہو گئی۔

"یعنی تم شکوہ کر رہے ہو کہ جب تم فرانس آئے تھے تو..." اس نے کہا اور صرف باسل سے کہا ہی نہیں۔ وہ خود بھی ایسی ہی سوچ رکھتی تھی۔

جب سے وہ حبیب اللہ روڈ شفٹ ہوئی تھی۔ اسے یہ ہی بات ستا رہی تھی۔ نانو کس قدر اعلا میزبان تھیں۔ باسل اور ریشار بھی انہوں نے کس طرح ایک اجنبی کو اپنے گھر میں جگہ دی ہوئی تھی اور گھر سے بھی زیادہ شاید دل میں۔ اپنوں سے بھی بڑھ کر وہ اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ جیسے وہ ان کی ہی کوئی گم شدہ رشتے دار ہو۔ اس سے کوئی پرانا تعلق ہو لیکن اس تعلق کا نام یاد نہ ہو۔ یاد کرنے کی ضرورت بھی نہ ہو۔ کیا ایسے لوگ دنیا میں اور بھی ہیں؟

"ارے نہیں بھئی... میں نے تو ویسے ہی کہا ہے... تمہیں ٹونٹ نہیں کیا... مجھے اندازہ ہے کہ تب تم اپنے ڈیڈ کی وجہ سے کس قدر پریشان تھیں۔" ڈیڈ کا ذکر چھیڑ کر باسل نے اسے پھر سے ڈیڈ کی یاد دلا دی۔

وقتی طور پر وہ بھول جاتی تھی کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ اسے کہاں جانا ہے۔ اسے تو بعض اوقات لگتا کہ وہ صدیوں سے یہیں رہتی چلی آ رہی ہے۔ اس پرانے پارک میں بھی وہ کافی دفعہ آ چکی ہے۔ اور اس کا جنم حبیب اللہ روڈ پر ہی ہوا ہے۔ پہلے جنم کے ہونے پر اس کا ایمان نہیں تھا لیکن اگر ایسا ہوتا تو اسے سو فی صد یقین ہوتا کہ وہ اپنی پہلی زندگی یہیں کہیں گزار چکی ہے۔

یہاں کا سب کچھ کسی خواب کی طرح کا تھا۔ بچپن کے ان خوابوں کی طرح کا نہیں جنہیں دیکھ کر وہ ڈر جایا کرتی تھی۔ اور خوف کے مارے سدیم انکل کے پاس بھاگا کرتی تھی۔ یہاں کے خوابوں کی نوعیت کچھ اور تھی۔ اسے پتا ہوتا کہ برے خوابوں کو جگہوں سے نسبت ہوتی ہے تو وہ بہت پہلے ہی اپنے گھر سے کہیں دور جانے کا پروگرام بنالیتی۔ وہ یہاں کی ایک ایک چیز سے بہت خوش تھی۔ کہیں خواب ٹوٹ نہ جائے۔ کہیں وہ نیند سے جاگ نہ جائے۔ وہ پھول جس کی نازک پنکھڑیاں ہاتھ لگانے سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ اسے اس پھول کو بہت احتیاط سے تھام کر رکھنا تھا۔ اس لیے وہ باسل کو ڈیڈ کا فیصلہ نہ بتا سکی کہ وہ زمل اور باسل کی شادی پر صرف اسی صورت راضی ہوں گے اگر باسل فرانس شفٹ ہو جانے کا فیصلہ کرلے۔ اسے خود اندازہ تھا کہ باسل نانو اور ریشار کو چھوڑ کر کبھی بھی فرانس شفٹ نہیں ہو گا۔ پھر وہ باسل سے ایسی بات کیونکر کر سکتی ہے۔ جس کا علم اسے پہلے سے ہی ہے۔ اور جسے ماننا باسل کے لیے ناممکن ہے۔

وہ اس سے محبت کرتا تھا اور یہ بات اس کا امتحان لینے کے مترادف تھی۔ ابھی زمل اپنی ذات میں اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ وہ کسی کا امتحان لے سکے۔ وہ خود امتحانوں کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اسے خود ابھی سہاروں کی تلاش تھی اور نجانے وہ کونسا لمحہ تھا؟ کس چیز کی کھوج لگاتے لگاتے وہ یہاں پاکستان آگئی تھی؟ اسے اندازہ ہوتا کہ اس ملک کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ ہر نئے آنے والے کو جکڑ لیتی ہیں تو وہ کبھی بھی پاکستان آنے کا فیصلہ نہ کرتی۔

باسل نے ڈیڈ کا فیصلہ سنا اور اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تو؟ بنا زمل کے جذبات کا خیال رکھے۔ اس نے صاف صاف انکار کر دیا تو...؟ پھر اس گھر میں رہنے کا بھی بھلا اس کے پاس کیا جواز باقی رہ جائے گا۔ وہ دل سے تو جائے گی ہی نانو ریشار اور اس گھر کی اپنائیت سے بھی دور ہو جائے گی۔

"اگر تم کبھی یہاں سے اس طرح جاؤ کہ واپس نہ آسکو تو سب سے زیادہ کس چیز کو مس کرو گی؟" باسل نے اسے مخاطب کیا۔

بارش متواتر برس رہی تھی۔ دونوں کے پاس درخت کے نیچے کھڑے رہ کر بارش کے تھم جانے کا انتظار کرتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ گھنے پرانے درخت کی کرم نوازی تھی کہ وہ سردی کی بارش سے محفوظ کھڑے تھے۔ قدرت بھی بعض اوقات عجیب طریقوں سے مہربان ہوتی ہے۔ وہ کھلے باغ میں تھے۔ پھر بھی درخت کے نیچے ایسے کھڑے

تھے جیسے کسی حصار میں قید ہوں۔ زمل نے دل ہی دل میں دعا کی کہ یہ حصار تاقیامت قائم رہے۔ وہ اس حصار میں اپنی پوری زندگی بتا سکتی تھی۔ بارش اوس کی مانند اسے چھو رہی تھی۔ معطر کر رہی تھی۔ ایسے میں باسل کی بات نے اسے یک دم جامد کر دیا۔

مجھے اس جگہ سے اس طرح دور جانا ہی کیوں پڑے کہ مجھے یہاں کی چیزوں کو یاد کرنا پڑے۔ وہ سوچ کر رہ گئی۔

"کیا سوچ رہی ہو... کیا کسی بھی چیز کو مس نہیں کرو گی۔"

"کروں گی... بہت ساری چیزوں کو مس کروں گی۔"

"مثلاً"۔

"نانو... ان کی شاپ... وہ پرانا بازار۔"

"بس اتنا ہی...؟"

"یشار بھائی... تمہارا گھر... سرخ اینٹوں کی وہ دیواریں... رنگین شیشوں والی کھڑکیاں... لکڑی کے پرانے دروازے... بہت کچھ اس کے علاوہ بھی ہے۔" زمل نے کہا تو وہ اپنا سر کھجانے لگا۔

"تو پھر سب بتا دو... فری ہی تو ہیں ہم دونوں۔"

"یہ باغ، بارش، درخت..."

"اور یہ وقت...؟" وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے منہ سے اپنا نام سننا چاہ رہا تھا۔

"ہاں... یہ وقت بھی۔"

"کچھ رہ تو نہیں گیا۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا۔

"نہیں میرا خیال ہے۔ میں نے سب گنوا دیا ہے۔" وہ دل ہی دل میں ہنسی۔

"یعنی میں کسی گنتی میں نہیں ہوں۔" وہ بھی پھر براہ راست پوچھنے پر اتر آیا۔

"تم سانسوں میں ہو... اور سانسوں کو کون گنتا ہے... وہ تو بس ضروری ہوتی ہیں جینے کے لیے۔ ان کی اہمیت کے لیے یہ ہی کافی ہے۔ اور تمہاری اہمیت کے لیے بھی۔" وہ سوچنے لگی لیکن کہہ نہ سکی۔

"ہاں... ہاں... سچ تم بھی... تمہیں کیسے بھول گئی میں... اچھے ہو یار تم بھی۔" ایسے کہا گیا جیسے وہ بھی کوئی "چیز" تو ضرور ہی ہے جسے یاد کر لیا جائے۔

باسل نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

زمل قہقہہ لگا کر ہنسی۔

"تم اپنا نام سننا چاہتے تھے تو بتا دیتے... میں تمہارا نام لے لیتی۔"

"سننا تو میں اپنا ہی نام چاہتا تھا۔ لیکن جس طریقے سے مجھے بتایا گیا ہے، سوچتا ہوں یہ ذکر نہ ہی چھیڑتا تو اچھا تھا۔" زمل اور زور زور سے ہنسنے لگی۔ باسل بھی مسکرانے لگا۔

"تم نے اپنے ڈیڈ سے بات کی تھی زمل؟" اس نے پوچھا۔ زمل کی ہنسی تھم گئی۔

"کیا ہوا...؟" اس نے پوچھا۔ زمل نے تھوک نگلا۔ وہ باسل سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"نہیں ابھی نہیں کی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے غلط بیانی کی۔

"کیوں؟" حیرت سے اس کی بھنویں ملیں۔ کیا اس کے لیے یہ سب اتنا ہی غیر سنجیدہ تھا۔ کیا یہ جذبے واقعی کوئی حقیقت نہیں رکھتے اس کے لیے۔

"میں فرانس جا کر بات کروں گی باسل۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"میں فیس ٹو فیس بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اور اگر وہ نہ مانے تو... انہیں کوئی اعتراض ہوا تو۔"

"نہیں، نہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

"اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو۔"

"وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں... شاید وہ صرف یہ کہیں کہ..." وہ رک گئی۔ نہیں ابھی نہیں۔ اس نے سوچا اور وقت کی مہربانی کا انتظار کرنے لگی۔

"کیا زمل...؟"

"کچھ نہیں باسل... چھوڑو ان باتوں کو... مستقبل کے اندیشے ہمارے حال کو بھی تباہ کر دیتے ہیں۔"

"اندیشے...؟" اس نے اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ اندیشہ کیا کم ہے کہ میں تمہارا ذاتی جواب تک نہیں جانتا۔" اس نے چوٹ کی۔

بارش تھم گئی تھی۔ رات میں ڈھلتا' آسمان نکھر کر چشمے کے پانی کی طرح صاف شفاف تھا۔ زمل سوچنے لگی۔ واقعی باسل اپنے شکوے میں درست ہے۔ ہر چیز سے قطع نظر وہ خود کیا سوچتی تھی وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ یہ تو سراسر زیادتی تھی۔ نانو کے نواسے کے ساتھ ایسی زیادتی؟ نانو کہیں اسے ہی نہ تراش کر رکھ دیں.... وہ ہنسی۔

"ٹھیک ہے.... مسٹر باسل.... آپ کی بے چینی جلد ہی دور کر دی جائے گی۔" کھڑے کھڑے ہی جیسے اس نے فیصلہ کر لیا۔

"اور جواب' سوال کرنے کے انداز سے بھی بڑھ کر انداز میں دیا جائے گا۔" اس نے مزید سوچا۔ نانو سے اس حوالے سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا۔ اور پھر اس نے خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔ "نہیں نانو نہیں.... کوئی بھی نہیں۔ کسی کو اس بات کا رازدار نہیں بنانا مجھے اپنے آپ کو بھی نہیں.... دور اپنی آنکھوں کی طرح کے جگمگاتے جگنوؤں کو دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"لایئے نانو میں آپ کی مدد کر دیتی ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کر راک سالٹ کا وزنی پیس نانو کے ہاتھوں سے لے لیا۔ جو نانو ایک ایک کر کے کارٹن میں بڑی احتیاط سے رکھ رہی تھیں۔

"کوئی بات نہیں زمل.... میں کر لوں گی۔"

"آپ کافی کر چکی ہیں.... اور کافی تھک بھی چکی ہیں۔"

"یہ تھکنا بھی مجھے اپنے کام کی طرح ہی عزیز ہے۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔ وہ تھک گئی تھیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح ظاہر نہیں کر رہی تھیں۔

"پھر تھوڑا مجھے بھی تھک جانے دیں۔" زمل ان کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کی مدد کرنے لگی۔

"تم میری عادتیں خراب کر رہی ہو زمل۔"

"وہ کیسے نانو....؟"

"یوں کہنا چاہیے کہ تم مجھے اپنی عادت ڈال رہی ہو۔ تم فرانس چلی جاؤ گی تو مجھے مشکل ہو گی۔" نانو نے کہا اور زمل اداس ہو گئی۔ دریائے سین کو دیکھنا اس کے لیے اتنا بھی ضروری نہیں تھا۔

"نانو۔" دوسرا آرائشی پیس کارٹن میں رکھتے ہوئے وہ بولی۔

"ہاں بولو زمل!" نانو نے کہا تو زمل جھجک کر خاموش رہی۔ "تم کچھ کہنا چاہتی ہو کیا؟"

"جی نانو.... وہ دراصل.... میرا پاکستان میں قیام طویل ہو گیا ہے اور اسی باعث اس گھر میں بھی...."

"تو پھر کیا ہوا میری جان۔"

"نہیں مجھے لگا کہ...."

"دوبارہ ایسی بات مت کرنا۔" نانو نے اسے ڈانٹا "تم جب تک چاہو یہاں رہ سکتی ہو۔" اور زمل نے ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔

"ویسے تمہاری این جی او یہاں کیا کام کرتی ہے.... کیا ورک ہے ان کا اور تمہارا؟ نانو نے پوچھا اور کارٹن کو بند کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔

"کچھ خاص نہیں نانو.... چند ایک سروے ہیں جو مختلف شہروں میں جا کر کیے جاتے ہیں مجھے بھی یہ ہی کام کرنا ہوتا ہے۔" اسے نانو جیسی ہستی سے جھوٹ بولنا اچھا نہ لگا۔

"اسی سروے کے لیے تم اکثر گھر سے باہر جاتی ہو۔"

"جی نانو۔" وہ حقیقت نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ کن پرانی ڈائریوں کے گم شدہ صفحے تلاش کرنے باہر جاتی ہے۔

نانو سر ہلا کر خاموش ہو گئیں۔ ویسے بھی یہ بات ان کی طبیعت میں شامل نہیں تھی کہ وہ زیادہ پوچھ گچھ کرتیں۔ جو تھا جیسا تھا۔ انہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

"آپ نے آج شاپ پر جانا ہے نانو؟" وہ پچھلے کافی

دنوں سے مختلف بہانوں سے ہر روز نانو سے پوچھا کرتی تھی کہ انہوں نے آج شاپ پر جانا ہے کہ نہیں اور آج صبح ناشتے کی ٹیبل پر نانو خود بتا چکی تھیں کہ انہوں نے آج شاپ پر نہیں جانا۔ اس کے باوجود زمل دوبارہ پوچھ کر اپنی "دیکی" تسلی کر لینا چاہتی تھی۔

"نہیں... آج نہیں جانا میں نے... آج میری طبیعت اجازت نہیں دے رہی مجھے۔" نانو نے پھر سے اسے آگاہ کیا۔ کارٹن پر ٹیپ لگاتی زمل 'نانو کی بات پر مسکرانے لگی۔

"باسل ہی اس کارٹن کو دکان پر چھوڑ آئے گا۔" نانو اسے بتا رہی تھیں اور وہ جیسے کچھ سن ہی نہیں رہی تھی۔

"یعنی آج کا دن بہترین رہے گا... نگار خانے جانے کے لیے۔" اس نے خود سے کہا۔

"کہاں کھو گئی ہو زمل۔"

"نہیں... کہیں نہیں نانو!" وہ چونکی اور کارٹن کو ٹیپ سے کور کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ الماری کھول کر اس میں سے اس نے ایک ڈبہ نکالا اور اس کے اندر سے ایک آرائشی بوتل جو باسل نے اسے دی تھی۔

پارے سے چمکتے پانی میں کشتی تیر رہی تھی۔ ننھی سی کشتی اور یوں تیر رہی تھی جیسے بحرالکاہل میں تیر رہی ہو۔ زمل نے اس کے بادبان پر اپنی نظریں مرتسم کر دیں۔

"تمہیں اس کا جواب اس سے بھی بڑھ کر ملے گا مسٹر باسل۔" مسکراتے ہوئے وہ خود سے بولی۔ اس کا ارادہ پہلے یشار کے کلینک جانے کا تھا۔ پھر نگار خانہ جانے کا۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے کہا تھا یہ اب تمہارا ہدف ہے زمل... اور اب مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ نے جو ہدف مجھے دیا تھا میں اس میں ناکام رہی ہوں۔" زمل نے دکھ سے اعتراف کیا۔

"میں اپنے دادا دادی کی قبروں کو نہیں ڈھونڈ سکی۔" وہ مزید دکھی ہوئی۔ ڈیڈ سے متعلق کوئی بھی گفتگو وہ یشار کے کلینک ہی آ کر کیا کرتی تھی۔ گھر میں نانو کی موجودگی اور کلینک میں باسل کی موجودگی میں وہ یا یشار خود بھی 'اس موضوع پر کوئی بات چیت نہیں کیا کرتے تھے۔

اسے پاکستان آئے کافی ہفتے گزر چکے تھے۔ وہ جہاں جہاں جا سکتی تھی جا چکی تھی۔ ڈیڈ کے جس بھی جاننے والے کا اسے پتا چلا تھا وہ اس سے مل چکی تھی۔ ان دنوں وہ امتحانات کی تیاری کے اس عرصے سے گزر رہی تھی جس میں طالب علم بڑے جی جان سے نوٹس بناتے ہیں۔ لیکن اس کے نوٹس جیسے رایگاں گئے تھے۔ امتحانات دیے بنا ہی وہ فیل ہو گئی تھی۔ یشار کے بتائے حل تک اس کی رسائی جیسے ناممکن کر دی گئی تھی۔ کوئی دروازہ تھا جو اس پر بند کر دیا گیا تھا۔ یا کوئی دیوار جسے وہ توڑ نہیں سکتی تھی۔ ہر راستے پر ایک آئینہ نصب تھا۔ جہاں اسے اپنی ہی صورت نظر آتی اور وہ اپنی ہی صورت دیکھ کر نانو کے گھر واپس چلی آتی۔ نجانے اس میں قدرت کی کوئی مصلحت تھی یا کچھ اور۔ زمل بہت دل شکستہ تھی۔

یشار کو اپنی ناکامی کے بارے میں بتانا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ جس مقصد کے لیے پاکستان آئی تھی وہ مقصد ادھورا رہ گیا تھا۔ بنیادی ہدف ہی ختم ہو گیا تھا۔ تو اب اس کے پاس پاکستان میں رہنے کا کیا جواز باقی رہ گیا تھا۔ اسی لیے یہ سوچ کر اس نے یشار کو ساری بات بتا دی تھی کہ شاید یشار پہلے ہی کی طرح اس بار بھی مزید کوئی بہتر فیصلہ کر سکے۔ وہ ڈیڈ سمیت زمل کی بھی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا۔ اور یقیناً 'کوئی بہتر راہ نکال سکتا تھا۔

"تمہاری کوششیں قابل ستائش ہیں زمل... یہ سب تمہارے لیے مشکل تھا۔" پوری بات سننے کے بعد یشار نے اسے سراہا۔ شاید یہ بھی اس کا کوئی طریقہ علاج تھا۔ وہ انسانی نفسیات کو اچھی طرح جانتا تھا۔ زمل مایوس ہو چکی تھی۔ ایسے میں یشار کی بھی مایوس کن گفتگو زمل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

"تم نے ساری زندگی فرانس میں گزاری ہے۔۔۔ ایک نئی جگہ پر آکر گم گشتہ چیزوں کو تلاش کرنا واقعی مشکل ہے۔"

"یہ سب میں نے اپنے ڈیڈ کے لیے کیا ہے یشار بھائی۔۔۔ ان کی صحت کی بہتری کے لیے۔" زمل نے بتایا۔ یشار پیپر ویٹ کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔

"تو پھر تم ایک کام اور کر دیکھو۔"

"اب کیا یشار بھائی۔"

"انہیں پاکستان بلا لو۔" یشار نے کہا اور زمل کی سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔

"لیکن۔۔۔ لیکن کس لیے۔۔۔ ڈیڈ پاکستان آکر کیا کریں گے۔"

"انہیں ان کے پرانے گھر لے کر جاؤ۔۔۔ ان کے کالج یونیورسٹی۔۔۔ ان کی کمپنی۔۔۔ انہیں ان کے پرانے دوستوں سے ملواؤ۔۔۔ ماضی سے جڑی ہر چیز سے ان کا دوبارہ رابطہ کرواؤ۔"

آپ ان چیزوں کو قبروں کا نعم البدل سمجھ رہے ہیں۔"

"بے شک۔۔۔ ماضی بھی تو ایک قبر ہی ہے۔"

"ڈیڈ نے کبھی پاکستان کو یاد نہیں کیا۔ نہ اپنے پرانے گھر کو۔۔۔ انہوں نے کبھی اپنی یونیورسٹی کا ذکر تک نہیں کیا۔"

"یعنی اگر وہ ذکر کرتے تب تمہارے لیے میری بات کوئی معنی رکھتی؟"

"نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ معنی اب بھی رکھتی ہے۔۔۔ لیکن میرا نہیں خیال کہ ڈیڈ پاکستان آنے کے خواہش مند ہوں گے۔"

"یہ خواہش بھی تمہیں ہی ان کے اندر جگانی ہے۔"

"اور اگر وہ تب بھی نہ مانے تو۔۔۔"

"فرض کرو تم اپنے دادا دادی کی قبروں کو تلاش کر چکی ہو۔۔۔ اس صورت میں تم نے انہیں پاکستان کیا کہہ کر بلانا تھا۔" یشار نے پوچھا۔ زمل متذبذب ہوئی۔ حقیقتاً "اگر وہ ایسا کر لیتی یا ایسا ہو جاتا تو وہ ڈیڈ کو پاکستان کیا کہہ کر بلاتی۔ انہیں یہاں بلانے کے لیے اس نے کیا جواز سوچ رکھا تھا۔ کیا وہ ہر تیر ہوا میں چلانے والی تھی۔ اسے آخر کو اس رخ پر بھی تو سوچنا ہی تھا تو کیوں نہ اس پر ابھی سوچ لیا جائے۔

"ٹھیک ہے۔ میں گھر جا کر ان سے بات کرتی ہوں۔"

ایک عزم سے وہ وہاں سے اٹھی۔

یشار مسکرانے لگا۔ زیان عالم کے دماغ تک جانے والا واحد راستہ زمل ہی تھی اور اگر وہ ہی ناامید ہو جاتی تو زیان عالم کی بہتری کے زیادہ چانسز نہیں تھے۔ یشار خوش تھا۔ اس نے زمل کو بہت آسانی سے اپنی بات ماننے پر آمادہ کر لیا تھا۔ خوداعتمادی کے ساتھ۔

وہ ابھی آفس سے باہر نکلی ہی تھی جب سامنے سے کچھ فائلوں کو الٹ پلٹ کرتا تیزی سے آتا باسل اس سے ٹکرا گیا۔

"اوہ سوری۔۔۔" وہ بولا پھر چونکا۔ "زمل تم۔۔۔ تم یہاں؟"

"میں یشار بھائی سے ملنے آئی تھی۔"

"خیریت۔۔۔؟"

"ہاں کچھ بات چیت کرنی تھی۔"

"اب کہاں جا رہی ہو؟"

"اب میں گھر جا رہی ہوں۔"

"چلو پھر اکٹھے چلتے ہیں۔۔۔ میں بھی بس تھوڑی دیر میں گھر ہی جانے والا ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ وہ دراصل۔" وہ بوکھلا گئی۔ اسے نگار خانہ جانا تھا۔ نانو اور باسل کی عدم موجودگی میں۔ وہاں کے ملازم کاریگر سے اسے کوئی خاص چیز تیار کروانی تھی اور وہ اپنے سرپرائز کو کسی قیمت پر آشکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"دراصل مجھے کہیں اور جانا ہے۔"

"تو آؤ۔۔۔ میں تمہیں وہاں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

"نہیں میں چلی جاؤں گی۔ تم گھر جاؤ۔"

"یہ تم اتنا تکلف کب سے کرنے لگی ہو۔" وہ ہنسا۔

"میں نے کہا نا باسل تم جاؤ۔۔۔ مجھے جہاں جانا ہو گا

میں خود ہی چلی جاؤں گی۔" اس نے تیز آواز سے کہا تو باسل خاموش ہو گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی۔" اس نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔

زمل نے کوئی اثر نہیں لیا۔ جس کام کے لیے وہ بڑی رازداری سے وہاں جا رہی تھی۔ اس کی خبر جب باسل کو ہو گی تو اس کی ساری وقتی ناراضی ختم ہو جائے گی۔ خود سے کہتی وہ بلڈنگ کی لفٹ سے باہر نکل آئی۔

☆ ☆ ☆

انارکلی آتے آتے اسے رات ہو گئی تھی۔ نگار خانہ کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے ڈر لگنے لگا کہ کہیں نانو اندر ہی موجود نہ ہوں۔ حالانکہ صبح دوسری مرتبہ کے پوچھنے پر یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ آج شاپ پر نہیں جائیں گی۔ لیکن زمل سارا دن گھر سے باہر رہی تھی۔ اور نانو سے کچھ بھی بعید نہیں تھا کہ ان کی طبیعت شام کے وقت بہتر ہو جاتی تو وہ شام کے وقت ہی دکان پر آجاتیں۔ لیکن خوش قسمتی سے آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ نانو اندر نہیں تھیں۔ اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

"کیسی ہیں آپ؟" کاریگر ملازم نے اس سے پوچھا۔ وہ اب ان کے لیے اجنبی نہیں رہی تھی۔ "بیگم صاحبہ نہیں آئیں آج۔۔۔ خیریت۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ نانو اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آسکیں۔۔۔ لیکن کل ضرور آجائیں گی۔۔۔ ان شاء اللہ۔" اس نے کاریگر ملازم کو بتایا۔

نانو کی طرح اب اس نے بھی بات بات پر ان شاء اللہ کہنا سیکھ لیا تھا۔ کاریگر ملازم خاموش ہو گیا اور زمل چاروں طرف سجی چیزوں پر اپنی نظریں دوڑانے لگی۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟" اس نے اسے ٹٹولتی نظروں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ چاہیے تو سہی۔۔۔"

"کیا چاہیے آپ کو۔۔۔ مجھے بتائیں۔"

"کچھ بہت خاص۔"

"یہاں کی ہر چیز خاص ہے۔" وہ فخر سے بولا۔

"کسی خاص کے لیے۔" اس نے خود سے کہا اور مسکرانے لگی۔ ملازم نے اسے اس طرح بلاوجہ ہی مسکراتے ہوئے دیکھ کر عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ زمل جھینپ کر سنجیدہ ہو گئی۔

"مجھے کسی چیز پر انگلش کے تین حرف لکھوانے ہیں۔"

"کون سے حرف؟"

"وائے۔ ای۔ ایس (Yes)۔" وہ پھر سے مسکرائی۔ ہوا کے کسی جھونکے نے اس کی نظروں کے سامنے بادبان کو لہرایا تھا۔ وہ اس بادبان کے سنگ پوری دنیا جیت سکتی تھی۔

"ول یو میری می۔" سنہری دھاگے سے لکھی گئی تحریر اس کے ذہن کے پردے پر چھا گئی۔ اس نے اپنے دوست سین سے پوچھا تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دے اور سین نے اسے بتا دیا تھا۔ اس سوال کا جواب صرف یس کی صورت ہی دیا جا سکتا تھا۔ کون بد قسمت لڑکی ہو گی جو باسل جیسے لڑکے کو نو کہے گی۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سی بدنصیبیاں اکٹھی کر لی تھیں۔ یا وہ خود بخود اس کی زندگی میں آگئی تھیں۔ اب وہ خوش قسمتی کے اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ ڈیڈ کو منا لے گی۔ باسل کو راضی کرے گی وہ کچھ بھی کرے گی لیکن۔۔۔

"کس چیز پر لکھوانا ہے آپ کو۔۔۔" کاریگر دوسری بار پوچھ رہا تھا۔

"کسی خوب صورت اور نایاب سی چیز پر۔"

"یہ ترکی تلوار کیسی رہے گی۔" کاریگر نے مشورہ دیا۔

"اوہ نو نو۔" اس نے اپنے قہقہے کو بمشکل دبایا۔ تلوار میں رومانیت کا عنصر بھلا کیونکر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

"تو پھر یہ۔۔۔" اب کی بار اس نے شیشم کی صراحی کی طرف اشارہ کیا۔ جس کے گول مٹکے پر نفیس نقش و

نگاری کی گئی تھی۔
"نہیں یہ بھی نہیں۔" راک سالٹ، شیشے جڑے گلدان۔ مور پنکھ کے آرائشی پیس، ایک ایک کر کے وہ ہر چیز رد کرتی رہی۔
"کیا باسل نے بھی اس کشتی اور بوتل کا انتخاب اتنی ہی دیر لگا کر کیا ہو گا۔" اس نے سوچا۔ وہ مایوس ہونے لگی تھی۔ اسے تو کوئی چیز پسند ہی نہیں آ رہی تھی۔ کاریگر بھی دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اپنی ذہنی الجھن کو لیے وہ وہاں اکیلی ہی کھڑی تھی۔ دکان کے بند ہونے کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک چیز پر پڑی اور اس کا چہرہ دمک اٹھا۔
"یہ... ہاں بس یہ ہی چیز چاہیے مجھے۔" اس نے کاریگر کو بلایا اور مرمر کی شطرنج کی طرف اشارہ کیا۔
"بالآخر فیصلہ ہو گیا۔" وہ بھی ہنسنے لگا۔
"کچھ خاص جو لینا تھا مجھے۔"
"یہ ٹھیک ہے۔" اس نے تائید کی۔
"پتھر کے ٹکڑوں سے اس کے اندر لکھوا سکتے ہیں آپ "یس؟"
"آسانی سے آپ بے فکر رہیں... ہو جائے گا... آپ بیگم صاحبہ کی خاص مہمان جو ہیں۔" وہ اتنی آسانی سے معاملہ حل ہو جانے (جسے وہ بہت پیچیدہ سمجھ رہی تھی) اور اپنی اتنی عزت افزائی پر نہال ہو گئی۔
"کس پتھر کا استعمال کرواؤں؟" کاریگر پوچھ رہا تھا۔ زمل نے کندھے اچکا کر اپنی کم علمی ظاہر کر دی۔
"سلیمانی زرد کیسا رہے گا؟ تقدس کی علامت ہے۔ اور سنگ سرخ محبت کی۔"
محبت کی... محبت کی... بازگشت ہوتی ہوتی دریائے سین تک جا پہنچی اور اس کی لہروں کو زمل نے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کیا۔
"سلیمانی زرد کی بساط کے اندر آپ سنگ سرخ سے لکھوا دیں۔"
تقدس اور محبت... ہاں یہ کمبی نیشن ٹھیک تھا۔
"جیسے آپ کہیں... پر ایسی شطرنج پھر کبھی کھیلی نہیں جائے گی۔ اس پر کبھی کوئی بازی نہیں لڑی جا سکے گی۔"
"ایسی شطرنج صرف محبت کرنے والوں کے لیے ہو گی... اور اس پر کون سی بازی لڑی جاتی ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہوں گے۔" اس نے مسکرا کر سوچا اور دکان سے باہر نکل آئی۔
"زمل..." ابھی وہ تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ اسے اپنے پیچھے سے ایک بے یقین سی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے باسل کھڑا تھا۔ زمل کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ باسل بھی اسے وہاں دیکھ کر حیران تھا۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو زمل... تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ پوچھ رہا تھا اور شکوہ آمیز لہجے سے پوچھ رہا تھا۔
"وہ... میں... مجھے جہاں جانا تھا میں وہاں سے ہو آئی ہوں۔" جھوٹ۔
"پھر یہاں کیا کر رہی ہو؟"
"یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا نانو کو بھی ساتھ لے چلوں۔" جھوٹ در جھوٹ۔
"نانو نے آج شاپ پر نہیں آنا تھا۔ یہ بات وہ صبح بتا تو چکی تھیں۔"
"ہاں... پر پتا نہیں میں یہ بات کیسے بھول گئی۔"
"تم کچھ چھپا رہی ہو؟" وہ بھنویں جوڑے۔ آنکھیں نیچے کیے شک کی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔
"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں... تم نے یہ بات کیوں سوچی۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔
"صبح سے ہی عجیب لگ رہی ہو۔"
زمل کی آنکھوں میں خفگی بھر گئی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا باسل؟"
"خیر بتاؤ اب کہاں جا رہی ہو۔ رات کافی ہو چکی ہے۔"
"اب میں گھر جا رہی ہوں۔"
"دوبارہ سوچ لو... گھر ہی جا رہی ہو نا۔"
"کہنا کیا چاہتے ہو تم۔" وہ کسی قدر غصے سے بولی۔

"میں یہ کارٹن اندر رکھوا دوں... پھر اکٹھے چلتے ہیں ... یا نہیں... اور اگر تم الگ سے ٹیکسی میں جانا چاہتی ہو تو وہ بھی بتا دو۔"

"تب واقعی مجھے کہیں اور جانا تھا یار.... چھوڑ دو اس بات کو اب۔" زمل نے کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

کارٹن اندر رکھوا کر وہ پارکنگ ایریا تک پیدل جانے لگے۔ بازار بند ہو رہا تھا۔ رات چھا رہی تھی اور جاتی سردیوں کی خنکی رات میں بڑھنے لگی تھی۔ زمل نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے وجود کے گرد لپیٹ لیے۔ آج کے ٹاسک کو تکمیل تک پہنچانے کی خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اپنی ہی ترنگ میں آگے بڑھ رہی تھی۔ باسل خاموشی سے واک کرتا ہوا اس سے قدرے پیچھے ہو گیا۔ وہ زمل کو ان نظروں سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جن سے ٹھیک تین ماہ پہلے تانو نے اس کو دیکھا تھا۔

زمل کے قدم چھوڑی جگہ پر پھول اگ رہے تھے؟

نہیں۔

ہواؤں کی ڈوریں اس کی انگلیوں میں پیوستہ تھیں؟

نہیں۔

کیا اس پر محبت کا موسم آگیا تھا؟ پتا نہیں۔

یا وہ تانو جیسی بصارت ہی نہیں رکھتا تھا؟ یقیناً "ہاں"۔

☆ ☆ ☆

"زیان... زیان عالم کی ہی بات کر رہی ہو نا تم۔" بوڑھے پروفیسر نے اس سے پوچھا۔

"جی... زیان عالم کی... یہ تقریباً تیس سال پہلے کی بات ہے۔" زمل نے بتایا۔

آج وہ ڈیڈ کی یونیورسٹی آئی تھی۔ یشار نے اب اسے جس راہ کی طرف پھر سے گامزن کر دیا تھا وہ اس راہ گزر پر چلنے لگی تھی۔ یہ راہ گزر کس قدر خاردار تھی۔ زمل کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ڈیڈ کی یونیورسٹی کا پتا چلا۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل سے اسے کوئی ایسا شخص ملا جو نہ صرف اس میں موجود تھا بلکہ وہ ڈیڈ کو یاد بھی رکھے ہوئے تھا۔

یشار سے ملاقات کے بعد ویسے بھی زمل کے اہداف میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ صرف ڈیڈ کو پاکستان بلانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ ڈیڈ کے ہر جاننے والے کو ان کے گرد ان کے لیے اکٹھا کر لینا چاہتی تھی۔ وہ اپنے ڈیڈ کی زندگی میں دنیا کی ہر خوشی بھر دینا چاہتی تھی۔

"زیان نے یونین الیکشن میں حصہ لیا تھا۔ مجھے وہ الیکشن آج بھی یاد ہیں۔"

"کیا ڈیڈ کبھی زندگی سے اتنے بھرپور بھی رہے تھے۔" پروفیسر کی بات سن کر زمل حیران رہ گئی تھی۔ اس نے کسی قدر تاسف سے سوچا تھا۔

"ان الیکشن کو کون بھول سکتا ہے۔ ایک جوان جہان مرد کو نگل گیا تھا وہ الیکشن۔" پروفیسر نے خود کلامی کی۔

"تو کیا ڈیڈ الیکشن جیت گئے تھے؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ڈیڈ کی زندگی کے خوب صورت ماہ و سال کو سننا اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔

"نہیں... وہ الیکشن زیان کا مخالف مصباح نامی ایک لڑکے نے جیتا تھا اور..." پروفیسر خاموش ہو گیا۔

زمل مزید سننے کی منتظر رہی۔

"اور وہ اسی رات قتل ہو گیا تھا۔" پروفیسر نے انکشاف کیا۔

"کیا؟" سنگی بینچ زمل کے وجود کے نیچے تھرتھرانے لگا۔

"قتل...؟ لیکن کیوں... کس نے کیا اس کا قتل؟" وہ گھبرائی آواز میں پوچھنے لگی۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ اس قاتل کو جانتی ہے۔ اس کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ پروفیسر نے چشمے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔

"پلیز بتایئے نا..."

"وہ قتل زیان کے دوست نے کیا تھا... یشب نام تھا اس کا۔" پروفیسر نے اس کی معصوم آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر کہا۔

"یشب...!" وہ چیخ مارتے مارتے رہ گئی۔ آنکھیں پھٹنے کو آگئیں۔

"ہاں... یشب... لیکن اسے سزا نہیں مل سکی تھی۔ وہ فرانس بھاگ گیا تھا۔" پروفیسر نے افسردگی سے کہا۔ اور آسمان سے شہاب ثاقب ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرنے لگے۔

"یشب انکل قاتل ہیں..." وہ بڑبڑائی۔ اس بات پر یقین نہ کرنے کی اسے کوئی وجہ نہیں مل سکی تھی۔ پروفیسر اسے اور بھی بہت کچھ بتا رہا تھا اور وہ جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔

"میرے ڈیڈ کا دوست ایک قاتل ہے... یشب انکل قاتل ہیں... میرا سوتیلا باپ قاتل ہے۔" یونیورسٹی کے سارے درخت اس کی نظروں کے سامنے چکر لگانے لگے۔ پھر اس کے وجود کے گرد... وہ ان کے دائرے میں قید ہو گئی۔

"اور ڈیڈ... انہیں اندازہ تک نہیں ہو گا کہ انہوں نے کس گناہ گار کو اپنے گھر میں جگہ دے رکھی ہے۔" ایسی بھیانک لاعلمی پر اس کے آنسو نکل آئے۔

"جو شخص کسی کو قتل کرنے سے دریغ نہیں کرتا... پھر ڈیڈ جیسے... مخلص دوست کو دھوکا دینا اس کے لیے کیا مشکل رہا ہو گا۔" افسردگی کے عالم میں وہ گھر واپس آئی۔

اسے دکھ تھا۔ سب نے مل کر اس کے ڈیڈ کی زندگی میں زہر گھولا تھا۔ جواب تھوڑا تھوڑا کر کے اسے بھی پینا پڑ رہا تھا۔ کئی دن اس کی حالت عجیب سی رہی۔ باسل نے اس سے وجہ پوچھی لیکن وہ سر درد کا بہانہ کر کے ٹالتی رہی۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھا۔ زمل جانتی تھی۔ ایسے دشوار گزار راستوں پر ایک وہ ہی اس کے لیے ابر رحمت بنا رہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"نانو..." اس نے ایک ہلکی سی چیخ مار کر نانو کو پکارا۔ نانو نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔

"نانو..." اس نے دوبارہ چلا کر کہا۔ نانو نے سنا نہیں تھا یا خوشی کے مارے اس کی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی آج کے دن کی ایک گھنٹے کی کوششیں رنگ لے آئی تھیں۔ "روٹی" قدرے گول بن گئی تھی۔

"تم نے مجھے کیمچی (Cimchi) بنانی سکھائی ہے۔ میں تمہیں روٹی بنانا سکھاتی ہوں۔ اپنے ڈیڈ کو بنا کر دینا۔ انہیں بہت پسند آئے گی۔"

"لیکن ہمارے گھر میں تو میڈ بہت اچھی روٹی بنا لیتی ہے۔"

"تم اپنے ہاتھوں سے انہیں بنا کر کھلانا... یہ انہیں سب سے زیادہ اچھی لگے گی۔" نانو نے مسکرا کر کہا۔ وہ سمجھ گئی۔

"ٹھیک ہے نانو۔" اس نے آمادگی ظاہر کر دی۔ ابتدائی کوششیں تو ناکام رہی تھیں مگر آج پانچویں دن اسے کہیں جا کر کامیابی ملی تھی۔ دونوں ہاتھ خشک و تر آٹے سے لتھڑے۔ چہرے اور بالوں پر بھی لگا خشک آٹا اور اس کی بری حالت۔ لیکن اسے ان سب کی پروا نہیں تھی۔ روٹی معیار کے قریب قریب پہنچ چکی تھی۔ اس لیے اس نے چیخ ماری تھی۔ برتنوں کے کھانے کی میز سے کھنکنے کی آواز آئی تو وہ روٹی ہاتھ میں ہی پکڑ کر باہر نکل آئی۔

"یہ دیکھیے نانو... اور شاباش دیں مجھے..." اس نے چہرے کے آگے سے روٹی ہٹائی۔

نانو وہاں موجود نہیں تھیں اور کرسی پر باسل بیٹھا ہوا تھا۔ جو پہلے تو اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہنسی کا ایک فوارہ اس کے لبوں سے پھوٹا۔ زمل شرمندہ سی ہو گئی ایک تو وہ وہاں باسل کے موجود ہونے کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ دوسرا باسل کا ہنسنا۔ تب ہی نانو بھی باہر نکلیں۔

"کیا ہوا زمل... تم بلا رہی تھیں مجھے..." انہوں نے حیرانی سے ساری صورت حال کو دیکھا۔ زمل خاموش تھی اور باسل بری طرح ہنس رہا تھا۔

"وہ... روٹی... گول بن گئی۔" چاہ کر بھی لہجے سے پرانی والی خوشی نہ جھلک سکی۔ وہ نظریں نیچے کیے نانو

سے بولی۔ نانو سب سمجھ کر دبی دبی ہنسی ہنسنے لگیں۔

"ہاں ٹھیک شاباش۔ بہت خوب زمل۔" انہوں نے اس کی تعریف کی۔

"نانو بہت زیادہ کام کرلیا ہے آج اس نے... ہاتھ پاؤں دبائیں اس کے کہیں یہ بیمار نہ ہو جائے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"چپ ہو جاؤ باسل... زمل کو تنگ مت کرو... اگر یہ ناراض ہو گئی تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔" نانو نے باسل کو ڈانٹا۔

"تنگ کب کر رہا ہوں... صحیح ہی تو کہہ رہا ہوں۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں اس کے ماتھے پر... کچن میں جا کر کہیں اسے بخار ہی نہ چڑھ گیا ہو۔"

"ادھر آؤ... بیٹھو تم ادھر زمل... بولنے دو اسے... میں کھانا لگاتی ہوں۔" نانو کچن کی طرف جانے لگیں۔

"یہ ڈبا کاریگر انکل نے بھیجا ہے تمہارے لیے زمل۔" باسل نے ایک ڈبا زمل کی طرف بڑھایا۔ نانو بھی جاتے جاتے رک گئیں۔ زمل کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ اتنی فاش غلطی کیسے کر سکتی ہے۔ وہ آخر کاریگر کو یہ کہنا کیسے بھول گئی کہ انہوں نے اس شطرنج اور اس کی عبارت کو صیغہ راز میں رکھنا ہے۔

"تم نے اسے کھول کر تو نہیں دیکھا۔" اس نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں کیا ہے اس میں؟"

"کچھ بھی نہیں... " وہ نظریں چرانے لگی۔

"اس میں شطرنج ہے۔" نانو نے بتایا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا نانو..." تو کیا نانو وہ دیکھ چکی تھیں۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ نانو مسکرانے لگیں۔

"مجھے دس سال ہو گئے ہیں زمل اپنی دکان چلاتے اور بائیس سال یہ کام کرتے... میں پیکنگ دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں کہ اس کے اندر کیا ہے۔"

"جی نانو... اس کے اندر شطرنج ہی ہے۔" اسے یک گونہ اطمینان ہوا۔

"کس کے لیے لی ہے... اپنے ڈیڈ کے لیے۔" باسل نے پوچھا۔

"ہاں..." اس نے جھوٹ بولا۔

"مجھ سے کہہ دیتیں... میں تمہیں کوئی خوب صورت سی شطرنج بنوا دیتی۔ نیلے جیڈ کی یا کاہی اور زرد کی۔" نانو نے اسے مشورہ دیا۔

"یہ بھی خوب صورت ہی ہے نانو..." اس نے ہلکے سے کہا۔

"دکھاؤ... کون سی والی پسند کی ہے تم نے... دکان میں تو بس دو طرح کی ہی پڑی ہوئی ہیں۔" نانو نے اسے شطرنج دکھانے کو کہا۔ زمل نے سہم کر ڈبا سینے سے لگا لیا۔

"دکھاؤ زمل... اس طرح چھپا کیوں رہی ہو۔" باسل نے بھی بھنویں جوڑتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھنے لگی... ہائے اللہ... کہاں چھپے وہ خود... اور کہاں چھپائے وہ اسے...

"زمل...؟" جب اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ اندر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" باسل نے نانو سے پوچھا کہ اگر وہ کچھ سمجھ گئی ہوں تو اسے بھی بتا دیں۔ نانو ہنسنے لگیں۔

"اب آپ کو کیا ہوا؟" وہ حیرت سے اب نانو کو دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں... تم نہیں سمجھو گے۔" ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"واقعی... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا..." وہ نادانی سے بولا۔

"میں کھانا لاتی ہوں۔" وہ کچن میں چلی گئیں۔ جہاں زمل نے ہر چیز الٹ پلٹ کی ہوئی تھی۔

"نادان لڑکی... میری ہی دکان کے کاریگروں سے شطرنج بنوا رہی ہے... اور سمجھ رہی ہے کہ میں ہی بے خبر رہوں گی۔" ان کی ہنسی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

قطرہ قطرہ بارش کا پانی تراشیدہ ہیرے کی مانند تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ عمر رسیدہ برگد اپنا پرانا رنگ و

روپ بدل چکا تھا۔ گرد آلود پتے نکھر چکے تھے۔ بل زدہ جٹائیں نم تھیں اور پرانی گوگلیں یک بہ یک کر پھٹ رہی تھیں۔ جن کے اندر کا مادہ شنگرفی تھا۔ قوسی سلاخ دار کھڑکی کے چوبی نقش و نگار پر ہاتھ پھیرتی بوڑھی کے ہاتھ کپکپا کر رک گئے۔ اسے شنگرفی رنگ سے نفرت تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال بگڑنے لگے۔ مزید گوگلیں پھٹیں اور شنگرفی مادہ چار سو پھیل گیا۔

تالاب کا گہرا سبز پانی لحہ بہ لحہ شنگرفی رنگ میں ڈھلنے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا پانی شنگرفی ہو گیا۔ برگد، جڑیں، جٹائیں ہر طرف شنگرف کے پھول کھلنے لگے۔ بوڑھے وجود کی آنکھیں پھٹنے کو آگئیں۔ اس کا مسام مسام خوف زدہ ہو گیا۔ کپکپاتی آواز میں وہ بمشکل بول سکی۔

"اوہ سنیاسی... محمد خدا یار سے پوچھو... پکے رنگوں کی ہولی کے داغوں کو کس جل سے دھوتا ہے... یہ کیوں نہ بتایا اس نے..."

کچے شنگرفوں کی لہر پھیلتے پھیلتے آسمان کی پہلی تہہ کو چھونے لگی۔

☆ ☆ ☆

ہوا کی طرح وہ بھی بے سمت، بے منزل چلے جا رہی تھی۔ ڈھلوانی پگڈنڈی پر پھسلتی... اپنے مقام سے گرتی... ایک گری ہوئی عورت کی طرح... اس کا پورا وجود تاپ کی لپیٹوں کی زد میں تھا۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ وہ چلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ گرنا چاہتی تھی۔ زمین کی کسی گپھا میں... جہاں روز قیامت بھی اسے نہ اٹھایا جائے۔ بھلا دیا جائے۔ نفسا نفسی کے اس عالم میں بھی وہ لوگوں کا سامنا کرنے کی خود میں ہمت نہ رکھتی تھی۔

اپنے جسم کے اندر قید... روح کے گھائل ہو جانے کا احساس اذیت ناک تھا۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ ہتھیلیوں سے اس نے اپنی بھیگی آنکھیں خشک کیں۔ ہونٹ بھینچ کر اندر کے غم کو سہا۔ یہ کچھ ایسا بھی آسان نہیں تھا۔ موت کے وقت کیسی تکلیف ہوتی ہے، وہ اب اس درد سے انجان نہیں رہی تھی۔ ارد گرد کے درختوں، پتوں، خشک ٹہنیوں، موٹی شاخوں نے بھی اس لٹی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور خود کو اس کا مجرم سمجھ کر منہ جھکا لیا۔

ایک ہفتہ پہلے... ٹھیک ایک ہفتہ پہلے وہ یہاں آئی تھی... خوش و خرم... نئی زندگی سے بھرپور... ایک جذبے کے اظہار کی تمنائی۔ اور آنے والے اندیشوں سے بے خبر...

اور اب...

وہ یہاں سے جا رہی تھی... ایک ہفتے بعد... اپنی خوشیوں، اپنی جرات مندی کو تار تار کروا کر... مکڑی کے جالے کی طرح... آنے والی زندگی کے لیے اب اس کے پاس کوئی بھی خوش کن اثاثہ نہیں رہا تھا۔ اس کا سب کچھ لوٹ لیا گیا تھا۔

لال کانچ ہوا آسمان پھٹ کر پھر سے تاریک تھا۔ نظام شمسی کے ظہور سے پہلے جیسا تاریک... ہفتے بھر سے ہوتی بارش بالآخر تھم چکی تھی۔ بارش نے اپنے رک جانے کا یہ وقت قدرت سے جیسے اس کے سفر کے لیے مستعار لیا تھا۔ اور یہ قرض اسے اب سود سمیت چکانا تھا۔ ہوائیں پرشدت نہ رہی تھیں۔ شاید یہ موسم بھی اس کے ساتھ ساتھ سات دن تک کسی بات کا سوگ مناتا رہا تھا۔ یہ موسم جیسے اسے دیکھتا رہا تھا... چوری چوری... اس کی حالت پر کڑھتا رہا تھا اور... اب جب کہ وہ اس ریسٹ ہاؤس سے بہت دور نکل آئی تھی تو یک لخت موسم بھی اس کے لیے بیگانہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ اپنی بربادیوں کا حساب اسی سے نہ مانگ لے۔ وہ تنہا تھی... شام کے رنگوں میں ڈوبتے اور لحہ بہ لحہ تاریک ہوتے جنگل میں... صحرا میں بھٹکتی کسی کونج کی طرح تنہا...

چہرہ اوپر اٹھا کر اس نے ساکت آسمان کو دیکھا... اور آسمان کے پار والے کو دیکھنے کی کوشش کی... اور یاد کیا۔ اس نے زندگی میں کب کسی کا برا چاہا تھا۔ کیا اس نے کبھی زندگی میں کسی کے ساتھ ایسی زیادتی کی تھی کہ جس کا ازالہ ناممکن تھا۔ یا اسے کسی فقیر درویش کی

بد دعا لگ گئی تھی۔ جسے اس نے کبھی نادانی میں تنگ کیا ہو گا۔ یا اس کا کوئی گناہ اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس طرح کہ اب وہ خود پوری کی پوری گناہ آلود ہو چکی تھی۔

چلتے چلتے وہ رکی۔ دونوں پاؤں پھوڑوں کی مانند دکھ رہے تھے۔ وہ نجانے کتنا سفر کر چکی تھی اور کتنا ابھی باقی تھا۔ اس کے سامنے ایک خستہ حال سی مسجد تھی۔ جس نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا۔ مسجد جو کم سے کم رقبے پر تعمیر کی گئی تھی' سالوں سے نمازیوں سے فریاد کرتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ خود بھی تو فریادی تھی۔ دو فریادی ایک دوجے کے آمنے سامنے تھے۔

کیا وہ مسجد کے اندر جانے کے قابل تھی۔ اس نے سوچا۔۔۔ ہاں وہ اس مسجد کے مالک سے مخاطب ہونے کے قابل تو ضرور تھی۔ ساتھ لگے نلکے کے رس رس کر آتے پانی۔۔۔ اور اپنے آنسوؤں کے ساتھ اس نے وضو کیا۔ اور جوتے اتار کر مسجد کے اندر داخل ہو گئی۔ امام کی جگہ کے دائیں بائیں دونوں طرف آیات مبارکہ کے پرانے کلینڈر جھول رہے تھے۔ اس نے ارد گرد کچھ تلاش کیا اور پھر وہ اسے مل گیا۔ طاقچے میں رکھے دو قرآن مجید' اس نے ایک کو ہاتھ بڑھا کر اٹھانا چاہا اور جوں ہی اس کی انگلیوں نے سبز غلاف کو چھوا' گے سے ایک جھرجھری سی آگئی۔ وہ ساری کی ساری کانپنے لگی۔ پورا وجود ٹوٹ کر جیسے دوبارہ جڑا۔ یہ کتاب آج اس قدر وزنی کیوں ہو گئی تھی کہ اس سے اٹھائی ہی نہیں جا رہی تھی۔

اندھیرے میں گم ہوتے ارض و سماں میں وہ قرآن سینے سے لگائے مسجد سے باہر نکل آئی۔ بجلی نے ہلکی سی چنگاری چھوڑی۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ روشنی پھیلی اور اندھی ہو گئی۔ پھوار موٹے موٹے کنکروں جیسے قطروں میں ڈھلتی گئی۔ خود پر اس کی گرفت مضبوط نہ رہ سکی اور وہ زمین پر ڈھے گئی۔ قطرہ قطرہ بارش کا پانی تراشیدہ ہیرے کی مانند اس کے جسم سے مس ہو کر نیچے بہنے لگا۔ اور پیال سے اٹی زمین پر شنگرفی پھول اگنے لگے۔ وہ کس کس چیز کا ماتم کرتی۔

اس نے قرآن کو سینے میں بھینچ لیا اور دور افق پار دیکھتے ہوئے حلق پھاڑ کر چلائی۔

"یا رحمٰن۔۔۔ یا رحیم۔۔۔ یا باری۔۔۔ یا ہادی۔۔۔ اب عادل بھی تو نے ہی بننا ہے۔"

آواز بازگشت کرتی بہت دور نکل گئی۔ اس کے چاروں طرف بجلی کڑکی۔ بارش نے ایک طوفانی جھٹکا زمین کی طرف اچھالا۔۔۔ اس کی عرضی سن لی گئی تھی۔ قرآن اسی طرح سینے سے لگائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور ہر سو خاموشی چھا گئی۔۔۔ کائنات بننے سے پہلے کی خاموشی۔

☆ ☆ ☆

گلناب عالم لاؤنج میں بیٹھیں فیشن میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھیں جب خاموشی میں انہیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ نظریں ہٹا کر انہوں نے دیکھا۔ سامنے زیان کھڑا تھا۔ اپنی جیکٹ کو اپنے کندھے کے پیچھے لٹکائے۔۔۔ تھکا ہارا سا۔۔۔ جیسے بہت دور سے پیدل چل کر آ رہا ہو۔

"آ گئے زیان۔۔۔" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔ سگریٹ کو ایش ٹرے میں بجھایا۔ زیان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آہستگی سے اوپر اپنے کمرے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ گلناب عالم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد چنگیزی وہاں آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا۔

"نگار اندر نہیں آئی ابھی تک۔۔۔ کہاں ہے؟"

"نگار صاحبہ تو زیان صاحب کے ساتھ نہیں آئیں۔" چنگیزی نے بتایا۔

"اچھا۔۔۔؟" نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے خود سے کہا اور میگزین ایک طرف رکھ کر وہ اوپر زیان کے کمرے میں آئیں۔ مکمل اندھیرا کیے وہ راکنگ چیئر پر جھول رہا تھا۔

"زیان۔۔۔" انہوں نے پکارا اور لائٹ آن کر دی۔ راکنگ چیئر جھولتے جھولتے رکی۔

"نگار اپنی والدہ کی طرف ہی اتر گئی تھی کیا؟"

انہوں نے پوچھا۔ زیان نے کوئی جواب نہیں دیا۔
"زیان... نگار کہاں ہے؟" وہ قریب آئیں۔
"نگار کہاں ہے...؟" وہ آنکھیں پتھر کیے گویا ہوا۔ "یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا...؟" وہ حیران ہوئیں... "نگار کہاں ہے یہ تمہیں کیوں نہیں پتا۔" انہوں نے قدرے تیز آواز سے پوچھا۔ زیان خاموشی سے سامنے دیوار کو تکتا رہا۔
"زیان... میری جان... ہوا کیا ہے... کچھ بتاؤ تو سہی۔"
"وہ چلی گئی... مجھے چھوڑ کر... وہ چلی گئی۔"
"چلی گئی کون چلی گئی۔" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔
"نگار... نگار چلی گئی۔"
"نگار...!! نگار کہاں چلی گئی؟"
"مجھے نہیں پتا... میں سو رہا تھا۔ جب میں سو کر اٹھا تو وہ وہاں نہیں تھی۔"
"کیا مطلب ہے تمہارا زیان... کیا کہہ رہے ہو تم؟" وہ چلائیں۔
"میں نے اسے بہت تلاش کیا... بہت زیادہ... لیکن مجھے وہ کہیں نہیں ملی۔"
"لیکن وہ گئی کیوں۔ کیا تم دونوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے؟"
"اس نے کہا وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اور میرے ساتھ کسی صورت نہیں رہنا چاہتی۔" زیان نے بتایا۔ گلناب عالم نے فق چہرے سے اس کی بات سنی۔
"اگر ایسی بات تھی تو اس نے تم سے شادی کیوں کی۔"
"وہ کہتی ہے اس نے اپنے ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے اور اب وہ مجھ سے طلاق چاہتی ہے۔" سن کر گلناب عالم سن سی رہ گئیں۔
"کیا... اسے طلاق چاہیے؟" وہ بڑبڑائیں۔ اور عین اسی وقت زیان ان کے سینے سے لگ کر رونے لگا۔ گلناب عالم کے چہرے کا رنگ بدل کر سفید ہو گیا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
"زیان۔" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ زیان کی حالت دیکھ کر۔ "تم ریلیکس ہو جاؤ زیان۔ تھوڑا... تحمل سے بتاؤ... کب ہوا سب... کیسے ہوا؟" زیان کو دیکھتے دیکھتے ان کی آواز روہانسی ہو گئی۔
"وہ مجھے پسند نہیں کرتی... اس نے شادی سے پہلے میرے آفس آکر بتایا تھا اور شادی کے بعد بھی... وہ چاہتی تھی کہ میں اسے طلاق دے دوں... میں نے انکار کر دیا... اور آج... آج وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ممی۔"
"لیکن تمہارے ساتھ سیر کے لیے جاتے وقت تو وہ بہت خوش تھی۔"
"پھر پتا نہیں اس نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ ممی... کیوں کھیلا اس نے یہ کھیل میرے ساتھ۔"
"ایک لڑکی ایسا کبھی نہیں کرے گی زیان... طلاق کوئی عام چیز تو نہیں۔" وہ پریشان تھیں کہ اچانک اتنا سب کچھ کیسے ہو گیا ہے۔ کیوں ہو گیا ہے۔ وہ زیان کی بات پر یقین کریں تو کیسے؟ نہ کریں تو کیوں...؟
"کیا نگار بتا کر گئی ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے... کچھ اندازہ ہے تمہیں؟" انہوں نے پوچھا۔ زیان نے نفی میں گردن ہلا دی۔
"نہیں مجھے کچھ پتا نہیں ممی... کہ وہ کہاں گئی ہے۔" گلناب عالم کے چہرے کے تیور بگڑنے لگے۔
"یعنی اسے اب طلاق چاہیے۔" وہ بڑبڑائیں پھر زیان سے کہنے لگیں۔ "میں نے شادی پر بہت سی باتوں کو صرف تمہارے لیے برداشت کیا زیان... تمہاری خوشی کی خاطر اپنی آدھی ناک کٹوائی ہے میں نے... اب میں اس لڑکی کو اپنی پوری ناک کاٹنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"چنگیزی! ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے... اور تم زیان کا خیال رکھو۔" انہوں نے گرج کر کہا اور اشارتاً بھی چنگیزی کو تاکید کی کہ زیان کا خاص خیال

رکھے۔ کمرے سے نکلتے وقت انہوں نے پیچھے پلٹ کر زیان کو دیکھا۔ وہ اپنا ماتھا تھامے کرسی پر نڈھال سا بیٹھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ اور نگار کو سوچتے ہوئے ماتھے پر غصے سے شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اس سب کے باوجود انہیں بری طرح سے محسوس ہو رہا تھا کہ واقعے میں کوئی ایک آدھ جز ضرور ایسا ہے۔ جس سے وہ بے خبر ہیں۔

کمرے کا دروازہ بند ہوا تو زیان خلاؤں میں دیکھ کر مسکرانے لگا۔

☼ ☼ ☼

موٹے اور برگزیدہ درخت بھی باریک تنوں کی مانند نظر آتے اور پھر اوجھل ہو جاتے۔ ٹرین تیز رفتاری سے چلتی چلتی پلک جھپکتے میں راستوں اور سنگ میلوں کو ماضی کا حصہ بنا رہی تھی۔ دھول تھی کہ اٹھتی ہی جاتی تھی۔ قبرستان تھے کہ ایک کے بعد ایک آتے ہی جا رہے تھے۔ وہ سب دیکھ رہی تھی۔ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے، ساکت کھلی آنکھوں سے.... اور جیسے کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ یونانی تراشیدہ ان اعلا مجسموں کی طرح ہو چکی تھی جن میں بس سانسوں کی کمی کا گمان ہوتا ہے۔ اس میں ایک اضافی کمی دھڑکنوں کی بھی تھی۔ اردگرد سے بے نیاز، خود سے بے گانہ، کانٹوں سے اٹا جنگل اور اس وحشت زدہ جنگل سے نکلنا آسان نہیں تھا۔

رات کے اندھیرے میں صبح کا سورج حمد و ثنا پڑھنے میں مصروف تھا، جب وہ خستہ حال مسجد کے قریب بڑے پتھر کے ساتھ پتھر ہوئی، جدا ہوئی۔ اپنے تر بتر وجود کے ساتھ۔ شنگرفی پھولوں کو رات کی سیاہی چاٹ گئی تھی۔ سنہری پیال نم ہو کر زمین کی آغوش میں تھی۔ اسے اپنا آپ بھی اسی پیال کی مانند لگا۔ بے زر.... بے فائدہ.... پھٹکارا ہوا سا۔

چلتے چلتے اپنے قریب سے گزرتی گاڑی کو اس نے روکا نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود ہی رک گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے سفر کے بعد وہ ٹیکسی میں بٹھا دی گئی "پنڈی اسٹیشن" وہ یہاں بھی اتنا ہی کہہ سکی۔ اور باقی کے تمام سفر میں خاموش اور مدہوش رہی۔ خلا کا سارا ہولناک سناٹا اس نے محسوس کیا تھا۔ زمین کی دھڑکنوں.... لاوے کی بہرہ کر دینے والی آواز کو اس نے سنا تھا۔ اب اس کے دل سے جہنم کا خوف بھی نکل گیا تھا۔

پنڈی اسٹیشن پر اتر کر اس نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی کھینچ کر اتاری اور ٹیکسی ڈرائیور کی طرف بڑھا دی۔ ڈرائیور اسے روکتا ہی رہ گیا تھا اور وہ آگے بڑھ آئی تھی۔ اب ٹرین میں بھی وہ اسی گومگو کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ باہر کی خاموشی، اندر کا شور۔ چھاؤں بدلتی دھوپ.... اور اجڑے درخت.... ان ہی درختوں کی طرح اجڑی ہوئی وہ خود بھی۔

کبھی وہ مکمل تھی۔ یہ زعم فنا ہو گیا تھا۔ اس کے گھاؤ آہستہ آہستہ بھر جائیں گے۔ ایسا کوئی اسم اعظم اس کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا.... وہ پھر سے پاک دامن ہو جائے گی۔ کر دی جائے گی.... ایسے طبیب تک اس کی رسائی روز قیامت تک نہیں ہونے والی تھی۔

سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے لگائے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ دو آنسو جاری ہوئے۔ اور پھر نجانے کتنے ہی۔ اس نے انہیں صاف نہیں کیا۔ چھپایا بھی نہیں۔ وہ اللہ کے علاوہ اب کسی کے روبرو نہیں تھی۔ اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ خاموشی سے بے آواز وہ پورے سفر میں روتی رہی اور وہ سفر کس قدر لمبا تھا۔ دنوں، سالوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے۔ نگار کی زندگی سے بھی زیادہ لمبا۔ وہ پٹریاں کہکشاں پر جا کر رکیں گی۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

جس وقت وہ اپنے گھر کے قریب پہنچی۔ سورج عروج پر تھا۔ تنگ گلی اسے اس حالت میں دیکھ کر وسیع ہو گئی۔ در و دیوار پرے پرے ہٹ گئے۔ حاجرہ خالا نے اسے دور سے آتے ہوئے دیکھا اور مسکرا کر گلے سے لگا لینا چاہا۔

"اکیلی آئی ہو نگار.... زیان ساتھ نہیں آیا۔" انہوں نے پوچھا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔ نہ ہی ان کے گلے لگ سکی۔ سیدھ میں چلتی وہ آگے بڑھتی گئی۔ اس

نے بے اعتنائی نہیں برتی تھی۔ اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ ہی سنا تھا۔ حاجرہ خالا حیران حیران سی اسے دیکھنے لگیں۔

بابا... اماں... ہمایوں ان سب کے بارے میں سوچتے سوچتے گھر کی دہلیز پار کرتے وقت اس نے خود پر بندھے ضبط کے سارے بند توڑ ڈالے۔

"میں ان سے کچھ نہیں چھپاؤں گی... میں انہیں سب بتادوں گی... سب کچھ... بنا جھجکے... چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا کر... اور پھر ان کے گریبان پکڑ کر ان سے جواب طلب کروں گی۔ اس سب کے ذمے دار یہ بھی ہیں... ہمایوں بھیا... اوہ لالہ میں نے کہا نہیں تھا کہ انتقام کا کالا موتیا آنکھوں میں اتر آئے تو بہت زیادہ خون بہا ادا کرنا پڑتا ہے... زلیخاجی... آپ کی دعائیں کیا ہوئیں... کس بہتر زندگی کی طرف دھکیلا ہے آپ نے مجھے... یہ کیسی زندگی چن کر دی ہے آپ نے جس نے میری سانسیں بھی مجھ پر تنگ کردی ہیں... خدایار... دیکھیے آپ کی بیٹی کے ساتھ کیسے پکے رنگوں کی ہولی کھیلی گئی ہے۔ اور اب اس ہولی کے داغوں کو کس بل سے دھوؤں میں...؟

دروازہ پھلانگ کر وہ صحن میں داخل ہوئی۔ اور اس کی خود ساختہ پکار اس کے سینے میں ہی کہیں دم گھوٹ کر رہ گئی۔ اسے کسی کو پکارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازے کی آہٹ پر ہی سب کے سب باہر آگئے تھے۔ وہ جیسے کب سے اس کے منتظر تھے۔ اپنے اپنے چہرے بیگانے کیے۔ جن میں اس کے لیے پیار کی کوئی رمق باقی نہیں بچی تھی۔ یک لخت نگار کو اندازہ ہوا کہ اسے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ رو رو کر نہ چیخ چیخ کر... نہ خاموشی سے نہ آنسو بہا کر اور نہ غم زدہ صورت دکھا کر اس کی چیخوں سے کوئی آسمان نہیں اٹھے گا۔ البتہ زمین ضرور پھٹ کر ان کے لیے ایک قبر بن جائے گی۔ وہ سب... سب کچھ جانتے ہیں۔ اور کافی سے بھی زیادہ جانتے ہیں۔ اسے جیسے انہیں دیکھتے ہوئے ادراک ہوا۔

وہ تو تمام سفر یہ ہی سوچتی آئی تھی کہ اس کے ساتھ کھیلا جانے والا کھیل وہ اب ختم کرکے آئی ہے۔ جس میں اسے مات ملی ہے۔ عمر بھر کی۔ لیکن گھر کے صحن میں پہنچ کر اس نے جانا کہ زیان کی بچھائی بساط میں ابھی تو صرف مہرے ہی آگے کو سرکے ہیں۔ بہت لمبا کھیل تو شاید ابھی باقی ہے۔

☆ ☆ ☆

ابابیلیں پھر پھڑا کر اس کے سر پر سے گزر گئیں۔ وقت نے بھی ایک بار تھم کر سرگوشی سی کی تھی۔ "کیا ہونے والا ہے؟"

صحن میں ساکت و جامد کھڑے وہ اپنے ہی گھر والوں کو دیکھنے لگی۔ ان کی اجنبی نظروں کو بھی۔ اس کی آمد کی خبر ہوا نے یا کسی اور نے جیسے اس کی آمد سے بھی پہلے ان تک پہنچادی تھی۔ کیا ان تک باقی کے حالات و واقعات بھی پہنچادیے گئے تھے؟ اگر ایسا ہی تھا تو انہیں کس طرح بتایا گیا تھا کہ اب وہ اسے سینے سے لگانے کے بجائے اس سے دور دور کھڑے تھے۔ تھوک نگل کر وہ خود ہی آگے بڑھی۔

زلیخا بی کے پیچھے ہمایوں بھی اس کی طرف لپکا اور ایک زناٹے دار تھپڑ اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ وہ لڑکھڑا کر پلٹی۔ تھپڑ سے زیادہ تکلیف کسی اور چیز کی تھی۔ گال پر ہاتھ رکھے اس نے حیرت سے ہمایوں کو دیکھا۔

"ہمایوں بھیا۔" وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ زلیخا بی نے بھی آگے بڑھ کر اسے کندھوں سے بری طرح جھنجھوڑا۔

"تو یہاں کیا کررہی ہے بدذات۔" وہ چلائیں اور نگار حیرانی کی آخری حد پر پہنچ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"زیان کو بتائے بنا کیوں نکلی وہاں سے... اور تجھے طلاق چاہیے 'بے غیرت۔" زلیخا بی نے بھی اسے ایک تھپڑ مارا۔

"اماں...!!" وہ زلیخا بی کے گلے لگ کر رونا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اسے دھتکار دیا۔

"دور ہوجا مجھ سے۔"

"بابا...!" وہ بابا کے قریب ہوئی۔ جو آج اسے ایسے

دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔
"مجھے دکھ ہے کہ تم میری بیٹی ہو.... اس سے بہتر تھا کہ تم مر جاتیں یا مجھے موت آجاتی۔" بابا نے دونوں طرف سے جیسے اسے ہی موت کی بددعا دی تھی۔ وہ بیگانگی سے سب کو دیکھنے لگی۔ ہمایوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلا تھا۔
"چل نکل، بے حیا...." وہ دھاڑا۔
"تو اصل تماشا اب شروع ہوا ہے۔" حال کے ثانیوں نے مستقبل کے لمحوں سے کہا۔

☼ ☼ ☼

"زمل...." اسے پھر سے پکارا گیا تھا۔
وہ کسی غار کے دہانے کے قریب کھڑی تھی اور اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس کی معصوم آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔
"زمل...." غار کے اندر سے آواز آئی۔ بھیانک آواز.... وہ ڈر کر پرے ہو گئی۔ اور عین اسی وقت کسی نے اسے دھکا دے کر غار کے اندر دھکیل دیا۔ وہ گرتے گرتے بچی اور ڈرتے ڈرتے آگے بڑھنے لگی۔
"اندر آجاؤ زمل...." اسے بلایا گیا۔ اندھیرے میں وہ اندھی ہو گئی۔ غار کی تاریکی میں اسے کچھ بھی سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا اور نہ ہی اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ آواز دینے والا کون ہے۔ وہ آواز انسانی تو ہرگز نہیں تھی۔ زمل نے جلد ہی اس آواز کے حلق کو پالیا۔ وہ ایک بہت بڑے سائز کا درخت تھا۔ زمل نے اپنی پوری زندگی میں اتنا بڑا درخت نہیں دیکھا تھا۔ اس کا تنا بے پناہ وسیع تھا اور اس کی شاخیں آسمان کو چھوتی تھیں۔
"قریب آؤ زمل...." اس درخت نے پیار سے اسے پکارا۔ وہ سہم سہم کر آگے بڑھی۔ لیکن اس کا پیار ایک فریب تھا۔ جوں ہی وہ اس کی حدود کے اندر داخل ہوئی۔ درخت کی جٹاؤں نے اسے مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ اپنا آپ چھڑانے لگی۔ لیکن مضبوط جٹائیں اس کے وجود کی گرد بل دینے لگیں۔ پھر اس کی گردن کے گرد۔ اس کا دم گھٹنے لگا اور آخری سانس لینے سے

پہلے اس نے مکمل جان لگا کر ایک چیخ مار دی۔
"کیا ہوا.... کیا ہوا زمل بیٹی...." نانو بھاگی بھاگی اس کے کمرے میں آئیں۔ وہ لحاف میں خود کو چھپائے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ نانو نے لائٹ آن کی، پھر تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔
"کوئی برا خواب دیکھ لیا کیا۔" انہوں نے پوچھا۔
"جی...." اس نے بتایا۔ ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔ اور آنکھوں میں آئے آنسو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ خواب بہت جلد حقیقت کا روپ دھارنے والا ہے۔
"تم میرے کمرے میں آجاؤ۔"
"نہیں کوئی بات نہیں نانو.... میں اکثر رات میں ڈر جایا کرتی ہوں۔" وہ بمشکل بولی۔
"ضد مت کرو.... اٹھو آجاؤ.... اب مجھے بھی نیند نہیں آئے گی۔ ساری رات تمہارے بارے میں سوچتی رہوں گی۔" نانو نے اسے اٹھایا۔
"میں ڈیڈ کو فون کر لوں؟ میرا دل کر رہا ہے ان سے بات کرنے کو۔" وہ ایک دم سے ہی رونے لگی۔
"زمل میری جان.... اس طرح رووں تو مت۔" نانو اداس ہو گئیں۔
"ٹھیک ہے تم اپنے ڈیڈ سے بات کر لو۔ پھر میرے کمرے میں آجانا۔" نانو کہہ کر چلی گئیں۔ اس نے سیل فون اٹھا کر ڈیڈ کو کال کی۔
"ڈیڈی...." اس سے اتنا ہی کہا گیا۔ پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے اس ایک لفظ میں بہت کچھ تھا۔
"ڈر گئی ہو نا...." انہوں نے پوچھا۔ زمل پھر سے بے اختیار رونے لگی۔
"سدیم بھی نہیں رہا اب تو.... نہ میں ہوں وہاں.... پھر کس کے پاس جاؤ گی تم۔" انہوں نے پوچھا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔
"کیوں ضد کر رہی ہو.... واپس آجاؤ.... چھوڑ دو این جی او کے ورک...."
"میں آپ کے پرانے گھر گئی تھی...." اس نے انکشاف کیا۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

"ماڈل ٹاؤن۔" اس نے مزید بتایا۔
"کیا کرنے گئی تھیں تم وہاں۔۔۔؟"
"پتا نہیں۔" وہ نہ جھوٹ بولنا چاہتی تھی نہ سچ بتا سکتی تھی۔
"کیا وہ گھر اب بھی ویسا ہی ہے۔ بڑا ہال۔۔۔ بڑا فانوس۔۔۔ گول سیڑھیاں۔"
"جی وہ بالکل ویسا ہی ہے۔" اس نے غلط بیانی کی۔ وہ ڈیڈ کو پاکستان آنے پر اکسانا چاہتی تھی۔
"پر میں وہاں کیسے آسکتا ہوں۔ وہاں تو آوازیں بھی وہی ہوں گی۔"
"کیسی آوازیں؟" اس نے پوچھا۔
"ایک لڑکی کے رونے کی آوازیں۔" بتایا گیا۔
"کس لڑکی کے رونے کی آوازیں۔" اس نے پھر پوچھا لیکن جواب نہیں آیا۔
"کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں آپ ڈیڈ۔" وہ بے قراری سے بولی۔
"ڈیڈ کہاں ہیں آپ۔۔۔؟ کیا آپ مجھے سن رہے ہیں؟" وہ چلائی گئی۔ رابطہ منقطع ہو گیا تھا جو بار بار نمبر ڈائل کرنے پر بھی دوبارہ نہ جڑ سکا۔
زیان عالم نے گرجتی آواز سے ڈیوڈ کو بلایا۔
"جی سر۔" ڈیوڈ مودب انداز سے بولا۔
"یہ نیچے سے کیسی آوازیں آرہی ہیں۔"
"کون سی آوازیں سر۔۔۔ نیچے تو کوئی بھی نہیں ہے۔"
"نہیں۔۔۔ غور سے سنو۔۔۔ آوازیں آرہی ہیں۔۔۔ ایک لڑکی رو رہی ہے نیچے۔۔۔ کیا نام تھا اس لڑکی کا۔۔۔ کیسے بھول گیا میں اس کا نام۔"
"نیچے کوئی لڑکی نہیں ہے سر۔۔۔"
"تم نے مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔" وہ چلائے۔
"جاؤ جا کر دیکھو۔۔۔ اسے کہو نہ روئے۔۔۔ تیس سال ہو گئے۔ کوئی اتنی مستقل مزاجی سے کیسے رو سکتا ہے۔"
"نیچے ہال خالی ہے سر۔"
"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ تم سب کے سب جھوٹے ہو۔ ملے ہوئے ہو آپس میں۔ کیا میں بہرہ ہوں۔۔۔ مجھے سنائی نہیں دیتا۔۔۔ سنو کوئی اب مجھے بلا رہا ہے۔۔۔ اسے کہو زیان آتا ہے۔" ڈیوڈ اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔
"کس کی آواز تھی یہ۔۔۔ ہاں ممی کی۔۔۔ میری ماں کی۔۔۔ گلناب عالم کی۔۔۔ سنو۔۔۔ غور سے سنو۔۔۔ تمہیں بھی سنائی دے گی۔۔۔ وہ چیخ رہی ہیں۔
"چنگیزی! زیان کو بلاؤ نیچے۔"

☼ ☼ ☼

بڑے ہال کے بڑے روشن فانوس کے نیچے گلناب عالم بے قراری سے چکر لگا رہی تھیں۔ جب ہمایوں نے نگار کو ان کے قریب لاکر پٹخا۔ وہ ان کے قدموں کے قریب گری۔ گلناب عالم چلتے چلتے رکیں۔ انہوں نے نگار کو دیکھا۔ غصے سے، نفرت سے، نخوت سے اور بے رحمی سے۔
"تم اس قدر گر جاؤ گی نگار۔۔۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔" انہوں نے کہا۔
"کیا واقعی میں اتنا گر گئی ہوں کہ اب ہر کوئی اس بات کو میرے چہرے سے پڑھ سکتا ہے۔"
"میرا بیٹا وہاں تمہیں پاگلوں کی طرح تلاش کر تا رہا ہے اور تم یہاں ہو۔" انہوں نے چلا کر اسے بتایا۔
بابا، زلیخا بی اور ہمایوں اس کے ارد گرد کھڑے تھے۔ وہ ان سب کے نرغے میں پھنسی تھی۔ جب چار اطراف سے پتھر برسائے جائیں تو مضبوط سے مضبوط چٹان بھی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ وہ تو تب ہی ٹوٹ گئی تھی جب بابا نے اس کے یا اپنے مرنے کی تمنا کی تھی۔ اسے پتا تھا۔ اب کچھ بھی کہنا بے کار ہے۔ زیان انتہائی مہارت سے یہ کھیل کھیل رہا تھا۔ اس کی کسی بات پر بھی یقین نہیں کیا جائے گا۔ اس کے باوجود اس نے بھیگی آنکھوں سے اپنے موقف کے لیے لب کھولے۔
"زیان نے میری بے حرمتی۔۔۔" وہ جملہ بھی پورا نہ بول سکی۔ اور یہ جملہ ادا بھی اس طرح ہوا تھا کہ الفاظ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ اس پر یقین نہ کیا جائے۔ گلناب عالم نے اچنبھے سے پہلے اسے دیکھا۔ پھر نخوت سے ایک ہنکار ابھرا۔

"دیکھا! کیا کہہ رہی ہے آپ کی بیٹی... بے حرمتی؟" بھرپور طنز سے انہوں نے زلیخاں اور بابا کو مخاطب کیا۔ دونوں کے سر شرم سے جھک گئے۔

"دراصل آپ کی بیٹی پاگل ہو گئی ہے... آپ کی بیٹی ایک نفسیاتی مریضہ ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے بدذات... تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" زلیخاں نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ انہیں واقعی پاگل لگنے لگی تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی اماں۔" وہ رونے لگی۔ "میری بات کا یقین کرو... وہاں سدیم اور ریشب بھی تھے۔ ان تینوں نے..." نگار کا فقرہ مکمل نہیں ہوا تھا۔ گلناب عالم نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور ہاتھ کا طمانچہ نگار کے منہ پر مارا۔

"بکواس بند کرو اپنی بدکار لڑکی... کس قدر جھوٹ بول رہی ہو تم... میرے بیٹے پر اتنا گھٹیا الزام لگاتے تمہیں بالکل بھی شرم نہیں آرہی... سدیم تو باپ کی وفات کی وجہ سے شادی پر ہی نہیں آسکا۔ اور ریشب تو فرانس گیا ہوا ہے۔"

وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ "بابا میری بات کا یقین کریں۔"

"میرا بیٹا اس کی محبت میں پاگل ہے۔ اور یہ اس پر الزام لگا رہی ہے۔" ہاں وہ پاگل تھا۔ لیکن محبت میں نہیں انتقام میں بدلے میں... اور اب وہ اس پر الزام کیسے لگا سکتی ہے۔ اس نے اسے الزام لگانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"بابا میں جھوٹ نہیں بول رہی۔"

"خاموش ہو جا بے غیرت!" ہمایوں پھر سے دھاڑا۔ اس رشتے میں تیری مرضی شامل نہیں تھی۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔"

"میرے بیٹے نے سب کے سامنے اس سے معافی مانگی... اور یہ ابھی بھی اس سے نفرت کرتی ہے۔" گلناب عالم چیختی جا رہی تھیں۔

"تو مر کیوں نہ گئی بے غیرت تو مر کیوں نہ گئی۔"

زلیخاں نے بھی واویلا کرنا شروع کر دیا۔ "ایسی بیٹی کا تو خود ہی گلا گھونٹ دینا چاہیے۔"

"کاش مجھے موت آجاتی۔" بابا رونے لگے۔

"اس نے مجھے طلاق دے دی ہے۔ پہلے طلاق دی ہے اس نے مجھے... اور اس کے بعد..." "ان سب کے درمیان کھڑی روتے روتے وہ اتنی قوت سے چلائی تھی کہ سب اپنا اپنا واویلا بھول گئے تھے۔ بڑے ہال میں یک دم ہی خاموشی چھائی تھی۔ گلناب عالم نے ایسے ایسے دیکھا جیسے اب تو اس کے پاگل ہو جانے میں واقعی کوئی شبہ باقی نہ رہا ہو۔

"چنگیزی... زیان کو بلاؤ نیچے۔" جلال بھری آنکھوں سے گلناب عالم نے گرج کر چنگیزی کو کہا تھا۔

٭ ٭ ٭

شیطان اگر انسان کا روپ دھار لیتا تو اس کا پسندیدہ روپ یقیناً "زیان" ہوتا۔

ریسٹ ہاؤس کے باہر بادل گرج رہے تھے۔ اور ان کی گرج کا طوفان نگار کے سینے میں قید تھا۔ بجلیاں اس کے وجود میں زندگی بھر کے لیے بھر دی گئی تھیں... وہ سہم کر پیچھے ہو گئی۔ زیان سیڑھیاں اتر کر نیچے آرہا تھا۔ اس شخص کا چہرہ زندگی میں دوبارہ دیکھنا اس کا مقدر تھا۔ اس سے بہتر تھا کہ اللہ اس کے مقدر پر سیاہی مل دیتا۔ نہ کسی جزا کا سوال باقی رہتا نہ کسی سزا کا۔

پژمردگی سے چلتا ہوا وہ نیچے اترا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سب خاموشی سے اس کے بولنے کے منتظر رہے۔

"نگار نے مجھے پہلے دن ہی بتا دیا تھا کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہے... اس نے صرف اپنے گھر والوں کے دباؤ کی وجہ سے مجھ سے شادی کی ہے... اور اب وہ مجھ سے طلاق چاہتی ہے..." وہ سر جھکائے نرم آواز سے بولا اور نگار کا دل کیا کہ اس خبیث کا منہ نوچ لے۔

"مجھے لگا تھا کہ میں شاید... نگار کو سمجھا لوں گا... اسے اپنی محبت کا یقین دلا دوں گا لیکن میں غلط تھا... میں ناکام رہا بابا... میں ناکام رہا..." وہ خدا یار سے

مخاطب ہوا اور بابا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نگار اس کے اتنے روپ دیکھ کر سکتے میں آ گئی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ طمانچے مار مار کر اس کا منہ لہو لہان کر دے۔

"یہ شیطان... یہ ابلیس... یہ جھوٹا ہے... سب جھوٹ بول رہا ہے یہ۔" وہ پوری قوت سے چلائی اور بے بسی سے بھی۔

"ٹھیک ہے... میں جھوٹ بول رہا ہوں... میں واقعی جھوٹ بول رہا ہوں۔" وہ اس طرح اطمینان سے بولا۔ "پھر تم سچ بولو نگار... اپنے بابا کی قسم کھا کر کہو کہ تم شادی سے پہلے میرے آفس نہیں آئی تھیں کہ میں اس رشتے سے انکار کر دوں۔" نگار کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

"بولو... جواب دو نگار... کیا تم نہیں آئی تھیں میرے آفس... کیا تم قسم کھاؤ گی اپنے بابا کی..." سب نے نگار کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکی اور مجرم بن گئی۔ زلیخا بی اونچی آواز میں رونے لگیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے ایک بار پھر اپنی شکست تسلیم کر لی۔ قسمت کے دوپٹے میں گرہ باندھ کر اس کے منہ میں ٹھونس دی گئی تھی۔ وہ اللہ سے کسی بھی طرح کی فریاد کرنے سے قاصر تھی۔ اور مکڑی والا لاکٹ جھولتا جھولتا ایک بار پھر... اس کے منہ پر آ لگا تھا۔ ساتھ چھوڑتے حواسوں کے ساتھ اس نے اپنی موت کی دعا مانگی تھی۔ ہمایوں تیزی سے جیسے اسے جان سے ہی مار دینے کی نیت سے اٹھا تھا۔ زیان نے اسے روکا پھر وہ نگار کی طرف آیا۔

"اٹھو نگار... بہت تماشا لگا لیا تم نے..." اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ شیطان نے حیرت سے اس کمینے انسان کو دیکھا۔

"میں سب کچھ بھلا دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور ابھی بھی تمہیں اپنانا چاہتا ہوں... اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی..." شیطانیت کی ایک جھلک زیان کی آنکھوں میں آ کر گزر گئی۔ وہ کتنا مزہ لے رہا تھا ہر بات کا "اس چیز کا نگار کو بخوبی اندازہ تھا۔ بند ہونٹوں کے کونے میں مسکراہٹ دبائے وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"آؤ نگار! اوپر چلتے ہیں... وہاں جا کر بات کرتے ہیں۔" اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پھر پیار سے اسے سہلانے لگا۔ نگار نے اپنا ہاتھ نہیں کھینچا تھا۔ ایک سسکاری اس کے وجود سے نکل کر اس کے وجود میں ہی دفن ہو گئی تھی۔

"آپ اسے لے جائیے زیان... یہ اب یہیں رہے گی..." ہمایوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میرے گھر میں اب تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہے نگار۔" بابا نے بھی اسے بتایا۔

اسے اب منہ چھپانے کے لیے بھی جگہ نہیں ملنے والی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ زیان نے ٹھیک کہا تھا کہ زمانہ تمہیں بتائے گا کہ کون گھٹیا ہے۔ اب زمانہ ہی اسے بتا رہا تھا کہ وہ کتنی گھٹیا ہے۔ اس زمانے میں سب اس کے اپنے ہی شامل تھے۔ دور، بہت دور... قوسی سلاخ دار کھڑکی کے قریب بیٹھے بوڑھے وجود نے ماضی کی نگار کو دیکھا اور چوبی نقش و نگار پر پھرتے اس کے ہاتھ کانپ کانپ گئے۔ موسم نے آہیں بھریں اور جہان نے قیامت کے روز کی مشق کرنا شروع کر دی۔ در اوڑیں آنکھوں میں ہر طرح کا جذبہ کافور ہو گیا۔ مروارید کی برادہ جل کر خاکستر ہو گیا اور جھریوں کی لائنیں برگد کی جڑوں کی طرح چہرے پر پھیلنے لگیں۔

یوں چپ بیٹھے بیٹھے ہی نگار نے تاعمر زبان کی بندش کی قسمیں اٹھا لیں۔

"آؤ نگار... اوپر کمرے میں چلتے ہیں۔" اس نے پیار سے کہا۔ دلی مسکراہٹ سے جسے صرف نگار ہی دیکھ سکتی تھی۔ آنکھوں میں رقم "تم کتنی مضبوط ہو جان جاؤ گی۔" جسے صرف نگار ہی پڑھ سکتی تھی۔ وہ اب واقعی مضبوط نہیں رہی تھی۔ اس کے آگے بے بس تھی۔

"چلو نگار کمرے میں..." زیان زبردستی اس کا ہاتھ

پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"کمرے میں ... کمرے میں ... کمرے میں
بازگشت زہریلے ناگ کے ڈنک کی طرح اس کے وجود میں اتر گئی۔

اس شخص نے روحانی اور باطنی دونوں طرح سے اس کی عزت کو لوٹا تھا۔ کیا ابھی بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اور اب وہ اس شخص کے آگے گھٹنے نہ ٹیک دے تو کیا کرے۔ اس کے آگے ہاتھ نہ جوڑے تو کیا کرے ... تاکہ اسے اس پر رحم آجائے۔ اور وہ اسے معاف کردے۔ اپنے حلق کا سارا تھوک نگار نے اپنے منہ میں اکٹھا کیا اور نفرت سے زیان کے منہ پر تھوک دیا۔ جھاگ دار مادہ زیان کے منہ پر گرا۔ زیان نے اس کی طرف لاوا ابلتی آنکھوں سے دیکھا۔ گلناب جالم اور باقی سب نے اس سے بھی بڑھ کر کسی اور نظروں سے۔ زیان نے آستین سے چہرے پر لگا تھوک صاف کیا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ تھا۔ کیا اس لڑکی کو چائے گرانے کا بدلہ اچھا نہیں لگا۔ کیا یہ کچھ زیادہ کی خواہش رکھتی ہے۔ اسے اس پر طیش آیا تھا۔ تو کیوں نہ اس کی خواہش پوری کردی جائے۔ اس نے سوچا۔

"اب تو تمہیں میرے ساتھ جانے سے اللہ بھی نہیں روک سکتا۔" اس نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف کھینچا۔

عین اسی وقت ایک اجنبی جو بڑی دیر سے لاؤنج کے کونے میں کھڑا سب تماشا دیکھ رہا تھا اور جس کے ہاتھوں میں ان دونوں کی شادی کا ہی گفٹ تھا۔ آگے بڑھا تھا۔ زیان سے نگار کا ہاتھ چھڑا کر اس نے زیان کے منہ پر ایک زوردار قسم کا تھپڑ مارا تھا۔ زیان نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

"خدا کی ڈھیل کو اس کی کمزوری مت سمجھو زیان۔"

انہوں نے کہا۔ نگار کے بت ہوئے وجود میں حرکت ہوئی۔ اس نے بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا اور پھر ان کے سینے کے ساتھ لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ اجنبی کوئی اور نہیں ... پروفیسر صغیر ربانی تھا۔

☼ ☼ ☼

آف وائٹ ڈریس کو زمل نے بیڈ پر پھیلا کر تفصیل سے دیکھا۔ پھر اس کے ساتھ کی میچنگ جیولری اور سینڈل کو بھی قریب ہی رکھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے عیاں تھی۔ باسل نے کہا تھا۔ "خاص دنوں کو خاص اہتمام سے منانا چاہیے ..." اس نے بھی اپنے خاص دن کو گزارنے کے لیے خاص اہتمام کرلیا تھا۔ شطرنج کو بھی اس نے بہت خوب صورت پیکنگ میں پیک کروایا تھا۔

اس نے ٹائم دیکھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ باسل کے آنے میں کم از کم چھ گھنٹے باقی تھے۔ وہ اتنا لمبا انتظار کیسے کرے گی بھلا۔ اس کی بے کلی بڑھنے لگی اور اپنی اس کیفیت پر اسے خود ہی ہنسی آگئی۔ باسل کو اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اور چپکے چپکے رازداری سے سب انتظام کرلیا تھا۔ اپنے ان سارے انتظامات پر وہ مطمئن تھی۔ رات کو وہ باسل سے کہے گی کہ اسے ڈیڈ کے کسی رشتے دار سے ملنے جانا ہے۔ اور راستہ بتاتے بتاتے وہ اسے اس ہوٹل تک لے جائے گی جہاں ایک ٹیبل اس نے آج رات کے لیے بک کروالیا تھا۔ باسل شاکڈ رہ جائے گا۔ وہ پھر سے ہنسی اور اوپر چھت پر آگئی۔ جہاں نانو نے چاندی کی بہت بڑی شیٹ پر پیپل کے دس ہزار پتوں والا خاکہ چھاپ کر کام شروع کیا ہوا تھا۔ لیکن ابھی انہوں نے بمشکل سو پتیوں کو ہی تیار کیا تھا کہ تھکن کے ساتھ ساتھ انہیں اکتاہٹ بھی ہونے لگی۔ تقریباً "نو ہزار نو سو پتیاں ابھی باقی تھیں۔

انسان میں درخت جتنا حوصلہ بھلا کہاں ہے کہ وہ اپنی ذات تیاگ کر اپنی روح سے کشید کرکے دوسروں کے لیے پتوں کو سینچے' انہیں اپنے اس نئے خاکے کو شروع کرنے سے پہلے ہی بہت الجھن ہورہی تھی۔ اب انہیں نئے نئے تجربات نہیں کرنے چاہئیں۔ دو تین اس طرح کے کام سالوں سے التواء کا شکار تھے۔

باریک بینی اور نفاست سے کرنے کی شرط کے باعث ان کی نظر بھی متاثر ہونے لگی تھی۔ یہ تمام کام اب انہیں ذہنی اور جسمانی دونوں طرح سے تھکانے لگے تھے۔ لیکن اب وہ چاندی کی مہنگی شیٹ کو خراب یا برباد بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے وہ جیسے تیسے کر کے خاکہ مکمل کر رہی تھیں۔

"آئندہ اتنے طویل کاموں کو میں اپنے ذمے نہیں لوں گی۔" انہوں نے خود سے کہا۔

جاتی سردیوں کے دن تھے۔ دھوپ بڑی روشن بڑی اجلی اجلی سی تھی اور چھت پر جا بجا لگی مخملی سبز کائی اور خودرو کھمبیوں پر پڑ کر انہیں منور کر رہی تھی۔

"یہ کیا ہے نانو؟" زمل نے پوچھا۔ آج زمل کو کہیں نہیں جانا تھا' یہ جان کر نانو نے دکان سے پھر چھٹی کر لی تھی۔ زمل کی وجہ سے وہ سالوں بعد خود کو ایسی رعایت دے رہی تھیں۔ اور اس رعایت میں بھی وہ دکان کا کام ہی مکمل کرنے بیٹھ گئی تھیں۔

"یہ لیمپ ہے زمل... فرشی لیمپ... دس ہزار پتوں کے خاکے والا... جب شیٹ تیار ہو جائے گی تو اسے آڑا موڑ لیا جائے گا۔ آڑا سمجھتی ہو نا... ہاں... اور پھر جب یہ روشن ہو گا تو دیکھنا کس قدر خوب صورت لگے گا۔" نانو تفاخر سے اسے بتانے لگیں۔ زمل دیکھ رہی تھی کہ شیٹ پر کام کس قدر محنت سے کیا جا رہا ہے۔

"میں بھی تھوڑی کوشش کروں۔" اس کے سوال میں التجا تھی۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... بیٹھو ادھر میرے ساتھ۔" نانو نے پیار سے کہا۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ہاتھ میں پکڑے دونوں اوزار انہوں نے زمل کو تھما دیے۔

"یہ پکڑو... اسے یہاں رکھو... پتے کے خاکے کے اوپر... اب ہلکی ہلکی ضرب لگاؤ... پتے والی جگہ کو خالی کرنا ہے۔" اس نے ایسا ہی کیا جیسا نانو اسے کہہ رہی تھیں... لیکن اختتام کی ضرب کچھ زیادہ ہی زوردار ہو گئی۔ جو کہ نہیں ہونی چاہیے تھی... چاندی کی مہنگی شیٹ میں اوزار کی دھار پتے کی حدود سے باہر نکل گئی اور زمل کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے شوق چرایا بھی تھا تو کس چیز کا۔

"اوہ گاڈ..." وہ چلائی... نانو نے دیکھا اور خاموش ہو گئیں۔ پھر پہلے ہلکے ہلکے اور بعد میں وہ اونچی آواز میں ہنسنے لگیں۔

"آئی ایم سوری نانو۔" اس نے کہا۔ نانو اور زور سے ہنسنے لگیں۔

"آپ اس طرح سے کیوں ہنس رہی ہیں نانو..." اس کی خفت مزید بڑھی۔ نانو ہنستے ہنستے بمشکل بولیں۔

"تمہاری عادتیں باسل سے ملنے لگی ہیں زمل... وہ بھی میرے کام خراب کر دیتا ہے اور پھر اپنا سر کھجانے لگتا ہے۔" زمل وجہ جان کر ہلکے سے مسکرائی۔

"میں نے آپ کا نقصان کر دیا نا۔"

"پریشان مت ہو... میں درست کر لوں گی۔" وہ ابھی بھی ہنس رہی تھیں۔ چاندی کی لشک دھوپ میں مدغم ہو کر ان کے چہرے پر رقص کر رہی تھی۔ زمل کو وہ چہرہ بہت ہی پرنور سا لگا۔

"باسل اور ریشار خوش قسمت ہیں کہ ان کے پاس آپ ہیں۔" اس نے کہہ دیا۔

"تو تم بھی خوش قسمت ہو جاؤ۔" انہوں نے کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ زمل نظریں چرانے لگی۔

"جاؤ اپنی آنٹی کو کھانا دے آؤ زمل' روٹی بنا کر رکھ دی تھی میں نے ہاٹ پاٹ میں' وہ دے دینا... سالن گرم کرنے کی ضرورت نہیں... ایسے ہی دے دینا۔"

"آنٹی بھی ہمارے ساتھ ہی کھانا کھالیں گی۔"

"وہ کسی کے ساتھ کھانا نہیں کھاتی۔" نانو کے چہرے پر شام سی اتری۔

"میرا مطلب ہے۔ اسے جلدی بھوک لگتی ہے۔ تم دے آؤ۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ نیچے آئی۔ بڑی ٹرے میں اس

نے آلو قیمے سے بھری پلیٹ کو رکھا۔۔۔ رومال میں لپٹی روٹی کو۔۔۔ پھر ایک گلاس پانی سے بھر کر اور ان سب چیزوں کو کپڑے سے ڈھانپ کر وہ گنگناتی ہوئی کچن سے باہر نکلی۔

☆ ☆ ☆

کہکشاں کے آٹھویں برج۔۔۔ کژدم سے ڈسا سورج۔۔۔ پشمینہ اوڑھے اپنے سارے عود دان الٹے۔ چپ کی نگری بسائے ساکت تھا۔ درخت کی تمام پرجاتیوں میں اس کی خیر خواہی کے چرچے تھے۔

برگد بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ اسے بدلاؤ کی طلب تھی۔ پانی کی التجا تھی۔ اور اس کی جڑیں پانی کی تلاش میں اپنے وجود کے بھیتر اس قدر وسیع ہو چکی تھیں کہ اگر اس کا تھالا بنتا تو وہ اس پورے مکان کو نگل گیا ہوتا۔ اس سال خوردہ کھڑکی کو۔ اس غم خوردہ بوڑھے وجود کو بھی۔

جواب اسے دیکھتے ہوئے استہزائیہ ہنسی ہنس رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر کی التجا کو سنتی ہو۔ برگد کو وحشت سی ہوئی۔ وہ اپنے بوڑھے لب کھولنے کے لیے بے چین تھی۔ نجانے بادلوں نے اس کا ساتھ کیوں دیا۔

صاعقہ نے رقص شرر کیا۔ اور بوڑھے وجود کی دونوں آنکھیں چمک اٹھیں۔

"پرشوتم۔۔۔ سایہ گوتم
ابن مریم سے کہہ دو۔۔۔ خدا کے اس معجزے سے
میری عزت کے ساتھ کھیلنے والے وہ تین تھے۔۔۔
تین
سدیم۔۔۔ یشب۔۔۔ اور زیان عالم۔۔۔"

بوڑھے وجود نے بادلوں کی طرح گرج کر کہا اور کچھ چیزوں نے فرش پر گر کر اس سے بھی بڑھ کر شور کیا۔ وہ شور بڑا گونج دار تھا۔ دنیا کے دوسرے کونے سے ٹکرا کر تھما تھا۔ بوڑھے وجود نے برگد سے نظریں اور سلاخ دار کھڑکی سے چہرہ ہٹا کر بڑی آہستگی سے دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں ٹرے دو ٹکڑے ہو چکی تھی۔ پانی سے بھرا گلاس، آلو قیمے کی پلیٹ۔ رومال میں لپٹی روٹی سب مٹی زدہ فرش پر گر کر بکھر چکا تھا۔ اور ان سب کے اوپر کھڑی زمل فق چہرے سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں لامحدود آنسوؤں کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔ اور وہ جو پچھلے کافی عرصے سے روز اسے کھانا دینے آ رہی تھی' اب اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یقین اور بے یقینی کے گرداب میں پھنسی ہو۔

پھر وہ لڑکی بھاگتی ہوئی اس تک آئی۔ اور گرد آلود تخت پر اس کے قریب ڈھے سی گئی۔

"کیا کہا آپ نے آنٹی۔۔۔ دوبارہ سے کہیے۔" زمل نے روہانسی آواز میں منت کی۔ نگار ساکت چہرے سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا کہا آپ نے۔۔۔ خدا کے لیے پھر سے کہیے نا۔" زمل رو دینے کے قریب تھی۔ نگار کچھ نہیں بولی۔

"آپ کو خدا کا واسطہ نگار آنٹی۔۔۔ آج تو بولیے۔" اور آنسو اس کی دونوں آنکھوں سے بہہ نکلے۔۔۔ نگار نے آہستگی سے لب کھولے۔۔۔ اور اتنی ہی آہستگی سے کہا۔

"وہ تین تھے۔۔۔ سدیم۔۔۔ یشب۔۔۔ اور زیان عالم۔"
الفاظ ابلتے لاوے کی مانند زمل کے کانوں میں اترے اور اس کے بے جان وجود نے کرنٹ سا کھایا۔ جھٹکے سے وہ تخت پر سے اٹھی۔

"نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔" وہ نجانے کس سے کہہ رہی تھی۔ نگار نے رخ اس کی طرف سے موڑ کر دوبارہ کھڑکی کے ساتھ جوڑ لیا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" نفی میں گردن ہلاتی وہ واپسی کے لیے الٹے قدم لینے لگی۔

"آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔۔۔ آپ جھوٹی ہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔" اور دیوانہ وار چلاتی ہوئی وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

(باقی آئندہ ماہ)

نیر فہیم خان

عید تمھارے سنگ پیا

تھکی سی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"فضول کیوں ہے۔ عشاء کی سہیلی۔ رابعہ کے کیسے نصیب کھلے تھے ارے ساٹھ لاکھ روپے کی گاڑی اور دو لاکھ روپے کا دلہن کا سامان ملا تھا۔ اور بائیک وہ تو

ٹوں۔ ٹوں کی مسلسل آواز پر اس نے جھنجلا کر فون پٹخا۔ "آئے ہائے کیا ہو گیا۔" اماں نے لپک کر 3310 کو یوں سینے سے لگایا جیسے ان کے جگر کا ٹکڑا ہو۔

"ٹوں ٹوں سن کر کان پک گئے ہیں اماں۔ گھنٹہ بھر سے بیٹھی ہوں۔ مگر کوئی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا۔ لگتا ہے سب سندھ گورنمنٹ کی طرح بھنگ پی کر سو رہے ہیں۔" وہ سخت غصے میں تھی۔

"میری بچی کوشش کرتی رہ۔ اللہ کامیاب کرے گا۔ اتنی آسانی سے نہیں ملتا نمبر محنت کرنی پڑتی ہے۔" اماں نے صبغہ کو پچکارا' وہ منہ بناتی پھر نمبر ملانے لگی۔

"اور تو..." وہ عشاء کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "تیرا کچھ کام ہوا۔" وہ چارلس بیبج کے ایجاد کردہ پہلے ماڈل مارک ون کے چھوٹے بھائی سے نبرد آزما تھی۔

"اماں ونڈو ہی نہیں کھل رہی۔" اس نے بے بسی سے اطلاع دی۔

"کیا؟" اماں کے سر سے گزر گیا۔

"اماں یہ نیلی پٹی پوری بھرے گی تو نمبر والی جگہ نظر آئے گی۔" اس نے اماں کو سمجھایا۔ اماں کی آنکھیں چیونٹی کی رفتار سے رینگتی ٹیب پر جم گئیں۔ "آئے ہائے یہ سستی ماری تو ہل ہی نہیں رہی۔" کافی دیر نظر جمانے سے ان کا دماغ ضرور ہل گیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" اصباح سینٹر سے لوٹی تو سب کو مصروف پایا۔

"کچھ نہیں آپی! بس ایسے ہی۔" عشاء اور صبغہ' دونوں اس کے غصے سے واقف تھیں۔ سو فوراً "اپنی مصروفیت پر پردہ ڈال دیا۔ مگر وہ سب سمجھ گئی۔ کان سے فون لگائے صبغہ' زمانہ قدیم کے کمپیوٹر پر نظر جمائے عشاء اور امید کے ساتھ دونوں کے چہرے تکتیں اماں۔

"اماں آپ پھر ان فضولیات میں پڑ گئیں۔ میں نے کتنی بار منع کیا ہے۔ یہ سب بے کار چیزیں ہیں۔ آپ کو میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔" وہ تھکی

یوں بانٹتے ہیں جیسے ریوڑیاں۔ لوگ پاگل ہیں جو ان کے پروگرام میں جانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ چلو سنی سنائی ہو تو مان لوں۔ یہ تو آنکھوں دیکھی ہے۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ کیا پتا اللہ تعالیٰ کرم کردے۔"

"اللہ تعالیٰ ہر لمحہ ہر لحظہ کرم ہی کرتا ہے۔ اس کے کرم کا دروازہ ہم پر کب بند ہوا ہے، آپ کیوں مایوس ہوتی ہیں۔"

"تو کیا کروں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ بقر عید کے بعد تیری شادی ہے، پلے کچھ نہیں ہے۔ خالی ہاتھ رخصت کردوں تو تیری زندگی خاک کردیں گے سسرال والے۔ باپ کون سی جائیدادیں چھوڑ کر مرا ہے، یہ ایک گھر ہے۔ جس کو آدھا کرائے پر دینے کے بعد ہم چاروں ماں بیٹی اس ڈربے سے کمرے میں گزارا کرتے ہیں۔ تمہاری تنخواہ اور کرایہ ملا کر کس مشکل سے مہینہ کھینچتی ہوں۔ ساری زندگی کی بچت صرف تجھ پر لٹادوں، تو بھی پورا نہ پڑے گا۔ پیچھے دو پہاڑ اور ہیں۔ ان کو کیسے دھکیلوں گی۔" اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عشاء، صبغہ دونوں نے اپنے کام چھوڑ کر اماں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اصباح نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ مہربان ہے، اس پر یقین رکھیے وہ ضرور کوئی راستہ نکالے گا۔" "مگر کب اور کیسے" ان کی آنکھوں میں سوال تھا۔ جس کا اصباح کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کمرے میں ایک اداس روح کو تڑپادینے والی خاموشی در آئی تھی۔

☆ ☆ ☆
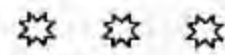
ٹی وی پر شو چل رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے پر جھپٹتے۔ دھکے دیتے لمبے ہاتھ کرکر کے بھکاریوں کی طرح انعامات لوٹنے میں مصروف تھے۔ ہوسٹ تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تو وہاں اودھم مچ جاتا، مرد و عورت، جوان و بوڑھے کی کوئی تفریق نہ تھی۔

بھوکے گدھوں کی طرح سب مردار پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ مال مفت کا تھا تو دل کو بے رحم ہونا تھا۔ یہ بے رحمی ہر سو عیاں تھی۔ مائیں چھوٹے بچوں کو آگے کرتیں۔ وہ آوازیں لگالگا کر گفٹ کی بھیک مانگتے۔ اور جس کو مل جاتا وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ مگر لالچ..... لالچ کی سیاہ پٹی چہرے مسخ کررہی تھی۔ اپنا گفٹ چھپا کر دوبارہ مانگنے والوں کی صف میں کھڑے ہوجاتے۔ گنگا بہہ رہی تھی۔ سب کو ہاتھ دھونے تھے کوئی کیوں بے ثمر رہتا۔

"عشاء مت لگایا کرو ایسے بے تکے اور گھٹیا پروگرام۔" اصباح نے ٹی وی پر نگاہیں جمائے ذوق و شوق سے دیکھتی عشاء کو منع کیا۔

"آپی دیکھیں تو..... اس عورت نے پانچ تولہ سونا جیتا ہے اور ایک آدمی کو دو بائیکس مل گئیں اور....." وہ جوش سے بتانے لگی تھی کہ اصباح نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی بند کردیا۔ ٹی وی بھی ابا کے دور کا تھا جو ریموٹ سے کم اور تھپڑوں سے زیادہ چلتا تھا۔

"آپی بند کیوں کردیا؟" وہ روہانسی ہوئی۔

"میں اپنے لوگوں کی اس سے زیادہ تذلیل نہیں دیکھ سکتی۔"

"تذلیل کی کیا بات ہے۔ فری میں اتنی چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہ تو خوش قسمت ہیں۔" صبغہ بولی۔

"خوش قسمت اور یہ لوگ..... ہونہہ" اس کے انداز میں تمسخر تھا۔ "یہ لوگ کٹھ پتلیاں ہیں۔ یا مداری کے بندر، جو ڈگڈگی پر رقص کرتے ہیں، مداری ڈگڈگی بجاکر جو حکم دیتا ہے بجالاتے ہیں، بوڑھے عمر رسیدہ اپنی عمر کا لحاظ نہ کرتے ہوئے الٹے سیدھے ہاتھ پیر مار کر رقص کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کچھ مل جائے۔ اپنے ہاتھوں چہروں کو کھانے پینے کی اشیاء سے لتھیڑ لیتے ہیں کہ ہم جیت جائیں اور کچھ مل جائے۔ مداری کا ہر حکم بجالاتے ہیں لڑکیاں اپنی نسوانیت کی پروا کیے بغیر حیا کے پردے چاک کرکے مداری کے حکم پر کبھی بل کھاتی ہیں کبھی گنگناتی ہیں، رقص کرتی ہیں۔ کہ کچھ

مل جائے۔ اور مل بھی جاتا ہے مگر اس وقت لمحہ بھر کے لیے بھی غور کیا کہ رب کریم کو کیسا جلال آرہا ہوگا۔ جو سب کچھ دینے پر قادر ہے اس کے بجائے لوگوں سے مدد بلکہ مدد بھی کیا بھیک مانگنا اسے کتنا ناراض کرتا ہوگا۔"
اصباح نے دونوں کو لتاڑا۔

"سارا پاکستان ہی یہ کام کررہا ہے۔" عشاء منمنائی۔

"سارا پاکستان نہیں چند لالچی، ندیدے اور بے ضمیر لوگ۔" اس نے ٹوک دیا۔ "یہ لوگ پاکستانی عوام کی ایک بھیانک تصویر پیش کررہے ہیں کہ ہم میں کوئی اخلاق نہیں، کوئی رواداری نہیں کوئی احترام نہیں۔ ہم مانگنے والی، چھین جھپٹ کرکھانے والی قوم ہیں میرا دل جلتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ باہر کے لوگ میرے وطن عزیز کے لوگوں کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔"

"اتنے بڑے بڑے انعام ملتے ہیں۔" صبغہ کی سوئی وہی اٹکی تھی۔

"ٹھیک کبھی تمہیں موقعہ ملے تو جانا اماں کو بھی لے جانا، جب وہاں بندروں کی طرح اچھلنے والا امداری اماں سے ٹھمکے لگوائے تو ضرور تالیاں بجانا، ہوسکتا ہے اماں کا ڈانس انہیں فرج دلوادے۔" دونوں نے تصور میں سادہ سی اماں کو ٹھمکے لگاتے دیکھا تو جھرجھری آگئی۔

"توبہ۔" دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"ہاں! توبہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اس کا کرم چاہو۔ سب مسائل حل ہوجائیں گے۔ میری شادی ہے، مجھے فیس کرنا ہوگا۔ جب مجھے فکر نہیں تو تم کیوں ہلکان ہوتی ہو۔ چلو شاباش پڑھائی کرو۔ اللہ تعالیٰ سب ٹھیک کردیں گے۔" اس کا ایمان مضبوط تھا۔ وہ دونوں سرہلاتی اٹھ گئیں۔ مگر عشاء حسرت بھری نظر ٹی وی پر ڈالنا نہ بھولی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میڈم یہ درخواست۔" اس نے مؤدب انداز میں درخواست بڑھائی۔

"کس چیز کی۔"

"میڈم تین ماہ بعد میری شادی ہے۔"

"اوہ اچھا۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی۔

"رمضان المبارک میں تو اسکول بند رہے گا۔ اس کے بعد مجھے نوکری چھوڑنا ہوگی۔ اور اسکول کے قوانین کے مطابق مجھے ایک ماہ پہلے اطلاع دینی تھی۔ اس لیے آپ کو بتارہی ہوں۔"

"بہت مبارک ہو اصباح! آپ بہت قابل ٹیچر ہیں۔ اسکول آپ کی خدمات یاد رکھے گا نکاح ایک مقدس فریضہ ہے اور جتنی جلدی ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت ڈالے۔ اور سارا کام خوش اسلوبی سے ہوجائے۔"

"تھینک یو میڈم! دعاؤں کی مجھے ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔" وہ مشکور سی اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

اسکول سے گھر آئی تو اماں کو الماری کھولے پایا۔ وہ اپنی تمام متاع حیات نکالے بیٹھی تھیں۔ اصباح کو دیکھ کر نگاہیں جھکالیں بولی نہیں، اصباح عبایا اتارے بنا ان کے پاس آگئی۔ "کیا بات ہے اماں؟"

"کچھ نہیں!" ان کا انداز مجرمانہ تھا۔

"بتائیں ناں کیا ہوا؟"

"صرف دو لاکھ اس طویل عرصے میں بچت کرنے پر بھی صرف دو لاکھ ہی جمع کرپائی میں اصباح۔"

"اماں بہت ہیں۔"

"کیسے بہت ہیں، ہزاروں کام ہیں۔ آج کل تو فرنیچر ہی لاکھ روپے سے کم نہیں آتا پھر کھانا۔ کپڑا، برتن ڈھیروں سامان کیسے پورا کروں گی۔"

"آپ نہیں اماں! اللہ پورا کرے گا۔ ہم انسان مٹی کی بنی مخلوق بھلا ہماری کیا اوقات ہم کچھ کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ کرے گا۔"

اس نے ہاتھ تھام کر تسلی دی۔ اماں نے بیٹی کا چہرہ دیکھا وہاں امید تھی۔ ایمان کی نرم روشنی تھی۔

"تو اتنی پرسکون کیسے رہ لیتی ہے اصباح! کسی بات کی فکر ہی نہیں ہوتی۔"

"آپ کی دعا سے۔" وہ مسکرائی بے حد خالص بے ریا' خوب صورت مسکراہٹ اس کے لبوں پر سجی تھی۔ "بس آپ دعا کرتی رہنا۔" وہ بونڈز اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اماں یہ کب لیے تھے۔"

"سال بھر ہوگیا' تیری خالہ نے کہا تھا پیسے رکھنے کے بجائے بونڈ لے لو' شاید بچیوں کے نصیب سے کھل ہی جائے۔" اصباح نے بونڈز پر تاریخ فروخت دیکھی حساب لگایا۔ سال سے اوپر ہوگیا تھا۔ ان کو گنا تو لگ بھگ لاکھ روپے کے تھے۔

"اماں آپ نے زکوٰۃ نکالی۔"

"زکوٰۃ!" ہمارے پاس باون تولہ چاندی یا سات تولے سونا ہے' جو زکوٰۃ نکالوں۔" اماں حیران ہوئیں۔

"باون تولہ چاندی کے برابر کی رقم تو ہے ناں آپ کے پاس سال بھر سے' اس میں سے نکالیں۔"

"پاگل ہوئی ہے' ہم زکوٰۃ والے کب سے بن گئے۔ یہ تو امیروں کے لیے حکم ہے۔"

"نہیں اماں! جس کے پاس نصاب کے برابر رقم ہو اور سال بھر تک پاس رہے' اس پر زکوٰۃ لازم ہے۔ الحمد اللہ ہم پر فرض ـــــ ہے۔ اور دو لاکھ ہمارے پاس ہیں لگ بھگ سال گزر گیا ہے۔ اب ہمیں اس کا چالیس واں حصہ نکالنا ہوگا۔ ایک لاکھ پر ڈھائی ہزار۔ اس طرح دو لاکھ پر پانچ ہزار روپے نکال دیں۔"

"میں روپیہ جوڑ رہی ہوں اور تم اور کم کردو۔" اماں ناراض ہوئیں۔

"اماں! اللہ کا مال ہے' اسی کا حکم ہے' میرا یا آپ کا کیا سوال؟ اور میں یہ کم نہیں کررہی ہوں۔ محفوظ کررہی ہوں۔ ناگہانی آفت سے' لوٹ مار اور چوری سے مال کا میل نکال کر پاک کررہی ہوں۔ برکت حاصل کرنے کے لیے یہ ایک لاکھ پچھانوے ہزار بھی ہمارے لیے کافی ہوں گے۔"

"تو نے ٹھیک سے پتا کرلیا ہے نا۔" اماں کو ابھی تک کھٹکا تھا۔

"جی اماں! مجھے پتا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا پھر بونڈز میں سے مت لینا۔ کھلے پیسوں میں سے نکال لے۔" اماں رضامند ہوگئی تھیں' اصباح پیسے گننے لگی۔

"اتنے سارے پیسے۔" عشاء نے خوشی سے چیخ ماری۔ "کس کے ہیں؟"

"پڑوسیوں کے۔"

"ہیں...؟" وہ ہونق ہوئی۔

"مطلب زکوٰۃ کے ہیں۔"

"کس کی زکوٰۃ" وہ مزید حیران ہوئی۔

"ہماری۔"

"اچھا' ہم زکوٰۃ دینے جتنے امیر ہیں۔" وہ اشتیاق سے بولی۔

"اللہ کے کرم سے۔"

"یہ آپ کس کو دیں گی۔"

"شرعی فقیر کو۔"

"شرعی فقیر! وہ تو میں بھی ہوں۔ میرے پاس نصاب نہیں' مجھے دے دیں۔"

"اچھا۔ زکوٰۃ کب فرض ہے یہ نہیں پتا۔ شرعی فقیر کا پتا ہے۔ ندیدی قوم۔" اصباح نے گھورا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس دی۔ "اماں میں یہ پیسے رضیہ بھابھی کو دے دیتی ہوں۔ بے چاری سارا سال لوگوں کے نئے کپڑے سیتی ہیں اور خود اور بچے پرانے کپڑے ہی پہن کر عید منا لیتے ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو بیٹا۔" اماں نے تائید کی۔ کمرے میں پرنور سی روشنی اتر آئی تھی جو کسی مجبور کی مدد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

✡ ✡ ✡

رمضان المبارک کی مبارک ساعتیں خطۂ ارض کو رونق بخش رہی تھیں۔ ہر ہر گھڑی میں مسلمانوں کے لیے رحمتیں' مسرتیں اور برکتیں تھیں۔ سحری کا مبارک وقت' مؤذن کی سحری کرنے کے لیے روزہ داروں کو جگانے کی ہدایات۔ نعتوں کی آوازیں' درود کی

خوب صورت آوازیں ماحول کو پرفسوں بنا دیتیں۔ اس نے پڑھا تھا کہ فجر سے پہلے کے وقت ماحول اتنا پرسکون اور ہوا خوشگوار کیوں ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے اس وقت فضا منافق کی سانسوں کی بو سے بوجھل نہیں ہوتی۔ اصباح خدا کے حضور سربسجود تھی کہ اس نے ایک بار پھر اپنی رحمت سے برکتوں اور مغفرتوں والا مہینہ عطا کیا تھا جس کا ایک ایک پل کسی قیمتی انمول ہیرے سے بھی زیادہ اہم تھا۔ ہیرے کا متبادل تو شاید مل جائے مگر ان برکت بھرے لمحات کا کوئی نعم البدل نہیں۔

سحری کے بعد نماز سے فارغ ہو کر عشا اور صبغہ تو سو گئیں' اماں اپنے وظائف میں مشغول ہو گئیں اور اصباح کے اسکول کی چھٹیاں تھیں سو وہ کچن صاف کر کے برتن دھو کر چھت پر آ گئی' جون کے مہینے میں بھی ایک خوشگوار سی صبح اپنا آغاز کر رہی تھی۔ یہ رمضان کے پہلے روزے کی رحمت تھی۔ عشرۂ رحمت شروع ہو چکا تھا۔ پرنور سی سفیدی' سیاہی کو شکست دینے کے بعد فاتحانہ انداز میں ہر سو پھیل رہی تھی۔ وہ تلاوت بمعہ ترجمہ اور تفسیر پڑھا کرتی تھی۔ اس کی حلاوت ہی الگ تھی۔ تلاوت سے فارغ ہو کر وہ دعا مانگنا نہ بھولی۔ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور زندگی کی جنگ کے لیے ہتھیار بے حد ضروری تھے۔ "اک روز ہو گا جانا سرکار کی گلی میں۔" موبائل فون سے نعت کی آواز ابھری۔ اس نے فون اٹھایا' لبوں پر دھیمی سی مسکان پھیل گئی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

"ماہم حسین سے بات ہو سکتی ہے۔" انداز شرارت سے پر تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی آواز نہیں پہچان پاتا۔

"جی نہیں' وہ گھر پر نہیں' آپ بعد میں فون کر لیجیے گا۔" اس نے بھی شوخی سے جواب دیا۔

"چلیں آپ ہی بات کر لیں' آپ کی آواز بھی بری نہیں۔"

"فلرٹ کر رہے ہیں۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

وہ ہنس پڑا۔

"بالکل نہیں۔ سیدھا سادا سا بندہ ہوں' اماں نے ایک نک چڑھی لڑکی کے پلو سے باندھ دیا سو بندھے ہیں فلرٹ کی سی آزادی ہمارا مقدر کہاں۔" سرد آہ بھری گئی۔

"بہت ارمان ہیں' پورے کر لیجیے کس نے روکا ہے۔"

"تم نے۔" اس کا لہجہ بھاری ہوا۔ "دل کہتا ہے کہ جب ایک اچھی لڑکی پوری ایمان داری کے ساتھ' حیا کی چادر کی حفاظت کرتے ہوئے میری زندگی کو گلزار کرنے آنے والی ہے تو نگاہیں آلودہ کیوں کروں۔" ماہم کے دل پر سکون اترا۔

"کیسے فون کیا آپ نے' رمضان کی مبارک باد تو کل چاند رات کو ہی دے دی تھی۔" اس نے سہولت سے موضوع بدلا۔ "ضروری بات ہے ماہم۔ خالہ جان کو کہنا کہ وہ میرے لیے عید پر عیدی کے لوازمات نہ بھجوائیں۔ پچھلے سال بھی انہوں نے بہت خرچا کیا تھا۔ منگنی کے بعد وہ پہلی عید تھی تو ان کے اصرار پر میں خاموش ہو گیا تھا مگر اب بالکل نہیں۔ تمہیں گفٹ دینا میرا فرض ہے مگر تم سے لینا۔۔۔ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میں صرف داماد ہوں۔ ان کا بیٹا نہیں۔"

"مگر فراز۔۔۔"

"امی مجھ سے متفق ہیں' ان کی فکر مت کرو اور ہاں صرف اپنی ضروری اشیا ساتھ لانا' جہیز کے نام پر مجھے کچھ نہیں چاہیے' یہ رسمی بات نہیں ہے میں حقیقتاً کہہ رہا ہوں۔ امی خود خالہ سے بات کرنے آئیں گی۔ وہ انہیں سمجھا دیں گی۔ تم ان کا ساتھ دینا۔ میں نہیں چاہتا کہ خالہ پر کسی قسم کا بھی بوجھ پڑے۔ میری بات سن رہی ہو نا۔"

"جی۔" وہ حقیقتاً اس کی دعاؤں کا ثمر تھا۔ خالص محبت اور بے ریا جذبوں کا مالک۔ اس کا ہم سفر بننے جا رہا تھا۔ "جی۔" وہ خود کو ایک ان دیکھے بوجھ سے آزاد محسوس کرنے لگی۔

"فراز۔"

"جی جناب۔۔۔"

"آپ بہت اچھے ہیں۔" اس کا لہجہ سادہ مگر انداز پر اثر تھا۔ فراز کے دل کو راحت سی ملی۔

"مجھی آپ کو مال و دولت کی خوبیوں کا اندازہ نہیں جب ملیں گی نا تو پتا چلے گا کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔"

وہ شریر ہوا۔ "خدا حافظ۔" اس نے فون رکھ دیا۔ اچھا ساتھی بھی اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔ ایک طمانیت بھرا احساس اس کے رگ و پے کو چھو گیا۔

☆ ☆ ☆

سادہ سی افطاری، نماز، اس کے بعد کھانے کی تیاری کچن میں شروع تھی۔ صبغہ نے نماز پڑھنے کے بعد ٹی وی لگالیا۔ شور و غل، میوزک' ایک کہرام سا مچا تھا۔ اصباح کچن سے نکلی تو دونوں بہنیں سر جوڑے شو دیکھ رہی تھیں۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

"آپی... دیکھنے دیں نا' ہر وقت ہٹلر کیوں بنی رہتی ہیں۔" عشا ناراض ہوئی۔ "اور کیا نماز پڑھ لی' اوابین پڑھ لی' عذاب قبر سے نجات کے لیے سورہ ملک اور فاقے اور غربت سے نجات کے لیے سورہ واقعہ کی تلاوت کرلی۔ اب تو روزہ ختم ہو گیا ہے۔" صبغہ کا انداز نروٹھا تھا۔

"روزہ ختم ہوا ہے عشرۂ رحمت نہیں' ہر لحہ رحمت برس رہی ہے اور تم گناہوں کے دلدل میں گرنے کی خواہش مند ہو۔ اگر کہیں سیل لگی ہو اور پچاس پرسنٹ آف ہو تو خواتین نوچنے کھسوٹنے لگ جاتی ہیں۔ یہاں ایک نیکی کا ثواب ستر گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے مگر نامہ اعمال کو بھاری کرنے کا کوئی ہوش نہیں۔ بلکہ گناہوں کا بوجھ بھی بڑھایا جا رہا ہے۔"

"تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔" صبغہ بولی۔

"یہ لحات زندگی کی طرح ہیں فوت ہو گئے تو کبھی واپس نہ آئیں گے جس طرح لوگ دنیا سے جا کر واپس نہیں آتے۔ بہتر یہی ہے کہ ان لحات سے استفادہ کرو۔" عشا نے منہ بنالیا۔ "رمضان رحمت کا مہینہ ہے۔ اس کی قدر کرو۔ ہماری تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ جو شخص رمضان کی قدر نہیں کرتا۔ وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ جب تک امت رمضان کی قدر و منزلت سمجھے گی۔ کبھی رسوا نہ ہو گی اور یہ ٹاک شو' ٹی وی پر انعامات کی بوچھاڑ کرنے والے شوز کیا رمضان کی قدر کرتے ہیں؟ یہ سب ہمیں رسوا کرنے کے لیے ہیں میں اگر پاور میں ہوتی تو ان تمام بے ہودہ شوز کو بالکل بند کرا دیتی جو رمضان کا تقدس برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ڈھیروں میک اپ تھوپ کر سر پہ دوپٹا رکھ کر پروگرام کرنے والی اینکرز۔ کیا یہ اس قابل ہیں کہ ہم ان سے اسلام سیکھیں۔ جو رمضان میں دوپٹا لیے اسلام کا درس دیں گی اور عید پر غیر مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ڈانس کرتی نظر آئیں گی استغفار۔ بیٹا۔ بات سمجھو اور اپنی سوچ بدلو۔ رمضان صرف روزہ تک محدود نہیں بلکہ اس کی ہر رات مقدس ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں آپی۔" عشا جلد سمجھ جاتی تھی۔ صبغہ کچھ جز بز ہوئی۔ اصباح نے پیار سے ماتھا چوما تو ڈھیلی پڑ گئی۔ "ٹھیک ہے' ہم رمضان تک نہیں دیکھیں گے' مگر بعد میں منع مت کیجیے گا۔"

"اوکے۔" وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ عشا نے سورہ نور کا ترجمہ نکال لیا اب دونوں آیتوں کے معنی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ سکون کا سانس لیتی کچن میں آگئی۔

☆ ☆ ☆

"اماں۔۔۔ آپی۔۔۔ صبغہ۔۔۔" خوشی سے بے حال لرزتی ہوئی آواز۔ "جلدی آئیں۔"

"الٰہی خیر!" اماں ہانپتی کانپتی آئیں۔ وہ مارے خوشی کے اماں سے لپٹ گئی۔

"ہمیں پاس مل گئے انعامی شو میں جانے کے۔"

"اللہ تیرا شکر۔" اماں یک دم نہال ہو گئیں۔ "میری بچی کی محنت رنگ لے آئی۔" انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ صبغہ بھی اس سے لپٹ گئی۔

"آپی! دیکھو دو پاس ملے ہیں۔" وہ خوشی سے پاس دکھانے لگی۔ اصباح ساکت رہ گئی اتنا سمجھانے کے باوجود وہ اپنی دھن میں لگی رہی تھیں۔

"اللہ تیرا کرم ہے۔ میں شکرانے کے دو نفل پڑھ لوں۔" اماں سے مسرت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ اصباح نے ایک نظر پاسز پر ڈالی اور دوسری ان کے مسرت سے دمکتے چہروں پر۔

"کیا ہوا، تجھے خوشی نہیں ہوئی۔" اماں نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں اماں! یہ بھلا کون سی خوشی کی بات ہے۔"

"آپی! آپ تو زمانے سے الگ ہو۔ لوگ پاگل ہوتے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ۔۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ "اور کیا آپ کو پتا ہے کتنی محنت کی ہے کتنا ٹائم ضائع ہوا ہے۔"

"اسی کا تو افسوس ہے۔" اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ "ٹی وی پر تماشا بننے کے لیے جانا کون سی خوشی کی بات ہے۔"

"تیرا تو دماغ خراب ہے۔ تیری شادی کی فکر مجھے رات کو سونے نہیں دیتی دعائیں مانگ کر یہ دن آیا ہے۔ اب اللہ نے ہماری مشکل آسان کرنے کا ذریعہ بنایا ہے تو تو بدشگونی کر رہی ہے۔" اماں کو غصہ آگیا۔

"مجھے اب کچھ نہیں کہنا میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا سوائے اس کے کہ ہم نہیں جائیں گے۔" اس نے عشا کے ہاتھ سے پاس لیے اور۔۔۔۔ ٹکڑے کر ڈالے۔ عشا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ صبغہ دیوانہ وار اس پر جھپٹی، ٹکڑے ہوتے پاسز کو بچانے اور اماں۔۔۔۔ انہوں نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ "یہ تو نے کیا کیا اصباح؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پرزوں کو دیکھ رہی تھیں جن کو عشا اور صبغہ جمع کر رہی تھیں۔ وہ خاموش رہی۔ اماں کچھ لمحے ساکت بیٹھی رہیں۔ پھر جھٹکے سے اٹھیں۔ اصباح نے ان کا ہاتھ تھامنا چاہا تو بری طرح جھٹک دیا۔ ایک ملامتی نگاہ اس پر ڈالی اور کمرے میں بند ہو گئیں۔ عشا کے چہرے پر غصہ تھا۔ اصباح کچھ دیر دیکھتی رہی پھر چھت پر آگئی۔

شام کا وقت تھا عصر کی نماز کے بعد سورج کی کرنیں چھوٹے چھوٹے مکانوں کی چھتوں پر سونا بکھیر رہی تھیں، ماحول میں ہلکی سی تپش تھی۔ اک محسوس کرنے والی خاموشی تھی۔ خواتین افطار کی تیاری میں مشغول تھیں۔ نوجوان روزہ کھلنے کے انتظار میں تھے۔ بچوں کی تو اپنی ہی دنیا تھی۔ وہ افطاری کے لوازمات کی تیاریوں کو دیکھ کر پرجوش تھے۔ ایک سناٹا سا ہر سو اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل بھی ویران سا تھا۔ اماں ناراض ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر وہ ٹہلتی رہی۔ پھر نیچے آگئی۔ افطاری تیار تھی اس نے دسترخوان لگایا عشا کی آنکھیں سرخ تھیں، شاید وہ روئی تھی۔ صبغہ کے چہرے پر شدید ناراضی تھی۔ وہ دسترخوان پر بیٹھ تو گئی تھی مگر بالکل خاموش تھی چھوٹے سے صحن میں افطاری کے وقت جو رحمتوں بھری رونق تھی وہ سوگ کی فضا میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اذان سے کچھ دیر پہلے اماں باہر آئیں۔ کھجور سے روزہ کھولا ایک گلاس شربت پیا اور اٹھ گئیں۔ صبغہ اور عشا نے بھی ان کی پیروی کی۔ اصباح تنہا بیٹھی رہ گئی۔

نماز مغرب کے بعد اماں دعا مانگتے ہوئے یوں تڑپ کر روئیں کہ کسی کے بھی آنسو نہ رک سکے۔ اصباح ان سے لپٹ گئی۔

"مجھے معاف کر دیں اماں۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے اصباح۔ بہت زیادہ۔" اماں رو رہی تھیں۔ "اللہ تجھے خوش رکھے۔" وہ ماں تھیں۔ دکھی تھیں مگر دعا دینا نہ بھولیں۔ وہ ان سے لپٹی روتی رہی۔

☼ ☼ ☼

دن خاموشی سے گزرتے رہے۔ "اصباح آج سینٹر مت جانا۔ تمہاری خالہ نے افطاری پر بلایا ہے۔ میں صبغہ کو چھوڑ جاتی ہوں اور عشا کو لے جاتی ہوں ہم روزہ وہیں کھولیں گے مگر جلد آنے کی کوشش کریں گے۔"

"آپی میں بھی جاؤں گی۔ اماں کو بس ہر جگہ عشا کو لے جانا ہوتا ہے۔" صبغہ ٹھنک کر بولی۔
"تو کیا یہ اکیلی گھر میں رہے گی۔" اماں نے گھورا۔
"لے جائیں اماں! مجھے کیا ہونا ہے' یہ اکیلی رہ کر میرا دماغ خراب کرتی رہے گی۔" صبغہ کھل اٹھی۔ اماں نے گھور کر اسے دیکھا اور ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ خوشی خوشی تیار ہونے چل دی۔

☼ ☼ ☼

وہ تراویح پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ اماں آگئیں۔ خوش باش اور کھلی کھلی۔ آتے ہی اصباح کا ماتھا چوم لیا اور ساتھ لگالیا۔ صبغہ اور عشا بھی دمک رہی تھیں۔ "آپی.....!" وہ بھی لپٹ گئیں۔ اصباح حیران پریشان سی دیکھنے لگی۔
"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟"
"آپی! فراز بھائی نے تو کمال کردیا۔ اتنا خوب صورت گھر بنایا ہے اور بیڈ روم اس کی تو بات ہی نرالی ہے۔ فرنیچر' پردے' ڈیکوریشن پیسز' سائیڈ ٹیبل کی لیمپ تو بے حد خوب صورت ہیں۔ اے سی بھی لگوالیا ہے۔ پورے گھر کو جگمگادیا ہے۔ بالکل نئی نویلی دلہن کی طرح۔" وہ بے حد خوش اور پرجوش تھیں۔ وہ بے یقینی سے اماں کی طرف دیکھنے لگی۔
"ہاں بیٹا! نجمہ نے تو میری ساری مشکل آسان کردی۔ کہنے کو تو خون کا رشتہ نہیں ہے لیکن احساس خون کے رشتوں جیسا ہے' مجھے سارا گھر دکھا کر کہنے لگی۔ "آپا بتایئے کسی چیز کی کمی تو نہیں؟" میں نے کہا ماشاء اللہ سب کچھ تو ہے۔ کہنے لگی ایک قیمتی شے نہیں ہے بس وہ آپ دے دیں۔" میں دہل گئی کہ الٰہی خیر! کیا فرمائش کرنے لگی۔ مجھے دیکھ کر ہنس کر کہنے لگی۔ "اس گھر میں صرف میری بیٹی کی ضرورت ہے وہ آپ کے پاس ہے۔ میری امانت' مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ فراز نے سب انتظام کرلیا ہے۔ آج افطار پر بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ سب تیاری ہے' بس اصباح بیٹی کے آنے سے میرا گھر روشن ہوجائے گا۔ کچھ بھی جہیز میں مت دیجیے گا جو جمع کیا ہے وہ دونوں بچیوں کو دے دیں۔" میں تو سن کر نہال ہوگئی۔ کیسی اچھی عادت پائی ہے نجمہ نے۔ اللہ دونوں جہانوں میں خوش رکھے۔ میں عشاء پڑھ کر نوافل ادا کرلوں' اللہ تعالیٰ نے میرے کندھے ہلکے کردیے۔" وہ کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
"آپی اتنے خوب صورت پردے' مانو جیسے ریشم..... اور کلر بھی بالکل ترکی کے ڈراموں کے جیسا۔" دونوں بہنیں گھیر کر بیٹھ گئیں۔ وہ خوب صورت مسکراہٹ لیے سنتی رہی۔

☼ ☼ ☼

گھر میں خوش گوار سی تبدیلی آگئی تھی' اماں کی ناراضی ختم ہوگئی تھی جو پاسز پھاڑنے سے ہوئی تھی' وہ لالچی نہیں تھیں مگر ضرورت کی شدت محسوس کرکے شارٹ کٹ چاہتی تھیں۔ عید کے بعد شادی تھی۔ عشا اور صبغہ پرجوش تھیں۔ مسرت بھرا منظر ہر سو چھایا رہتا۔ کبھی اماں مہمانوں کی لسٹ بناتیں تو کبھی گھر کے سودا سلف کی اور کبھی رنگ و روغن کے حساب کتاب میں الجھتیں' جہیز والی ڈائری تو انہوں نے واپس رکھ دی تھی۔ اصباح کے کپڑے کچھ زیورات اور چند ضروری اشیا سے ایک سوٹ کیس تیار تھا۔ اماں نے کچھ چادریں اور برتن وغیرہ رکھنے چاہے مگر نجمہ خالہ نے اپنی نگرانی میں سامان پیک کرایا۔ اماں ان کی محبت سے مجبور ہوگئیں۔ کہا بھی کہ محلے والوں کو کیا کہوں گی۔ انہوں نے اس کا بھی حل نکال لیا۔ "کہہ دیجیے گا نقد رقم دی ہے اور کتنی' یہ بتانے کی ضرورت نہیں' ہزار روپے بھی رقم ہی ہوتی ہے۔" اماں شانت تھیں۔ اس دن بھی وہ کھانے کا حساب کتاب لگارہی تھیں کہ کتنے آدمی ہوں گے' کیا کھانا بنے گا' ہال کتنے کا بک ہوگا؟ کہ ان کے چہیتے 3310 موبائل کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے مصروف سے انداز میں فون اٹھایا۔
"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام میں اصباح کی پرنسپل الماس بات کررہی ہوں۔ اصباح کی والدہ سے بات کرنی ہے۔"

"جی بول رہی ہوں۔" وہ کچھ حیران ہوئیں۔ اصباح نے نوکری رمضان سے پہلے ہی چھوڑ دی تھی بس سینٹر جاتی تھی۔ اب کیا ہوا؟

"بات دراصل یہ ہے کہ اصباح ہماری بہت لائق اور محنتی ساتھی رہی ہیں' انہوں نے ہمارے ادارے کو بہت محنت اور جانفشانی سے کام کر کے فائدہ پہنچایا۔ جیسا کہ آپ جانتی ہوں گی ہمارا اسکول ایک ویلفیئر ٹرسٹ اور مخصوص برادری کے لوگوں کے ڈونیشن سے کام کرتا ہے۔ ہمارے ٹرسٹ میں اسکول' اسپتال اور کمیونٹی سینٹر ہے' میں نے اصباح کی کارکردگی کی رپورٹ بورڈ میں بھجوادی تھی۔ انہوں نے اصباح کے لیے شادی کے گفٹس کے طور پر اپنے شادی ہال کی اجازت دی ہے اور 500 افراد کا کھانا بھی ٹرسٹ کی طرف سے ہوگا۔"

"جی..." اماں ہونق سی رہ گئیں۔ "میں سمجھی نہیں۔"

"دیکھیں! جس طرح بعض اداروں میں میڈیکل فری ہوتا ہے اسی طرح ہم نے رول بنایا ہے کہ ہم اپنی ٹیچرز کی شادی کے سلسلے میں مدد کریں گے' یہ بہت بڑا فریضہ ہے' بے حد ذمہ داری کا کام ہے اکثر والدین اس فریضے کی انجام دہی کے لیے پریشان رہتے ہیں۔ اسی لیے ہم ان کے لیے کچھ آسانی پیدا کرتے ہیں اور خاص طور پر ان بچیوں کے لیے جن کے والد حیات نہ ہوں۔ خاموشی اور عزت نفس کو ٹھیس پہنچائے بنا مدد کی جائے' یہ ہمارا مقصد ہے۔ آپ تاریخ طے کر کے بتادیں تاکہ ہم اپنے انتظامات کرلیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔"

اماں ساکت بیٹھی تھیں۔ بنا ہاتھ پھیلائے' اپنا تماشا لگائے لوگوں کی نگاہوں میں بے توقیر ہوئے بنا سارے معاملے سلجھ گئے تھے۔ یہ غیبی امداد ہی تھی۔ اللہ کی طرف سے انسانی ہمدردی کے روپ میں بننے والا سبب۔ ان کے کانوں میں اصباح کی آواز گونجی۔ "اللہ سب معاملات ٹھیک کردے گا اماں۔" اس کا یقین رنگ لے آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

عید کی صبح بے حد پررونق تھی۔ نماز پڑھ کر فراز سیدھا سلام کرنے آیا تھا۔ اماں نے پیشانی چومی۔ عشاء شیر خرما لے آئی۔ اصباح ناشتے کی تیاریوں میں لگی تھی۔ آلو در ساگ' پھولوں کا سالن' سوجی کا حلوہ اور گرم گرم پوریاں' مہندی سے رچے ہاتھ اور کلائیوں میں بجی چوڑیاں' خوشی کے لحاظ سے ہم آہنگ تھے۔

فراز کی نگاہیں اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ "اب تو شادی کے بعد ہی دیکھیے گا فراز بھائی۔" عشاء نے بھانپ لیا۔

"تم مدد نہیں کروگی' صرف ایک نظر۔" وہ سراپا التجا بنا۔

"پہلے عیدی۔" اس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ "نہ دی۔" اس نے جواباً گھورا۔ وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑی۔

"اصباح! ناشتا لگادو فراز کے لیے۔" اماں نے آواز دی تو اس کے دل کی کلی کھل گئی۔ چھوٹے سے گھر میں چھپنا ویسے بھی محال تھا۔ اس کا آسمانی آنچل لہراتا دکھائی دے رہا تھا۔ دستر خوان بچھا کر وہ ناشتا لگانے لگی' صحن میں بیٹھے فراز کا دل اک نظر کا طالب تھا۔ وہ جانتی تھی۔

"آؤ بیٹا۔" اماں نے کمرے میں بلایا۔ اماں اندر گئیں' وہ متلاشی نگاہوں سے کچن کو دیکھنے لگا۔ اصباح دوپٹا سر پر ڈالے سامنے آگئی۔ اس لمحے دونوں کی عید ہوگئی تھی۔ فراز اس کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر پرسکون ہوگیا۔

"آہم صبغہ — کھنکھاری تو وہ مسکراتا' اندر چلا گیا۔ وہ بھی کچن میں پلٹ گئی۔

دلوں میں یقین اور محبت کا احساس ہو تو سب کچھ ٹھیک ہوجاتا ہے۔ رب ذوالجلال کی نعمت عید اس کے چھوٹے سے آنگن میں اپنے تمام رنگ لیے اتری تھی۔ خوشی' مسرت' اعتماد اور پیار کے رنگ۔

نایاب جیلانی

آزمائش محبت

ڈھولک کی تھاپ دور تک سنائی دیتی تھی۔ رات کی تاریکی میں ڈھولک کی تھاپ مجیروں سے مشابہ تھی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے چاندی کے تھال میں سکے گر رہے ہوں۔ ایسا شور جو سماعتوں کو بھلا لگنے کے بجائے گراں گزر رہا تھا۔

وہ کانوں پہ ہاتھ رکھتی ریلنگ پہ جھکی تو نیچے دور تک تاریکی دکھائی دی تھی۔ آسمان بھی روشنی سے خالی تھا۔ جانے ستارے کہاں تھے؟ اور اکلوتا چاند؟ اسے پورا آسمان خالی دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے اس کے بائیں پہلو میں خاموش دل۔ جو دھڑک تو رہا تھا... لیکن سکون سے خالی تھا اور شاید امنگوں سے بھی۔

اس نے اپنی گوری کلائیوں میں سجی چوڑیوں کو دیکھا۔ ہری اور لال شیشے کی چوڑیاں... جن میں کھنک نہیں تھی اور اپنے وجود پہ لپٹے پیلے لباس کو دیکھا۔ اس کا دل، اس کا وجود... سب کچھ خالی پن میں کھویا ہوا تھا۔

کچھ دیر پہلے وہ اس کے پاس آئی تھیں۔ اسے ڈھونڈتی ہوئی۔ ان کے چہرے پہ تفکرات تھے۔ پریشانی تھی۔ وہ نکاح سے پہلے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ وہ دل میں ہزاروں خدشے لیے اسے ڈھونڈتی سب سے

مکمل ناول

اور بی چھت پہ۔ آئیں تو وہ انہیں سرنیہوڑائے ریلنگ کے پاس لٹی پٹی سی تیلیتھی دکھائی دے گئی تھی۔ ان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

وہ اتنی آزردہ، رنجیدہ اور غم زدہ کیوں تھی۔ سب کچھ تو حسب منشا تھا، پھر بھی؟

اور جب انہوں نے یہی بے ضرر سا سوال اس کے سامنے رکھا تو وہ اندر تک کاٹ دینے والی نگاہ سے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ اس نگاہ میں کیا کچھ نہیں تھا۔ ان سے سرہی نہ اٹھایا گیا اور جب انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نیچے لے جانا چاہا تو اس کے خاموش لبوں نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی تھی۔ اس کی سرخ انگارہ آنکھوں سے قطرہ قطرہ سیل رواں تھا۔ ان کے اندر جیسے خزاں اترنے لگی۔

ان لفظوں میں کیا تھا؟ آخر کیا تھا؟ انہوں نے اپنا

دل بمشکل سنبھالا اور ریلنگ کا سہارا لیا۔ وہ انہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کررہی تھی۔ وہ ان کے سامنے انکار بھی نہیں کررہی تھی۔ وہ تو صرف انہیں "احساس" دلا رہی تھی..... وہ احساس جو ان کے اندر سے کہیں کھو گیا تھا۔ ان کی بیٹی اس "احساس" کا انہیں احساس دلا رہی تھی اور اس کے لفظ؟ ان کا رواں رواں کان بن گیا تھا۔

"اگر آپ کو ان سے محبت ہے تو؟ اگر آپ کو اپنی بیٹی سے محبت ہے تو..... اگر محبت ہے تو؟ یوں مت کریں، ایسا مت کریں۔"

چار لفظوں کے اس چابک کو اگر جملہ کہتے تھے تو یہ جملہ بڑا سخت قسم کا جملہ تھا۔ ان کی ہستی کو ہلا دینے والا۔ ان کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لینے والا..... وہ جب الٹے قدموں جارہی تھیں تو ان کے قدموں تلے انگارے بچھے تھے اور زمین پہ جیسے بھونچال تھا۔ ان کا ایک قدم کہیں جاتا اور دوسرا کہیں.....

☼ ☼ ☼

مشک فام سی رات میں گلابوں اور گیندے کی کلیوں

کی باس تھی۔ کچھ نمکین سا، ذائقہ بھی..... ہاں آنسوؤں کی نمی کا احساس یا پھر اسے ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گیا۔ اور پردے بھی برابر کر لیے تھے۔ اس نے قد آدم آئینے کی طرف توجہ کرلی تھی۔ آئینے کے اندر اس کا اپنا عکس تھا۔ ایک مکمل اور بھرپور سراپا..... وہ خود کو دیکھتا چونک گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت خالی اور ادھورا سا لگا۔

کچھ دیر بعد نکاح کی رسم تھی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنے لگا۔ سب کچھ حسب منشا، حسب رضا تھا، پھر بھی یہ ادھورا پن اور کاٹ کھاتی تنہائی؟ یہ اس کے اندر کی کیفیات تھیں، ورنہ باہر تو ایک ہنگامہ تھا اور اس "ہنگامے" کے پیچھے ایک اور بڑا ہنگامہ.....

اور ابھی وہ اس کے پاس آئی تھیں۔ اسے آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اور اسے دیکھ کر ان

کا "جی" نہیں بھر رہا تھا۔ وہ کتنا پیارا تھا، کتنا بھرپور تھا۔ کسی بھی لڑکی کا خواب..... انہیں اس سے بہت محبت تھی۔ بے انتہا، بس اسے جنم نہیں دیا تھا۔ ممتا تو سارے زمانے کی نچھاور کی تھی اور آج وہ، جو ان کی بیٹی تھی۔ اسی محبت کا حساب مانگنے کھڑی تھی۔

وہ شاہ زیب کے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں۔ مشکل سے ہی سہی۔ دل کو مار کر ہی سہی۔ جذبوں کو مار کر ہی سہی۔

"زیب! وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کہتی ہے۔ اگر مجھے تم سے محبت ہے تو میں ایسا مت کروں۔ اس شادی کو روک دوں..... اور میں نے خود کو ہزار مرتبہ ٹٹول کر سوچا اور فیصلہ کیا ہے کہ میں اس کی بات مان لوں..... کیونکہ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ اس لیے میں یہ نہیں کروں گی۔"

وہ اسے پتھر بنا کر الٹے قدموں واپس جارہی تھیں..... یوں کہ ان کے قدم لرزیدہ تھے۔ شکستہ تھے اور شاہ زیب بھی جیسے پتھر میں ڈھل کر ان کے لفظوں کے اثر میں کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور آج دوپہر کملائی ہوئی تھی۔ خشک، بے رنگ اور ویران سی.....

اس نے ایک تکان بھری نگاہ دور تک پھیلی تارکول ڈالی تھی۔ ابھی تک اس کی مطلوبہ وین آنے کے کوئی آثار نہیں لگتے تھے۔ جانے آج وین والا کہاں مر گیا تھا؟

اپنی فائلز، فولڈر، اسکیچز اور پورٹ فولیو کے بنڈل بینچ پہ رکھ کر اس نے موبائل نکالا' تاکہ ڈیڈی کو دیر ہوجانے کی صورت میں اطلاع کرسکے۔ ورنہ ڈیڈی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔

ثانی نے پسینے سے تربتر اپنا لال ٹماٹر چہرہ ٹشو سے رگڑا اور موبائل پرس سے نکال کر ڈیڈی کا نمبر ڈائل کرنے کے لیے بٹن پریس کیا تو موبائل کی بیٹری ہی ڈیڈ تھی۔ ایک نئی مصیبت..... اب کرے تو کیا کرے؟

وہ شدید ڈپریس ہورہی تھی۔ ان حالات میں اکثر اسے اپنے کسی بھائی کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس معاملے میں چاچو کتنے خوش نصیب تھے۔ چاچو کے چار چار بیٹے تھے۔ چھوٹے بڑے سب فرض شناس..... اپنی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنے والے اور ایک ثانی تھی۔ تنہا، اکیلی اور سے ڈھیروں ذمہ داریاں تھیں۔ جب سے ڈیڈی شوگر اور دل کے عارضے میں مبتلا ہوئے تھے۔ ثانی کا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ باہر کی ذمہ داریوں کو بھی نپٹائیں۔ وہ حتی المقدور کوشش کرتی تھی باہر کے کام بھی خود سرانجام دے آیا کرے۔ اور اس وقت جانے کیسے کیسے احساس حملہ آور ہورہے تھے' جنہیں ذہن سے جھٹکتے ہوئے وہ چاچے فوجی کی وین کا مزید انتظار کرنے کے بجائے تمام ہمتیں مجتمع کرتی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔ اسے اب پیدل ہی گھر جانا تھا اور جب وہ ساڑھے تین میل پیدل چلنے کے بعد ہانپنے لگی اور سر چکرانے لگا تو ایسے ہی سڑک پہ رواں دواں گاڑیوں کے اژدھام میں اسے ایک شناسا چہرہ دکھائی دیا تھا۔ ثانی کو پہلے پہل تو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔ کیونکہ وہ عموماً" اس وقت اپنے دفتر میں ہوتا تھا۔

اس نے لال ہوتی آنکھوں کو مسل مسل کر دیکھا۔ وہ ہو بہو وہی تھا۔ سفید براق ایوی ایشن کی یونی فارم شرٹ اوپر ایوی ایشن کے بیج..... بلیک پینٹ اور اس کا انتہائی عالی شان سراپا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دھوپ نے دھنک اوڑھ لی ہو۔ وہ ایسا ہی تو تھا۔ لاکھوں میں ممتاز نظر آنے والا۔ دل نشین، وجیہہ..... روح اور دل میں اتر جانے والا۔

اور اس وقت اس بیکراں ہجوم میں وہ اپنی ایک الگ "شان" کے ساتھ بائیک پہ موجود تھا اور کئی نگاہوں کا اکلوتا مرکز بھی..... ثانی نے رشک کے عالم میں کئی لوگوں کو مڑ مڑ کر اسے دیکھتے دیکھا تھا۔

اس تیز دھوپ میں اتنا خوب صورت چہرہ اچانک دکھائی دیا تو ایسے لگ رہا تھا جیسے دن بھر کی تمام تکان کا خاتمہ ہوگیا تھا۔

اور ایسے ہی نگاہ..... ہاں اس وجیہہ چہرے پہ جمی

ہوئی نگاہ ذرا دیر کو پیچھے کی طرف ہٹی تو ثانی کی آنکھوں میں اذیت پھیلتی چلی گئی تھی۔

وہ کالج یونی فارم میں... اس کے پیچھے نزاکت سے بیٹھی ہوئی تھی۔ گود میں فائل رکھے۔ یقیناً "پیپر دے کر آرہی تھی اور وہ اسے امتحانی مرکز سے واپس گھر چھوڑنے جارہا تھا۔ واہ... مولا! کیسے کیسے نصیب پائے ہیں لوگوں نے... اس کے اندر نہ چاہتے ہوئے بھی ایک حسد کی چنگاری بھڑکی تھی۔ جانے کیوں ثانی کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو بھر گئے تھے۔ جسے جھپک جھپک کر اندر کرتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ لمحوں میں اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔

چونکہ اشارہ کھل گیا تھا اور ٹریفک کے بے ہنگم شور' ہارن کی آوازوں پہ ایک بھونچال آگیا تھا۔ وہ دل فریب چہرہ نگاہوں سے اوجھل ہوا تو ذرا دیر پہلے پھیلی ہوئی دھنک بھی جانے کس طرف ڈھلک گئی تھی۔ اس وقت وہی بے زار کن ماحول اور کملائی ہوئی دوپہر کی بے زاریت ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ثانی نے ایک دکھ بھرا سانس فضا کے سپرد کیا اور سر جھکائے چلنے لگی۔ اس حال میں کہ شہر دل گھٹی گھٹی سسکیوں سے گونج رہا تھا اور اندر ایک حشر برپا تھا۔ یہ اس کی کج ادائی تھی' بے وفائی تھی یا بے اعتنائی تھی۔ جو ازل سے وہ سہتی آرہی تھی۔ اپنے دل پہ خاموشی سے' بڑی ہی خاموشی سے جھیلتی آرہی تھی۔ کیونکہ یہ اس کے اندر ازل سے پلتے عشق کا کمال تھا اور اس کے عشق سے قطع نظر وہ اس سے محبت کا کہیں بھی دعوے دار نہ تھا۔

ثانی کو اپنے اس یک طرفہ عشق پہ بڑا ہی ترس آیا۔

یہ عشق باکمال ایسا ہی تھا جس پہ ترس کھایا جاتا۔

☼ ☼ ☼
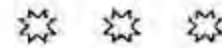
گھر پہنچتے پہنچتے دھوپ ڈھل ہی گئی تھی۔

وہ پسینے سے نچڑتے لال چہرے کے ساتھ جیسے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تو لمحہ بھر کے لیے اس کا دل سکڑ سا گیا تھا۔ تاحد نگاہ گلی خالی تھی۔ بالکل سنسان اور ویران... کہیں دور نزدیک کیپٹن خضر حیات کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی نہ دیتی تھی۔ جس کا مطلب تھا۔ ڈیڈی اس کے انتظار میں گلی کے نکڑ پہ کہیں نہیں کھڑے تھے۔ کیا وہ اس کا انتظار کرتے کرتے تھک کر گھر چلے گئے تھے؟ یا آج وہ آئے ہی نہیں تھے؟ بھلا یہ ممکن تھا کیا۔

پھر اچانک ہی اسے خیال آیا۔ "ڈیڈی کی طبیعت نہ خراب ہو؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کے انتہائی سفید دودھ سے گلابی ملائم چہرے پہ وحشت پھیلی تھی۔

چند فرلانگ کی گلی پل صراط کی مانند تھی۔ جسے اس نے کس مشقت سے طے کیا تھا۔ اس کا دل جانتا تھا۔ سامنے ہی اس کا گھر تھا۔ اپنا گھر' آٹھ دس مرلے پہ مشتمل۔ ایک زمانے میں خوب صورت سا بڑی بڑی کھڑکیوں والا بنگلہ تھا۔ جس کے چاروں اور برآمدے تھے۔

اس کے ڈیڈی کیپٹن ریٹائرڈ خضر حیات نے بڑی محبت اور چاہ سے بنوایا تھا۔ بعد ازاں امی کی وفات کے بعد ان کی دلچسپی گھر سے کم ہوتے ہوتے فقط ثانی تک محدود رہ گئی تھی۔ اب یہ سبز بیلوں والا بنگلہ اتنا قابل توجہ نہیں رہا تھا۔ عرصہ ہوا پینٹ کی قبا پھٹ گئی تھی۔ بارشوں اور طوفانوں کے نشان جگہ جگہ انمٹ تھے۔ برآمدے اور صحن کی چپس کا حال بھی ماٹھا تھا۔ گیٹ کے سامنے چھوٹی سی راہ داری تھی اور ایک طرف مختصر سا صحن... آگے برآمدہ تھا اور لائن میں تین کمرے۔ برآمدے میں ایک طرف باتھ روم تھا تو دوسری طرف باورچی خانہ... تینوں کمروں کے آگے جالی دار دروازے لگے تھے۔ جو اس وقت بند تھے۔ برآمدے کے بالکل ساتھ سیڑھیاں تھیں جو اوپر کی طرف دوسری منزل پہ جاتی تھیں۔ اوپر چاچو کی فیملی آباد تھی۔

برآمدے میں کین کی کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈیڈی یہیں بیٹھ کے ناشتا کرتے تھے۔ لنچ البتہ کمرے میں ہوتا تھا۔ پھر شام کی چائے اور ڈنر یا تو برآمدے میں یا صحن میں... برسوں سے یہی معمول چلتا آرہا تھا۔ برآمدے میں کین کی کرسی پہ بیٹھنا ڈیڈی کو بہت پسند تھا۔ وہ

یہاں بیٹھ کر اخبار پڑھتے تھے۔ یا ثانی سے باتیں کرتے تھے۔ یا پھر اوپر والوں کو جلی کٹی سناتے۔ اپنے دل کی بھڑاس نکالتے تھے۔

اس نے تیزی سے بیل دی۔ ایک دفعہ' دو دفعہ' تین دفعہ۔۔۔

اوپر والوں نے کبھی گیٹ کھولنے کا فریضہ سرانجام نہیں دیا تھا۔ اوپر سے کھڑکی کھول کر جھانک لیتے۔ ان کا کوئی مہمان ہوتا یا یہ خود۔۔۔ اوپر سے کوئی بھی نیچے آنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔

معاً" دروازہ کھل ہی گیا۔ آخر کسی کو ترس آ ہی گیا تھا۔ دروازہ کھولنے والا جس تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا آیا تھا' ایسے ہی واپس چلا گیا اور ثانی بس اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس کے لب کھلے اور پھر بند ہو گئے تھے۔ منہ میں آیا سلام وہیں کہیں اندر ہی گھٹ گیا تھا۔ پھر اس نے جالی دار کچن کے دروازے میں سے اندر جھانکا تھا۔ کچن بھاں بھاں کر رہا تھا۔ وہیں سلیب پہ اسے مٹھائی کا ڈبا دکھائی دیا۔ یہ ڈبا کہاں سے آیا تھا؟ وہ سوچتی ہوئی ڈیڈی۔۔۔ ڈیڈی پکارتی اندر آئی تو ڈیڈی اپنے کمرے میں بستر پہ بیٹھے دکھائی دیے تھے۔ گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے یعنی وہ اپنے دھیان میں اتنے گم تھے کہ انہیں گھنٹیوں کی آواز نے بھی نہیں چونکایا تھا؟ ثانی کا دل بری طرح سے ہراساں ہوا۔

وہ تیزی سے ان کے قریب آ گئی تھی۔ پھر اس نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف جھانکا۔ وہ کچھ کاغذات نکال کر بیٹھے تھے۔ اسے دیکھ کر بری طرح سے چونک گئے۔

"اتنی دیر لگا دی؟ وقت دیکھا ہے تم نے؟ میری جان نکال کے رکھ دی۔" وہ غصے میں اچانک بولتے چلے گئے تھے اور ساتھ ساتھ کاغذات بھی سمیٹ رہے تھے۔ بڑے غیر محسوس طریقے سے پھر بھی ثانی جان ہی گئی تھی۔ یہ پرانی فائل کیا تھی اور اس کے اندر کون سے کاغذ موجود تھے۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"تب ہی آپ میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ اتنی دھوپ میں' آنکھیں لگا کر۔۔۔" وہ خفگی سے جوابی کارروائی کرتے ہوئے تھی۔ ڈیڈی نے آنکھیں میچ کر اسے دیکھا اور اس کے سرخ بھبھوکا چہرے کو بھی۔۔۔

"اٹھارہ چکر لگا کے آیا تھا۔ اب تو ٹانگوں میں دم نہیں رہا۔ اس الو کو فون کرتا رہا۔ اس کی وین کا ٹائر بلاسٹ ہو گیا تھا اور تمہارا نمبر بند۔۔۔ پریشانی نے بلڈ پریشر ہائی کر دیا تھا۔" وہ بھی ناراضی سے بتا رہے تھے اور اس ناراضی کی تان کہاں آ کر ٹوٹ جاتی تھی؟ ثانی نے گہرا سانس بھرا۔

"میں کہتا ہوں۔ بھاڑ میں جھونکو اس آرٹ اکیڈمی کو۔۔۔ میں تمہاری نوکری کے پہلے بھی حق میں نہیں تھا۔ اب بس بہت ہو گیا۔" انہوں نے دوٹوک کہا تھا۔

ثانی نے خاموشی ہی غنیمت جانی تھی۔ اب کیا تکرار کرتی؟ وہ جانتے تو تھے۔ ان کی پنشن میں گھر چلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اوپر سے ان کی دوائیوں کا خرچا' مہمان داری؟ وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

"آپ نے کچھ کھایا ہے؟" وہ اپنی چیزیں اٹھا کر ایک طرف رکھتی اب بی پی چیک کرنے کا آلہ لے آئی تھی۔ پہلے اس نے ان کا بی پی چیک کرنا تھا اور پھر شوگر۔۔۔ اس کے بعد وہ ان کے لیے کھانا لگاتی۔ پھر دوا کھلاتی اور کہیں بعد میں اسے اپنا خیال آتا تھا۔ یہ ہی تو اس کی محبت تھی۔۔۔ بے انتہا' بے اندازہ۔۔۔ وہ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگے تھے' لیکن زبان پہ گویا انگارے دھرے تھے۔

"ہاں کھایا ہے۔ بھوسا' غصہ' تلخیاں۔۔۔" وہ منہ بنا کر بولے تھے۔ ان کا موڈ آف لگتا تھا۔ جانے کیوں؟ اس آف موڈ میں انہوں نے بلڈ پریشر چیک کروایا تھا۔ خدا کا شکر تھا۔ بی پی اب نارمل ہی تھا۔

"فریج میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ ان تمام آئٹمز کے علاوہ۔۔۔" ثانی تحمل سے گویا ہوئی تھی۔

"میں نہیں کھاتا۔۔۔ وہ فریج کی سڑی ہوئی چیزیں۔۔۔" انہوں نے بی پی آپریٹس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

"اب میں شوگر چیک نہیں کرواؤں گا۔" ساتھ وارننگ بھی دی تھی۔ وہ انہیں خواہ مخواہ گھورتی رہی۔

"وہ جو کچن میں مٹھائی پڑی ہے' اس پہ ہاتھ صاف کرلیا ہوگا۔ اب شوگر چیک کیوں کروائیں گے۔" اس کا انداز خفگی سے بھرپور تھا۔ انہوں نے نگاہیں چرائیں۔

"اس مٹھائی کو واپس بھجوا دو۔" انہوں نے کچھ سوچ کر فرمان جاری کیا تھا۔ وہ کچھ بھونچکی ہوئی۔

"کہاں؟ مطلب کہاں سے آئی ہے؟" اس کے انداز میں کچھ تجسس تھا۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے تھے' پھر جیسے پھٹ پڑے۔

"اوپر سے آئی ہے۔ ویسے نہ کوئی تعلق داری' نہ میل' نہ ملاقات.... مہینوں شکل نہیں دکھائی ایک دوسرے کو.... اور مٹھائیوں کے لین دین چلتے ہیں۔ ایسی مٹھائی میں ان کے منہ پہ دے ماروں۔"

"کسی کے گھر سے آئی چیز واپس نہیں کرتے۔" وہ رسان سے بولی تھی۔ انہوں نے ناک چڑھالی۔

"اوپر سے آئے تو کردیتے ہیں۔" ڈیڈی اپنی بات پہ قائم تھے۔ ثانی نے گہرا سانس اندر کی طرف کھینچا تھا۔ پھر ملائمت سے بولی۔

"پھر واپس کی کیوں نہیں؟ رکھ کیوں لی ہے؟" اس کے سوال پہ لمحہ بھر کے لیے وہ جز بز ہوئے تھے' پھر چڑ کر گویا ہوئے۔

"وہ مہارانی خود باورچی خانے میں رکھ آئی۔" اپنے تئیں بڑا اچھا جواز پیش کیا تھا جو ثانی کو بھایا نہیں۔

"تو آپ کہتے ہمیں نہیں چاہیے۔ جب ملنا ملانا نہیں۔ اوپر نیچے آنا جانا نہیں۔ تو اس طرح کے لین دین کی کیا ضرورت ہے؟" ثانی سنجیدہ تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔ پھر گہرا سانس بھر کے بولے تھے۔

"زیب کے نام کی مٹھائی تھی۔ کیسے واپس لوٹا دیتا۔" ان کے انداز میں گہری بے بسی تھی۔ ثانی نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی تھی۔ پھر ایک دم چونک گئی تھی۔

"کس خوشی میں؟ کس سلسلے میں؟ کہیں آپ کے بھتیجے نے چھپ چھپا کر کورٹ میرج تو نہیں کرلی؟" اس کے انداز میں واضح شرارت تھی۔ ڈیڈی بھی اس کی شرارت کو سمجھ گئے تھے۔

"اس کی اتنی جرات نہیں۔ ماں سے پوچھے بغیر تو سانس نہیں لیتا۔ کورٹ میرج تو بہت دور کی بات ہے۔" ڈیڈی کا انداز جلا کٹا تھا۔

"میں تو مٹھائی کبھی نہ لیتا۔ خود کچن میں رکھ کر چلتی بنی۔ حد ہے ڈھٹائی کی۔" ڈیڈی کو پھر سے کچھ یاد آگیا تھا۔ ثانی چونک گئی۔ یہ بات انہوں نے کوئی چوتھی مرتبہ دہرائی تھی۔

"مٹھائی واپس کرنے کا کیا جواز تھا؟ آپ نے اچھا کیا رکھ لی اگر واپس کرتے تو چچی نے چار لگا کر زیب کو بتانا تھا۔ وہ خواہ مخواہ کبیدہ خاطر ہوتا۔" ثانی نے نرمی سے کہا تو وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"وہ پہلے بھی ہم سے کبیدہ خاطر رہتا ہے۔ سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف جاتا ہے' کبھی اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ بیمار تایا کا حال پوچھ لے۔ کبھی برآمدے میں گھڑی بھر کے لیے نہیں آیا۔ سلام کرنا گوارا نہیں کرتا۔ جب تک ماں اجازت نہ دے۔ اس عورت کا زیب پہ پورا تسلط ہے۔"

ان کا غصہ بجا تھا۔ ثانی نے تسلیم کرلیا۔ کس قدر دل دکھانے والی بات تھی۔

"بڑا غرور ہے آپ کے بھتیجے کو اپنی اچھی صورت اور اچھی نوکری کا۔" ثانی کا دل بھی بھر آیا تھا۔ ڈیڈی جو کہہ رہے تھے' ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔

"اور اب اس کی پروموشن بھی ہوگئی ہے۔" ڈیڈی نے جل کر کہا تھا۔ کبھی زیب کی کامیابیاں انہیں دنوں مسرور رکھتی تھیں۔ وہ اسکول میں ٹاپ کرتا' کالج میں فرسٹ آتا۔ کھیل میں پہلا انعام جیتتا.... سب سے زیادہ ڈیڈی خوش اور پرجوش ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ زیب کا رویہ بہت ہی لیا دیا سا ہوتا تھا۔ ٹھنڈا' خشک اور اجنبی۔

وہ جانے سوچوں کے تانوں بانوں میں کہاں تک الجھتی کہ ڈیڈی کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

"خود آکر مجھے مٹھائی دے کر جاتا تو کس قدر خوشی ہوتی۔ سیروں خون بڑھ جاتا۔ میں کوئی جلتا ہوں اس کی کامیابیوں سے۔" ڈیڈی کا وہی غصیلا انداز تھا۔ آف موڈ' جلا کٹا لہجہ۔ یعنی غصے کی اصل وجہ یہی تھی۔ وہ خود کیوں نہیں آیا۔

"اوپر جو رہتا ہے۔۔۔ خلائی مخلوق کے ساتھ 'مزاج تو ایسا ہی ہو گا نا۔" ثانی ان کا موڈ اچھا کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑے تھے۔

"اب تم اٹھو اور کھانا کھاؤ۔ بلکہ پہلے نہاؤ۔ بہت بو آرہی ہے پسینے کی۔" اب وہ اسے چھیڑ بھی رہے تھے اور اکسا بھی رہے تھے کیونکہ اس کا ارادہ فی الحال فریش ہونے کا نہیں تھا۔ وہ ڈیڈی کو کھانا کھلانا چاہتی تھی پہلے اور پھر دوائی۔ اس کے بعد ثانی کی اپنی باری آتی۔ ڈیڈی چاہتے تھے۔ وہ اتنی گرمی میں آئی ہے۔ پہلے ترو تازہ ہو جائے۔ پھر جب وہ فریش ہو کر گرم گرم لنچ تیار کر کے واپس کمرے میں آئی تو ڈیڈی کا مزاج پہلے سے اچھا ہو چکا تھا۔

"میری بیٹی کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے تعریف کر رہے تھے۔ ثانی کا دل خوش ہو گیا۔

"تمہارا شوہر مجھے بڑی دعائیں دے گا۔" ڈیڈی کھانا کھاتے ہوئے شریر ہوئے تھے۔ ثانی ان کے پٹڑی بدلنے پر خفیف سی ہو گئی تھی۔

"اس زندگی میں تو امید نہیں لگتی۔" وہ بے خیالی میں کہہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ اتنی یاسیت اچانک پھیلی تھی جس نے ڈیڈی کو پریشان کر دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے گم صم ہو گئے تھے۔

"تم نے ایسا کیوں کہا ثانی!" انہوں نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ تب ہی ثانی کو اپنی بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ فوراً" لہجے میں بشاشت بھر کے بولی تھی۔

"میری بات کا مطلب تھا۔ آپ کے بھتیجے سے امید نہیں۔ وہ میری کوکنگ کی تعریف کر دے۔" اس نے بمشکل ہی بات بنائی تھی۔ پھر انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

"تم یاد سے اوپر مبارک باد دے آنا۔ پھر اس عورت کا پتا ہے نا۔ شوہر اور بیٹوں کے کان بھرے گی۔ تایا کو خوشی نہیں ہوئی۔ یاد نہیں زیب کی جب نوکری لگی تھی۔ تب کتنا ڈراما بنایا تھا اس نے۔ جب تم بیمار تھیں۔ ان کی دعوت میں جا نہیں سکی تھیں۔" ڈیڈی نے اسے بہت کچھ یاد دلایا تھا۔ ثانی کا دل بھر آیا۔ کچھ یادیں کتنی تلخ ہوتی ہیں۔

"آپ نہیں چلیں گے؟" ثانی نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"ان گوڈوں گٹوں کے ساتھ اوپر جانا محال ہے' ضمیر سے بھی ملاقات نہیں ہو پاتی۔ وہ اوپر معذور اور میں نیچے۔ ایک دوسرے کی صورت کو ترستے ہیں۔ واہ مولا۔ تیرے رنگ ہی نیارے۔" ڈیڈی نے پانی پیا اور ہاتھ پونچھ کر اخبار اٹھا لیا تھا۔ ثانی نے گہرا سانس کھینچا اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی تھی۔

وہ جانتی تھی انہیں کس بات کا دکھ تھا۔ یہی نا کہ شاہ زیب خود کیوں نہیں مٹھائی دینے آیا؟ اور یہ شکوہ ان کا بجا تھا۔ اگر انگلیوں پہ گنتی تو کتنے ہی سال ہو گئے تھے شاہ زیب نے عید شب رات پہ بھی ان کے پورشن میں آنا چھوڑ دیا تھا۔

اور ایسا کیوں ہوا تھا؟ اور کس کی وجہ سے ہوا تھا؟ وہ اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اگر ایسا تھا تو ایسا ہی سہی۔

لیکن وہ جانتی تھی یہ محض سوچنے کی حد تک باتیں ہیں۔ ان پہ عمل وہ عمر بھر نہ کر سکتی تھی۔ وہ شاہ زیب کی ذات سے عمر بھر بے نیاز نہ ہو سکتی تھی۔

یہ عشق باکمال کی ادا تو نہیں تھی۔ محبوب کی سنگ دلی کا جواب سنگ اٹھا کر دینا؟

☆ ☆ ☆

اور اگلی صبح اتنی ہی مصروف ترین تھی۔ ویسی ہی بھاگ دوڑ' جلد بازی اور تیزیاں۔

ثانی دوپٹہ کس کے لپک جھپک صفائی میں مصروف تھی۔ پہلے تینوں کمرے سیٹ کیے۔ پھر کچن رگڑا۔ اور

پھر برآمدے اور صحن کو لشکانے لگی تھی۔
آج اس کی آنکھ تھوڑا لیٹ کھلی تھی سو اسی حساب سے اس کے ہاتھ بھی تیز چل رہے تھے۔ ابھی کھانا بھی بنانا تھا۔
آج اس نے اکیڈمی تھوڑا دیر سے جانا تھا۔ وہ فائن آرٹ اکیڈمی میں آرٹ ٹیچر تھی۔ یہ ایک معروف مقامی اکیڈمی تھی۔ اچھی خاصی تنخواہ مل جاتی تھی۔ اور ثانی اس اکیڈمی کے ماحول سے بھی مطمئن تھی۔ لیکن ڈیڈی بہت نالاں تھے۔ دراصل ثانی کے چلے جانے کے بعد وہ تنہائی محسوس کرتے تھے۔ اوپر والوں کی رونق بس اوپر تک ہی محدود تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کبھی کسی نے نیچے جھانک کر ڈیڈی کا حال پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی وہ سب مصروف ہوتے تھے۔ شاہ زیب اپنی جاب میں اور اس کے چھوٹے چاروں بھائی کالجز اور اسکولز میں۔ افزاء گورنمنٹ کالج سے ماسٹرز ان اکنامکس کر رہی تھی۔ آج کل اس کے پیپر چل رہے تھے۔ ویسے بھی اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ افزا کا کون سا ان سے کوئی قلبی یا خونی تعلق تھا۔ جو ثانی اس سے توقعات وابستہ رکھتی۔ اصل دکھ تو شاہ زیب کی لاپروائی کا تھا۔ جو ہر گزرتے دن کے ساتھ پہلے سے بڑھ کے اجنبی ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا راستے میں روک کر پوچھ ہی لے۔ اس لاتعلقی کے پیچھے کیا وجہ ہے؟ لیکن وہ جانتی تھی۔ یہ محض سوچ کی حد تک ممکن تھا۔ وہ ایسی بہادر ہرگز نہیں تھی۔
اور اس وقت وہ زور و شور سے فرش دھوتی مسلسل زیب کے متعلق سوچ رہی تھی۔ معاً "گیٹ پہ بجنے والی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔
وہ گہرا سانس کھینچتی پائپ سمیت کر گیٹ تک آئی۔ گیٹ کھولا تو سامنے ہارون کو کھڑا دیکھ کر چونک گئی تھی۔ وہ اپنی ازلی مسکراہٹ کے ساتھ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا تھا۔ ہارون کو غیر متوقع اپنے سامنے دیکھ کر ثانی بے ساختہ چونک گئی تھی۔
"سلامتی ہو؟ کیسے احوال ہیں؟ مانا کہ بڑا اچھا لگ رہا ہوں۔ لیکن ایسی بھی کیا محویت!" وہ اپنے بے ساختہ انداز میں بولتا اسے بری طرح سے جھل کر گیا تھا۔ پھر اپنے بکھرے حلیے پہ دھیان گیا تو شرمندہ سی ہو گئی تھی۔ جلدی سے بکھری لٹوں کو سمیٹا۔ شلوار کے پائنچے نیچے کیے، صحن کی کھونٹی سے دوپٹہ اتار کر اوپر لیا۔ تب تک ہارون برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پیچھے آگئی تھی۔
"لوگ مجھے دیکھ کر ایسے ہی ہپناٹائز ہو جاتے ہیں۔" اسے لال بھبھوکا دیکھ کر ہارون کو شرارت سوجھی تھی۔ ویسے بھی وہ بلا کا شرارتی تھا۔ ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی۔
ثانی نے گہرا سانس اندر کی طرف کھینچا۔ اور ذرا سنجیدہ انداز میں بولی۔
"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں۔" اس کا انداز بھی جلانے والا تھا۔
"خوش فہمی نہیں۔ اسے خود آگاہی کہتے ہیں۔" ہارون نے تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ثانی نے ہونہہ پہ ہی اکتفا کیا تھا۔ ہارون ہنسنے لگا۔
"مزاج یار اتنا جلا ہوا کیوں ہے؟" کچھ دیر بعد وہ بڑی ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔ ثانی جو اس کے لیے اسکوائش بنانے کچن میں چلی گئی تھی۔ کچن کی کھڑکی سے گردن نکال کر بولی۔
"تمہاری شکل جو دیکھ لی ہے۔"
ہارون کین کی کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"یعنی کہ میری شکل دیکھ کر؟" اسے جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ "بی بی! اپنی آنکھوں کا علاج کرواؤ۔ مجھے دیکھ کر تو مٹیاریں رستہ بھول جائیں۔ ایسی نورانی صورت ہے میری۔ پیاری پیاری لڑکیوں کا تو دل ہی نہیں بھرتا مجھے دیکھ دیکھ کر۔" وہ تو تڑپ ہی اٹھا تھا۔
"پیاری پیاری لڑکیوں کا دل نہ بھرتا ہو گا۔ میرا تو نہیں۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا تھا۔ پھر جگ میں چینی گھولنے لگی۔
"اس کا مطلب ہے تم تسلیم کرتی ہو کہ تم پیاری نہیں۔"

"ہاں کرتی ہوں پھر؟" اسے غصہ آیا تھا۔ باہر سے ہارون کی چلبلاتی آواز ترنت آئی تھی۔

"پھر تو تمہاری نظر واقعی چیک کروانی پڑے گی۔ اے احساس کمتری کی ماری خاتون! تمہارا تو کوئی حال ہی نہیں۔ جیسا تمہارا چمکتا گورا رنگ ہے اس کے لیے لڑکیاں بیوٹی کریموں پہ زر کو آگ لگاتی ہیں اور تمہیں قدر ہی نہیں۔" ہارون نے جیسے تاسف کا اظہار کیا تھا۔ ثانی نے گہرا سانس بھرا۔

"گورے رنگ کو خوب صورتی کی علامت نہیں سمجھا جاتا۔" اس نے اپنے بھیگے ملائم دودھیا ہاتھوں کو دوپٹے سے پونچھا اور جگ اٹھا کر باہر آگئی تھی۔

"یہ یقیناً" اوپر والوں کا ارشاد ہو گا۔" ہارون فوراً" ہی معاملے کی تہہ میں اتر گیا تھا۔ ثانی نے آہ سی بھری تھی۔ اپنی لمبی زبان کے باوجود ہارون اس کا مزاج آشنا تھا۔ اسے ماننے ہی بنی تھی۔

ہارون اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ انتہائی ملائم سا شفاف چہرہ' بے ریا آنکھیں۔ ذرا پھیلی سی ناک۔ جاپانیوں جیسی۔ سادہ چہرہ' عام سے نقوش اور بے تحاشا گوری رنگت۔ وہ کہیں سے بھی اتنی معمولی نہیں لگتی تھی' جس قدر وہ خود کو عام اور معمولی سمجھتی تھی۔ خاص طور پہ اس کی گلابوں سی رنگت عام سے نقوش کو ڈھانپ لیتی تھی۔ جانے وہ کیوں کمپلیکس کا شکار رہتی تھی۔ شاید اوپر والوں کی وجہ سے۔

"اب ایسی بھی بات نہیں۔" ثانی نے فوراً" خود پہ قابو پایا تھا۔ خود کو ارزاں کرنا اسے گوارا نہیں تھا۔

"مجھے لگتا ہے تم افزا سے خاصی متاثر ہو۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پھر سے بارود چھوڑا تھا۔ اب کے ثانی ہکابکا رہ گئی تھی۔

"یہ بے پر کی کس نے اڑائی ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق بھلا؟" وہ مارے غصے کے ایک دم بولتی چلی گئی تھی۔

"میرے دماغ نے۔" ہارون نے فوراً" تسلیم کرلیا تھا۔

"تم اپنے دماغ کا علاج کرواؤ۔" ثانی نے چڑ کر مشورہ دیا تھا۔

"اور تم آنکھوں کا۔ یہی بتانے تمہیں آیا تھا۔ ورنہ اس گرمی میں گھر سے نکلنا محال تھا۔ سوچا' تمہاری آنکھیں کھول آؤں۔ بلکہ علاج کا مشورہ دے آؤں۔" وہ بے تکی ہانکتا اسے چونکا گیا تھا۔ ثانی کا دل عجیب سے خدشے کے تحت کپکپایا تھا۔

"اس بک بک کا مطلب؟" وہ اپنی پریشانی اس پہ ظاہر کیے بغیر ترخ کر بولی تھی۔ ہارون آنکھیں میچ کر اسے دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ اسکوائش کا جگ بھی خالی کرتا رہا۔

"بڑا عام سا مطلب ہے۔ تمہارا ٹائی ٹینک ڈوبنے کے قریب پہنچ چکا۔۔۔ اور میں تمہارا نقصان ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہی بتانے آیا تھا۔ کوئی ہاتھ پاؤں ہلالو تم اور ماموں۔" وہ کیا بات کر رہا تھا۔ اسے سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ اتنی بے بس تھی کہ بس رو دینے کی کسر باقی رہ گئی۔ ایک تو ہارون کے سامنے کچھ بھی چھپانا محال تھا۔

"بس تمہاری یہی بزدلی میری نیا بھی ڈبوئے گی۔" ہارون نے تاسف سے جتلایا تھا۔ ثانی اس کی گفتگو کا پس منظر سمجھ گئی تھی۔

"تو تم خود کیوں نہیں تیس مار خان بن جاتے؟ ویسے تو ساری پھنے خانیاں آتی ہیں۔" تب ہارون دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کے واکنگ چیئر پہ جھولنے لگا تھا۔ جیسے کسی سوچ میں ڈوب گیا ہو۔

"میں تیس کے بجائے پچاس مار خان بھی بن سکتا ہوں۔ اگر بیچ میں ہیبت ناک سماج نہ ہو۔" اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ وہ سمجھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا دی تھی۔

"سماج نے تو بیچ میں ہی رہنا ہے۔" اس نے ہارون کو بے ساختہ ڈرایا تھا۔

"صرف رہنا ہی نہیں۔۔۔ اپنی طرف سے سارے گر بھی آزمانے ہیں اور تم دیکھ لینا۔ وہ اپنا مقصد پانے میں ہر حد سے گزر جائیں گی۔" معاً" ہارون بے ساختہ

سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تمہیں میرا غم زیادہ ہے یا اپنا؟" کچھ دیر بعد ثانی گہری سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔ ہارون نے لمحہ بھر کے لیے جھولنا موقوف کیا تھا۔ پھر آنکھیں میچتا بے ساختہ بولا۔

"دونوں کا۔ اب اگر تم نے ہمت نہ کی تو یہ نیا ڈوب جائے گی۔"

ہارون کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ یہ عام خدشات نہیں تھے ان کے پیچھے بہت کچھ تھا۔ سول یوی ایشن کی بہترین جاب اور شاہ زیب کا نہ نظرانداز کرنے والا سراپا۔ اس کی فرماں برداری اور ان سب کے لیے انتہا درجے کی کیئر، محبت، خیال، کیا شاہ زیب سے دست بردار ہونا "اس" کے لیے بھی آسان تھا؟ وہ جس کے لیے راہیں ہموار کرنے والے موجود تھے۔ وہ جنھوں نے زیب کو ان سے دور کرنے کے لیے ایک دیوار کا کام کیا تھا؟ کیا وہ لوگ اتنی آسانی سے زیب کو وہاں سے لے کر یہاں تک کا فاصلہ طے کرنے دیتے؟ شاید کبھی نہیں۔

ہارون کے سینے سے ایک سرد آہ برآمد ہوئی تھی۔ اور اس کی بے قرار نگاہیں سیڑھیوں کی اونچائی تک جاتی اور پھر نامراد سی پلٹ آتی تھیں۔

ثانی اس کی بے چینی کو سمجھتی تھی۔ اسی لیے اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے بولی۔

"مجھے باتوں میں لگالیا میں اکیڈمی سے لیٹ ہو رہی ہوں۔" اس کا انداز آخر میں ڈپٹنے والا ہو گیا تھا۔ ہارون نے ایک لمبی آہ بھری تو کچھ دیر پہلے والی یاسیت سے پیچھا چھڑاتا ہوا مسکرایا تھا۔

"خادم اس جرم یہ سزا بھگتنے کے واسطے تیار ہے۔" وہ تھوڑا جھکتے ہوئے کورنش بجالایا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرادی تھی۔

"تو پھر اٹھو اور مجھے اکیڈمی ڈراپ کردو۔" اس نے ہارون کے کندھے پہ ایک دھپ لگائی تھی، پھر اپنا سامان لینے اندر چلی گئی۔ پھر جب وہ واپس آئی تو ہارون اپنی بائیک کی چابیاں اچھالتا ایڑیوں کے بل اچک اچک کر اوپر دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے کسی گلابی آنچل کی جھلک دکھائی دی تھی۔ نگاہیں دید کی پیاس لیے مایوس سی واپس پلٹیں تو سامنے ہی ثانی کو گھورتے دیکھ کر وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا تھا۔

"دیکھ لو، ثانی! ہم دونوں کی منزل ایک ہی ہے۔ یہ ماربل کی سیڑھیاں اور اوپر کا پورشن....." وہ اپنی بات کا خود ہی مزہ لیتا تھا، آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے ثانی تھی۔ جو اپنی فائل اس کے کندھے پہ مار رہی تھی۔

"لیکن مجھے اپنی منزل کو ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔" اس کے جواب نے ہارون کو بڑا ہی محظوظ کیا تھا۔ وہ مسکاتا ہوا گردن گھما کر بولا۔

"اس لیے کہ تمہاری منزل قریب اور محبوب آنکھوں کے سامنے ہے۔ دن میں ایک مرتبہ تو دید سے آنکھیں سیراب ہو جاتی ہیں۔ جناب اکھڑے اکھڑے ہی سہی کم از کم دکھائی تو دیتے ہیں۔" ہارون نے ایک آہ بھری اور بات کو مزید جاری رکھا "اور ایک اپنی پھوٹی قسمت ہے۔ کبھی تو دیدار نصیب ہو....."

"اتنی آہیں مت بھرو اور اوپر خود جا کر درشن کروا آؤ۔ کیا خبر 'ادھر' بھی کسی کو انتظار ہو۔ تمہارے یہ شعلہ نما جذبے رنگ دکھا ہی جائیں۔" اس کا انداز صاف پچکارنے والا تھا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر....." وہ کھلکھلایا تھا۔ پھر اچانک غصے میں بولا۔ "لیکن جب تک زیبو اپنی افسری سمیت کھونٹے سے نہیں بندھتا۔ میری نیا بیچ منجدھار میں ہی پھنسی رہے گی۔" اس نے دائیں ہاتھ کا مکا ہوا میں اچھالا تھا۔ ثانی نے اسے زیادہ جذباتی ہوتے دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر بائیک تک لے آئی۔ بس ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"خدارا..... یہ مکالمے بعد میں کرلینا۔ مجھے اکیڈمی چھوڑ آؤ پہلے....." پھر اس نے بائیک اسٹارٹ کی تو ثانی محتاط سی اس کے کندھے کا سہارا لے کر بائیک پہ بیٹھ گئی تھی۔ پھر زن سے بائیک زوں زوں کرتی کیپٹن خضر حیات کے مکان سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ جانے

والوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ دھوپ بھری اس دوپہر میں ماربل کی سیڑھی کے سب سے اوپر والے قدمچے پہ کوئی کھڑا تھا۔ لال انگارہ آنکھیں لیے۔ جن سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں اور چہرے پہ ایسے برف سے تاثرات تھے کہ دیکھنے والی نگاہ تک برف ہو کر جم جاتی۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

کچن سے پریشر ککر کی سیٹی بجنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔

پورے گھر میں اشتہا انگیز سی خوشبو پھیلی تھی۔ امی بریانی کے ساتھ کڑاہی گوشت بنا رہی تھیں۔ وہ سب بچوں کی پسند کا خیال رکھتیں۔ حسن، احسن، رمیز، سمیر.... لیکن عموماً "مینیو" شاہ زیب کی پسند کا ہوتا تھا۔ نائلہ کے ہاتھ میں لذت بہت تھی۔ عام سی ترکاری بھی ایسی مزے کی پکاتی تھیں کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ تب ہی تو اتنے سال بعد بھی ضمیر کا دل نائلہ کے دل کے ساتھ بندھا ہوا تھا اور شاید معدے کے ساتھ بھی.... اور وہ اس چھوٹی سی راجدھانی کی اکیلی ملکہ تھیں۔ وہ ہر فیصلے میں کار مختار تھیں۔ گھر کی خریداری سے لے کر خاندان میں لین دین.... حتیٰ کہ بچوں کی زندگیوں کے متعلق ہر فیصلہ کرنے میں.... اور انہیں اپنی بات منوانے کے سارے گُر بھی آتے تھے۔

شاہ زیب بڑا بیٹا تھا۔ ہر لحاظ سے پرفیکٹ، کماؤ، فرماں بردار....

زیب کی تنخواہ پر سارا گھر چل رہا تھا۔ اس کی اچھی تنخواہ کی وجہ سے چھوٹے چاروں بھائی اچھے پرائیویٹ کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ افزا حال ہی میں تعلیم سے فارغ ہوئی تھی۔ اب نائلہ کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ زیب ساری تنخواہ ماں کے ہاتھ پہ رکھ دیتا تھا۔ بس اپنی ضرورت کے لیے مختصر رقم پاس رکھتا۔ ویسے بھی اس کی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ ابو کا علاج، دوائیں اور گھر کے اخراجات ہی اتنے تھے کہ اسے لگتا تھا نائلہ بہت مشکل سے گھر چلاتی تھیں۔ شاہ زیب اپنے بہن بھائیوں کا بہت احساس کرتا تھا۔ بچوں میں محبت و یگانگت نائلہ کے لیے دلی سکون کا باعث تھی۔ وہ چاہتی تھیں ان کے سب بیٹے ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے رہیں اور یہ تب ہی ممکن تھا جب شاہ زیب کی زندگی کا فیصلہ ان کے حسب منشا ہو جاتا اور یہ ان کے لیے بہت آسان تھا۔ وہ بس کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھیں۔ جس کے بعد ان کا برسوں پرانا خواب پایہ تکمیل تک پہنچ جاتا۔

وہ کچن سے باہر نکلیں تو شاہ زیب اندر آتا دکھائی دیا تھا۔ آج وہ آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ چہرے سے تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ اور گال گلابی.... ناک بھی لال ہو رہی تھی۔ شاید فلو کی شکایت تھی۔

ہاتھ میں لیدر کا دفتری بیگ، لیپ ٹاپ، موبائل.... آج وہ یونیفارم میں نہیں تھا۔ شلوار قمیص میں تھا۔ پیپر کاٹن کی سفید شلوار قمیص اس کے وجیہہ سراپے کا مول بڑھا رہی تھی۔ اونچا لمبا، اسمارٹ سا زیب.... ان کے دل میں سیدھا اتر گیا تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا۔ اپنی ہی نظر لگ جانے کا خدشہ ہوا تھا۔

"آج جلدی آ گئے بیٹا!" انہوں نے بھاگم بھاگ اس کے ہاتھ سے چیزیں پکڑیں.... پھر سمیر کو آواز دی۔ "بھائی کا سامان اندر رکھ آؤ.... اور اس کے سلیپر لے آؤ۔"

کچھ دیر بعد سمیر بمعہ سلیپر سمیت نمودار ہوا تھا۔ نائلہ نے افزا کو آواز دی تھی۔

"کہاں ہو افزا! نکل آؤ اپنے کمرے سے۔ جانے یہ لڑکی سارا دن کیا کرتی ہے۔ اب تو امتحانوں کا بہانا بھی گیا۔"

ان کی اونچی آواز پہ افزا ہڑبڑا کر باہر آ گئی تھی۔ سامنے ہی شاہ زیب کو دیکھ کر جھجک گئی۔ پھر اس کے سرخ چہرے پہ نگاہ پڑی تو ماں سے اشارہ میں پوچھا۔ "بھائی کو کیا ہوا؟" اس کے لہجے میں واضح تفکر تھا۔

نائلہ نے جواباً "گھور کر تنبیہہ کی تھی۔ وہ جیسے سمجھ کر کچھ چپ سی ہوگئی تھی۔ پھر اس نے ہمت کر کے شاہ زیب کے قریب آکر پوچھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اپنے کمرے میں چلے جائیں۔ میں جوشاندہ بنالاتی ہوں۔" افزا کی آواز پہ شاہ زیب چونک گیا تھا' لیکن اس نے آنکھوں سے بازو نہیں ہٹائے تھے۔ معاً" اسے اپنے پیروں پہ سرسراہٹ سی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا اور دھک سے رہ گیا تھا۔ افزا اس کے جوتے اتار رہی تھی۔ شاہ زیب کو کرنٹ سا لگا تھا۔ وہ تیزی سے پیر سمیٹ کر اٹھ بیٹھا۔

"یہ کیا کر رہی تھیں افزا....؟" اس کا تنفس کچھ تیز تھا اور چہرہ پہلے سے بھی لال.... افزا تھوڑا ڈر کے خوف زدہ سی ہوگئی تھی۔

"جوتے اتار رہی تھی۔" اس نے سہمے انداز میں جواب دیا تھا۔ زیب گہرا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے تیز لہجے پہ قابو پالیا تھا۔

"بری بات افزا! آئندہ ایسا نہیں کرنا۔ میرے پیروں کو ہاتھ نہیں لگانا۔ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔" وہ ملائمت سے تنبیہہ کر رہا تھا۔ افزا کچھ شرمندہ ہوگئی تھی۔

"سوری...." اس نے فوراً" کانوں کو ہاتھ لگالیے تھے۔ زیب اس ادا پہ ذرا سا مسکرا دیا۔

"تم کبھی بھی بڑی نہیں ہوگی۔"

"میں بڑی ہو چکی ہوں۔" افزا نے بے ساختہ کہا تھا۔ وہ ایڑیوں کے بل تھوڑا اونچا ہو کر اسے دکھا رہی تھی۔ شاہ زیب مسکرا دیا۔

"ہاں.... اس لحاظ سے بڑی ہو۔ مگر عقل کے معاملے میں زیرو...." اب وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ افزا ٹھنکنے لگی۔

"زیبی بھائی! آپ بھی نا...."

نائلہ جب دوبارہ چھوٹے سے لاؤنج میں آئیں تو افزا کو ٹھنکتے پا کر ان کے ماتھے پہ بل پڑ گئے تھے۔

"جانے یہ گدھی کب بڑی ہوگی۔" انہوں نے اندر ہی اندر تلملاتے ہوئے سوچا تھا۔ پھر زیب کی طرف جوشاندے والا مگ بڑھا کر بولیں۔

"اسے پی لو بیٹا! تھوڑا افاقہ ہوگا اور اب تم آرام کرو۔" وہ بہت محبت سے زیب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جو کنپٹیاں مسلتا ہوا مگ پکڑ کے اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

نائلہ نے فکرمندی سے دیکھا۔

"میں ذرا کچن میں بزی ہوں۔ افزا! تم ایسا کرو تیل اٹھا لاؤ۔ زیب کے سر میں مالش کردو۔ دیکھنا کتنا سکون آتا ہے۔" نائلہ کے کہنے پہ افزا سر ہلاتی تیل لینے باہر گئی تو شاہ زیب نے فوراً" ماں کو منع کیا۔

"رہنے دیں امی! اس کی ضرورت نہیں۔"

"کیوں ضرورت نہیں۔ دیکھنا آرام آجاتا ہے فوراً"...." نائلہ نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا تھا۔ شاہ زیب جیسے بے بس ہو گیا تھا۔ تاہم افزا سے ایسے کام کروانا اسے پسند نہیں تھا۔ یہ تو امی نے اسے سر میں تیل ڈلوا کر مالش کروانے کی عادت ڈال رکھی تھی۔ وہ اتوار کے اتوار ان چاروں بھائیوں کو زبردستی اپنے گھٹنوں تلے دبوچ لیتی تھیں۔

لیکن کچھ عرصے سے امی نے بہت سی ذمہ داریاں افزا کے اوپر ڈال دی تھیں۔ خاص طور پہ شاہ زیب کے سارے کام.... اسے کھانا دینے سے لے کر کپڑوں تک.... امی' شاہ زیب کی ہر ضرورت کے لیے افزا کو آواز دیتی تھیں۔ اپنے کام کے لیے اسے زحمت دینا شاہ زیب کو پسند نہیں تھا۔

جب اس نے دبے لفظوں میں امی کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی تو امی الٹا برا مان گئی تھیں۔

"اپنے باقی بھائیوں کے کام بھی تو کرتی ہے۔ بلکہ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ زبردستی اس سے کام کرواتے ہیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟ کیا افزا اس گھر کا فرد نہیں ہے؟" امی کے پاس دلائل کی کمی نہیں تھی۔

جب سے افزا پڑھائی سے فارغ ہوئی تھی۔ گھر کی آدھی ذمہ داری اس نے اٹھا رکھی تھی۔ ایک لحاظ سے یہ بھی بہتر تھا۔ امی کا بوجھ کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ابو کی دیکھ

بھال' ان کی تیمار داری کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو امی نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ پورے دن کی بھاگ دوڑ سے اب تھک جاتی تھیں۔

اور اس وقت افزا کے ہاتھ میں تیل کی بوتل دیکھ کر زیب کو کوئی مناسب بہانا نہیں سوجھ رہا تھا۔

امی کا اشارہ پا کر افزا نے جھجکتے ہوئے ہتھیلی پہ تیل لیا۔ شاہ زیب کے بالوں کا مساج کرنے لگی تھی۔ امی قریب بیٹھی سلاد کاٹ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ہدایات بھی دیتیں۔ افزا نے تنگ آ کر بول ہی دیا تھا۔

"اس سے بہتر تھا' آپ خود کر لیتیں۔" اس کے جواب پہ زیب خاصا محظوظ ہوا تھا۔ اس کے جادو اثر مساج کا اثر تھا کہ زیب کو صوفے پہ ہی نیند آ گئی تھی۔ وہ افزا کا شکریہ بھی ادا نہیں کر سکا۔ جوشاندے نے بھی خاصا افاقہ دیا تھا۔ وہ سکون کے ساتھ نیند میں گم ہو گیا تھا۔

تب نائلہ نے افزا کو اشارہ کیا اور خود بھی چیزیں سمیٹ کر کچن میں آ گئی تھیں۔ ساتھ سمیرو غیرہ کو تنبیہہ بھی کی۔

"بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ سو رہا ہے۔ خبردار جو ہاہا کار مچائی تو...."

افزا نے بھی ہدایت نامہ دھیان سے سنا تھا۔ پھر سلاد کے پتے کھاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"امی! ایک بات کہوں؟" اس کا انداز پر سوچ قسم کا تھا۔ گہرا سنجیدگی بھرا۔ نائلہ نے بیٹی کے چہرے پہ پھیلی کشمکش کو دیکھا اور گہرا سانس بھر کے رہ گئی تھیں۔

"ہاں.... کہو...." نائلہ کا انداز مصروف قسم کا تھا۔ وہ کڑاہی تیار کرنے میں مگن تھیں۔ ابھی آٹا گوندھ کے روٹی پکانی تھی۔ تب تک شاہ زیب بھی اٹھ جاتا۔ یہ سارا مینیو شاہ زیب کی پسند کو مد نظر رکھ کے بنایا گیا تھا۔

"امی! جو آپ چاہتی ہیں' کیا ایسا ممکن ہے؟" افزا کے لہجے میں بلا کی جھجک تھی۔ نائلہ کچھ چونک گئیں۔ پھر انہوں نے گردن گھما کر بیٹی کی طرف دیکھا تھا۔

"اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔ مجھے پتا ہے کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے' لیکن ایک طرف سے دل کو سکون بھی ہے۔"

افزا اماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"زیب کی طرف سے میں مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کسی قیمت پہ بھی نہیں ٹالے گا۔ رہا ضمیر.... تو اسے میں دیکھ لوں گی۔" نائلہ نے سب کچھ خود ہی طے کر رکھا تھا۔

"امی! کیا نیچے والے خاموش رہیں گے۔" افزا نے انتہائی بے چینی کے عالم میں پوچھا تھا۔

"یہ تم مجھ پہ چھوڑ دو۔ جب شاہ زیب ڈٹ گیا تو کون آواز اٹھائے گا؟ میرا ہتھیار زیب ہے۔ میرا بیٹا.... مجھے کبھی بھی نیچا ہونے نہیں دے گا۔" نائلہ کے لہجے میں مان بول رہا تھا۔ افزا اماں کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

ان کی اس خواہش میں اتنی شدت تھی کہ وہ اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ ان کی خواہش کے ادھورا رہ جانے کے خوف کی وجہ سے.... کیا ضروری تھا ساری تمنائیں پوری ہو جاتیں؟

"یہ میری زندگی کی اولین تمنا ہے۔ پہلی اور آخری خواہش...." اور جب وہ ببانگ دہل ابو کے سامنے اعلان کرتی تھیں تو ابو کا چہرہ ایک دم سفید پڑ جاتا تھا۔ تب اگر امی کبھی بھی ابو کا بے رنگ چہرہ دیکھ لیتیں یا اس چہرے پہ امڈ آئی' حسرتوں کا شمار کر لیتیں تو انہیں احساس ہو ہی جاتا۔ اسی لیے امی نے کبھی ابو کا چہرہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ افزا ہونٹ کچلتی ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ اب بھی سکون کے ساتھ تن دہی سے کڑاہی پکانے میں مگن تھیں۔

جبکہ وہ ہزار خدشوں اور وسوسوں کے حصار میں گھری تھی۔ بے یقینی کی ناؤ میں ڈولتی ہوئی۔ آر یا پار ہونے کے فیصلے کی سولی پہ اٹکی ہوئی۔

کتنا عذاب ناک تھا اس شخص کی ہاں یا نا کے درمیان سفر کرنا جو بہت کم عرصے میں نظر اور دل کی دنیا کو تہہ بالا کر گیا تھا۔

اس نے ہمیشہ امی کے منہ سے یہ ہی سنا تھا۔ اسے اسی گھر میں رہنا ہے اور شاہ زیب کے حوالے سے رہنا

ہے۔ افزا کو آج بھی وہ سرمئی سی شام یاد تھی۔ جب سہ پہر ڈھلے اس کی کالج فیلو اپنی ماں کے ساتھ افزا کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی۔

''افزا کا رشتہ تو طے ہے تقریباً''۔ اب تو بس رسم کی تاریخ رکھوں گی۔ اس لیے میں معذرت کرتی ہوں۔'' سارہ کی امی کے اصرار پہ نائلہ نے بتا دیا تھا کہ افزا کا رشتہ کس سے طے ہے۔

یہ سن کر وہ ماں بیٹی مایوس سی واپس لوٹ گئی تھیں، لیکن افزا کے دل کی دنیا تو تہہ و بالا ہو چکی تھی۔ یہ امی نے کیا کہہ دیا تھا؟

اس کا رشتہ زیب بھائی سے طے تھا؟ کب کس طرح...؟

وہ ان سوالوں میں نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے دل کی خوشی اور اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

شاہ زیب ضمیر علی... کاکول اکیڈمی میں پی آئی اے کے اسپیشل کوٹ میں پڑھنے والا اور اپنے شان دار اکیڈمک ریکارڈ کے ساتھ اتنا خوبرو ایروناٹیکل انجینئر...

وہ تو ایک خواب تھا۔ وہ تو آسمان کا چاند تھا۔ تو پھر افزا کے نصیب میں کیسے آگیا؟

اسے کئی راتیں نیند ہی نہیں آئی تھی۔ وہ رات رات بھر جاگتی... اور زیب بھائی کو سوچتی... پھر اسے خود ہی شرم سی آجاتی تھی۔ اکثر اسے خیال آتا کہ زیب کی اس کے لیے جانے کیسی فیلنگز ہوں۔ وہ تو بڑا نارمل ری ایکٹ کرتا تھا۔ کسی خاص جذبے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا یا شاید اسے خود پہ کنٹرول تھا۔ لیکن افزا کے اندر کے موسم بدل چکے تھے۔ وہاں اب محبت میٹھا میٹھا درد جگاتی تھی۔ وہ بچپن کی انسیت اور زیب کا خصوصی لگاؤ بہت طریقے سے محبت اور الفت میں ڈھلنے لگا تھا۔

حالانکہ زیب تو وہی تھا۔ ہمیشہ والا زیب... خیال رکھنے والا... پیار کرنے والا... جب تک وہ کالج جاتی رہی تھی۔ باقی چاروں کے ساتھ اسے بھی الگ سے پاکٹ منی ملتی تھی۔ زیب بھائیوں کے لیے شرٹس لاتا تو امی اور افزا کے اسپیشل سوٹ ہوتے، گرمیوں، سردیوں کی ورائٹی بن کے پہنچ جاتی۔ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا اور امی اسے اور طریقوں سے باور کرواتی تھیں۔

''دیکھا... زیب کو ابھی سے تمہارا کتنا خیال ہے۔'' اور افزا بہت شرما جاتی تھی۔ گھبرا جاتی... جھینپ جاتی... یہ احساس کتنا دل نشین تھا کہ کوئی آپ کا اس قدر خیال رکھتا ہے؟ لیکن زیب تو پہلے بھی بہت خیال رکھتا تھا؟ ہاں اب اس کی جاب ہو چکی تھی تو خیال رکھنے کے طریقوں میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔

امی نے اسے سوچوں میں گم کھویا کھویا دیکھا تو نرمی سے اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہوں نے برنر گھما کر آنچ دھیمی کر لی تھی۔ انہوں نے پیار سے اس کا دلنشین چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیا۔

''تمہیں کس بات کا غم ہے؟ کیا تمہیں اپنی ماں پہ بھروسا نہیں؟ میں تمہاری ماں ہوں، افزا مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ میں تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کروں گی۔ جو بھی مجھ سے ہو سکا...'' ان کے یقین بھرے لہجے پہ افزا بمشکل ہی لبوں پہ کھینچ تان کر مسکراہٹ لا سکتی تھی۔ حالانکہ دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کیونکہ بیچ میں کیپٹن خضر حیات ریٹائرڈ اور ان کی دختر ایک اٹل حقیقت کی طرح کھڑی تھی تن کر اور امی تھیں کہ اس خوف ناک حقیقت سے اتنے آرام کے ساتھ نگاہیں چرائے بیٹھی تھیں۔ اس کی آنکھوں کا ہراس اور سوچوں کا عکس چہرے پر بہت واضح تھا۔ جسے دیکھ کر امی نے گہرا سانس بھرا اور نرمی سے بولیں۔

''تمہیں ثانی کی وجہ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ثانی بہت عرصہ پہلے سے ہی زیب کی زندگی سے نکل گئی تھی اور اگر کوئی رہی سہی کسر باقی ہوئی بھی تو اس کے لیے میں ہوں نا۔'' انہوں نے اس کا گال تھپتھپا کر ہمت بندھائی تھی۔ وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ بہت چاہ کر بھی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہ آسکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کچن میں کھانا تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ نائلہ گرم گرم چپاتیاں بنا رہی تھیں، جبکہ افزا چھوٹی سی میز پہ کھانا لگا رہی تھی۔ میز کافی پرانی تھی۔ گھسی ہوئی... رنگ اڑی... نائلہ نے سوچ رکھا تھا۔ شاہ زیب کی شادی سے پہلے سارا فرنیچر بدلوائیں گی۔ آخر افزا کو جہیز بھی تو دینا تھا۔ اوپر فرنیچر کم بھی تھا اور معمولی بھی...

ضمیر کی آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ بمشکل گھر کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے۔ اس لیے وہ اپنا گھر سجانے کا شوق پورا نہ کر سکیں۔

پھر بچے ہوئے تو ان کے خرچے... پڑھائیاں، مہنگی تعلیم... یہ تو زیب کمانے کے قابل ہوا تو حالات میں بہتری آئی تھی۔ نائلہ نے بڑے ہی تنگی کے دن دیکھے تھے۔ یہ بھی ایک الگ ہی داستان تھی۔ وہ بھی دن گزر گئے۔ اب اچھے دن آئے تھے تو وہ ان اچھے دنوں کو گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھیں۔

ابھی بھی وہ روٹی بنا کر فارغ ہوئیں تو کچن کی کارنر والی کھڑکی سے عادتاً نیچے جھانکا اور چونک گئیں۔ کچن بیرونی سیڑھیوں کے پاس تھا۔ بالکل کارنر پہ... اس کی کھڑکی سے نیچے والوں کا صحن اور باہر کے گیٹ کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ حتیٰ کہ روڈ بھی اور راہ گیر بھی...

نیچے گیٹ کے اندرونی طرف انہیں ہارون دکھائی دیا تھا اور اس کے ساتھ باتیں بگھارتی ثانی بھی... کتنا مکمل اور بھرپور منظر تھا۔ اگر زیب بھی دیکھ لیتا تو... ؟

ہارون اور ثانی... ثانی اور ہارون... ان کے ذہن میں کچھ فسانے تراشے جانے لگے تھے۔ وہ کچھ پل کے لیے کھڑی سوچتی رہیں۔ پھر کھڑکی سے ہٹ کر لاؤنج میں آئیں تو تازہ دم سا زیب کچن میں آتا دکھائی دیا تھا۔

اس کی طبیعت اب ٹھیک تھی اور خاصا فریش نظر آرہا تھا۔ نائلہ نے کچھ پل کے لیے سوچا پھر جلدی سے بولیں۔

"طبیعت کچھ بہتر ہے تو کارنر سے اپنے ابو کے لیے بلڈ پریشر کی گولیاں پکڑ لاؤ۔ صبح سے مجھ سے کہہ رہے ہیں۔" نائلہ کے التجائیہ کہنے پہ زیب نے فوراً بائیک کی چابیاں اٹھائیں اور باہر نکلنے لگا۔

"کمال ہے امی! ابو کی دوائی میں لاپروائی نہ کیا کریں۔ آپ مجھے پہلے بتاتیں۔" وہ بولتا ہوا باہر نکلا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ نائلہ اس کے نکلتے ہی کچن کی کھڑکی میں جم کر کھڑی ہو گئیں۔ نیچے منظر کچھ بدل گیا تھا۔ ثانی اور ہارون اب باہر تھے۔ ثانی اس کے کندھے پہ دھپ لگاتی ہنس رہی تھی۔ پھر ہنستی ہوئی اس کی بائیک پہ بیٹھ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کتنا بھرپور منظر تھا۔ نائلہ کو مزہ آگیا۔

زیب ابھی تک سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ شدید دھوپ میں... انتہائی گرمی... نائلہ کا دل بے چین ہو گیا۔ نائلہ مزید بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد خود باہر نکل آئیں۔ وہ ماں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ پھر اپنی لال انگارہ آنکھوں کو جھکاتا تیزی سے اندر چلا گیا۔ شاید اپنے کمرے میں...

نائلہ بھی ہاتھ مسلتی اس کے لیے ٹھنڈا پانی لے کر جلدی سے پہنچ گئیں۔ وہ بستر پہ لیٹا ہوا تھا۔ بازو سے منہ کو ڈھانپے... نائلہ مضطرب سی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

انہوں نے یہ ضرور چاہا تھا وہ ثانی کو ہارون کے اتنا قریب دیکھ لے۔ لیکن یہ ہرگز نہیں چاہا تھا کہ وہ اس منظر کو خود پہ سوار کرلے۔

انہوں نے نرمی سے اس کا کندھا ہلایا۔ شاہ زیب چونک گیا اور پھر ماں کو اتنا قریب دیکھ کر سیدھا ہو بیٹھا۔ نائلہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے گہرا سانس بھرا اور دھیمی آواز میں کہنے لگیں۔

"تمہیں اس بات پہ غصہ یا دکھ ہے تو بڑا ہی عجیب غصہ اور دکھ ہے۔" نائلہ کے نرم لہجے اور گہرے الفاظ پہ زیب بے ساختہ چونک کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"آج کچھ انوکھا یا نیا نہیں ہوا؟ جو تمہیں بہت عجیب لگا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ تم نے آج دیکھا اور تم ابھی تک شاک میں ہو۔" نائلہ نے کچھ دیر بعد سلسلہ

کلام وہیں سے جوڑا تھا۔

"یہ تو معمول کے منظر ہیں۔ ہارون کی نیچے والے ماموں سے گاڑھی چھنتی ہے۔ وہ ایک دن چھوڑ کے آ دھمکتا ہے۔ کبھی رات بھی رک جاتا ہے۔ یہ تو معمول کی باتیں ہیں۔" وہ بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ زیب نے ایک مرتبہ پھر چونک کر لال آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا تھا۔ اگر وہ کہہ رہی تھیں تو ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ انہیں کیا ضرورت تھی مبالغہ آمیزی کی۔ شاہ زیب کی کنپٹیاں سلگنے لگیں۔

"ثانی کی ہارون سے گاڑھی چھنتی ہے۔ ایسی بے تکلفی اور پیار ہے کہ حد نہیں.... اوپر چچا کے بھی تو بچے ہیں۔ مجال ہے جو کبھی کسی کو بلایا ہو۔ آواز تک دی ہو۔ یہ سمیر' رمیز تو خود ہی ڈھیٹوں کی طرح نیچے میچ دیکھنے چلے جاتے ہیں کہ پلازما ٹی وی پہ میچ کا اپنا ہی مزہ ہے۔ میں تو ہزار دفعہ منع کر چکی ہوں' مگر سنتے ہی نہیں۔ نیچے ثانی اتنا بڑا بڑاتی ہے کہ گھر پھیلا کر چلے گئے۔"

زیب نے ان کی ساری تقریر سنی تھی۔ لیکن اس کا ذہن بس اسی بات میں اٹک گیا تھا۔ ایسی بے تکلفی اور "پیار" ہے کہ حد نہیں۔ اس کا ذہن لفظ "پیار" پر جیسے جم گیا تھا۔

اس کی شیشے جیسی آنکھوں سے کانچ ترخنے لگی کنپٹیوں میں لہو جیسے جوش مار رہا تھا۔

"ہارون نکمے کو بھی کوئی کام نہیں.... باوا کا چلتا بزنس ہے۔ خود اکلوتا.... کیا ضرورت ہے کسی کی چاکری کرنے کی.... ادھر بڑے ماموں کے چرنوں میں بیٹھ کر دعائیں لیتا ہے۔ ایک ٹکٹ میں کئی مزے...."

شاہ زیب کی برداشت بھی جیسے تمام ہو چکی تھی۔

"تو ہماری طرف سے جہنم میں جائیں۔ ہارون بچپن سے کمینہ ہے۔ اب بھی کمینگی ہی دکھائے گا۔"

اس کا لہجہ آنچ دیتا تھا۔ نائلہ کو دلی سکون ملا تھا۔

"ہاں تو دفع کرو۔ ویسے بھی تمہاری پھوپھو کی بڑی لاڈلی بھتیجی ہے ثانی.... ہاتھ سے کہاں نکلنے دیں گے۔ ثانی کو ماں' بیٹا.... خیر چھوڑو.... اب آؤ' تمہارے بھائی انتظار کر رہے ہیں کھانے پہ۔ جن لوگوں کو ہماری پروا نہیں.... ہم ان لوگوں کی پروا کیوں کریں۔" وہ پیار سے اسے سمجھائی اپنی جگہ سے اٹھیں تو زیب بھی خون کے گھونٹ بھر با بظاہر خود کو نارمل ظاہر کر کے اٹھ گیا تھا۔

"آپ چلیں.... میں منہ ہاتھ دھو کے آتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد اس نے اتنا ہی کہا تھا اور پھر واش روم کی طرف چلا گیا۔ نائلہ نے مسکرا کر اس کی پشت کو دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر نکل گئیں۔ آج کے دن کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

☆ ☆ ☆

رات کو نسبتاً" موسم بہت خوش گوار تھا۔

شاید کہیں دور دراز کے علاقوں میں بارش ہوئی تھی۔ تب ہی ہوائیں ٹھنڈی اور نم تھیں۔ گرمی کا زور بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک اپنے دفتری کام میں مصروف رہا۔ پھر سمیر' رمیز کے پکارنے پہ اسے باہر آنا ہی پڑا تھا۔ حسن' احسن اور رمیز' سمیر کرکٹ میچ کھیل رہے تھے۔ نیچے تایا کے صحن میں.... صحن چھوٹا تھا' پھر بھی شوق کا کوئی مول ہوتا ہے بھلا؟

وہ ٹیرس کی ریلنگ پہ کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آواز لگا کر جیسے انہیں تنبیہہ کی تھی۔

"تایا اور ان کی دختر کا پتا ہے۔ کیوں موت کو آواز دیتے ہو۔ اوپر آجاؤ۔ شطرنج کی بازی لگاتے ہیں۔" لیکن ان پہ آج کرکٹ کا بھوت سوار تھا۔ انہوں نے اس کی ایک ۔۔۔ نہیں سنی۔

"تایا اور ثانی آپا کو ہارون بھائی اپنے گھر لے کر گئے ہیں۔ وہ رات سے پہلے نہیں آئیں گے۔" نیچے سے سمیر نے اطلاع پہنچائی تھی۔ شاہ زیب جیسے سر ہلاتے ہوئے چونک گیا تھا۔

"اچھا.... تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔" اس کے اندر تنفر کی تیز لہر اٹھی تھی۔ جسے دبا کر وہ تیزی سے اندر چلا گیا تھا۔ آنکھوں میں سرخی' چہرہ لال اور عجیب سے تاثرات.... وہ کھولتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب ابو نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔

"کبھی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ ایک تمہیں ماں پیاری ہے اور دوسرا اپنا کمرہ۔" ابو کے اپنے ہی بے حساب شکوے تھے۔ شاہ زیب چونک گیا۔ پھر سر جھٹکا کران کے قریب آگیا۔ وہ اپنی وہیل چیئر پہ بیٹھے تھے۔ کھڑکی کے سامنے۔ باہر سے تازہ ہوا آرہی تھی اور نیچے سے شور بھی.... زیب نے گہرا سانس بھرا... اب وہ ابو کے غوری میزائلوں کے لیے خود کو تیار کررہا تھا۔

"کہاں ہوتے ہو شاہ زیب! ایسی بھی کیا مصروفیت۔ صبح دیکھوں تو تم گھر نہیں اور رات کو کیا دیکھوں؟ پتا نہیں کب آتے ہو۔" اب وہ موڈ بگاڑے پوچھ رہے تھے۔ زیب نے گہرا سانس بھرا تھا۔

"صبح میں جلدی دفتر کے لیے نکل جاتا ہوں۔ ایئرپورٹ ہمارے گھر سے بہت دور ہے اس لیے۔ رات کو دیر سے آتا ہوں۔ آپ تب تک سو چکے ہوتے ہیں۔ اتوار کو آپ کا ویکلی چیک اپ' دوائیاں' ٹیسٹ' ایکسرسائز.... پھر سودا سلف لانا۔ ہفتے بھر کے جمع شدہ کام اتوار کے دن کرنے ہوتے ہیں۔ آپ کو پتا تو ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولتا بولتا جانے کیوں تلخ ہو رہا تھا۔

"میں یہ ہی تو کہہ رہا ہوں۔ اتوار کے اتوار تم میرے ساتھ مصروف ہوتے ہو۔ کبھی تمہیں خیال آیا۔ میرے جیسا' بیمار' مریض میرا ایک بھائی بھی ہے نیچے۔ اسے بھی تمہاری ضرورت ہے۔ تمہارے باپ جیسا تمہارا تایا؟ ان کا تو بیٹا بھی کوئی نہیں۔" انہوں نے اچانک گفتگو کو اور سمت موڑا تھا۔ شاہ زیب ہکابکا رہ گیا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔ وہ بات کو تایا کی طرف لے جائیں گے۔

"ان کا بیٹا نہیں' لیکن بھانجا تو ہے نا؟" جانے کیوں وہ اندر تلک سلگ گیا تھا۔ ابو نے گہری سانس اندر کو کھینچی تھی۔ وہ وہیل چیئر کی ہتھیوں پہ ہاتھ جما کر بیٹھے تھے۔

"بھانجا ہے اور ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اتنی دور سے آجاتا ہے۔ بھتیجا کیوں نہیں؟ اتنا قریب رہ کر بھی.... تم گھڑی بھر کے لیے بھی وقت نہیں نکال سکتے' جبکہ ہارون....؟" ابھی وہ کچھ اور بھی بولنا چاہتے تھے لیکن شاہ زیب نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا تھا۔

"وہ نکما ہے' فارغ.... اسے کوئی کام نہیں۔ باپ کی کمائی اس کی نسلوں کے لیے کافی ہے' تب ہی وہ خدمت گزاری کے لیے آجاتا ہے۔ جبکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ جو دوسروں کی جی حضوری میں صرف کروں۔" وہ اتنے تلخ لہجے میں بولا کہ ابو ہکابکا رہ گئے تھے۔ اس کے انداز میں کاٹ دار قسم کی اجنبیت تھی۔

"وہ تمہارے تایا ہیں۔ کوئی دوسرے نہیں۔ کاش' میں اتنا محتاج نہ ہوتا۔ اپنے بھائی کی خبر گیری ہی کرلیتا۔ نہ وہ اوپر آسکتے ہیں اور نہ میں نیچے.... جب کبھی ڈاکٹر پاس جاؤں تو گھڑی دو گھڑی کے لیے ان کی صورت دیکھتا ہوں۔" انہوں نے بے حد رنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"اتنی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ ... اپنی پروموشن کی خبر دے آتے۔ اتنی سی بات پہ بھائی جان نے خوش ہو جانا تھا۔" ابو کے مزید شکوؤں پہ زیب نے گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا۔ شاید کلاس ختم ہوگئی ہے مگر....

"امی مٹھائی لے کر گئی تو تھیں۔" اس نے جزبز ہو کر کہا۔

"تم خود کیوں نہیں گئے مٹھائی لے کر؟"

"امی جو چلی گئی تھیں۔ یہ کم تھا کیا؟ پھر نیچے سے کسی کو توفیق ہوئی اوپر آنے کی؟ اوپر آنا تو دور کی بات ہے۔ نشاۃ الثانیہ صاحبہ نے امی کو رسماً بھی مبارک باد نہیں دی۔ ایسی بھی کیا اکڑ؟" زیب نے سلگ کر جواب دیا تھا۔ ابو اس کا سرخ چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

"مصروف ہوگی' تب ہی نہیں آئی۔" انہوں نے بودا سا بھتیجی کا دفاع کیا تھا۔ وہ کاٹ دار انداز میں انہیں دیکھتا رہا۔

"رہنے دیں ابو! ویسے سارے زمانے میں مٹرگشت کرتی ہیں۔ اوپر دریا بہہ رہا تھا۔ بیچ میں خلیج فارس تھی۔" وہ زیر لب تلخی سے بڑبڑایا تھا۔ باپ کو ثانی کی تفریحات کے بارے میں بتا نہیں سکا تھا۔ ہارون کے

ساتھ سیر سپاٹوں کے لیے بڑا وقت تھا۔ اوپر آتے ہوئے جان نکلتی تھی۔

"اور آپ اس کی بے جا حمایت نہ کریں۔ آپ جانتے تو ہیں۔ تایا اور ان کی بیٹی امی کے بارے میں کیسے خیالات رکھتے ہیں۔" اس نے جیسے بات ختم کرنا چاہی تھی، لیکن بات اس طرح ختم کیسے ہو سکتی تھی۔ ابو پریشانی سے اسے دیکھنے لگے تھے۔ کس قدر کبیدہ خاطر تھا اور کس قدر بھائی جان سے متنفر نظر آرہا تھا۔ انہیں لگا سالوں پہلے جوان کے ایک انتہائی قدم کی وجہ سے ساری گتھیاں الجھ گئی تھیں آج بھی اسی طرح الجھی ہوئی تھیں۔ دلوں کی یہ کدورت کئی طریقوں سے نفرت میں ڈھل رہی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس ــــ کا انہیں کوئی سدباب کرنا تھا۔ مگر کیسے؟ شاہ زیب اٹھ کر جانے لگا تو نیچے سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ ساتھ ہی فضول سا شور' لگتا تھا گیند لگنے سے کسی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ شاہ زیب سر پہ ہاتھ مارتا تیزی سے باہر نکلا۔ نیچے والوں کا نقصان ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک خوش گوار سی شام کے بعد پھوپھو کے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھایا تو عرصے بعد کھانے کا مزہ آگیا تھا۔

ڈیڈی بھی بہت خوش لگ رہے تھے۔ پھوپھو کے گھر آکر ان کا مزاج اچھا ہو جاتا تھا۔ پھر ہارون اپنے ہاتھ سے گرین ٹی بنا لایا۔ اس نے ٹرے میں سے کپ اٹھا کر ہارون کو چھیڑا۔

"یہ زنانہ سے کام کرتے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے تم۔ یوں لگتا ہے شیف گلزار کے چھوٹے بھائی ہو۔"

ہارون جو بڑے ہی موڈ میں راکنگ چیئر پہ بیٹھا تھا۔ اس "اعزاز" پہ تھرا ہی اٹھا۔ یعنی کہ شیف گلزار؟ اس کی جان ہی جل گئی تھی۔

"جب تمہارے گھر کے کچن میں آدھا کام کروا آتا ہوں۔ کپڑے دھوتی ہو تو الگنی پہ ڈالتا ہوں۔ تب زنانہ ٹائپ نہیں لگتا؟ اب کچھ زیادہ لگ رہا ہوں۔" اس نے دوبدو چڑ کر جواب دیا تھا۔ ثانی اسے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اچھا تھا۔ نائس اور ہمدرد۔۔۔ خاص طور پر اس کا دل بہت اچھا تھا۔ خوش شکل اور خوش مزاج۔ یہ اس کی اضافی خوبیاں تھیں۔

"ایسے کیا گھور گھور کے دیکھ رہی ہو؟ مجھ پہ ڈورے ڈالنے کا ارادہ تو نہیں۔" ثانی نے اسے ایسے گھورا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"مجھ پہ ابھی اتنے بھی برے دن نہیں آئے۔" اس نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"تم میں اتنی خوبیاں ہوتیں تو اور کیا چاہیے تھا؟ تم تو میری ناک بھی کٹوانے والی ہو۔ میری کزن ہو کر ایسی بزدلی۔۔۔" وہ بہت طریقے سے بات کو گھما کر وہیں لے گیا۔

"تو پھر کیا کروں؟ مجھے یہ لچھن نہیں آتے۔۔۔ اور جسے بیٹھا ہوا کوئی نظر نہ آئے اسے کھڑا ہو کر دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔ کہ دیکھو' ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔۔۔ خدارا۔۔۔ ہم پہ نظر کرم کرو۔" ثانی نے شدید اذیت کی لہر دباتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ہارون کچھ پل کے لیے چپ سا رہ گیا تھا۔ اس نے کتنی سچی بات کہی تھی۔

"یوں پھر کب تک چلے گا ثانی؟" ہارون شدید بے چینی کے عالم میں بولا تھا۔ ثانی خالی خالی نظروں سے ہرے بھرے لان کو دیکھتی رہی۔

"امی کے ارادے اچھے نہیں۔ یہ جو نام نہاد رشتہ داری نبھا رہی ہیں نا۔ کبھی عید' شب رات پہ کوئی میٹھی چیز بھیجنے والی۔ یہ بھی عنقریب ختم ہو جائے گی۔" ہارون کا لہجہ کھرا' کاٹ دار' تلخ تھا۔ ثانی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

"اور سب سے بڑی بات۔۔۔ اس لاٹ صاحب کے اندر کیسی خو بُو آگئی ہے۔ انسان کو انسان نہیں سمجھتا۔ پاس سے گزر جائے گا' لیکن مخاطب نہیں کرے گا۔ جیسے میں نے تو اس کی بھینس چرائی ہو۔" ہارون کو زیب پر بہت ہی غصہ تھا اور اب وہ اپنا غصہ نکال رہا تھا۔

"اس سب کے پیچھے کوئی تو وجہ ہے۔" ثانی نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"وجہ وہی ہماری عزت مآب ممانی جان..." وہ جل کر رہ گیا۔

"کیا خبر... تمہاری ہونے والی ساس بن جائیں۔ کچھ عزت کرلیا کرو۔" ثانی ماحول پہ چھائی کثافت کم کرنے کے لیے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے چھیڑ رہی تھی۔ ہارون کے چہرے پہ حسرت چھا گئی۔

"اپنے ایسے نصیب کہاں؟ وہ تو اپنے لاڈلے کی ہی ساس پلس ماں بننا چاہتی ہیں۔" اس کا انداز کھولتا ہوا تھا۔ اس کے جلے کٹے الفاظ پہ ثانی ہنسنے لگی تھی۔

ان دونوں کی باتوں سے قطع نظر پھوپھو نے ڈیڈی کو گھیر رکھا تھا۔ ہارون فون سننے کے لیے اٹھا تو ثانی کا دھیان ان کی باتوں بلکہ سنجیدہ ترین گفتگو میں اٹک گیا تھا۔

پھوپھو' ڈیڈی سے کہہ رہی تھیں۔ "میں کہتی ہوں۔ بات کو کسی کنارے سے لگاؤ۔ ضمیر سے دوٹوک بات کرو۔" پھوپھو کا انداز دوٹوک تھا۔ اٹل اور فیصلہ کن...

"خود سے کیا بات کروں؟ بیٹی کا باپ ہوں۔ شرم سی آتی ہے۔ ضمیر کو خود سے خیال نہیں۔ اتنے سالوں سے اس کے بیٹے کا نام پہ میں نے اپنی بیٹی کو بٹھا رکھا ہے۔ اب جبکہ اس کے حالات بہتر ہیں۔ زیب اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ لیکن وہ لوگ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ گئے ہیں۔" ڈیڈی کے چہرے پہ برسوں کی تھکن اتر آئی تھی۔ ثانی کا دل بھی بھر آیا۔ اس کا باپ کس قدر بے بس تھا۔ بلکہ اس مقام پر ہر باپ ہی اتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

"مجھے نائلہ کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔ ضمیر سے کھل کے بات کرو۔ ہماری بچی گری پڑی تو نہیں... میں تو خود اپنے ہارون کے لیے... اگر ثانی کا رشتہ بچپن سے طے نہ ہوتا۔ بلکہ زیب کی مرحومہ ماں اپنی بھانجی سے طے کر کے نہ جاتی تو میں ثانی کو کبھی نہ جانے دیتی۔" پھوپھو ہاتھ مل رہی تھیں۔ ثانی انہیں بہت عزیز تھی۔

"میں سوچتا ہوں کچھ... اور کتنا انتظار کروں؟ میں بیمار آدمی ہوں۔ اپنی بچی کا فرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔" ڈیڈی نے کہا تھا۔ پھوپھو نے ان کی تائید کی تھی۔

"میں خود بھی کروں گی۔ آتی ہوں کسی دن۔ زیب کو مبارک باد بھی دینی ہے۔ ماشاءاللہ سے کامیابیوں پہ کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔" بھتیجے کے لیے پھوپھو کے لہجے میں محبت امڈ آئی تھی۔ ثانی سے مزید کچھ سنا نہیں گیا تھا۔ دل ایک دم بوجھل ہو گیا تھا۔ ڈیڈی اور پھوپھو کی باتیں جس حد تک بھی صحیح تھیں۔ زیب سے محبت چاہے جس حد تک بھی تھی پہ۔ اپنی ذات کی بے قدری کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا' وہ ڈیڈی کو اس بات سے... باز ہی رکھے گی۔

☆ ☆ ☆

پھوپھو کے گھر میں ایک اچھا دن گزارنے سے طبیعت کا بوجھل پن کچھ کم ہی ہو گیا تھا۔ پھر ہارون اپنی گاڑی پہ انہیں گھر ڈراپ کر گیا۔

ثانی جیسے ہی اندر آئی ڈیڈی کو ڈرائنگ روم کی گلاس وال کے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گئی تھی۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ وال تک گئی اس کے مانو پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وال کا آدھا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اندر اتنا بڑا سوراخ تھا کہ سامنے والا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ نیا نکور شیشہ چکنا چور پڑا تھا۔

ابھی تو وہ اچھا بھلا سب کچھ چھوڑ کر گئے تھے۔ کس نے یہ سب کیا؟ ثانی کا سلگتا دماغ ایک نکتے پہ جم گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بے ساختہ اوپر کو اٹھی تھیں۔ وہیں ریلنگ پہ سمیرا اور رمیز جھول رہے تھے۔ شاید گاڑی کی آواز سن کر آئے تھے۔ ثانی کی شعلہ بار نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر فوراً" اندر غروب ہو گئے تھے اور ثانی ان کی کارستانی سمجھ چکی تھی۔ اسے بے تحاشا غصہ آیا تھا۔ ہمیشہ ڈیڈی کے سمجھانے پہ ثانی درگزر سے کام لیتی تھی' لیکن آج وہ ان کو معاف کرنے والی نہیں

تھی۔ ڈیڈی اس کا ارادہ بھانپ چکے تھے۔ وہ بے بسی سے "ارے ارے" کرتے رہ گئے۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی اور اب ثانی کی اوپر سے تیز تیز بولنے کی آواز آرہی تھی۔

"تمہارا گھر ہے یا اصطبل... ڈنگروں کا باڑہ؟ یا کرکٹ گراؤنڈ؟ نہ کوئی تمیز ہے، نہ کوئی اخلاق... گھر سے کہیں جاؤ تو یہ بے نتھے بیلوں کی طرح فوراً "میدان خالی دیکھ کر نیچے بھاگ آتے ہیں۔" وہ غصے کے عالم میں بہت اونچا بول رہی تھی۔ اتنا اونچا کہ ڈیڈی کو نیچے اختلاج قلب ہونے لگا تھا۔

"قیامت تو نہیں آگئی۔ شیشہ ہی ٹوٹا ہے۔ تم تو لڑنے مرنے پہ اتر آئی ہو۔ ذرا جو تمیز ہو۔" نائلہ کے آگ لگاتے انداز نے ثانی کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔

"مجھ میں تو ذرا بھی تمیز نہیں۔ کیونکہ مجھے تمیز سکھانے والی تو مر گئی۔ لیکن آپ تو بہ فضل خدا حیات ہیں۔ آپ ان بچوں کو اتنا نہیں سمجھا سکتیں۔ کہ اتنا چھوٹا سا صحن پلے گراؤنڈ نہیں ہو سکتا۔ ہر دفعہ یہ لوگ کوئی نہ کوئی قیمتی چیز توڑ دیتے ہیں۔ گلاس وال توڑ دی۔ اتنا بڑا نقصان؟ اس کو کون پورا کرے گا؟"

وہ تیز لہجے میں بولتی اس بات سے ناواقف تھی کہ گھر میں اس وقت شاہ زیب بھی موجود تھا اور اس نے اپنے کانوں سے بہت کچھ سن لیا تھا۔ اسے باہر آنا ہی پڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ثانی چپ ہو گئی تھی۔ نائلہ نے فوراً "فائدہ اٹھایا تھا۔

"آو زیب! دیکھ لو اس لڑکی کی زبان، کہتی ہے، میں نے بچوں کو تمیز نہیں سکھائی۔ ایسی بدتمیز لڑکی؟ ایسی لمبی زبان... بڑے چھوٹے کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔" نائلہ نے تو لمحوں میں رونا شروع کر دیا تھا۔ جیسے ثانی کی بدتمیزی نے انہیں بڑا دھچکا پہنچایا ہو۔ ثانی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ کیونکہ شاہ زیب اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

"تمہیں اس لہجے میں میری ماں سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تم ہوتی کون ہو امی کو یہ بتانے والی کہ انہوں نے اپنے بچوں کی اچھی تربیت نہیں کی۔"

شاہ زیب کا دھیما پر غصیلہ لہجہ... ثانی کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ چاچی نے بات کو غلط رنگ دیا تھا تو بیٹے نے بھی اپنی مرضی کے معنی و مطالب نکال لیے تھے۔ شاہ زیب کا دوبدو بات کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" ثانی ہکلا سی گئی تھی۔ جبکہ نائلہ تو چہک ہی اٹھیں۔

"دیکھو... دیکھو... منہ پہ مکر رہی ہے۔ اللہ کیسی جھوٹی لڑکی ہے۔" نائلہ کے واویلے پہ ثانی خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی تھی۔

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔ میں تو صرف یہ کہنے کے لیے آئی ہوں کہ سمیر، رمیز اب بچے نہیں ہیں۔ کھیلنے کے لیے پلے گراؤنڈ جایا کریں۔ آج گلاس وال توڑ ڈالی۔ کبھی کوئی گملا، کبھی گل دان، کبھی کوئی روشن دان... ان کے نشانے پہ رہتا ہے۔ آئے دن نقصان کرتے ہیں۔ ہمارا کون ہے جو کاریگروں کے پیچھے بھاگے۔ ٹھیک کروائے۔ انہیں کچھ خیال کرنا چاہیے۔"

ثانی قدرے دھیمے لہجے میں بولتی جانے کے لیے مڑی ہی تھی جب پیچھے سے شاہ زیب کی سلگتی آواز سنائی دی۔ "جو تمہارا نقصان ہوا ہے وہ پورا ہو جائے گا۔ لیکن آئندہ تم اس انداز میں میری ماں سے گفتگو کرنے سے پرہیز کرنا۔ ورنہ میں بہت بری طرح سے پیش آؤں گا۔"

شاہ زیب کے سخت لہجے اور الفاظ پہ ثانی نے سخت توہین محسوس کی تھی۔ اس کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں بھینچا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی تھی۔ اس حال میں کہ اس کے بے آواز آنسو موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

ہارون آیا تھا، اسے اتنا اداس دیکھا تو اس سے رہا

نہیں گیا۔ بس تفصیل پوچھنے کی غلطی کرلی تھی۔ پھر جو ثانی شروع ہوئی تو پھر چپ ہی نہ ہو سکی۔

''اب روکیوں رہی ہو گلاس وال تو سیٹ ہو چکی۔ یہ مگرمچھ کے آنسو کیوں بہا رہی ہو۔'' اس کا انداز ہلکا پھلکا سا تھا۔ وہ اسے چپ کروانا چاہتا تھا۔ ثانی کو اور بھی شدت سے رونا آگیا۔

''اسی بات کا تو رونا ہے۔ اس نے ٹھیک کروا دی اور جاتے جاتے باتیں بھی سنائیں کہ میں اٹھ کر تسلی کرلوں۔ کہیں پھر سے ان پہ الزام نہ دھر دوں۔'' میں نے کوئی الزام نہیں دھرا تھا۔ بس اتنا کہا۔'' وہ ایک ہی سانس میں روانی سے بولتی جا رہی تھی' جب ہارون نے بے ساختہ ٹوک دیا تھا۔

''جو تم نے کہا تھا' وہ میں نے تین سو تیرہ مرتبہ سن لیا ہے۔ اب تو مجھے لفظ لفظ حفظ بھی ہو گیا۔ چاہو تو میں دہرا دیتا ہوں۔ تم زحمت نہ ہی کرو۔'' ہارون کے کہنے پر وہ خفیف ہو گئی تھی۔

''اصل دکھ تمہیں زیب کے بی ہیویر پہ ہے تو کسی حد تک وہ ٹھیک تھا۔ تمہارا ردعمل خاصا جارحانہ رہا۔ یہ بات آرام سے بھی کی جا سکتی تھی۔ جبکہ تم ماہی کا مزاج بھی جانتی ہو۔'' اب وہ اسے رسان سے سمجھا رہا تھا۔ ثانی سوں سوں کرتی ہونق سی ہو گئی۔

''تو اب میں کیا کروں؟'' اس کے انداز میں بلا کی معصومیت تھی۔

''سوری.... '' ہارون نے اطمینان سے کہا تھا۔ ''تم اب سوری کرلو۔''

''مگر کیسے؟'' وہ ہونق سی ہو گئی تھی۔

''اپنی اس پھینی ناک کو ایک طرف رکھ کے.... شاہ زیب سے سوری کرلو۔ اس طرح بات ختم ہو جائے گی اور اس کی کدورت بھی.... '' ہارون نے مشورہ دیا تھا۔ ثانی تذبذب کا شکار تھی۔ اوپر وہ جانا نہیں چاہتی تھی اور نیچے وہ آتا نہیں تھا۔

بھلا ہارون جیسا اعتماد وہ کہاں سے لے آتی؟ اس نے گہرا سانس کھینچا اور بے بسی سے صحن میں چکر کاٹنے لگی۔ کیا پتا شاہ زیب کسی بھی وقت نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آجاتا۔ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سلونی شام دریچوں سے پھسلتی رات میں بدل رہی تھی۔ آسمان پہ جا بجا ستارے چمک رہے تھے۔ کہیں درختوں کی اوٹ میں شام کے بعد لوٹ کر آنے والے پرندوں کا شور تھا۔

افزا اپنے ہی دھیان میں الگنی سے کپڑے اتارتے ٹھٹک گئی تھی۔ کوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر آرہا تھا۔ پھر جیسے ہی اس کی بالکونی پہ نظر پڑی۔ ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔

افزا گھبرا سی گئی۔ ہارون اندر جانے کے بجائے سیدھا بالکونی میں آگیا تھا۔ افزا نے رخ موڑ لیا تھا۔ یہ شوخ آنکھوں والا زیب کا کزن اسے بڑا ہی چھچھورا لگتا تھا۔

''اہم.... '' اس نے کھنکھارا اور سلام جھاڑا.... ''سلامتی ہو.... کیا حال احوال ہیں؟'' وہ ایسے بول رہا تھا جیسے بڑا ہی پرانا دوستانہ ہو۔ افزا نے جواب نہیں دیا تھا۔ بلکہ رخ موڑے کپڑے اکٹھے کرتی رہی۔

''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔ اس بڑبڑاہٹ کا جواب اس کے اندر سے آیا تھا۔ بہت اندر سے دل کی گہرائیوں کے پار سے....

''وہ تو ہمیشہ تمہاری طرف ہی آتا ہے۔ اسی طرف جہاں تم ہو۔'' اس جواب پہ وہ ہراساں سی ہو گئی تھی۔ جبکہ ہارون اس کے تاثرات پڑھتا اندر ہی اندر محظوظ ہو رہا تھا۔

''اس خاموشی کو کیا سمجھوں؟ اک ادا یا بے زاری؟'' وہ ریلنگ سے کمر ٹکا کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

''مجھے نہیں پتا۔'' افزا خفا خفا سی بولی تھی۔ ''آپ ادھر کیوں آئے ہیں۔ پلیز اندر چلے جائیں۔ اگر زیب بھائی نے دیکھ لیا تو اچھا نہیں ہو گا۔'' اس نے انگلیاں

چھپاتے ہوئے کپڑوں کی پوری ڈھیری فرش پہ گرا دی تھی۔"

ہارون نے آگے بڑھ کے فرش پہ گرے کپڑے اٹھا کر چارپائی پہ رکھے اور پھر بڑے انداز سے بولا تھا۔

"میں تو چاہتا ہوں... تمہارا زیب بھائی دیکھ ہی لے۔ کم از کم یہ بیل تو منڈھے چڑھے۔" ہارون کے معنی خیز لہجے پہ وہ پوری جان سے گھبرا گئی تھی۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ زیب بھائی کی خبر ہے؟ اور امی... یعنی میری امی؟ وہ آپ کا قیمہ بنا دیں گی۔"

مارے ہکلاہٹ کے وہ الٹا سیدھا بولتی ہارون کے دل میں سیدھا سیدھا چھید کر گئی تھی۔ وہ کراہ کر رہ گیا تھا۔

"تمہاری امی کا پتا ہے۔ وہ تو سالم نگلتی ہیں۔ قیمہ بنانے کا کیا تردد کریں گی اور رہی زیب بھائی کی بات' تو اس سے میں نپٹ لوں گا۔ اپنی جان ہے وہ..." ہارون نے بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ اس کی صورت تکنے لگی تھی۔ مارے حیرانی سے... یہ اور بات تھی کہ زیادہ دیر اس کی شوخ نگاہوں کا مقابلہ نہیں کر سکی تھی۔

"اور وہ جان' آپ کی جان نکال لے گا۔" افزا نے جیسے ڈرانا چاہا تھا۔

"بھول ہے تمہاری... ایسا نہیں ہو گا۔" ہارون نے لاپروائی سے کہا۔ پھر اچانک اس کے قریب آ گیا۔ وہ دیوار سے لگ گئی تھی۔

"ایک بات بتاؤ افزا! جس چنگاری نے میرے اندر کی دنیا کو برزخ بنا رکھا ہے۔ اس کی تپش ابھی تک تمہارے اندر نہیں پہنچی؟" اس نے اچانک ہی آر یا پار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن افزا... وہ تو جیسے کرنٹ کھا کر اچھل پڑی تھی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ہارون اندر تک سلگ گیا۔

"کچھ نہیں... جھک مار رہا ہوں۔ اتنے عرصے سے... تف ہے ہارون تجھ پہ۔"

افزا کے بدن میں جیسے جان ہی باقی نہیں رہی تھی۔ سینے سے لگے کپڑے ایک مرتبہ پھر سجدہ ریز تھے اور ہارون دھپ دھپ کرتا رخ پلٹ کر نیچے جا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

لاؤنج میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ جب وہ کپڑوں کے ڈھیر کو سینے سے لگائے اندر آئی تو لاؤنج سے دھیمی دھیمی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ زیب گھر آ چکا تھا۔ اس کے بھائی ٹیوشن پڑھنے گئے تھے۔ ابو شاید نماز پڑھ رہے تھے۔ سوا امی اور زیب کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ یہ راز و نیاز بھری باتیں وہ دونوں ہی کرتے تھے۔ صلاح و مشورے' تبصرے اور تجزیے... اس کا دل ابھی تک کانوں میں دھڑک رہا تھا اور ہتھیلیاں پرنم تھیں۔ ہارون کا چہرہ... آنکھیں' انداز' گفتار... ایک ایک ادا "اعلان محبت" کے لیے کافی تھی۔ اس صورت میں جبکہ اس کی آنکھیں شاہ زیب کے خواب بننے لگی تھیں اور اس کی امی سپنوں میں بھی اسے زیب کی دلہن بنے دیکھتی تھیں۔ اس صورت میں ہارون بھلا کن راہوں کی مسافرت اختیار کر رہا تھا؟ اسٹور روم کی طرف جاتے جاتے ٹھٹک گئی تھی۔ اسے امی کی ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔

"تم سوچ لو زیب! جو تمہارا باپ چاہتا ہے' وہ میری زندگی میں کبھی نہیں ہو گا۔ میں مر بھی جاؤں تب بھی نہیں..." امی کی آواز میں صاف دھمکی تھی۔ دھونس بھری دھمکی... ان کے لہجے میں ایک مان تھا۔ وہ زیب کا جواب سننے کے لیے رک گئی تھی۔

"جو آپ چاہتی ہیں' ویسا ہی ہو گا۔ ابو کچھ نہیں کر سکتے۔" زیب کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

"تمہارے ابو تیار بیٹھے ہیں۔ وہ ہر صورت رشتہ لے کر جانا چاہتے ہیں۔ میرے لاکھ سمجھانے پہ بھی... بھائی جان اور ان کی بیٹی کے نخرے آسمانوں پہ ہیں۔ وہ ہمیں رشتہ نہیں دیں گے' بلکہ آج کل ہارون ان کے دماغوں پہ سوار ہے۔ تو پھر اپنی بات گنوانے کا فائدہ؟"

اب وہ بات کو صاف دوسرے رنگ میں بدل رہی تھیں۔ شاہ زیب کچھ لمحہ کے لیے چپ رہ گیا تھا۔

"ابو سے میں خود بات کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" کچھ دیر بعد وہ بمشکل بولا تھا۔

"وہ نہیں سنیں گے۔ انہوں نے مجھے دوٹوک کہہ دیا ہے۔ اپنی بھتیجی کی زبان درازی دیکھتے ہوئے بھی..... ابھی دو دن پہلے وہ میری گھر آکر اتنی بے عزتی کر گئی ہے۔ اتنی باتیں سنا گئی ہے۔ ابھی وہ ذرا احترام لحاظ نہیں کرتی۔ بعد میں تو جوتی کی نوک پہ رکھے گی۔" انہوں نے آنکھیں مسلتے ہوئے کہا۔ زیب پریشان ہوگیا۔ ماں کے آنسو اسے بے قرار کر رہے تھے۔

"جو آپ چاہیں گی، وہی ہوگا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اٹھ کر اندر جارہا تھا۔ افزا جلدی سے کچن میں گھس گئی۔ امی ابھی تک لاؤنج میں تھیں۔ زیب اپنے کمرے میں چلا گیا تو افزا کچن سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری تھی۔ جسے ماں کے سامنے رکھتے ہوئے وہ خود بھی تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔ نائلہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے کی رنگت کملائی سی تھی۔ پھیکا رنگ، اداس آنکھیں.....

"کیا ہوا ہے افزا؟ باہر کوئی آیا تھا؟" انہوں نے محتاط انداز میں پوچھا افزا اندر سے گھبرا گئی تھی۔

"ہارون....." اس نے بمشکل ہی کہا تھا۔ نائلہ چونک گئیں۔

"وہ کیوں آیا تھا؟" نائلہ کی آنکھوں میں حیرت پھیلی۔ ان کے انداز میں ناگواری تھی۔ افزا نے نفی میں سر ہلایا۔

"پتا نہیں..... شاید زیب سے ملنے....."

"اچھا..... اچھا..... اب زیب کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہوجاتی۔ زیب کو ان لوگوں سے دور ہی رہنا چاہیے۔" اب وہ اس معاملے کو مزید لٹکانا نہیں چاہتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اگلی سویر بڑی پرتپش تھی۔ دھوپ بھری..... گرمی کا زور کچھ زیادہ ہی لگ رہا تھا۔ افزا نے صبح ہی صبح اٹھ کے صفائی کرلی تھی۔ نائلہ کچن میں ناشتا بنا رہی تھیں۔ بچے کالج، اسکولوں میں جاچکے تھے۔ زیب ابھی اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا۔ آج اس نے ذرا دیر سے جانا تھا۔

جیسے ہی وہ کمرے سے تیار ہو کر باہر نکلا نائلہ بھی کچن سے ٹرے سجا کر برآمد ہوئی تھیں۔ زیب پہ نگاہ پڑی تو زیر لب ماشاءاللہ کہا تھا۔

معاً" ضمیر بھی اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے باہر آگئے تھے۔ ہاتھ میں اخبار تھا۔ جسے انہوں نے رول بنا کر تخت پہ اچھال دیا تھا۔ زیب کچھ چونک گیا تھا۔ نائلہ نے زیب کے سامنے چھوٹی تپائی پہ ٹرے رکھی۔ وہ باپ کا انتظار کرنے لگا تھا، تاکہ اکٹھے ناشتا کرلیں، نائلہ نے بتایا۔

"ضمیر نے چائے لی ہے۔ ٹھہر کے ناشتا کریں گے۔ تم شروع کرو۔" نائلہ بھی قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ایک ٹک زیب کو دیکھ رہے تھے۔ جانے کیوں دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ معاً" ضمیر نے گہرا سانس کھینچا اور گلا کھنکھار کے زیب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"زیبی! آج ذرا وقت پہ گھر آجانا..... اور واپسی پہ اچھی سی مٹھائی بھی لانا۔" ان کا انداز نرم تھا۔ نائلہ نے چونک کر شوہر کی طرف دیکھا تھا۔

"خیر کیوں..... شوگر بڑھانے کا ارادہ ہے ابو!" زیب کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔ ضمیر دھیمے سے مسکرا دیے۔

"بس یوں ہی..... دل چاہتا ہے کچھ ہلا گلا سا ہو..... زندگی پہ جمود سا طاری ہے۔"

"تو اس جمود کو توڑنا چاہتے ہیں۔ شوگر بڑھا کے، اپنے قل کروا کے گیدرنگ تو ہوجائے گی، مگر آپ دیکھ نہیں پائیں گے۔" نائلہ نے اندر اٹھتے اضطراب کو بمشکل دباتے ہوئے بات کو اور رنگ دیا۔

"نہیں..... میں زیب کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ماشاءاللہ سے اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ ہمارا اور اپنی بیوی، بچوں کا خرچا اٹھا سکتا ہے۔ دیر مناسب نہیں لگتی۔" ضمیر نے نرمی سے زیب کا چہرہ ٹٹولتے کہہ رہے تھے۔ اس کی خاموشی سے ضمیر کو ڈھارس سی پہنچی۔ اس نے انکار نہیں کیا تھا۔

"میں تو خود اس دن کے انتظار میں ہوں۔ اللہ یہ

مبارک دن لائے۔ میں اپنے بیٹے کو دولہا بنے دیکھوں۔" نائلہ نے سچائی کے ساتھ کہا تھا۔ ضمیر نے گہرا سانس اندر کو کھینچا تھا۔ وہ نائلہ کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"ہوں..." انہوں نے ہنکارا سا بھرا تھا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ تم آج مٹھائی لانا۔ میں نیچے جاؤں گا بھائی جی سے شادی کی تاریخ لینے۔ برسوں گزر گئے رشتے کو۔ اب اس معاملے کو تکمیل تک پہنچنا چاہیے۔"

ضمیر کے الفاظ نہیں تھے۔ کوئی بم تھا جو ان کے سروں پہ پھٹا تھا۔ نائلہ تو ایسے ہو گئیں جیسے برف کی کوئی سل ہو۔ ایسی ہی کیفیت زیب اور افزا کی تھی۔ افزا بھی ماں کی طرح کچن کے چوکھٹے میں ہی جامد ہو گئی تھی۔

"میں شادی کروں گا ابو... ضرور کروں گا... لیکن ثانی کے ساتھ نہیں۔ یہ بات میں بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ بس پہلی اور آخری دفعہ کہہ رہا ہوں۔" زیب کے ٹھنڈے برف سے لہجے نے اب کی بار ابو کو برف بنا دیا۔ وہ ششدر سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے تھے۔

زیب نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اب وہ ٹشو سے انگلیاں پونچھ رہا تھا۔ نائلہ جو لحہ بہ لحہ ریزہ ریزہ ہو رہی تھیں۔ زیب کے مضبوط لہجے پہ جیسے قطرہ قطرہ پھر سے جمع ہونے لگیں۔ ان کے حلق میں اٹکتی سانسیں بحال ہو رہی تھیں۔ یہ ہی حال دیوار سے لگی افزا کا بھی تھا۔

"ثانی سے نہیں... تو کس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" بہت دیر بعد ابو نے کپکپاتی آواز میں پوچھا تھا۔ ان کا لہجہ زخمی تھا اور آواز کانپ رہی تھی۔

"کسی سے بھی... کوئی بھی ہو... بس نشاۃ الثانیہ صاحبہ نہ ہوں۔" اس کا لہجہ بلا کا کھردرا اور کاٹ دار تھا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی نفرت پھیل گئی تھی۔ ابو اس کا چہرہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

"اس انکار کی کوئی وجہ..." انہوں نے بہت دیر بعد لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا تھا۔ زیب کچھ پل کے لیے چپ رہا، پھر گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"ضروری نہیں کوئی وجہ ہو... اگر ہو بھی تو ہر وجہ بتانے والی نہیں ہوتی۔ بس یوں سمجھ لیں، آپ کے بھائی صاحب بہت اونچے لوگ ہیں اور میں ان کے قابل نہیں۔" اس کا دوٹوک انداز انہیں بے چین کر گیا تھا۔ جبکہ نائلہ اب پرسکون تھیں۔

"شاہ زیب... یہ نہیں ہو سکتا... تم انکار نہیں کر سکتے۔ میرا بھائی ٹوٹ جائے گا۔ میرا خاندان ٹوٹ جائے گا اور تمہاری مرحومہ ماں کی یہ آخری خواہش تھی۔ تم مدحت کی آخری خواہش کو پورا نہیں کرو گے؟ تمہاری مرحومہ ماں کا خواب..." بولتے بولتے ابو کی آواز رندھ گئی تھی۔ جانے انہیں کیا کچھ یاد آگیا تھا۔ شاید اپنی زیادتیاں اور مدحت کا صبر۔ وہ سینہ مسلتے سخت بے چین تھے۔ زیب نے ایک طویل اور گہرا سانس لبوں سے برآمد کیا تھا۔ پھر جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پرسکون تھا۔

"میری مرحومہ ماں کے تو بہت سے خواب تھے۔ جو سب ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے تھے۔ سارے خواب پورے نہیں ہوتے، یہ بھی نہ ہوا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" زیب کے اطمینان پہ نائلہ تک ششدر رہ گئی تھیں۔ دیوار سے لگی افزا بھی یک ٹک زیب کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ماں بہت خوش تھی کہ زیب اس کے حسب منشا ڈٹ گیا ہے۔ لیکن جانے کیوں افزا کا دل کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔ اسے زیب کی آنکھوں میں ویرانی نظر آرہی تھی۔ یہ ویرانی اس کی ماں کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ اس ویرانی کو محبت کرنے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ افزا کا دل قطرہ قطرہ پگھلنے لگا تھا۔

"میری بات مان لو زیب! تمہاری ماں کی روح کو بہت تکلیف پہنچے گی۔" ابو کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔ زیب نے لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بھینچ لیں۔ پتلیوں کے اس پار بہت کچھ تھا۔ کچھ احساس، کچھ جذبے، کچھ محبت کے شگوفے، کچھ خواب، کچھ تمنائیں، کچھ چاہتیں، لیکن ضروری تو نہیں، ہمیں سب کچھ اسی زندگی میں میسر آجائے۔

"میری ماں جب زندگی کو موت سمجھ کر جی رہی تھی۔ اس کی روح کو تب بھی بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ بس یہ تھا کہ اس وقت آپ کو ان کی تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ اب ان کو کیا تکلیف پہنچے گی اب وہ ساری تکلیفوں سے بے نیاز ہو چکی ہیں۔" زیب کے لہجے میں چٹانوں سی سختی بھر گئی تھی۔

"تمہیں اس عورت نے متنفر کر رکھا ہے۔ تمہیں اپنی ماں کی آخری خواہش کا بھی احساس نہیں رہا۔" وہ جیسے حلق کے بل چلائے تھے۔ یوں کہ افزا کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہوئی تھی اور نائلہ کی رنگت فق ہو گئی تھی۔ انہوں نے آج ضمیر کا ایک اور ہی روپ دیکھا تھا۔

"تمہیں اس عورت نے ورغلا رکھا ہے۔ متنفر کر دیا ہے۔ یہ سازشی عورت...." جانے وہ غصے کی انتہا میں کیا کچھ کہنے والے تھے۔ ان کے الفاظ پہ زیب کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا تھا۔

"یہ عورت آپ کی بیوی ہے۔ آپ اسے میری ماں پہ سوکن بنا کر لائے تھے۔ میری ماں اس صدمے سے مری یا بیماری کے غلبہ پانے سے....؟ میں نے تو صرف انہیں اپنی ماں کے بعد بطور ماں قبول کیا تھا۔ آپ جو بھی سمجھیں.... بس آپ کی بھتیجی میری بیوی نہیں بن سکتی۔" وہ زہر خند سا بولتا چلا گیا تھا۔ ابو لمحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گئے تھے۔

"زیب!" ان کی رنگت اڑ گئی تھی یا شاید وہ سچائی کو برداشت نہیں کر سکے تھے۔

"ثانیہ تمہاری ماں کی سگی بھانجی ہے۔" اب کے ان کی آواز کپکپائی ہوئی تھی۔ انہیں اپنے کمزور لہجے پہ ترس آیا تھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ بے نیاز تھا اس نے اٹھ کر موبائل اور لیپ ٹاپ اٹھایا۔ ابو نے بھیگی آنکھوں سے اسے جاتے دیکھنا چاہا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دھند آ رہی تھی۔

"تمہاری منگیتر ہے۔" ان کا لہجہ اور بھی کمزور تھا۔

"وہ کبھی تھی....." اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"یہ رشتہ تمہاری مرضی سے ہوا تھا۔" وہ اسے کچھ یاد دلا رہے تھے۔

"کبھی ہوا تھا۔" زیب جیسے سب کچھ بھول چکا تھا۔ ایک ماضی تھا۔ جس کی قبر میں اس نے سب کچھ دفن کر دیا تھا۔ ابو اپنا سینہ مسلنے لگے۔

"ثانی تمہاری پسند تھی۔" وہ تھکنے لگے تھے۔ زیب آگے بڑھ رہا تھا۔

"کبھی تھی۔" وہ دروازے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اب وہ دروازہ کھول رہا تھا۔ اسے ابو کی آواز پھر سے سنائی دی تھی۔ اس آواز میں بہت کچھ تھا۔ گئے دنوں کی یادیں۔ کچھ اچھی، کچھ بری اور ان کے پیچھے جھانکتی محبت....

"ثانی تمہاری محبت تھی شاہ زیب!" انہوں نے وہیل چیئر کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور ان کے سفید بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

اس دفعہ شاہ زیب "کبھی تھی" کہہ کر آگے نہیں بڑھا تھا۔ کچھ تھا جس نے اسے روک لیا تھا۔ پھر اس نے گردن موڑ کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پہ واضح شکستگی تھی۔ ایسی ہی شکستگی اور تھکن شاہ زیب کے چہرے پہ دھول کی مانند اتر رہی تھی۔ افزا سے زیب کے چہرے پہ اتری تھکن دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگائے لگائے پلکیں سختی سے میچ لی تھیں۔ تب ہی دو آنسو بغاوت کرتے آنکھوں کے کناروں سے ٹوٹ کر گر پڑے تھے۔ آج وہ عمر بھر کے لیے مفلس ہو گئی تھی۔

✡ ✡ ✡

درختوں کی دو رویہ قطار تلے ذیلی سڑک تھی۔ گھنی چھاؤں سے ڈھکی یہ سڑک بہت ٹھنڈی تھی۔ جس کے اوپر چرمرے پتے جگہ جگہ گرے پڑے تھے۔ شاید تیز ہوا سے جھڑے تھے۔ وہ ان پتوں کو جوتوں تلے روندتا چل رہا تھا۔

اسے آج کیا کچھ نہیں یاد آرہا تھا۔ وہ سب کچھ جو کبھی بھولا نہیں تھا۔ بھولنے والا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی ماں کی بیماری اور پھر اس کا تڑپ تڑپ کر مرجانا۔

لیکن پھر بھی زیب نے سب کچھ بھلا دیا۔ زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے۔۔۔ زندہ رہنے کے لیے۔۔۔ جینے کے لیے۔۔۔ کچھ رشتوں کو بچانے کے لیے۔۔۔

وہ چلتا چلتا رک گیا تھا۔ پھر قریب ہی لکڑی سے بنے ایک اونچے چوکور بینچ پہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بہت پرانے منظر عکس سے تصویر بننے لگے تھے اور اس تصویر کے اندر ایک نیا چہرہ تھا۔ شگفتہ' تروتازہ اور خوب صورت' ایک ایسا دلکش چہرہ جسے دیکھ کر اس کی ماں کے چہرے پہ موت کی سی مردنی چھا گئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے کناروں کو بھیگتا سا محسوس کیا۔ اس کا ذہن بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

وہ خزاں کے دن تھے۔ ایسے ہی درختوں کے پتے' جھڑ جھڑ کر گرتے اور سڑکوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ وہ پتوں سے بھری سڑک پہ پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں کتابوں کا تھیلا تھا۔ وہ بہت سست قدموں سے چل رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر جانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

وہ گھر جس میں زیب کا ٹھکانا تھا۔ وہ اس کے باپ کا گھر نہیں' بلکہ تایا کیپٹن خضر حیات کا گھر تھا۔ زیب کے ابو کی اچھی بھلی جاب اچانک ختم ہوگئی تھی۔ اس کی امی بدحت بیمار تھیں۔ ابو کی نوکری ختم ہوگئی تو ان کے گھر کا نظام درہم برہم ہوگیا تھا۔ زیب کی پڑھائی تک چھوٹ گئی تھی۔ مالک مکان نے ایک سال تک کرایہ نہ دینے کی وجہ سے انہیں گھر سے نکال دیا تھا۔ تب اس کی خالہ فرحت جو اس کی تائی بھی تھیں' انہیں اپنے گھر ہمیشہ کے لیے لے آئی تھیں۔ ابو تب بھی بے روزگار ہی تھے۔ تائی نے ان کے گھر کا خرچا بھی اٹھالیا تھا۔ زیب کا اسکول بھی شروع ہوگیا اور مالک مکان کے عنایت سے بھی جان چھوٹ گئی تھی۔ کسی حد تک زندگی میں سکون آگیا تھا۔

ابو اور تایا میں بہت محبت تھی تو تائی اور امی میں بھی بڑا پیار تھا۔ اسے یاد تھا۔ اس کے گھر اوپر کم ہی کھانا پکتا تھا۔ تائی ہمیشہ کھانا بنا کر اوپر بھیج دیتی تھیں۔ زیب کو تب نہیں پتا تھا کہ اس کی بھاری فیس' گھر کے اخراجات اور امی کی دوائیوں کا خرچا کون اٹھاتا ہے۔

بس یہ سب کام جن پر ان کے گھر میں ہمیشہ لڑائی ہوتی تھی' خود بخود سرانجام پا جاتے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔

تایا کے گھر میں آجانے کے بعد زندگی میں ایک ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ابو کی امی سے لڑائیاں کم ہوگئی تھیں۔ اب وہ امی کو بیماری کے اتنے طعنے نہیں دیتے تھے۔ گھر کے خرچے پہ بھی تکرار نہیں ہوتی تھی۔

زیب تھوڑا بڑا ہوا تو اسے اندازہ ہوا تھا۔ اس کی شفیق تائی کی بدولت بہت سارے معاملات خاموشی کے ساتھ طے پا جاتے تھے۔ تائی کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ اسی طرح امی کو اپنی اکلوتی بھانجی سے بڑا پیار تھا۔ زندگی میں ایک روانی تھی۔ ایک سکون تھا۔ امی نے ثانی کو زیب کے لیے بہت بچپن میں ہی مانگ لیا تھا۔ لیکن یہ رشتہ بہت ساری بدگمانیوں اور رنجشوں تلے دب گیا تھا۔ ایک ایسی آندھی اٹھی تھی جو زیب کے گھر کو تنکا تنکا بکھیر گئی تھی۔

اس کے ابو نے فیکٹری میں اپنے ساتھ ملازمت کرتی ایک طرح دار' خوب صورت لڑکی سے شادی کرلی تھی۔ نہ صرف اس سے نکاح کرلیا تھا' بلکہ اسے اپنے ساتھ گھر میں بھی لے آئے تھے۔ اس کی بیمار ماں پہ ستم ڈھانے کے لیے۔۔۔

یہ ایک قیامت تھی' جو آئی اور ٹھہر گئی۔ ابو کی دیدہ دلیری' امی کی خاموشی' نیچے تائی اور تایا کا بانگ دہل نفرت اور لاتعلقی کا اعلان۔۔۔ نیچے والوں نے ابو کی دوسری شادی کو کسی طور قبول نہیں کیا تھا۔ تائی ابو کو کسی بھی طور معاف کرنے پہ تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اوپر آنا چھوڑ دیا اور اپنا دست شفقت ان کے گھرانے سے اٹھالیا تھا۔

کچھ عرصہ اسی لاتعلقی کے درمیان گزر گیا۔ تائی کی آمدورفت کم ہوئی تو اوپر نائلہ نے اپنا سکہ جمالیا۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی بیٹی افزا کو بھی اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ افزا اس کے پہلے شوہر سے اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی امی نائلہ کی اجارہ داری بڑھتے دیکھ کر خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھیں' لیکن اس کی خالہ نے جو تائی بھی تھیں نائلہ کے ساتھ کھلم کھلا "لڑائی" کا اعلان کردیا تھا۔ وہ انہیں اپنے گھر سے بھی نکالنا چاہتی تھیں اور یہ ایک انتہائی فیصلہ تھا۔

نائلہ کو گھر سے نکالنے کا مطلب یہ تھا کہ زیب کا بھی اس گھر سے چلے جانا.... ابو اور امی کا بھی نکل جانا... لیکن تائی' امی اور زیب کو روکنا چاہتی تھیں۔ یہ حکم بس نائلہ اور اس کی بیٹی افزا کے لیے تھا۔ لیکن جب ابو نے سنا تو ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ ابو نے بہ بانگ دہل اعلان کردیا تھا۔

"اگر نائلہ اس گھر میں نہیں رہے گی تو وہ اور زیب بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔ مدحت اکیلی بہن کے چرنوں میں رہیں۔"

ابو کے اس ظالمانہ فیصلے نے امی کو اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ ان کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہوگئی تھیں۔ نائلہ کی محبت کا جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ ابو کو نائلہ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ادھر تائی اپنے فیصلے سے ہٹنے پہ تیار نہیں تھیں۔

یوں ایک دن ابو نے نائلہ' افزا اور شاہ زیب کو لیا اور تایا خضر حیات کا مکان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس صورت میں کہ زیب کی بیمار ماں اسی گھر میں بے یارومددگار اکیلی رہ گئیں۔ شوہر اور بیٹے کی جدائی کا لامحدود غم سینے سے لگا کر....

☆ ☆ ☆

سبک رفتاری سے گزرتے وہ دن زیب کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھے۔ وہ اپنی امی کی یاد کو سینے سے لگا کر رات بھر تکیے میں منہ دیے کر روتا تھا۔ اسے اس گھر میں ہر چیز سے وحشت ٹپکتی نظر آتی تھی۔

یہ چھوٹا سا ایک کمرے کا مکان تھا۔ انتہائی غلیظ علاقے میں۔ بہت گندا' پرانا اور جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا۔ بارش آتی تو چھتوں سے ٹپک ٹپک کر سیلاب آجاتا تھا۔ گلیوں میں پانی کھڑا ہوجاتا۔ ابو کی محدود آمدن میں اس مکان سے بہتر ٹھکانا ملنا بہت مشکل تھا۔ چار افراد کھانے والے' جن میں ایک دو سال بعد مزید اضافہ ہوتا گیا تھا۔

یوں کچھ عرصہ کھینچ تان کے وقت بمشکل گزرا اور ایک دن تایا ان کے لیے دوبارہ زندگی کا پیغام لے کر آگئے تھے۔ تایا کی آمد ان کی گھٹن زدہ زندگیوں میں بہار کا ایک جھونکا ثابت ہوئی تھی۔ تایا' ابو کو لینے آئے تھے۔ امی کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ زیب سے ملنا چاہتی تھیں۔ تائی نے بھی سینے پر پتھر رکھ کر ایک مرتبہ پھر اپنے گھر کے دروازے ان کے لیے کھول دیے تھے۔ لیکن وہ اپنے دل کے دروازے آنے والے کئی سال تک کھول نہیں سکی تھیں۔

ان کی آمد کے ساتھ ہی امی کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ وہ شاید زیب سے ملنے کے انتظار میں تھیں۔ اسے دیکھ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ زیب کے لیے ماں کی دائمی جدائی ایک نہ ختم ہونے والے مسلسل درد کی صورت اختیار کرگئی تھی۔ ماں کی موت کا ذمہ دار کون تھا۔ ابو؟ حالات؟ وقت؟ یا ابو کی دوسری شادی؟ زیب نے کسی بھی صورت میں اپنی سوچوں کو منفی نہ ہونے دیا۔

جس طرح سوتیلی ماں کو قبول کرلیا تھا۔ اسی طرح ماں کی موت کو بھی قبول کرلیا۔ بس وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہوگیا تھا۔ گزرتے وقت نے نائلہ کو زیب سے بے انتہا قریب کردیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی۔ امی کی موت کے بعد نائلہ کے اندر بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ اب وہ پہلے کی طرح اکڑ اور خودی میں نہیں رہتی تھی۔ گوکہ زیب کے ساتھ اس کا رویہ پہلے بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن اب اس کا رویہ بے انتہا اچھا ہوگیا تھا۔ حقیقی معنوں میں نائلہ نے زیب کو سگی ماں سے بڑھ کر چاہت اور محبت دی تھی۔ شاید اس نے دل

سے زیب کو اس گھر کا بڑا بیٹا سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔
جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ نائلہ کے دل میں زیب کے لیے نرمی اور محبت بڑھتی گئی تھی۔ اسی طرح فرحت تائی کے دل میں زیب کے لیے محبت کم ہوتی گئی۔ فرحت کے لیے بہن کی موت کو بھلانا بہت مشکل تھا۔ وہ ان سب کو اپنی بہن کی موت کا ذمہ دار سمجھتی تھیں۔
وہ سمجھتی تھیں کہ زیب بھی باپ کی طرح ہی بے ضمیر ہے۔ جس نے ماں پر ہونے والی زیادتیوں کو بھلا کر سوتیلی ماں سے اچھے تعلقات بنالیے تھے۔ وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھیں کہ زیب نے نائلہ کو ایک حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا تھا۔ لیکن تائی کو کون سمجھاتا۔ ان کی نفرت ضمیر، نائلہ اور اس کے بچوں تک محدود نہیں رہی تھی۔ بلکہ اس نفرت کی لپیٹ میں ان کا سگا بھانجا بھی آگیا تھا۔
انہوں نے اوپر والوں کا مکمل بائیکاٹ کردیا تھا۔ نہ وہ خود اوپر جاتی تھیں اور نہ ہی اپنی بیٹی ثانیہ کو اوپر جانے دیتیں۔ اسی طرح زیب کے چھوٹے بھائیوں تک کو بھی نیچے آکر کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ شاہ زیب کے اندر بھی پہلی مرتبہ اپنی خالہ کے لیے بدگمانی اور بے زاری بڑھنے لگی تھی۔ جس کو وقتاً" فوقتاً" نائلہ کی چرب زبانی سے تقویت ملتی تھی۔ نیچے والوں سے دور کرنے میں کچھ تو فرحت کا اپنا ذاتی ہاتھ تھا اور کچھ نائلہ کی پھیلائی بدگمانیوں کا کمال تھا۔ یوں زیب اپنے تایا کی فیملی سے دور ہوتا گیا۔
یہ ان دنوں کی بات تھی جب شاہ زیب پی آئی اے کی طرف سے اسپیشل کوٹے پر ایرونائیکل انجینئرنگ کرنے کاکول اکیڈمی میں زیر تعلیم تھا۔ ان دنوں اس کے امتحانات اور اسپیشل پروجیکٹ چل رہے تھے۔ اس مشقت بھری زندگی میں باپ کی معمولی ملازمتوں کو دیکھتے ہوئے اس نے ہمیشہ ایک ہی خواب دیکھا تھا۔ زیادہ پڑھنے کا خواب، آگے بڑھنے کا خواب۔ ایک اونچا مقام پالینے کا خواب۔
وہ اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ ایک تعلیم ہی تھی۔ جو اسے اچھی زندگی مہیا کرسکتی تھی اور وہ اپنے بھائیوں کو ایک خوش حال زندگی دینے کے لیے جدوجہد کررہا تھا۔ لیکن پاسنگ آوٹ سے پہلے پہلے شاہ زیب کو ایک زبردست دھچکا لگا تھا۔ نائلہ نے رات کو ہی اسے فون کرکے بتایا تھا۔
"تمہاری خالہ نے ثانی سے تمہارا رشتہ توڑ دیا ہے۔ بقول تمہاری خالہ کے جیسا باپ، ویسا بیٹا۔ کل باپ میری بہن پہ سوکن لے آیا تھا۔ بیٹے سے کیا بعید وہ بھی زندگی کے کسی موڑ پر میری بیٹی پر سوکن لے آئے۔ میں ایسی رشتہ داری سے توبہ کرتی ہوں۔"
خالہ پلس تائی کے یہ الفاظ زیب کے لیے کسی جذباتی دھچکے سے کم نہیں تھے۔ تائی نے کس طرح اس کی امی سے کیا وعدہ توڑ دیا تھا؟ وہ کس طرح اس کی امی سے طے کیا رشتہ توڑ سکتی تھیں۔
زیب کے لیے یہ بہت تکلیف دہ حقیقت تھی۔ اسے قبول کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ اپنا دل ٹٹول رہا تھا اور اسے اپنے دل کے خالی پن پہ جھٹکے لگ رہے تھے۔ آن کی آن میں اس کا دل امنگوں اور خوابوں سے خالی ہوگیا تھا اور اس خالی مکان میں سناٹے گونجنے لگے تھے اور ان سناٹوں کے اندر کہیں دور میٹھا میٹھا درد اڑ رہا تھا۔ یہ درد لادوا تھا اور شاید محبت کے سارے ہی درد لادوا ہی ہوتے ہیں۔
جس طرح زیب نے اپنی سوتیلی ماں کو قبول کرلیا تھا، جس طرح اپنی ماں کی موت کو قبول کرلیا تھا، اسی طرح تائی کے فیصلے کو بھی چپ چاپ قبول کرلیا، لیکن وہ ایک مرتبہ اپنی تائی کے سامنے جاکر ان سے دوٹوک بات کرنے کا ارادہ ضرور رکھتا تھا۔ اس نے دوران پروجیکٹس چھٹی کے لیے اپلائی کردیا۔
اور یہ شاہ زیب کی سب سے بڑی بدقسمتی تھی جب وہ تائی سے ملنے آرہا تھا۔ وہ زیب کے آنے سے پہلے ہی ابدی سفر پہ چل پڑیں۔ جس شب وہ اپنے شہر آنے کے لیے ٹکٹ کٹوا رہا تھا۔ اسی شب اس کی پیاری خالہ اور تائی اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے وفات پاگئی تھیں۔ ساری رنجشیں اور کدورتیں دھری

کی دھری رہ گئیں۔ اس نے ٹکٹ پھاڑا اور واپس چل دیا۔ جنازہ تو ہو چکا تھا۔ اب جانے کا کیا فائدہ تھا۔

پھر جب وہ چھٹی پہ گھر آیا تو ادھر کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ وہ ثانی جو دریچوں اور درزوں میں سے چھپ چھپ کر شاہ زیب کو دیکھا کرتی تھی۔ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔ شاہ زیب اس وقت شدید خجالت اور شرمندگی میں مبتلا ہوا' جب اس نے تایا سے افسوس کرنے کے بعد ثانی سے ملنا چاہا اور تائی کی وفات پہ تعزیت کرنا چاہی تھی' لیکن ثانی نے اس سے ملنے سے معذرت کرلی تھی۔ تایا کا رویہ بھی حوصلہ شکن تھا۔ شاہ زیب دنوں اس تکلیف دہ رویے پہ پریشان رہا۔ ان ہی دنوں ۔ نائلہ موقع سے فائدہ اٹھا کر شاہ زیب سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں۔ ثانی کے رویے سے دل برداشتہ شاہ زیب نے افزا سے فطری سا دوستانہ تعلق رواں رکھا تھا' لیکن اس تعلق میں بھی حد فاصل برقرار تھی۔

پھر یوں ہی بدگمانیوں میں چھپے دن گزرتے چلے گئے تھے۔ وہ بطور ایرو ناٹیکل انجینئر پی آئی اے میں شان دار عہدے پہ کام کرنے لگا تھا۔ اس کی جاب کے ساتھ ہی گھر کے حالات بدلتے گئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ابو کو مستقل معذوری نے آن دبوچا تھا۔ ابو کی ملازمت چھوٹ گئی تھی۔ اب وہ گھر تک محدود تھے۔ گزرتے وقت نے ان کے سارے دم خم نکال دیے تھے۔ اب وہ بہت رنجیدہ رہتے تھے۔ اکثر ماضی کی یادوں کو دہراتے تھے۔

نائلہ کی ساری توجہ زیب اور افزا پہ تھی۔ وہ چاہتی تھیں۔ زیب کی افزا سے شادی ہو جائے۔ ان کی بیٹی کا مستقبل محفوظ ہو اور وہ ایک شان دار زندگی گزارے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ زیب کو ثانی سے متنفر کیا جاتا۔ وہ اپنی چالوں میں لگی ہوئی تھیں۔ زیب کو ملازمت ملنا ایک ایسی خوشی تھی جس پہ پھوپھی بھی نائلہ سے تمام رنجشیں بھلا کر مبارک باد دینے چلی آئی تھیں۔

نائلہ نے بھی شاہ زیب کی کامیابی کو بھرپور طریقے سے منایا تھا۔ ایک پر تکلف دعوت پہ پورے خاندان کو اکٹھا کیا گیا تھا۔ دور نزدیک کے سارے ہی رشتے دار آئے تھے۔ لیکن تایا اور ثانی نے آنے سے معذرت کرلی تھی۔ شاہ زیب نے سنا تو اسے نہ غصہ آیا' نہ افسوس ہوا۔ اب اتنے سالوں میں ڈھیروں رنجشوں کے بعد دل پہ بے حسی کا خول تو چڑھ ہی گیا تھا۔ اس نے ماں کے غصے اور جھنجلاہٹ پہ بس اتنا ہی کہا۔

"ان کو بلانا آپ کا فرض تھا۔ نہیں آتے تو نہ آئیں۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" شاہ زیب پر سکون تھا اور نائلہ کے سکون کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس دعوت کے بعد نائلہ کا کڈنی آپریشن دوسرا ایسا موقع تھا جس پہ نیچے والوں کی لاتعلقی نے دونوں خاندانوں میں مزید تناؤ کی لکیر کو کھینچ دیا تھا۔ نائلہ نے اس بات کو دوسرے ہی رنگ میں پیش کیا تھا۔

"بہت ہی غرور چڑھ گیا ہے بھائی صاحب کی بیٹی کو۔ ظاہر ہے، جب ہارون نظر آرہا ہو تو۔۔۔" نائلہ کی ہر تان ہارون پہ ٹوٹتی تھی۔ لیکن ضمیر ہر صورت شاہ زیب کے طے شدہ رشتے کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ شاید مدحت کو دیے گئے زخموں کی تلافی اسی صورت کرنا چاہتے تھے' لیکن شاہ زیب ان کے ہاتھ نہیں آرہا تھا اور وہ جانتے تھے کہ شاہ زیب کو نائلہ کی پشت پناہی حاصل ہے۔

☆ ☆ ☆

ایک تناؤ بھری فضا کو نائلہ کی تلخ آواز نے بہت شدت کے ساتھ تتر بتر کیا تھا۔ افزا نے ہونٹ بھینچ کر آلو کاٹنے شروع کر دیے تھے۔

جانے شاہ زیب کہاں چلا گیا تھا؟ ابو سے جھگڑے کے بعد وہ ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ اس کی تفکر بھری نظریں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ نائلہ مسلسل بول رہی تھیں۔

"میری اتنے سالوں کی ریاضت کا یہ صلہ دیا؟ مجھے مکار اور چال باز کہا.... یہ انسانیت ہے تمہاری؟" وہ جیسے شدت غم سے پھٹ رہی تھیں۔

"غصے میں انسان کچھ بھی کہہ دیتا ہے۔ اپنے لاڈلے پہ تم حرف نہیں آنے دیتیں۔ مجھے غصہ اسی نے دلایا تھا۔ نہ وہ ایسی بات کرتا۔ نہ میں تمہیں کچھ کہتا.... بہرحال وہ تمہاری شہ پہ ہی سب کچھ کرتا ہے۔" ضمیر کا لہجہ دوٹوک تھا۔ اٹل اور سنجیدہ.... امی کا پارہ کچھ اور اوپر کو چڑھ گیا تھا۔

"میری شہ پہ؟" وہ چیخ پڑی تھیں۔ "کیا وہ خود عقل اور سمجھ بوجھ نہیں رکھتا؟ اس کی آنکھیں ہیں اور وہ سب دیکھتا ہے۔" ان کا انداز زہر بھرا تھا۔

"کیا دیکھتا ہے وہ؟ ذرا میں بھی تو سنوں۔" ان کا ٹھنڈا ہوتا غصہ پھر سے ابل پڑا تھا۔

"نیچے جو کچھ ہوتا ہے۔" نائلہ جز بز ہوئی تھیں۔

"یہی پوچھ رہا ہوں۔ کیا ہوتا ہے نیچے؟ جو مجھ سے مخفی ہے۔" ان کے انداز میں شدید کوفت اور غصہ تھا۔

"ہارون کے پھیرے۔ اپنے ماموں کا دایاں بازو تو وہی ہے۔ ایسے تو نہیں ماموں کی اتنی خدمتیں کرتا۔" نائلہ نے دبی آواز میں کہہ ہی دیا تھا۔ اور معمول کے مطابق ابو بھڑک اٹھے تھے۔ افزا کا سہا دل کچھ اور سہم گیا تھا۔

"تم بات کو جان بوجھ کے غلط رنگ دیتی ہو۔ ہارون اگر اپنے ماموں کا خیال رکھتا ہے تو کم از کم میرے ان نالائق بیٹوں سے بہتر ہے۔ جنہیں اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ نیچے تایا کا حال ہی پوچھ آئیں۔" انہوں نے عینک جھٹک کر جتلایا تھا۔

"تو وہ مطلب سے ہی آتا ہے۔ میرے بیٹے مطلبی نہیں ہیں۔" نائلہ چمک کر گویا ہوئی تھیں۔

"کیا مطلب؟" وہ پھر سے چونکے تھے۔ انہیں نائلہ سے کسی بھی اچھی بات کی امید نہیں تھی۔

"آپ تو جیسے بچے بن گئے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ آپ کی بہن اور بھانجے کی نظر ہے نشاۃ الثانیہ پہ۔" نائلہ تلخی سے چبا چبا کر بولی تھیں اور ابو نے انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"جب ہماری طرف سے خاموشی ہو گی۔ تو اور لوگ آگے ضرور بڑھیں گے۔ آخر ہیرا جیسی بچی ہے ہماری۔" ان کے لہجے میں شیرینی گھل گئی تھی۔ "جس گھر جائے گی چراغاں کرے گی۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"مجھے اس لالٹین سے اپنا "اندھیر خانہ" روشن نہیں کرنا۔ سنا تم نے۔" نائلہ نے چبا چبا کر کہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئے تھے اس عورت سے مغز ماری کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اب انہیں کوئی عملی قدم اٹھانا تھا۔ شاہ زیب مانتا یا نہ مانتا۔ وہ اس کے باپ تھے اور بیٹے پہ اختیار رکھتے تھے۔ ایک دن اسے تسلیم کرنا ہی تھا۔

اسی لیے انہوں نے بہن کو رازدار بنانے کے لیے رات کو فون کھڑکا دیا۔ آپا بھی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ.... بے بھاؤ کی سنا ڈالی تھیں۔

"بہت بڑا افسر بن گیا ہے تمہارا بیٹا۔ قدم زمین پر نہیں ٹکتے۔ رشتوں کا اسے کوئی احساس باقی نہیں رہا۔ نہ بوڑھے تایا کے جھکے کندھے دکھائی دیتے ہیں۔ میں کہتی ہوں۔ ابھی کے ابھی اپنے بیٹے سے فیصلہ کرواؤ۔ ورنہ میں اگلے چند دنوں میں بارات لے کر پہنچ جاؤں گی۔ تمہاری بیوی کے تو ارادے ہی نہیں لگتے۔" آپا کی لمبی تقریر نے ضمیر کے پسینے چھڑا دیے تھے۔ آپا ایسی ہی تھیں۔ اپنی سنانے والی۔ کسی اور کی کہاں سنتی

تھیں۔ ضمیر بے چارے ارے ارے کرتے رہ گئے تھے۔ آپا خاموش ہوئیں تو انہیں بولنے کا موقع ملا۔

"آپا! کسی اور غریب کی بھی سن لیا کریں۔ اسی لیے تو فون کیا ہے۔ اور آپ ہارون کی بات بیچ میں نہ لائیں۔ ثانی میری بیٹی ہے اور میری ہی رہے گی۔" ان کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"ارے کوئی عملی قدم بھی تو اٹھاؤ۔ یا باتوں سے ہی ٹرخاتے رہو گے۔" آپا نے کھنچائی کرتے ہوئے جتلایا تھا۔

"یہی تو آپ سے طے کرنا ہے۔" ضمیر کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ آپا بھی ہمہ تن گوش ہوئیں۔ پھر دونوں ایک فیصلہ کر کے اس پہ متفق ہو گئے تھے۔ اگلا دن ڈھیر ساری حیرانیوں کے ساتھ طلوع ہونے والا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ نماز عشاء ادا کر کے گھر کی طرف لوٹا تھا۔ دل کچھ سکون سے بھرا بھرا لگ رہا تھا۔ لیکن یہ کیفیات بھی لمحاتی تھیں۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ گیٹ کے دوسری طرف اس کا چین سکون لوٹنے والی کھڑی تھی۔

اس نے جوں ہی بیل پہ ہاتھ رکھا۔ گیٹ اگلے ہی پل کھل گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے انتظار میں ہی کئی گھنٹوں سے کھڑی تھی۔ جیسے ہی شاہ زیب کی اس پہ نگاہ پڑی تھی۔ اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ اک تلخ نگاہ ڈال کر آگے بڑھنے لگا تھا جب ثانی نے اچانک اسے آواز دے کر روک لیا تھا۔

وہ رکا ضرور مگر مڑا نہیں تھا۔ اس کی پشت ثانی کی طرف تھی۔ ثانی نے بمشکل ہی اپنے اعتماد کو برقرار رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنا تھی۔" وہ بمشکل ہی بول سکی۔

"لیکن مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔" اس نے تلخی سے کہا۔ ثانی لمحہ بھر کے لیے منجمد ہو گئی تھی۔ اسے شاہ زیب سے اس درجے رکھائی کی امید نہیں تھی۔

"زیب..." وہ جیسے خفت سے سرخ پڑ گئی تھی۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے۔ جو تم مجھ سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں؟" ثانی نے ساری انا کو پس پشت ڈال کر بالآخر سوال کر ہی دیا تھا۔

"یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔" وہ تلخی سے گویا ہوا تھا۔

"یہی جاننے کے لیے تو یہاں کھڑی ہوں۔" ثانی کا انداز بھی تلخی لیے ہوئے تھا۔ شاہ زیب نے ایک سلگتی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی۔

"تم مجھ پہ ایسا کوئی حق نہیں رکھتیں۔" شاہ زیب نے جیسے اسے ہلا ڈالا۔ ثانی اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

اور وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ کس رشتے کے تحت وہ اس سے سوال نامہ کھولے کھڑی تھی۔ وہ رشتہ جو تلخیوں کی گرد تلے دب گیا تھا۔

"میں تم لوگوں کے اس سرد رویے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھی۔" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ شاہ زیب اس کا گلابی ہوتا چہرہ دیکھنے لگا۔

"اور اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ جو کچھ تم کرتی پھر رہی ہو۔" اس نے دھیمی سلگتی آواز میں جتایا تھا۔ شاید وہ گلاس وال ٹوٹنے پہ اس کے رد عمل کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"جو رمیز لوگوں نے نقصان کیا؟ اسی کے لیے، ہے نا؟ ٹھیک ہے ہمیں زیادہ غصہ کر گئی تھی۔ اسی لیے تو معذرت۔" ثانی نے دھیمی آواز میں کہنا چاہا تھا تب ہی شاہ زیب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"تمہیں معذرت کرنے کی ضرورت آخر کیوں پیش آگئی؟ حیرت کی بات ہے۔" اس کا انداز گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ ثانی نے بمشکل ہی اپنے حلق سے نیچے اتارا۔ وہ صرف ڈیڈی کے لیے اتنا کچھ برداشت کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ شاہ زیب کی لاتعلقی سے بہت رنجیدہ ہوتے تھے اور اب تو وہ ثانی کے لیے سنجیدگی کے ساتھ کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔

کیا تھا اگر وہ اپنی انا کو ایک طرف رکھ کے چھوٹی سی

کوشش کرلیتی۔ اور اس نے یہ کوشش کر ہی لی تھی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا تھا؟ بس اپنا آپ ہی ارزاں کیا تھا۔ اور اس کے لیے اب وہ اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔

"زیب! تم اتنے بدگمان کیوں ہو....." نہ چاہتے ہوئے بھی ثانی کے ہونٹ سوالیہ حالت میں پھڑپھڑائے تھے۔ یہ ایسا سوال تھا جس نے زیب کو لمحہ بھر کے لیے چونکا دیا تھا۔ وہ اس کے سادہ نقوش سے سجے بے انتہا سفید چہرے کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس کے نقش عام سے تھے۔ پھیلی سی ناک، قدرے بھرے بھرے ہونٹ، آنکھیں سیاہ تھیں اور رنگت دودھ سی سفید، بالکل تائی کی طرح.... وہ عام سی تھی، افزا کے سامنے تو کچھ بھی نہیں تھی۔ بس اس کی چمپئی سی رنگت اسے سب میں ممتاز کردیتی تھی۔

زیب نے گہرا سانس بھرا اور اپنی نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا۔ وہ اس کے سحر سے آزاد ہی رہنا چاہتا تھا۔

"اگر تم یہ سوال خود سے کرو تو تمہیں جواب مل جائے گا۔"

زیب نے تلخی سے جواب دیا اور اوپر سے جھانکتی امی کی پکار پہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ اس حال میں کہ ثانی ساکت کھڑی تھی۔ اتنی ساکت کہ ہارون کے آنے اور اونچا اونچا چلانے کا بھی اسے پتا نہیں چلا تھا۔

ہارون خوشی کے عالم میں اس کے گرد گھومتا بھنگڑا ڈال رہا تھا۔ اس کے عجیب انداز پہ ثانی حیران و پریشان تھی۔ جبکہ وہ چلا چلا کر بتا رہا تھا۔

"تمہارے لیے گڈ نیوز لایا ہوں ثانی! میری ویڈنگ والدہ تشریف لا رہی ہیں۔ ایک خاص مقصد کے لیے۔" اس کی اونچی چہکار اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اوپر یعنی چاچو کے پورشن تک.... ثانی نے دہل کر اچانک اوپر کی طرف دیکھا۔ وہاں کچن کی کھڑکی میں عجیب نگاہوں سے دیکھتی نائلہ کھڑی تھیں جبکہ اندرونی دروازے کا لاک گھماتا زیب بھی ابھی تک سیڑھی کے آخری سرے پہ کھڑا تھا۔ نیچے کی طرف دیکھتا ہوا۔ ہارون کو اور اسے۔ عجیب بھسم کردینے والی نگاہوں سے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا زہر تھا۔ عجیب سی تپش تھی، وہ ہارون کو زہرخند نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جس سے ہارون قطعاً "بے نیاز تھا۔ اور ثانی!

ثانی پہ کھڑے کھڑے ہی انکشاف ہو گیا تھا۔ وہ سوال جو اسے زیب سے پوچھا تھا۔ اس کا جواب زیب کی زہر اگلتی نگاہیں دے رہی تھیں۔

"میری نفرت کی وجہ تمہارے پہلو میں کھڑی ہے۔" وہ اس کی نگاہوں کا زہر بھرا جواب خود تک پہنچتا دیکھ کر بت کی مانند ساکت ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے اوون سے گرما گرم پزا نکالا، ٹیبل سے کوک کے ٹن اٹھائے اور کب سے ساکت اور چپ چاپ بیٹھی ثانی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس وقت وہ ڈیڈی کی اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ ٹرے اس نے سینٹرل ٹیبل پہ رکھ دی تھی۔ پگھلی ہوئی پنیر اور گرما گرم پزا تو ثانی کی کمزوری تھا۔ ہارون کو اب تشویش ہونے لگی۔

"ثانی! میں تمہارے لیے پزا لایا ہوں اور تم نے پزا کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ پزا کو دیکھ کر تو تمہاری بے ہوشی بھی ٹوٹ جائے۔" وہ بات کو مزاحیہ رنگ دیتا اندر سے بہت متفکر تھا۔ ثانی کے انداز بہت پریشان کن تھے۔ وہ اتنی خاموش تھی کہ حد نہیں۔ ہارون کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"میں تو گڈ نیوز سنانے آیا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا۔ تم یہاں صف ماتم بچھا کر بیٹھی ہو۔" ہارون نے چڑ کر جتلایا تھا۔ وہ گڈ نیوز پہ تھوڑا سا چونکی تھی۔ پھر اسے دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو "کیا؟"

"مام آرہی ہیں.... بلکہ بلایا گیا ہے انہیں۔" اس نے لہجے میں ڈرامائی تاثر بھرتے ہوئے کہا تھا۔ ثانی پوری طرح سے چونک گئی تھی۔

"کس نے بلایا ہے؟" اس نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

ہارون کچھ دیر مسکراتا رہا۔ پھر آنکھیں پھیلاتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بڑے انداز میں بولا تھا۔

"ضمیر ماموں نے بلایا ہے.... خاص مقصد کے لیے۔" بالآخر اس نے بتا ہی دیا تھا۔

"کون سا مقصد؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بہت احمق ہو ثانی! اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔ ضمیر ماموں' مام کے ساتھ یہاں آئیں گے۔ تمہاری بات پکی کرنے کے لیے۔" ہارون نے جیسے دھماکا کیا تھا۔ ثانی ہکا بکا رہ گئی۔

"یہ تم سے کس نے کہا؟ مطلب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زیب تو۔" ابھی تو زیب کی اتنی جلی کٹی سن کر آ رہی تھی۔ پھر اس کے عجیب و غریب انداز' غصہ' نفرت؟ اور اب یہ انکشاف؟ ثانی کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

"زیب کی ایسی کی تیسی... ماموں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ شکر ہے ورنہ زیب کی جگہ مجھے قربان ہونا پڑتا۔" اب وہ بڑے خوشگوار موڈ میں اسے چھیڑ رہا تھا۔ ثانی کچھ سمجھی نہیں۔

"بھلا کیسے؟" اس نے غائب دماغی سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ میری والدہ تو تلی بیٹھی تھیں تمہیں اپنی بہو بنانے کے لیے۔" ہارون کھلکھلایا تھا۔ "اور تم تو جانتی ہو۔ میں نے اپنا دل اوپر اٹکا رکھا ہے۔"

"اوپر کہاں... آسمان پر۔" ثانی پہلی مرتبہ قدرے ہلکے پھلکے لہجے میں بولی تھی۔ ایک دم جیسے وہ اعصاب شکن کیفیت سے نکل آئی تھی۔ یعنی اوپر اس کے چاچو اس معاملے پہ اب کوئی حتمی فیصلہ کرنے پہ تیار تھے؟ تب نائلہ یا زیب بھلا کیا کر لیتے؟

"اب زبان کہاں سے آ گئی؟" ہارون تو کلس ہی گیا تھا۔ ثانی دھیمے سے مسکرا دی۔ اس نے ٹرے اپنی طرف کھسکالی تھی۔ اور اب مزے سے پزا کھانے میں مگن تھی۔ ہارون اس کا یا پلٹ پہ حیران تھا۔ کہاں تو انیس سو بیس کی ہیروئن بنی اداس بلبل کی طرح بیٹھی تھی۔ اور کہاں اب مسکراہٹ ماند نہیں پڑ رہی تھی۔ صرف ایک ہلکا سا سندیسہ ملنے پہ۔ ہارون بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

"تم تو ابھی سے آنکھیں بدل رہی ہو ثانی!" ہارون نے کچھ دیر بعد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ "ابھی تو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہیں اوپر بھجوانا ہے۔ اور اپنا مطلب نکلوانا ہے۔" وہ اپنی اگلی پلاننگ اس کے گوش گزار کر رہا تھا۔ ثانی نے پزا کا بڑا سا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا۔

"یہ تم بار بار مجھے اوپر بھجوانے کی بات کیوں کرتے ہو؟ میرا ابھی مرنے کا ارادہ نہیں۔"

ہارون اس کی عقل پہ بس ماتم کناں دکھتا رہ گیا تھا۔

"شادی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا رخصت ہو کر اوپر نہیں جاؤ گی ڈفر!" وہ اسے گھورتے ہوئے جتا کر بولا تھا۔ ثانی بس "آہم آہم" کرتی رہ گئی تھی۔

پھر وہ اس سے اپنی "یک طرفہ" محبت اور شادی کی پلاننگ کرنے لگا تھا۔ اور ثانی پہلی مرتبہ بڑے دل کے ساتھ اس کی پلاننگ میں اپنے مشوروں کا اضافہ کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بات سنیں آپا! بیچ میں ہارون کہاں سے ٹپک پڑا؟ ثانی میرے زیب کی منگیتر ہے۔" ضمیر بہت خفگی کے عالم میں بڑی بہن سے مخاطب تھے۔ جو بڑے طمطراق سے تخت پہ بیٹھی تھیں۔ اور سامنے میز پہ کچھ ایسا سامان رکھا تھا جسے دیکھ کر نائلہ کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا۔ اور افزا کا دل بالکل خالی۔

"ارے یہ تو تمہاری لاتعلقی کی وجہ سے سوچا تھا۔ تاکہ خضر کی پریشانی کم ہو سکے۔ اب کیوں سوچوں گی۔ میرے لیے شاہ زیب اور ہارون برابر ہیں۔" آپا نے فوراً وضاحت کی تھی۔

وہ بڑے دل سے تیار ہوئے تھے۔ سفید لٹھے کا کڑکڑاتا سوٹ' نئی نکور چپل' بال نفاست سے بنے ہوئے تھے۔ تازہ بہ تازہ خوشبو بھی لگا رکھی تھی۔ یہی حال آپا کا تھا۔ مونگیا رنگ کا بریزے کا سوٹ۔ کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں اور ہلکا پھلکا نفیس میک اپ۔ وہ بھائی کے ساتھ نیچے جا کر شادی کی تاریخ پکی کرنے کے

لیے پوری پوری تیار تھیں۔ میز پہ مٹھائی کی ٹوکری، پھل وغیرہ رکھے تھے۔ جو بطور خاص ضمیر نے چھوٹے بیٹوں سے کہہ کر منگوائے تھے۔ اور جسے دیکھ کر نائلہ کے سینے پہ سانپ لوٹ رہے تھے۔ اور اپنے ذہن میں جلد از جلد کوئی تگڑی پلاننگ سوچ رہی تھیں۔

"اب چلنا ہے کہ نہیں؟" آپا نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیوں نہیں چلنا۔ اب یہ بچے مجھے نیچے اتاریں تو بیٹا۔" انہوں نے لاچاری سے بیٹوں کو آواز دی تھی۔ تب ہی نیچے سے ہارون آگیا تھا۔ جسے دیکھ کر افزا جانے کیوں غیر محسوس انداز میں منظر سے ہٹ گئی تھی۔ جبکہ اس کی مشتاق نگاہیں افزا کو نہ پاکر خاصی مایوس ہوئی تھیں۔

ادھر نائلہ کو شوہر سے اندر ہی اندر اتنی بڑی پلاننگ کی امید نہیں تھی۔ اور اب ان کے دل کو پتنگے لگ گئے تھے۔

انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا۔ ان ہی چند ساعتوں میں کرنا تھا۔ کچھ سوچ کر انہوں نے کچن سلیب پہ رکھا موبائل دبوچا اور سیڑھیاں چڑھ کے اوپر ٹنکی کے پاس آ گئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ زیب سے ہم کلام تھیں۔

"تمہارا باپ مٹھائی کے ٹوکروں سمیت نیچے جارہا ہے۔ اس دوغلی منافق لڑکی کا رشتہ لینے۔ جس نے آنکھیں کہیں لڑا رکھی ہیں اور شادی کہیں کرے گی۔ تمہاری پھوپھی بھی آئی بیٹھی ہے۔ اتنی ہمدرد ہے تو اپنے بیٹے سے کرلے۔" زیب ان کی بات سن کر چکرا گیا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھ سے پوچھے بغیر۔"

"جب ہو جائے گا تو تمہیں پتا چلے گا۔" وہ جیسے رو دینے کو تھیں۔

"میں ابو کو فون کرتا ہوں۔" اس نے جیسے فیصلہ کیا تھا۔

"ہرگز نہیں۔ فون سے کام نہیں چلے گا۔ تم گھر آؤ۔" انہوں نے تحکم سے کہا تھا۔ زیب نے ہامی بھرلی۔

"اوکے، میں آتا ہوں۔ ڈونٹ وری امی! کچھ بھی نہیں ہوگا آپ کی مرضی کے خلاف۔" وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔ لیکن نائلہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

"تم دیر نہیں کرو زیب! ورنہ عمر بھر پچھتاؤ گے۔ وہ لڑکی تمہارے قابل نہیں۔" وہ نفرت کی انتہا پہ تھیں۔ اور اسے ہر ممکن حد تک متنفر کر رہی تھیں۔

جیسے ہی وہ فون بند کرکے مڑیں اپنے پیچھے افزا کو کھڑا پایا۔ وہ انہیں عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ نائلہ نے بے ساختہ نگاہیں چرالی تھیں۔ افزا دو قدم چل کر ان کے قریب آگئی تھی۔ وہ خوامخواہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ افزا ایک ٹک ماں کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں اس کی نگاہوں سے الجھن ہونے لگی۔

"کیوں آئی ہو اوپر؟ نیچے رہتیں۔۔۔ ان دونوں بہن بھائی کا پروگرام تو سنتیں۔" وہ بلاوجہ بولنے لگی تھیں۔ جیسے اپنی کچھ دیر پہلے والی گفتگو کا اثر مٹا رہی ہوں۔ افزا نے چبھتی نظروں سے انہیں دیکھ کر پوچھا تھا۔

"آپ زیب بھائی سے کیا بات کر رہی تھیں؟"

"تمہیں اس سے کیا؟" وہ خفگی سے کہہ کر نیچے جانے لگی تھیں۔

"امی! یہ ٹھیک نہیں ہے۔" وہ کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ نائلہ بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا ٹھیک نہیں ہے؟" ان کی تیوری پہ بل آگئے تھے۔

"آپ نیچے جاکر ابو سے کوئی لڑائی نہیں کریں گی۔ مجھے لڑائی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں ان کو کرنے دیں۔" اس نے بھرائی آواز میں التجا کی تھی۔ نائلہ جیسے پھٹ پڑیں۔

"کیوں کرنے دوں؟ ساری زندگی قربانیاں میں نے دیں۔ محبت دی، پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اب انعام کا وقت آیا ہے تو پلیٹ میں سجا کر کسی اور کو پیش کر دوں؟ اور وہ بھی اس کے جو آتے ساتھ ہمیں اس گھر سے چلتا

کر کے اپنا انتقام پورا کرے گی۔ اپنی خالہ پہ نادیدہ مظالم اور سوکن کا انتقام۔" وہ نفرت سے سر جھٹک کر نیچے چلی گئی تھیں، نیچے زیب آچکا تھا۔ وہ بہت اونچا بول رہا تھا۔ افزا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ لاکھ وہ اس کی چاہت تھا۔ بے شک وہ آنکھوں میں اترنے والا خواب تھا۔ وہ نصیب سے مل جاتا تو افزا خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ اپنے نصیبوں پہ نازاں ہوتی۔ لیکن اسے اس انداز میں چالبازیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا کر کے حاصل کرنا اسے کبھی بھی گوارا نہیں تھا۔ کبھی بھی نہیں۔

وہ لرزتے قدموں سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ امی کے لیے جھگڑ رہا تھا۔ کیونکہ ثانی امی کی پسند نہیں تھی۔ وہ ان کا سوتیلا بیٹا تھا۔ لیکن سگے بیٹوں سے بڑھ کر مان رکھتا تھا۔ وہ اب بھی امی کا مان بڑھا رہا تھا۔ اور باقی سب لوگ حیران و پریشان تھے۔ افزا وہیں ریلنگ پکڑے ساکت کھڑی تھی۔ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ دل ہراس کا شکار تھا۔

"یہ جو تماشا چل رہا ہے' اسے ختم کریں۔" زیب نے دو ٹوک لہجے میں باپ اور پھپھی کو واضح طور پر روک دیا تھا۔ اس کی نگاہیں میز پہ جمی تھیں۔ جس کے اوپر مٹھائی اور پھلوں کی ٹوکریاں تھیں۔

"کیوں ختم کریں۔ برسوں سے رشتہ طے ہے۔ کب تک ٹالتے رہیں۔ ہم تاریخ لینے جا رہے ہیں۔ تم اپنا ذہن بنا لو۔ اسی مہینے کے آخر میں نکاح ہو گا۔" پھوپھو نے اپنے ازلی دبنگ لہجے میں حکمیہ کہا تھا۔

"معذرت کے ساتھ پھوپھو! آپ کی یہ خواہش پوری کرنے سے قاصر ہوں۔ اس قربانی کے لیے کسی اور کو تیار کر لیں۔ میری طرف سے معذرت ہے۔" وہ سخت مگر دھیمے لہجے میں بولا تھا۔

"تم شادی نہیں کرو گے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے زیب!" پھوپھو ہکلا گئیں۔ ابو خود گم صم بیٹھے تھے۔ یعنی اس نے پھوپھی کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ وہ کوئی حتمی فیصلہ کر چکا ہے۔ وہ لمحوں میں پوری جان سے ڈھے گئے تھے۔

"میں نے یہ کب کہا۔ میں شادی کروں گا اور آپ کی خواہش کے مطابق اسی مہینے کے آخر تک کروں گا۔ لیکن امی کی پسند سے 'وہ جہاں کہیں۔'" شاہ زیب نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ ابو نے اپنا سر تھام لیا اور پھوپھو کی حالت ایسی تھی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"نائلہ کی پسند؟" پھوپھو کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔ ان کی شعلہ بار نظریں نائلہ کی طرف اٹھیں۔

نائلہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ سر ہلایا۔ ان کے اندر سکون کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔

وہ حاضرین کو فتح مندی کے احساس کے ساتھ دیکھتی رہیں۔ اس وقت سب ہی موجود تھے۔ خاص طور پر ضمیر اور اس کی بہن۔ جو بڑی کار مختار سمجھی جاتی تھیں۔ سو یہ وقت بہت مناسب تھا۔ فیصلہ کرنے اور عمل کرنے کے لیے۔ نائلہ نے ایک نظر زیب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں مضبوطی تھی۔ استحکام تھا۔

"میں احسان مند ہوں اپنے بیٹے کی۔ جس نے مجھ ناچیز کی عزت رکھ لی۔ اور مجھے اس قابل جانا کہ میں اس کے لیے کوئی فیصلہ کر سکوں۔ میں آپ سب کے سامنے اپنی بیٹی افزا اور شاہ زیب کی نسبت کا اعلان کرتی ہوں اور شادی بھی اسی مہینے کے اختتام تک ہو گی۔"

نائلہ نے بڑے سکون سے ان سب کے سروں پہ ایک دھماکا کیا تھا اور ہکا بکا زیب کا بازو تھام کر اندر کی طرف چلی گئی تھیں۔ جبکہ باقی سب لوگ پتھر کا بت بنے کھڑے تھے۔

یعنی نشاۃ الثانیہ سے نسبت توڑ کر نائلہ نے افزا کی منگنی شاہ زیب سے کر دی تھی اور اسی مہینے کے آخر میں تقریب نکاح ہونا قرار پا گئی تھی۔ یہ حقیقت قبول کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ خبر نیچے رہنے والوں کے سروں پہ بھی بم کی مانند گری تھی۔ ایک قیامت تھی جو آئی اور ٹھہر گئی۔ پھوپھو نیچے اتریں تو ان کے قدم شکستہ تھے۔ ڈیڈی کے

لیے یہ صدمہ کوئی معمولی صدمہ نہیں تھا۔ وہ پہلے تو سن کر گم صم ہوئے' پھر ان کے سر پہ غصہ سوار ہو گیا تھا۔ وہ اتنا چیخے کہ خدا کی پناہ۔ ایک ایک چیز ان کے ہاتھ تک پہنچتی اور تڑتڑ ٹوٹتی چلی گئی۔ ڈیڈی کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ پھوپھو اور ہارون انہیں ہسپتال لے گئے۔ جانے کتنے گھنٹوں بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں سہارا دے کر اندر لے آئی۔ پھر جب وہ انہیں پلنگ پہ بٹھا کر واپس جانے لگی تھی تب ڈیڈی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا تھا۔

"ثانی! یہاں بیٹھو۔" انہوں نے زبردستی اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ ثانی سر جھکائے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"ثانی! تمہیں دکھ ہوا ہے؟" ڈیڈی نے کپکپاتی آواز میں پوچھا تھا۔ ثانی کے اندر آنسو اترنے لگے تھے۔

"نہیں۔۔۔ دکھ کس بات کا؟ ان سے اور امید بھی کیا ہو سکتی تھی؟"

وہ بے آواز رو رہی تھی۔

"وقت مرہم ہوتا ہے۔ دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اسے تسلی دے رہے تھے۔

"اور میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا۔ اسی لیے آپا کو بلوا کر اوپر بھیجا تھا تاکہ آر یا پار کا فیصلہ تو ہو۔" ڈیڈی نے نم آواز میں بتایا۔ ان کا ہاتھ اس کا سر تھپک رہا تھا۔ ثانی نے لمبی سی سسکی کو اپنے لبوں کے اندر ہی روک لیا تھا۔ وہ ڈیڈ کو تکلیف سے بچانا چاہتی تھی۔

"ثانی! تمہیں بہادر بننا ہے۔ کیا تم اپنی کمزوری ظاہر کرو گی؟ ان لوگوں پہ جن کے دل پتھر اور لوہے کے ہیں۔ جنہیں رشتوں کا کوئی احساس نہیں کوئی پاس نہیں۔" وہ باپ تھے۔ اس کے اندر کا حال جانتے تھے۔

"ڈیڈی!" اس کی آواز پھٹنے لگی تھی۔ "زیب نے ایسا کیوں کیا؟" وہ ان کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈیڈی کی آنکھیں بھی بھرنے لگیں۔

"احسان فراموش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جب وہ لوگ دھکے کھا رہے تھے' میں انہیں گھر لے آیا۔ اپنے گھر میں جگہ دی' تحفظ دیا۔ اور آج وہی لوگ میرے قدموں تلے سے زمین کھینچ رہے ہیں۔" ان کا لہجہ بھیگا ہوا زخمی تھا۔ درد میں ڈوبا ہوا۔ ثانی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"وعدہ کرو تم نہیں روؤ گی۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔" وہ خود رو رہے تھے اور اس سے نہ رونے کا عہد لے رہے تھے۔

وہ ڈیڈی کو کیسے بتاتی؟ درد کا تعلق چوٹ کی شدت سے ہوتا ہے۔ چوٹ جتنی سخت ہو' درد اتنا ہی گہرا ہوتا ہے۔ اور یہ درد تو تھا ہی لاوا۔۔۔ نہ درد کو افاقہ آتا۔ نہ درد کو کوئی علاج ملتا۔ اور مسیحا تو تھا ہی کوئی نہیں۔ وہ ڈیڈی کو کیسے بتاتی؟

☆ ☆ ☆

اور اوپر جیسے ہی شادی کا ہنگامہ اٹھا' نیچے ڈیڈی کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

وہ اپنے بھائی سے شدید بدگمان تھے۔ ان کے نزدیک' ان کا بھائی اس حد تک "بے ضمیر" تھا کہ اسے اپنے بھائی کے دل پر خنجر چلا کر شادیانے بجانے کا کوئی قلق نہیں تھا۔ اب ڈیڈی کو کون سمجھاتا۔ ضمیر تو اس دن سے کمرہ بند کیے سب سے ناراض تھے اور بھائی کا سامنا کرنے سے گریزاں۔

اور کل سے تو ڈیڈی خاصے پراسرار بھی لگ رہے تھے۔ آج بھی صبح صبح تیار شیار ہو کر نکل گئے تھے۔ ثانی کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ وہ گھر کا کام ختم کر کے اب کھانا بنا رہی تھی۔ تب ہی باہر کا گیٹ کھلا تھا۔ چاچی لدی پھندی سی آگے آگے تھیں۔ پیچھے حسن' احسن تھے۔ شاپرز کا ڈھیر اٹھائے۔ شادی کی تیاریاں جو چل رہی تھیں۔ ثانی کا اندر تک زہر آلود ہو گیا تھا۔ اس نے غصے میں کچن کی کھڑکی ہی بند کر دی تھی۔ تب ہی کوئی چپکے سے کچن کے اندر داخل ہوا تھا۔ ثانی نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں چوکھٹے میں ہارون کھڑا تھا۔ ہمیشہ کے بالکل برعکس بجھا بجھا سا۔ ثانی نے گہرا سانس بھرا تھا۔

وہ آج اتنے دن بعد سوگ کی کیفیت سے باہر نکلا تھا۔

"صدمے سے نکل آئے ہو؟ آگیا ثانی کا خیال؟" اس نے ٹماٹر کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا تھا۔ ہارون چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا خالی پن تھا۔ ثانی کو اپنا طنز واپس لینا پڑا۔

"ہارون! کیا ہوا ہے؟ اب بس بھی کردو۔" وہ ملامت سے بولی۔

"تم نے بس کردی؟ کیا یہی محبت تھی؟" ہارون کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ ثانی ہونٹ کاٹتی رہ گئی۔

"مجھے اپنا آپ ارزاں کرنا گوارا نہیں۔ اگر زیب مجھے دھتکار سکتا ہے اور مجھ پہ افزا کو فوقیت دے سکتا ہے تو میری انا کا تقاضا ہے کہ میں ان رستوں کی طرف بھی نہ دیکھوں۔ جہاں سے اس کا گزر ہو۔" ثانی شدید اذیت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ہارون اس کے جذباتی لہجے پہ قطعاً" جذباتی نہیں ہوا تھا۔ وہ بس پُرسوچ نظروں سے صحن میں پھیلی دھوپ کو دیکھتا رہا۔

"اگر میری والدہ ماجدہ افزا کا رشتہ مانگ لیتیں تو یہ ساری صورت حال بگڑتی نہیں۔" ہارون نے کچھ دیر بعد کھیرا کترتے ہوئے خیال ظاہر کیا تھا۔ ثانی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ چاچی ایسے ہی افزا کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیتیں؟ جبکہ ان کے سامنے زیادہ تگڑا پرپوزل موجود تھا۔ وہ شاہ زیب سے دست بردار نہیں ہوسکتیں۔" ثانی نے تھکی تھکی سانس بحال کرتے ہوئے بتایا تھا۔ ڈیڈی گھر کے اندر داخل ہوئے اور ان دونوں کو دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھرتے سوچنے لگے تھے۔ ہارون ماموں کو دیکھ کر چونک گیا تھا۔ پھر جلدی سے پانی اور گلاس لے کر باہر بھاگا۔ ڈیڈی برآمدے میں بیٹھ چکے تھے۔ ثانی نے پنکھا چلا دیا۔ ڈیڈی پانی پینے لگے تھے۔ گرمی کا زور کچھ کم ہوا تو چہرہ پونچھتے ہوئے بولے۔

"تم کب آئے ہو ہارون!"

"دنیا میں آئے ہوئے تو بہت سال ہوچکے ہیں ماموں! ویسے مردوں سے بھی ان کی عمر نہیں پوچھتے۔"

اس نے بات کو مزاحیہ رنگ دیا تو ڈیڈی بھی جانے کس وقت سے مسکرا دیے تھے۔ ثانی بھی ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

"اور جن کی عمر کا ایک ایک دن دل پہ لکھا ہو! پاگل تم اور زیب ایک دن میں پیدا ہوئے۔ ستائیس کا وہ ہو چکا ہے اور ستائیس کے تم.... ثانی تم دونوں سے ایک سال چھوٹی ہے۔" وہ حساب لگاتے ہوئے جانے کیسے بھول چوک میں اس دشمنِ جان کا ذکر لے بیٹھے تھے۔ حالانکہ زیب کا نام لینا بھی ڈیڈی نے حرام قرار دے دیا تھا۔ لیکن یہ رشتے اور محبتیں؟ ثانی بس ان کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی تھی۔

"خیر چھوڑو۔ مجھے تم دونوں کو بتانا تھا۔ میں آج وکیل سے ملا ہوں۔ اس گھر کو ثانی کے نام کروانے کے لیے کچھ مشورہ کرنا تھا۔ اور اس سے بھی پہلے اوپر والوں کو تحریری اور قانونی نوٹس بھجوانا ہے۔ تاکہ میرا مکان خالی کردیں اور کہیں اور جا کر شادی کے شادیانے بجائیں۔" ان کا لہجہ سرد اور دو ٹوک تھا۔ جبکہ ثانی اور ہارون تو اچھل پڑے تھے۔ ایک دم اتنا انتہائی فیصلہ؟ ضمیر چاچو کو گھر سے نکالنا؟ ایک مرتبہ پھر گھر سے بے گھر کرنا؟ یہ بہت جذباتی اور غلط فیصلہ تھا۔ ثانی کا دماغ گھوم گیا تھا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر کنپٹی میں سر ہلانے لگی۔

"ہرگز نہیں۔ آپ ایسا کچھ بھی نہیں کریں گے؟ یہ تو صاف انتقامی کارروائی ہے۔ ضمیر چاچو کے بیٹے نے مجھے ٹھکرایا اور بدلے میں ہم انہیں گھر سے نکالیں گے۔ کبھی نہیں۔"

ثانی اتنی شدت کے ساتھ بولی تھی کہ ڈیڈی اس کے ردعمل پہ بالکل چپ کر گئے تھے۔ بے شک ڈیڈی کا غصہ بجا تھا۔ اس رشتے کے ٹوٹنے سے انہیں بہت ٹھیس پہنچی تھی۔ اپنی توہین بھی محسوس کی تھی اور ذلت بھی۔ لیکن ثانی کسی بھی صورت میں ایسے اوچھے ہتھکنڈے کے بارے میں سوچ نہیں سکتی تھی۔

❋ ❋ ❋

یہ شادی بلکہ افزا سے شادی بالکل غیر متوقع تھی۔

سچ تو یہ تھا۔ افزا تو کیا کسی سے بھی فوری طور پہ ایک نیا رشتہ بنانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ ماں کے دعوے کو سن کر لمحہ بھر کے لیے ڈگمگا گیا تھا۔ جب امی اس کی نسبت کا اعلان کر رہی تھیں۔

زیب تب انکار کر دیتا تو جانے کیا ہو جاتا؟ کچھ بہت ہی غلط کچھ ایسا جو امی کا اعتبار ہمیشہ کے لیے توڑ دیتا۔ اس لیے زیب تب خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن تنہائی میں اس نے امی سے ضرور بحث کی تھی۔ اس نے افزا کے لیے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ ہمیشہ بہن ہی سمجھا۔ اور امی اس کی جذباتی کیفیت کو نہیں سمجھ رہی تھیں۔ بلکہ انہوں نے زیب کا کندھا تھپتھپا کر بڑی محبت سے کہا تھا۔

''یہ تو تمہاری شرافت ہے بیٹا! تمہاری ان ہی پیاری عادتوں نے مجھے گرویدہ کر رکھا ہے۔ تب ہی تو میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی کے لیے تمہیں سوچا۔ میری بیٹی کو تم سے اچھا ہم سفر نہیں ملے گا۔ اور تم حقیقتاً ''اپنی ماں پہ ہو۔ ویسے ہی نرم مزاج' قانع اور صابر شاکر...... اپنے باپ کا تم پہ عکس بھی نہیں پڑا۔'' نائلہ نے اعتراف کیا تھا۔ سچ تو یہ تھا۔ وہ مجبور ہو گیا تھا۔ امی کی محبت اور مان کے بار تلے دب گیا تھا۔ اور پھر اس نے خود کو وقت کے دھارے پہ چھوڑ دیا۔ وہ اسٹینڈ لیتا بھی کس لیے؟ کیا ثانی کے لیے۔

اس کے ذہن و دل پہ ہارون سوار تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان دونوں کا رشتہ بچپن سے طے ہے۔ زیب کی غیرت کو قطعاً ''یہ گوارا نہیں تھا وہ ایسی لڑکی کو اپنی زوجیت میں لیتا۔ اس سے بہتر یہ تھا۔ وہ سارا الزام خود پہ لے کر راستہ بدل لیتا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس کے بدلے میں ابو کی ناراضی سہنا پڑی تھی۔ پھوپھی کی لعن طعن اور خاندان والوں کا بائیکاٹ۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اس کی زندگی برباد ہونے سے تو بچ گئی تھی۔ لیکن اب بھی۔ آباد ہونے سے کوسوں دور لگتی تھی۔

افزا سے شادی' یہ ایک مشکل ترین سودا تھا۔ جو طے پا گیا تھا۔ بہت حد تک زیب نے خود کو سمجھا لیا تھا۔ بہت حد تک اس نے اپنا مائنڈ میک اپ کر لیا تھا۔ شادی تو کرنی ہی تھی۔ پھر افزا سے ہی سہی چلو' کوئی تو خوش ہوتا۔ اور اب شادی سے محض دو دن پہلے جب سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ بری' جہیز سب تیار تھا۔ زیب نے شادی کے نام پہ نائلہ کو دل کھول کے پیسہ دیا تھا۔ جس سے انہوں نے اپنے سارے چاؤ پورے کیے تھے۔

اور اب ابو کہہ رہے تھے کہ وہ زیب کے نکاح میں شامل نہیں ہوں گے۔ بھلا اس سے بڑی بے عزتی اور جگ ہنسائی کیا ہو سکتی تھی؟ نائلہ کا غصہ سوا نیزے پہ تھا۔ اور زیب بھی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیے بیٹھا تھا۔

''یہ تم لوگوں کا ذاتی فیصلہ ہے۔ اور میں اس فیصلے میں نہ شامل ہوں۔ نہ خوش ہوں۔ سو میں شادی میں شرکت بھی نہیں کروں گا۔'' انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

ایک دم سکوت طاری ہو گیا تھا۔ ریکارڈر پہ گانے سیٹ کرتا سمیر باپ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ڈھولک پہ بے ڈھنگے پن سے ہاتھ مارتا رمیز بھی بت بن گیا۔ نائلہ کفگیر سمیت کچن سے باہر آ گئی تھیں اور ریلنگ پکڑے کھڑی زرد لباس میں مایوں کی دلہن کا روپ دھارے افزا سرسوں کا پھول بن گئی تھی۔

''آپ خوش ہوں یا نہ ہوں۔ آپ کی مرضی اس فیصلے میں شامل ہو یا نہ ہو۔ آپ نے ہر صورت تقریب نکاح میں شمولیت کرنی ہے۔ ورنہ آپ سمجھ لیجیے گا ابو! کہ شاہ زیب آپ کے لیے مر گیا ہے۔'' وہ اتنے غصے کے عالم میں ایک دم بولا تھا کہ افزا نے بے ساختہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا جبکہ سمیر' رمیز کی روح فنا ہو گئی تھی۔ کسی نے بھی زیب کو آج تک اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔

''نیچے والوں کی آپ کو بہت پرواہ ہے۔ ان کے لیے آپ اپنے بیٹے سے عداوت رکھیں گے۔ تو سن لیں ابو! اور نیچے جا کر بتا دیں۔ میں تو اپنے ہر عمل اور ہر رشتے میں فیئر ہوں۔ میری نیت صاف ہے اور میں راہیں

بدلنے والا بھی نہیں۔ لیکن مجھے ایسی عورت کسی بھی قیمت پر قبول نہیں۔ جس کے دل میں کوئی اور ہو۔"

وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ جبکہ ضمیر اپنا سر تھام کر بیٹھے تھے۔ جیسے اس کی بات سمجھنا چاہتے ہوں۔ اور جب انہیں بات سمجھ میں آگئی تو ان کے جسم کا سارا خون چہرے پہ اکٹھا ہو گیا تھا۔ انہوں نے میز پہ رکھی ایک ایک چیز اٹھا کر توڑ دی تھی۔ ان کا غصہ کسی قیمت پہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ اور مغلظات کا ایک طوفان ان کے لبوں سے نکل رہا تھا۔ وہ جیسے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔

"بدذات عورت! ثانی کے بارے میں یہ سارا زہر کس نے زیب کے اندر بھرا ہے؟ کس نے ثانی پہ کیچڑ اچھالا؟ اس کے کردار پہ انگلی اٹھائی لعنت ہو تم سب پر ... یہ دن دیکھنے کے لیے زندہ تھا میں؟ تم میری بھتیجی کو بدنام کرتی ہو صرف اپنا مطلب نکالنے کے لیے۔" وہ چیخ چیخ کر تھک گئے تھے۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ سمیر اور رمیز نے بمشکل انہیں قابو کیا تھا۔ انہیں پانی پلا کر اندر لے گئے تھے۔ نائلہ سر سے بلا ٹلتے ہی گہرا سانس بھرتی فرش سے کانچ اٹھانے لگی تھیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے اس خبطی بڈھے کا۔ حد ہے پکڑ کے اتنا کانچ توڑ دیا۔" وہ غصے کے عالم میں بڑبڑا رہی تھیں۔ جب ان کے قریب آکر سمیر نے بے حد سنجیدگی بھرے غصے سے کہا تھا۔

"آپ کو ان کانچ کے ٹکڑوں کی پرواہ ہے۔ جو فرش پہ گرے اور ٹوٹ گئے۔ ادھر اتنے قیمتی دل ٹوٹ رہے ہیں۔ ان کی ذرا پرواہ نہیں۔" سمیر اپنی بات کہہ کر رکا نہیں تھا۔ تیزی سے باہر نکل گیا۔ ساکت کھڑی نائلہ بیٹے کی پشت کو گھورتی رہ گئی تھیں۔ پھر سر جھٹک کر غصے میں چیخیں۔

"ہر کوئی علامہ بننے پر تلا ہے۔ سڑیل، حاسد میرے بچوں کی خوشی برداشت نہیں ہو رہی۔" وہ اگلے کئی گھنٹوں تک ان سب کو باری باری کوستی رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆
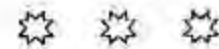
خوب صورت سی تاروں بھری شام آنگن میں اتری تھی۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور تیاری مکمل کرتا مطمئن سا ہو گیا وہ خوشبوؤں میں نہایا بن ٹھن کر نیچے اترا تو امی اداس سی صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ وہ امی کو اداس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔

"جانا نہیں آپ نے؟" ہارون کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ چونک گئی تھیں۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ غائب دماغی سے بولیں۔

"کمال ہے بھول بھی گئیں؟ آج آپ کے بھتیجے کا نکاح ہے۔ جلدی اٹھیے۔" ہارون خاصا اتاولا ہو رہا تھا۔ امی اسے اتنا بنا ٹھنا بلکہ کسی حد تک دولہا بنا دیکھ کر چونکیں۔

"تم ایسے لشکارے مار رہے ہو۔ جیسے آج تمہارا ولیمہ ہو۔ اتنی تیاریوں کی کیا ضرورت تھی۔" ان کا اپنا دل برا تھا۔ اس لیے برے دل کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔ ہارون بے ساختہ جھکا۔

"کیا پتا اپنا بھی کوئی چانس لگ جائے۔" وہ مسکرایا تھا۔ امی نے خفگی سے اسے دیکھا اور پھر اٹھ کر اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔

"کیا ہمیں جانا چاہیے تھا؟" گاڑی میں بیٹھ کر انہوں نے ہارون سے بھرے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں جانا چاہیے؟" ہارون نے الٹا سوال کر دیا۔

"خضر اور ثانی کا دل برا ہو گا۔" وہ جھجکتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"نہیں ہو گا۔" ہارون کا اطمینان قابل دید تھا۔

"میرا تو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہم نہ ہی آتے ہارون۔" امی نے کوئی دسویں مرتبہ کہا تھا۔ ہارون نے اپنا سر ہی پیٹ لیا تھا۔

"اب کیا ہو سکتا ہے ... گھر تو آگیا ... دیکھیں شامیانے لگے ہوئے ہیں۔" ہارون کھڑکی سے باہر لٹک کر جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ شادی والی گہما گہمی صاف نظر آرہی تھی۔ مہمان بھی نظر آرہے تھے۔ اور کام والے لڑکے بھی۔

"میرا دل دھڑک رہا ہے ہارون! ثانی پہ کیا گزرے

گی۔" امی کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ ہارون نے اپنا ماتھا اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔
"امی! دل کا دھڑکنا تو نارمل بات ہے۔ اگر نہ دھڑکے تو مسئلہ ہو۔ اور باقی ثانی کی فکر پہ چھوڑیں۔" وہ آنکھیں گھما گھما کر باہر دیکھ رہا تھا۔ امی نے اس کے کندھے پہ دھپ لگائی تو وہ بے ساختہ ان کی طرف مڑا۔
"ہارون!" امی نے بڑے دلار سے پکارا تھا۔
"جی جان امی۔" ہارون نے جواباً" اسی دلار سے مسکہ لگایا۔
"میری ایک بات مانو گے۔" وہ منت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ہارون ہمہ تن گوش ہوا۔
"اتنے تیار ہو کر آئے ہو۔ اتنے پیارے لگ رہے ہو۔ یہ ویسٹ کوٹ اور کرتا بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بالکل دولہا سے لگ رہے ہو۔ دیکھو ہارون! تمہاری ماں ہو کر منت کر رہی ہوں۔ تمہیں حکم بھی دے سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں کیا۔ ہارون! میری جان۔"
انہوں نے اس کا کندھا دبوچ کر منہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا تو ہارون اس شدت کے پیار پہ کراہ بھی نہیں سکا تھا۔ اوپر سے امی کی تمہید اس کی جان نکال رہی تھی۔
"جی... امی... جان!" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا تھا۔
"میرا دل چاہ رہا ہے۔ جس طرح ضمیر اور نائلہ نے کیا۔ ہماری بچی کی عزت نفس پارہ پارہ کر کے۔ آج ہم بھی ان کے منہ پہ جوتا ماردیں۔ انہیں جتلادیں کہ ثانی بھی گری پڑی نہیں۔ ہارون! تم ثانی سے نکاح کے لیے مان جاؤ۔" امی کے الفاظ پہ ہارون اچھل کر کھڑکی سے جا ٹکرایا تھا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا اور سانس پھول گئی تھی۔ حالت قلب نازک تھی۔
"امی... یہ ممکن ہی نہیں، کسی بھی قیمت پہ نہیں ... میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔"
وہ امی کے کان پہ جھکا تو اگلے چند منٹوں بعد امی کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ سانس پھول گئی تھی۔ آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ حالت قلب نازک تھی۔
"یہ کیسے ہوگا؟" امی نے بمشکل اٹک اٹک کر پوچھا تھا۔ تب ہارون نے سینہ تان کر کہا۔
"ایسے...." اس نے چٹکی بجائی اور۔ اتر گیا۔ امی اسے گھورتی رہ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ ہوا۔ جو کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ جہاں کسی کی سوچ کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔ وہاں پہ ایک چیز کھڑی تھی۔ جسے تقدیر کہا جاتا ہے۔
لیکن اس شام ہوا کیا تھا؟
جب مہمانوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ گونجتی تھی۔ اور سکھیاں ملن کے گیت گاتی تھیں۔ نائلہ خوش بھی تھیں اور آزردہ بھی۔ یہ آزردگی نجانے کیوں دل میں چٹکیاں بھر رہی تھی۔ یہ ایک وسوسہ تھا جس پہ توجہ دی جاتی تو نائلہ پوری جان سے کانپ جاتیں۔ کیونکہ یہ وسوسہ بے بنیاد نہیں تھا۔
اور وہ اپنے چٹکیاں بھرتے دل کو جھوٹے دلاسے دیتی کاموں کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ اس دوران ان کی زیب پہ بھی نگاہ پڑی تھی۔ وہ نکاح کے لیے تیار ہو کر آگیا تھا اور بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ یوں کہ نائلہ نے کتنی ہی مرتبہ چپکے چپکے نظر اتاری تھی۔
افزا بھی تیار تھی۔ اب بس نکاح ہونا تھا۔ نائلہ کو اس وقت کا کتنی بے چینی سے انتظار تھا۔ اور اب یہ مبارک گھڑی آن پہنچی تھی۔
لیکن نکاح سے کچھ دیر پہلے ہی وہیل چیئر گھسیٹتے ضمیر اپنی کچھار سے باہر آگئے تھے۔ ان کا لباس مسلا ہوا تھا۔ اور آنکھیں ویران تھیں۔ نائلہ کے ماتھے پہ بل آگئے تھے۔ ایک تو زیب کی ضد؟ اس شخص کے بغیر بھی تو نکاح ہو سکتا تھا؟
وہ بل کھاتی شوہر کو گھورنے لگیں۔ معاً" ان کی کسی بھانجی نے آواز لگائی تھی۔
"خالہ! آپ کو افزا بلا رہی ہے۔" وہ اس پکار پہ کیا دھیان دیتیں انہیں اچانک ضمیر نے روک لیا تھا۔ وہ

ماتھے پہ بل ڈالے رک گئی تھیں۔

"جو تم نے کیا۔۔۔ اچھا نہیں کیا۔ میرے بیٹے کو اس کی محبت سے بدگمان کیا اور اس الو کے پٹھے کی محبت بھی ایسی ہی تھی جو پل میں بدگمان ہو گیا۔ پھر بھی میں، سب کچھ بھلا تا ہوں کہ افزا کو بیٹی کہا ہی نہیں سمجھا بھی تھا۔ اور اگر وہ ثانی کی جگہ نہ ہوتی تو خود اسے رخصت بھی کرتا۔ لیکن خیر۔۔۔ اب کیا کہوں، مجھے آج احساس ہوا ہے کہ مدحت کیا تھی؟ اور تم کیا ہو؟ بس اتنا کہوں گا کہ چالیں الٹی بھی ہو جاتی ہیں۔ اور تدبیریں تقدیر سے ٹکرا بھی جاتی ہیں۔ بہر حال بیٹی کی شادی کر رہی ہو۔ سو مبارک باد کی حق دار ہو۔ اور اس لحاظ سے خوش قسمت بھی کہ مدحت کے بیٹے نے تمہیں اسی مقام پہ جگہ دی جس پہ اس کی ماں تھی۔۔۔۔ یا اس کی ماں ہوتی۔" وہ اپنی بات کہہ کر وہیل چیئر سمیت زیب کے کمرے کی طرف مڑ گئے تھے۔ اس حالت میں کہ نائلہ پتھر کا بت بن گئی تھیں۔ پھر کسی نے ان کا کندھا ہلایا تھا۔

"حافظ صاحب کب سے انتظار کر رہے ہیں۔ دلہن سے اجازت لینی ہے۔ آپ کہاں گم ہیں۔"

"آں۔۔۔ ہاں ادھر کمرے میں چلو، میں ساتھ آتی ہوں۔" نائلہ گڑبڑا کر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ جب اچانک ہارون ان کے سامنے آگیا تھا۔

"دلہن کمرے میں نہیں ہے۔ چھت کے اوپر ہے، اور ابھی تک پیلے جوڑے میں ملبوس ہے وہ تیار نہیں ہوئی۔ ادھر ٹنکی کے پاس دیکھا ہے میں نے۔۔۔ شامیانے سے نکلتے ہوئے اچانک اوپر نگاہ پڑ گئی تھی۔ اسی لیے بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ کہیں خود کشی تو نہیں کرنے لگی؟" ہارون کے الفاظ پہ نائلہ کی روح تک کانپ گئی تھی۔ انہوں نے شدید غصے کے عالم میں ہارون کو گھورا۔

"تمہارے منہ میں خاک۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھیں۔ ہارون انہیں جاتے دیکھتا رہا۔ پھر سکون سے تخت پہ بیٹھ گیا۔ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ لی تھی۔ اور سامنے رکھی مٹھائی کی ٹوکری سے مٹھائی نکال نکال کر کھا رہا تھا۔

"میرے منہ میں خاک کیوں خدانخواستہ۔۔۔۔ میرے منہ میں چم چم، قلاقند۔" وہ مٹھائی پہ ہاتھ صاف کرتا رہا۔ اور اوپر ہونے والی کارروائی کے متعلق سوچتا رہا۔۔۔۔ وہ چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا۔

افزا کا اجڑا روپ، ویران آنکھیں، اداس چہرہ۔ لٹا پٹا سراپا۔

"کوئی بات نہیں جان! بس چند ساعتوں کی بات ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ پھر رس گلے کھاتا رہا۔ اور اوپر کے منظر کو چشم تصور سے دیکھتا رہا۔ اسے اندازہ تھا۔ اوپر کیا چل رہا ہو گا۔

نائلہ جب لرزتے قدموں سے چلتی ہوئی اوپر آئیں تو افزا کی حالت کسی کٹی پتنگ جیسی تھی۔

ان کی آنکھیں افزا کو دیکھ رہی تھیں۔ اور کان ڈھولک کی تھاپ سن رہے تھے۔

رات کی تاریکی میں ڈھولک کی تھاپ مجیروں سے مشابہ تھی۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے چاندی کے تھال میں سکے گر رہے ہوں۔ ایسا شور جو ساعتوں کو بھلا لگنے کے بجائے گراں گزر رہا تھا۔ بلکہ نیچے سے آتی ہر آواز۔

اس کی گوری کلائیوں میں سجی چوڑیاں بھی کھنک سے خالی تھیں۔ اور اس کے وجود سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ نائلہ کے دل پہ جیسے تلواریں چل گئی تھیں۔

افزا کی حالت کہیں سے بھی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔ وہ تو کوئی اجڑی ہوئی سودائی لگ رہی تھی۔ نائلہ نے اسے جھنجھوڑ دیا تھا۔

"یہاں کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں تیار ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ اب چلو نیچے۔ نکاح کے لیے حافظ صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔" وہ اسے بازو سے دبوچ کر نیچے لے جانا چاہتی تھیں۔ جب افزا نے ان سے ایک عجیب بات کہی تھی۔

وہ انہیں کٹہرے میں کھڑا نہیں کر رہی تھی۔ وہ ان سے جھگڑا بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ تو صرف انہیں احساس دلا رہی تھی۔ اور اس کے لفظ؟ ان کا رواں

رواں کان بن گیا تھا۔

"اگر آپ کو ان سے محبت ہے تو؟ اگر آپ کو اپنی بیٹی سے محبت ہے تو یوں مت کریں۔ ایسا مت کریں۔"

چار لفظوں کے اس چابک کو اگر جملہ کہتے تھے تو یہ جملہ بڑا سخت قسم کا تھا۔ ان کی ہستی کو ہلا دینے والا۔

"یہ دیا ہے... آپ نے ان کی محبت کا انعام؟ دھوکا دہی؟ بدگمانی، ایک چال میں لپٹا رشتہ؟ یہ احسان مانا تھا آپ نے اپنے شوہر کا؟ جس نے کسی اور کی اولاد کو عمر بھر اپنے گھر میں رکھا۔ پالا پوسا، تعلیم دی اور آپ نے اس کا بیٹا تک اس سے چھین لیا؟ اس شخص کا اپنی اولاد پہ اتنا بھی حق نہیں تھا؟ کہ وہ اپنی مرضی کا کوئی فیصلہ اس سے منوا لیتا؟ آپ نے بیچ میں اپنی محبت رکھ دی؟ کیا ہے آپ کی محبت؟ دھوکے میں لپٹی؟ غرض میں لپٹی؟ مطلب میں لپٹی؟ وہ آپ کی بیٹی کو بس اپنا لے؟ آپ کی بیٹی ایک بڑے افسر کی بیوی بن جائے۔ بس اتنی سی خواہش ہے آپ کی؟ اور بدلے میں وہ خود کہیں کھو جائے... یہ تھی آپ کی زیب سے محبت؟ بس اتنی سی؟ ایک دن بھی آپ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا؟ کیا وہ خوش ہے اس زبردستی کے رشتے پہ؟ آپ ماں ہوتیں یا آپ کو اس سے محبت ہوتی تو اس کے دل اور آنکھوں کی ویرانی آپ کو نظر آجاتی۔ کیا وہ آپ کو چیخ چیخ کر بتاتا؟ وہ خوش نہیں ہے۔ اس کا دل برباد ہو گیا ہے۔ آپ نے اسے ثانی سے بدگمان نہیں کیا بلکہ اس کا اعتبار توڑا ہے۔ اس کے اعتماد کو ہلایا ہے۔ آپ کو لگتا ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پہ اسے پتا چلا تو وہ مجھ پہ بھی اعتبار کر پائے گا؟ اور محبت؟ یہ تو آپ نے سوچا بھی نہیں ہو گا؟ وہ مجھے محبت دے گا یا نہیں... اس کے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے تو سوچتیں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی بولتی جا رہی تھی۔ اور نائلہ، ان کی حالت ایسی تھی جیسے جسم میں جان ہی باقی نہ ہو یہ کیسا آئینہ تھا۔ جوان کی بیٹی نے انہیں دکھا دیا تھا اور اس آئینے میں ان کا کریہہ روپ نظر آ رہا تھا۔ ان کی بھیانک صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شدید

اذیت میں مبتلا تھیں۔ جبکہ افزا ان سے کسی بھی بات کی وضاحت لیے بغیر تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔ کہاں، کس طرف؟ نائلہ کو اس بات کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ اگر اندازہ ہوتا۔ تو افزا کو روک لیتیں۔ اسے واسطے دے کر منا لیتیں۔ مگر نیچے نہ جانے دیتیں۔

وہ شکستہ قدموں سے شاہ زیب کے کمرے سے نکلیں تو ایک مرتبہ پھر ہارون نے انہیں روک لیا تھا۔

"آپ نے اچھا کیا زیب کو افزا کے انکار کا بتا دیا۔ میں بتاتا تو برا لگتا اس کو خیر، خبر خوشی کی ہے یا غمی کی۔ یہ تو اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ آپ غم میں ہیں اور میں خوشی... مطلب خوشی کو غارت ہوتا دیکھ کر پریشان ہوں۔ اس تقریب کی سوگواری کو دور کرنے کے لیے آپ کی بیٹی چھوٹے ماموں کو ساتھ لے کر مطلب وہیل چیئر سمیت نیچے چلی گئی ہے۔ خضر ماموں کے پاس۔ اب نیچے کیا ہو رہا ہے مجھے نہیں پتا آپ کو اطلاع دینے کے لیے رکا ہوا تھا۔ اب نیچے جا رہا ہوں۔ شاہ زیب سے ملاقات پھر سہی... اور ہاں، اب بتایئے گا مجھے۔ میرے منہ میں خاک یا شکر؟" وہ ایک تواتر سے بولتا نائلہ کو بم کی طرح لگا تھا۔ جو گا ہے بگاہے ان کے سر پہ پھٹ پڑتا تھا۔

نائلہ اس کی تقریر پہ چیخ پڑی تھیں۔ ان کا بی پی شوٹ کر رہا تھا۔ یہ آخر کیا ہو رہا تھا؟

"تمہارے منہ میں خاک۔"

وہ بل کھاتی ہوئی پیچھے مڑیں تو شاہ زیب کو سمیر، رمیز، حسن، احسن گھسیٹ کر کہیں لے جا رہے تھے۔ جب وہ منظر سے ہٹے تو نائلہ کے پیروں میں پہیے لگ گئے تھے۔ وہ شاہ زیب کو روکنا چاہتی تھیں۔ لیکن بے سود اور ادھر ہارون ان کے تاثرات سے مزہ لیتا لب کشائی کرنے سے باز نہیں آیا تھا۔

"اب آپ کو نئی اطلاع بھی دے دیتا ہوں۔ کیا یاد کریں گی آپ۔ زیب کو آپ کے لخت جگر یرغمال بنا کر نیچے لے گئے ہیں۔ بڑے ماموں سے معافی دلوانے اور ان سے یہ کہنے کہ آپ کے بیٹے جانی کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔" ہارون ایک مرتبہ پھر ان کے سر پہ کسی

بم کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اب کے ان کی ساری ہمت نچڑ گئی تھی۔ وہ جیسے شکست خوردہ ہو کر ڈھے گئیں۔ اب کوئی کوشش بھی بے کار تھی۔ بے سود' بے فائدہ.... ان کی چال اپنی کشتی سمیت ڈوب گئی تھی۔

اور ان کی بیٹی نے سچ ہی کہا تھا... انہوں نے شاہ زیب کو نہیں خود کو دھوکا دیا تھا۔ زیب کو ثانی سے متنفر کر کے دور کیا۔ اور اپنی بیٹی کے لیے راہیں ہموار کیں۔ یوں اپنے شوہر کی بھی مجرم بنیں۔ بیٹے کی بھی۔ اور جس پہ الزام دھرا تھا اس کی بھی۔ اور ان کے ہاتھ کیا آیا؟ ندامت' پچھتاوا؟

ان کی فریب کاری ان کے منہ پر پڑی تھی۔ ایک جوتے کی مانند۔

اور اب وہ ہاتھ ملتی شدید ندامت کے گڑھے میں اوندھی گری پڑی تھیں۔ تنہا اور اکیلی.... اوپر خاموشی تھی' نیچے ہنگامہ تھا۔ پہلے اوپر ہنگامہ تھا اور نیچے موت کی سی خاموشی۔ اور یہ تقدیر کے ہی کھیل تھے۔ جب چاہتی نصیب پلٹ جاتے۔ بازیاں الٹ جاتیں۔

وہ نم آنکھوں کو مسلتی اس اندھیرے لاؤنج میں تنہا بیٹھی تھیں۔ اور یہ ان کے عمل کا رد عمل تھا۔ تنہائی' اکیلا پن اور سناٹا انہوں نے اپنے گھر کی خوشیوں کو خود آگ لگائی تھی۔ اس پہ جتنے آنسو بہاتیں کم تھا۔

☆ ☆ ☆

اور یہ ایک تقریب باسعید کا منظر تھا۔

تاروں بھری شام جو رات میں ڈھل گئی تھی اس وقت بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ہنستے مسکراتے چہرے اور رونقیں۔ ان چہروں پہ حقیقی خوشی اور رونق تھی۔ اور یہ رونق ایسے نہیں لوٹی تھی۔ اس کے لیے بڑی پلاننگ کرنا پڑی تھی۔

اس پلاننگ کا ماسٹر مائنڈ ایک عام سا دماغ تھا۔ جو نہ تو پڑھائی میں چل سکا تھا۔ اور نہ ہی کاروبار میں.... ہاں' رشتے بنانے اور نباہنے میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ اور جس کے کمال نے آج اس تقریب کو بھی بام کمال پہ پہنچا دیا تھا۔

جی ہاں۔ یہ ہارون تھا... باتوں کا جادوگر اور لوگوں کو شیشے میں اتار لینے والا۔ سو اس نے سب سے پہلے افزا کو شیشے میں اتارا تھا۔ افزا بھلا اسے کہاں ملی تھی؟ کہیں بھی نہیں.... ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی؟ پھر کیا ہوا تھا؟ بہت سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہارون نے بس ایک فون کال سے کام چلایا تھا۔ چھوٹی سی ایک کال۔ اتنا بڑا "بھونچال" لے آئی تھی۔ یہ بھونچال نہیں تو اور کیا تھا؟ شادی رکی اور پھر چل پڑی۔

اس کے لیے چند گھنٹے پیچھے جانا پڑا تھا۔

جب ہارون گھر سے تیار شیار ہو کر آیا تھا۔ تب وہ پوری پلاننگ کے ساتھ آیا تھا۔ جب ماموں کے گھر پہنچا تو امی کی اچانک انڈ آنے والی ہمدردی اس کی پلاننگ پہ لات مارنے والی تھی۔ لیکن اچھا ہوا۔ امی کو اس کی پلاننگ پسند آ گئی تھی۔ تب ہارون نے سمیر سے کہا کہ بلکہ اسے اعتماد میں لے کر افزا تک پیغام پہنچایا۔ یوں افزا ہارون سے فون پہ بات کرنے کے لیے رضامند ہو گئی تھی۔ اور اس بات کا متن کیا تھا؟ انتہائی مختصر۔ ہارون نے کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں باندھی تھی۔ اس نے صاف اور سیدھی بات کی۔ مستحکم اور دو ٹوک۔ جسے سن کر افزا کی روح تک کانپ گئی تھی۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔

"سنو' افزا! میں لمبی بات نہیں کروں گا۔ بس اتنا سن لو۔ تمہاری والدہ نے جو منصوبہ سازی کی ہے' وہ کبھی بھی کامیاب نہیں ہو گی۔ شاہ زیب وقتی طور پہ بدگمان ہوا ہے اور ان کی باتوں میں آ گیا ہے۔ لیکن کب تک؟ ثانی پہ الزام لگایا گیا ہے۔ بات اس کے کردار کی ہے۔ اور نام میرا بھی بیچ میں آ رہا ہے۔ میں چپ نہیں رہوں گا۔ بلکہ زیب کو خانہ کعبہ لے جا کر اپنی اور ثانی کی صفائی دوں گا۔ وہ میری بہن ہے۔ اور قیامت تک بہن ہی رہے گی۔ اس کے بعد ہر صفائی بیچ ہے۔ باقی' تمہاری والدہ نے جو کھیل رچایا ہے؟ کیا وہ کامیاب ہو سکے گا؟ کیا تم جانتی ہو کسی کی زندگی میں زبردستی گھسنا کیا ہوتا ہے؟ تم زیب کی زندگی میں تو آ جاؤ گی۔ مگر اس کے دل میں جگہ نہیں پا سکو گی۔

کیونکہ ایک بات تو طے ہے۔ زیب 'ثانی سے اور ثانی' زیب سے محبت کرتی ہے۔ زیب اعتراف کرے نہ کرے۔ محبت تو ایک حقیقت ہے تو کیا بہتر نہیں... کسی ایسے شخص کی زندگی میں شامل ہونے سے گریز کیا جائے جو آپ کا ہے ہی نہیں۔ بلکہ کسی ایسے بندے کو منتخب کرلیا جائے جو آپ کو چاہتا ہو... جیسے کہ میں... تمہارے پاس دس سیکنڈ ہیں۔ فیصلہ کرو اور مجھے آگاہ کردو۔ باقی مجھ پہ چھوڑ دینا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

اور ہارون کو اپنی تقریر کا دس سیکنڈ میں نہیں آدھے سیکنڈ میں جواب مل گیا تھا۔ صرف آدھے سیکنڈ میں۔

"آپ نے جو کہا۔ میں نے سن لیا۔ فیصلہ کٹھن ضرور ہے مگر نا ممکن نہیں۔ مجھے آپ کا تعاون درکار رہے گا۔" افزا کی آواز اس کے لیے ہفت اقلیم کی دولت کا پیغام تھی۔ اس نے کال بند کردی تھی۔ اور اب انتظار کر رہا تھا۔ پھر یہ انتظار اتنا طویل نہ رہا۔ ایک دم پورے ڈرامے کا سیٹ ہی بدل گیا تھا۔

افزا نے ماں سے دو ٹوک بات کی اور پھر ایک بڑا اور انہونا فیصلہ کرتی نیچے چلی آئی تھی۔ اگر اوپر اس کی ماں نے معاملات خراب کیے تھے تو نیچے والوں پہ ان کا اثر لازمی تھا۔ اب ضروری تھا کہ نیچے بھی ساری بے ترتیب چیزوں کو درست کیا جاتا۔ اور اس کے لیے افزا نے بڑا بہادری کا کام کیا تھا۔ وہ نیچے تایا ابو کے پاس آگئی تھی۔ اور پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تایا ابو کے سامنے دو زانو بیٹھ کے ان سے معافی مانگی۔ تایا ابو تو اس افتاد پہ گھبرا اٹھے تھے۔ انہوں تو یہ سوچا بھی نہیں تھا۔ جو ہو رہا تھا اور جو ہونے جا رہا تھا۔ یہ ایک فلمی سی سچویشن تھی۔ جس کا ڈائریکٹر ہارون تھا۔ جو اب دروازے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جبکہ افزا لگاتار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں آپ سے اور ثانی سے معافی مانگنے کے لیے آئی ہوں۔ جو کچھ میری امی نے کیا۔ جو ثانی پہ الزام لگایا۔ جسے سن کر زیب کو غصہ آیا۔ اور ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اس سب میں زیب کا کوئی قصور نہیں۔ پلیز' تایا ابو! ہمیں معاف کردیں۔ اور ہو سکے تو میری امی کو بھی... اور زیب کو اپنا بیٹا بنالیں۔ مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ کیونکہ مجھے احساس ہو گیا ہے۔ کچھ غلط ہوتا دیکھ کر اس پہ آنکھیں بند کرلینا بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔"

وہ بولتی جا رہی تھی۔ اور روتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو ساری بدگمانی کو دھو رہے تھے۔ سب کے دل صاف ہو رہے تھے۔ ان کا دل پسیج گیا اور ان کی بیٹی کا بھی۔ ڈیڈی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ تب ہی ضمیر بھی آگے بڑھ آئے۔ انہوں نے بھی بھائی کی طرف ہاتھ بڑھا دیے تھے۔ جنہیں ڈیڈی نے تھام لیا تھا۔ دلوں کی کدورتیں اور فاصلے ختم ہو گئے تھے۔ تب ہی سمیر اور رمیز زیب کو بھی گھسیٹ لائے۔ اور زیب سب جان چکا تھا۔ اپنی عزت ماب والدہ کی چال بازی کو بھی... اور وہ سب کچھ درگزر کر سکتا تھا۔ لیکن ثانی پہ لگے الزام کو؟ یہ ایک پھانس تھی۔ جو اس کے سینے میں اٹک گئی تھی۔ امی کچھ بھی کرلیتیں۔ مگر ثانی پر الزام نہ دھرتیں۔ کیا رشتہ توڑنے کے لیے کوئی اور جواز نہیں تھا ان کے پاس؟

اور زیب جب خود آگیا تھا تو ڈیڈی کہاں تک ناراض رہتے۔ اس پہ دو چار گالیوں کی برسات کر کے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

ادھر گلے شکوے دور ہو رہے تھے' ادھر حافظ صاحب ناراض ہو کر واپس جا رہے تھے۔ اور گھر میں موجود مہمانوں نے الگ شور مچا رکھا تھا۔ ہارون بھاگم بھاگ حافظ صاحب کو پکڑ لایا تھا۔ مہمان پھر سے اکٹھے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد نکاح ہوا۔ مگر دلہنوں اور دولہا کی تبدیلی کے ساتھ۔

☼ ☼ ☼

اور اب اسٹیج پہ کچھ روشن چہرے موجود تھے۔ اور ان میں ایک چہرہ ساری دنیا سے خفا اور بیزار بھی تھا۔ جی ہاں۔ نشاۃ الثانیہ کا چہرہ۔ خفا اور بیزار۔ اوپر سے الٹا سیدھا میک اپ جو فوری دستیاب کزنز کے اناڑی

ہاتھوں کا کرشمہ تھا۔ درحقیقت اسے میک اپ کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر بھی پھوپھو نے اپنے ارمانوں کے ہاتھوں تنگ آ کر اسے کارٹون بنا ہی دیا تھا۔

یہ سب کچھ بہت اچانک ہوا تھا۔ بلکہ ڈرامے کا پورا سیٹ ہی بالکل اچانک تبدیل ہو گیا تھا۔ زیب کی اچانک شادی پہ اس نے رو دھو کر صبر کر ہی لیا تھا۔ وہ اتنی گری پڑی تو نہیں تھی کہ محبت نہ ملتی تو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر منتیں کرتی۔ اسے اپنی انا بڑی پیاری تھی۔

البتہ ڈیڈی کے لیے اس شادی کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ اپنی بھڑاس بھی نکالتے تھے۔ غصہ بھی کرتے تھے اور پھر بے بسی کے عالم میں رونے بھی لگتے تھے۔ لیکن ثانی نے خود کو مضبوط کر لیا تھا۔ وہ نہ روئی اور نہ شادیانوں اور ڈھولک کی آواز پہ اپنے ضبط کو بے قابو کر سکی۔ اس نے خود کو ''بے حس'' بنا لیا تھا۔ لیکن یہ بے حسی کئی موقعوں پہ ترخی بھی تھی۔ خاص طور پہ جب بھی وہ کچن اور کمرے کی جالیوں میں سے زیب کو اوپر، نیچے، اندر، باہر جاتا دیکھتی تھی۔

یہ محبت بھی عجیب بلا تھی۔ اور اس کا جادو بھی عجیب تھا۔ اور نہ کوئی تعویز رد بلا تھا۔

جب سے پھوپھو کی زبانی اسے چاچی کے بہتان کا پتا چلا تھا تب سے تو وہ اندر ہی اندر کٹ رہی تھی۔ مر رہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کہیں سے زیب کو پکڑ کر اپنے سامنے لے آئے۔ اور چیخ چیخ کر چاچی کے جھوٹ کا بتائے۔ رشتہ توڑنے کے لیے انہوں نے اس پہ اتنا بڑا الزام لگا دیا تھا؟

پھر جب افزا اور زیب کی شادی کا ہنگامہ اٹھا اور پھوپھو کو جلال آیا تو انہوں نے ہارون کے لیے ڈیڈی سے فوراً ''ثانی کو مانگا تھا۔ یہ اچانک رشتہ دراصل چاچی کے منہ پہ طمانچہ مارنے کے مترادف تھا کہ ان کی بھتیجی ایسی گری پڑی نہیں ہے۔ لیکن ثانی نے سہولت سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے لیے دنیا میں کوئی رشتہ نہ بھی بچتا تب بھی ہارون تو کسی طور پہ بھی اس کی زندگی میں نہیں تھا۔ اس کے پیچھے دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ہارون کو ثانی نے ہمیشہ بھائی سمجھا تھا۔ وہ اسے کسی اور رشتے کے تناظر میں دیکھ ہی نہیں سکتی تھی اور دوسرے یوں تو چاچی کو باتیں بنانے کا موقع مل جاتا بلکہ وہ زیب پہ ثابت بھی کر دیتیں۔

''دیکھا ان دونوں کا چکر تو تھا نا۔'' اور ثانی کو یہ کسی بھی قیمت پہ گوارا نہیں تھا۔

پھر جب ثانی نے اندر ہی اندر مٹنے اور پگھلنے کے بعد کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر ہی لیا تھا تب اچانک وہ ہو گیا جو کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ مہمان رخصت ہوئے۔ گھر آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ پھر اچانک ہی باقی رہ جانے والے خاندان کے لوگوں نے رخصتی کا شور مچا دیا تھا۔

جی ہاں، رخصتی؟ افزا اور ہارون کی۔

ان کی زندگیوں میں در آنے والا یہ موڑ بالکل اچانک آیا تھا۔ جیسے ہی ثانی اور زیب کا نکاح ہوا۔ ساتھ ہی ہارون نے پھوپھو کا پلو پکڑ لیا۔

پھوپھو نے ضمیر چاچو سے افزا کا ہاتھ مانگا تو سب کو ہی نائلہ چاچی کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ افزا کے نکاح کا شور بار ندامت سے دبی نائلہ کے لیے ایک زندگی سے بھرپور سندیسہ تھا۔ وہ خود بخود نیچے پہنچ گئی تھیں۔

ان کی گھٹیا چالوں کے باوجود افزا اپنی اچھی نیت کی وجہ سے اچھے لوگوں میں چلی گئی تھی۔ یہ ان کے لیے مقام شکر تھا۔ اور جب اپنی بیٹی کو ہارون کے شور مچانے پہ رخصت کیا تو وہ اندر تک شرمندہ ہو رہی تھیں۔ اور اسی رنجیدگی، ندامت اور شرمندگی تلے دب کر انہوں نے ثانی سے معافی بھی مانگ لی تھی۔ اس نے چاچی کو معاف کر دیا۔ اور اس معافی کے بعد چاچی نے بھی ڈیڈی سے رخصتی کا مطالبہ کر دیا۔ حالانکہ ثانی ابھی رخصتی کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن ڈیڈی نے ایک نہ سنی۔ ویسے بھی بھاوج سے نئی نئی صلح ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ سے رنجشیں پیدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

یوں ثانی بھی ایک ہائی جمپ لے کر نیچے سے اچانک اوپر آ گئی تھی۔ اوپر یعنی چاچو کے پورشن میں اور زیب کا کمرہ؟ اور اب جب سارے حواس کام کر

رہے تھے۔ اور اس اچانک بدلتی صورت حال کو ذہنی طور پر قبول کرلیا گیا تھا تب ثانی کو وہ سب کچھ یاد آرہا تھا۔ جسے اس نے کچھ عرصہ پہلے بھلا دیا تھا۔

وہ سارا غصہ، گلے، شکوے جو اسے زیب سے تھے۔ اور ثانی زیب کو فی الحال معاف کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔

دوسری طرف زیب کی کیفیات بھی مختلف نہیں تھیں۔

جب امی نے آکر اسے اتنا کہا۔ "وہ شادی کے لیے نہیں مان رہی۔"

یہ الفاظ نہیں تھے۔ اس کے لیے رہائی کا پیغام تھے۔ اور مقام شکر بھی۔ اس پہ بات نہیں آئی تھی۔ اور وہ صاف طور پہ بچ بھی گیا تھا۔

جس حد تک وہ ثانی سے بدگمان تھا۔ امی اس کے لیے کسی کو بھی منتخب کرلیتیں۔ بس وہ نشاۃ الثانیہ نہ ہوتی۔ اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ وہ لڑکی جسے اپنے بچپن کے طے شدہ رشتے کا احساس تک نہیں تھا۔ وہ کیوں اس لڑکی کے لیے اپنے گھر کا ماحول خراب کرتا اور پھر زبردستی ثانی پہ مسلط ہوجاتا۔

اور اب جب ساری غلط فہمیاں دور ہوگئی تھیں تو زیب چاہتا تھا کہ پچھلی ساری باتوں کو بھلا کر نئے سرے سے نئی زندگی کی شروعات کرنی چاہیے تھیں تو۔۔۔ اب کے وہ پھنس بہت برا گیا تھا۔ کیونکہ جو اس کی شریک سفر تھی۔ وہ اتنی آسانی سے کچھ بھی بھلانے والی نہیں تھی۔ لگ رہا تھا۔ وہ ڈیڈی کے مجبور کرنے پہ اوپر آتو گئی تھی مگر ایسے بیٹھی ہوئی تھی جیسے زیب سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد تن فن کرتی نیچے چلی جائے گی۔

اور یہ اس کی بدقسمتی ہی تھی جو اس نے ثانی سے کہہ ہی دیا۔ بلکہ غلط وقت میں کہہ دیا تھا۔

"دیکھو ثانی! جو کچھ بھی ہوا۔ اب اسے بھلانا اور ذہنی طور پہ قبول بھی کرنا ہے۔ بڑوں کے فیصلے اچھے ہی ہوتے ہیں۔ تم بھی ذہنی طور پہ قبول کرلو۔"

زیب بولتا بولتا اچانک رک گیا تھا۔ شاید اسے احساس ہوا تھا۔ یہ الفاظ نئی نویلی دلہن کے حساب سے

ٹھیک نہیں تھے۔ دلہن بھی وہ جو اچانک آئی تھی۔ اسے احساس ہوا۔ وہ قطعاً "ان رومانٹک" بندہ ہے۔ کم از کم اب تو کوئی ڈھنگ کا جملہ بول دیتا۔ بلکہ اپنی خواہش اور خوشی کا ہی اظہار کر دیتا۔ کہ کیسے اس جیسے بدھو کی خدا نے سن لی تھی۔ اب بھی اس نے بڑوں کے کندھے پہ بندوق رکھی تو اندر تک سلگی بیٹھی ثانی بھڑک اٹھی تھی۔

وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتی رہی تو زیب کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ اس نے واقعی نامناسب جملہ بولا ہے۔ اسے ثانی کی تعریف ہی کر دینی چاہیے تھی۔

اب ثانی کی بھلا تعریف کیا کی جاتی؟ زیب نے اس کا تفصیلاً "جائزہ لے کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ قطعی طور پہ روایتی دلہن نہیں تھی۔ بلکہ سر جھاڑ منہ پہاڑ.... مسلے کپڑے 'اترا' پھیلا میک اپ' کھلے بال' اس کے باوجود زیب نے دل پہ پتھر رکھ کر اپنے پہلے جملے کا اثر مٹانے کی غرض سے کہہ ہی دیا۔

"تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو ثانی!" اس آواز اور الفاظ پہ ثانی کو دو سو واٹ کا کرنٹ لگا تھا۔

"آنکھیں ٹھیک ہیں کیا؟ میں تمہیں اس حلیے میں اچھی لگ رہی ہوں۔ افزا کے انکار کا کچھ زیادہ غم نہیں لگ گیا۔ بینائی ہی جاتی رہی۔" اس کا لہجہ گہرا کاٹ دار طنزیہ تھا۔ زیب نے گہرا سانس خارج کیا۔ یعنی ثانی اپنے اصلی جنگجو رنگ میں ہی تھی۔ اسے تسلی ہوئی۔

"بیوی ہو تو ہر حلیے میں اچھی ہی لگو گی۔ غم تو تمہیں لگا ہوا تھا۔ تب ہی جوگیوں جیسی حالت بنا رکھی ہے۔ میں تو اتنا فریش ہوں اور تمہیں پا کر تو کچھ زیادہ ہی فریش لگ رہا ہوں۔" زیب نے مسکرا کر کہا تو اس کو جیسے آگ ہی لگ گئی تھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ افزا کی بہادری کا میڈل اپنے سینے پہ سجا لو گے؟ اگر افزا انکار نہ کرتی تو میرے سامنے ہیرو بن کر نہ بیٹھے ہوتے۔ شکر ادا کرو جو افزا کی بہادری نے تمہیں ڈائیلاگ جھاڑنے کے قابل کر دیا۔" وہ جانے کس کس بات کا غصہ اتار رہی تھی۔ اس کی اتنے سالوں کی لاتعلقی اور بیگانگی کا؟ اپنے ریجیکٹ کیے جانے کا؟ یا اب کی پچویشن کا؟

"مجھے ڈائیلاگز جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام تو ہارون بہت اچھے سے کر رہا ہو گا۔ افزا کو اپنی محبت کا یقین دلاتے ہوئے۔ کیونکہ وہ محبت جو ہم دونوں کے بیچ ہے۔ اس کا یقین ہم دونوں کا ملن ہے۔ ورنہ ایسا کبھی نہ ہوتا۔"

وہ اب بہت بدلے لہجے اور انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی نرم گرم جذبے لٹاتی نگاہیں اور الفاظ؟ ثانی کا دل ہاتھوں سے بس نکلنے ہی لگا۔ اس نے بمشکل نگاہ چرائی تھی۔

"لیکن اگر افزا یہ قدم نہ اٹھاتی؟ تب تمہاری محبت اور یقین کہاں جاتا؟ اب بھی جو کیا افزا نے کیا۔ تمہیں تو افزا ہی قبول تھی۔" اصل پھانس تو یہی تھی۔ جو نکل نہیں رہی تھی۔ زیب سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے اسے نرمی سے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

"تم کیسے کہہ سکتی ہو جو کچھ بھی کیا۔ افزا نے کیا؟" وہ ملائمت سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ چھویا ہوا۔ نرمی سے دباتا ہوا۔ وہ اپنے دھیان میں نہیں تھی۔ ورنہ ہاتھ ہی کھینچ لیتی۔

"تو کیا میں اندھی ہوں۔" وہ برا مان گئی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" زیب نے نفی میں سر ہلایا "لیکن تمہارا اندازہ غلط ہے ثانی! چلو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ جب امی نے کہا۔ ثانی اور ہارون خدانخواستہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ تو مجھے فطری طور پہ بہت غصہ آیا۔ بہت حسد ہوا۔ دل چاہا دو جھانپڑ لگا کر تم سے نکاح پڑھوا لوں۔ پھر عقل سے کام لیا تو سوچا کہ زور زبردستی کے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ تب میں امی کی آنکھوں سے دیکھتا اور ان کے کانوں سے سن رہا تھا۔

لیکن نکاح سے کچھ دیر پہلے حقیقت کھل ہی گئی۔ جب امی اپنی کسی بہن سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ تب میں نے سب سن لیا تھا۔ وہ سب کچھ جو بعد میں کھلتا تو بڑا ہی نقصان ہوتا۔ امی کا بھی اور افزا کا بھی۔ پھر مجھے

سوچنا پڑا کہ کیا کروں؟ کس طرح سے اس شادی کو روکوں؟ اسے تم میری کمزوری سمجھ لو کہ میں نے ساری عمر جنہیں ماں سمجھا تھا۔ ان کے سامنے عین وقت پر انکار نہیں کر سکتا تھا۔

ذہن میں ہارون کا خیال آیا تھا۔ امی کی باتیں سن کر میں جان چکا تھا کہ ہارون پر بھی الزام لگایا گیا ہے۔ میں نے اسے کال کر کے اپنا منصوبہ بتایا۔ وہ نہ صرف سمجھ گیا۔ بلکہ پُرجوش ہو گیا۔ بعد میں اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ یعنی افزا سے شادی نہ کرنے پہ۔ ہارون نے افزا کو فون پہ ساری حقیقت بتائی تھی اور سمجھایا بھی۔ خدا کا شکر ہے۔ وہ سمجھ گئی۔ اس نے اپنے دل اور مستقبل کا نہیں سوچا۔ اس نے انسانیت کا سوچا۔ اور سچائی کا ساتھ دیا جس کے انعام میں اسے ہارون جیسا اچھا' چاہنے والا شریک سفر مل گیا۔ میں نے تمہارے لیے غلط سوچا۔ پھر تم سے وضاحت بھی نہیں لی۔ میں اس کے لیے تم سے معافی مانگنے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

زیب نے اس کے دونوں کانوں کو چھوا تو ثانی جو ہکا بکا بیٹھی تھی۔ ایک دم چیخ پڑی۔

"یعنی ہارون بھی..... ؟ افزا، تم اور ہارون..... تم تینوں کو خبر تھی۔ اور مجھ سے چھپایا۔ بلکہ مجھے تڑپایا۔ سلگایا۔ اور اب معافی مانگتے ہو۔ اب اتنا ہی تڑپو اور سلگو۔" ثانی لال بھبھوکا سی اچھل ہی پڑی تھی۔

"اس ہارون کی تو میں چٹنی بنا دوں گی۔ کس قدر گھنا ہے۔ بھاپ تک نہیں نکالی۔" وہ غصے میں تاؤ کھا رہی تھی۔

"اس کی چٹنی بناؤ یا قیمہ۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن مجھے تو معافی کا سندیسہ دو۔ تاکہ میری بھی شادی بلکہ ایمرجنسی شادی کی رات تھوڑی رومانٹک ہو سکے۔"

اب وہ پھیلتا ہوا ثانی کے قریب ہوا تو وہ اچھل کر اس سے دور ہٹی تھی۔ ہاں اندر کہیں بدگمانی کے بادل چھٹ رہے تھے۔ لیکن ابھی اسے کچھ اور سزا دینی تھی۔

تاروں بھرا آسمان ہارون کے گھر میں پھیلا مسکرا رہا تھا۔ وہ گھر جہاں افزا گئی تھی۔ وہ گھر جس میں ہارون کی ڈھیروں محبتیں اور چاہتیں تھیں۔ ان چاہتوں میں کھو کر وہ شاہ زیب کو بھلا سکتی تھی۔ اس چاہت کے رنگ ہارون کی محبت کے گہرے رنگوں میں ڈوب کر ملکے ہو سکتے تھے۔ یہ افزا کو یقین تھا۔ اور اس کا یقین باطل نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور ویسا ہی آسمان کیپٹن خضر حیات کے بنگلہ کے اوپر بھی جھانک رہا تھا۔ اس آسمان پہ اداسی کا رنگ تھا۔ اس آسمان کے نیچے نائلہ کھڑی تھیں۔ رنجیدہ اور پشیمان سی۔

افزا نے ان سے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "اگر آپ کو زیب سے محبت ہے تو اس کی ویران آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں۔ وہاں آپ کی افزا کا نشان بھی نہیں ہے۔ اگر آپ کو شاہ زیب سے محبت ہے تو زیب کی محبت اسے لوٹا دیں۔"

افزا کے الفاظ نہیں تھے۔ ایک آئینہ تھا۔ جس میں نائلہ کو اپنی کریہہ صورت دکھائی دے گئی تھی۔ سو انہوں نے اپنے دل کو فوراً ہی پلٹ دیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کے دل کو ویران کر دیا اور شاہ زیب کے دل کو آباد کر دیا۔ محبت قربانی مانگتی ہے اور ایثار تو ہر صورت۔ سو انہوں نے اپنی بیٹی کا دل قربان کر دیا اور شاہ زیب کی محبت کو بچا لیا۔ وہ لاکھ بری سہی' بدنیت سہی۔ لیکن آزمائش محبت کے اس پیمانے پہ پورا اُتر گئی تھیں۔

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	ڈولی
میک اپ	سلیک بائی عینی
فوٹو گرافی	ایم۔ کاشف

تنزیلہ زہرہ افضل

پرانی قمیص

باجی جی یہ قمیص کا گلا تو بہت پیارا ہے' کہاں سے کام کروایا تھا؟" سعیدہ نے اس سبز قمیص کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

فرنیچر صاف کرنے سے پہلے اس نے شکیلہ سے کوئی پرانا کپڑا مانگا تو اس نے اسے یہ سبز قمیص لا کر پکڑا دی۔

"یہ لے لو' یہ اب پرانی ہو گئی ہے۔" سعیدہ' شکیلہ کے گھر کا کام کاج کرتی تھی اور صفائی کے لیے شکیلہ چاہے کوئی نئی قمیص پکڑا دیتی یا پرانی' اس کو تو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ غرض تھی تو صرف کام سے اور وہ اب جلدی جلدی کام نپٹا کر جانا چاہ رہی تھی۔

"میں نے کہاں کام کروانا تھا' امی نے لے کر دی تھی یہ قمیص' بلکہ سوٹ تھا پورا۔" شکیلہ نے سرسری انداز میں اسے بتایا۔

"قمیص کا کپڑا پرانا ہو گیا ہے' پر گلے کا کام ابھی نیا ہے۔" سعیدہ ابھی بھی گلے کی طرف دیکھ رہی تھی' پھر سر جھٹک کر صفائی کرنے کو مڑی۔

"ہاں۔ قمیص خوب صورت تھی' اسی وجہ سے تو میری اپنی بہن سے لڑائی ہوئی تھی۔" شکیلہ نے ہنستے ہوئے کہا تو سعیدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"ہیں واقعی باجی۔ اس سوٹ کی وجہ سے۔" اس نے شکیلہ سے پوچھا۔

وہ کافی عرصے سے شکیلہ کے گھر کام کرنے آیا کرتی تھی اس لیے اسے یہ پتا تھا کہ شکیلہ کا اپنی چھوٹی بہن سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا جس کے بعد سے شکیلہ نے شازیہ سے بول چال بند کر دی تھی۔ مگر اسے یہ پتا نہیں تھا کہ وجہ کیا تھی۔ شکیلہ تیز مزاج تھی' عمومی طور پر سعیدہ سے اپنے گھر کی کوئی بات وغیرہ شیئر نہیں کرتی تھی مگر آج موڈ میں تھی تو یہ بات کہہ دی۔

"ہاں اسی سوٹ کی وجہ سے لڑائی ہوئی تھی۔" شکیلہ نے اب کپڑے استری کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

اسے تین سال پہلے والا وہ واقعہ یاد آ گیا تھا جب شازیہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور شادی کے بعد جب وہ ملنے آئی تو امی نے اس کے لیے ایک سوٹ خریدا تھا اور ساتھ میں شکیلہ کے لیے بھی خرید لیا۔ چند روز بعد شکیلہ امی کی طرف گئی تو شازیہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کچھ دیر تک تو وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں پھر امی نے سوٹ نکال کر دونوں کو دکھائے تو شکیلہ کا چہرہ یک دم غصے سے سرخ ہوا۔

"یہ کیا؟ میرے لیے یہ بھدا سا نیلا سوٹ اور شازیہ کے لیے یہ اتنا پیارا سبز کام والا؟"

اس سے شاید برداشت نہیں ہوا تھا اس لیے جھٹ گلہ کیا۔ امی اور شازیہ خاموش کی خاموش رہ گئیں۔

"اس کی تو نئی نئی شادی ہوئی ہے' اس لیے زیادہ کام والا لیا ہے۔۔۔۔" امی نے کمزور سے لہجے میں توجیہ پیش کی تھی مگر وہ بھی شکیلہ تھی۔ جھٹ شروع ہو گئی۔

"امی تو نئی نئی شادی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے اتنا قیمتی سوٹ لے لیا اور میرے لیے یہ سستا سا؟" اس نے بے حد تلخ لہجے میں پوچھا۔ حالانکہ اس کا والا بھی ایسا سستا کہاں تھا۔ اچھا خاصا خوب صورت اور مہنگا تو تھا۔

وہ دو چار منٹ تو کافی زور زور سے بول کر اپنے غصے کا اظہار کرتی رہی اور شازیہ سنتی رہی پھر شازیہ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تو وہ بھی بول اٹھی۔

"آپا! میرا نیا نیا سسرال ہے اور امی نے تو اس لیے لیا تھا کہ عزت بنی رہے مگر آپ سے شاید برداشت نہیں ہوا۔۔۔"

اس نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ شکیلہ کا پارہ یک دم چڑھ گیا۔ وہ بیگ اٹھا کر فوراً" واپس جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی' ابو اور شازیہ سب ہی نے اس کی منت سماجت کی' منایا بھی مگر وہ بھی ضد کی پکی تھی۔ بس رکشہ لیا اور گھر واپس آ گئی۔ ہاں البتہ امی کے گھر سے نکلتے نکلتے وہ سبز جوڑا اپنے بیگ میں ڈالنا نہ بھولی تھی (پہلے تو جی میں آیا کہ اسے وہیں چھوڑ آئے مگر پھر یہ سوچ کر کہ شازیہ پر وہ جوڑا کتنا جچے گا" اس نے فوراً" اسے اٹھالیا)

"بس وہ دن اور آج کا دن' میں نے شازیہ سے دوبارہ کلام نہیں کیا۔" اس نے بڑے فخر سے سعیدہ کو سارا قصہ سنایا تھا۔ سعیدہ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

"اول تو شازیہ کے میاں کی ٹرانسفر ہی کراچی ہو گئی ہے' اس لیے وہ اب کم کم ہی آتی ہے میکے۔ مگر جب آئی ہو تو میں جاتی نہیں' جاؤں تو اس سے بولتی نہیں۔" وہ بڑی خوش ہو کے بتا رہی تھی۔ سعیدہ اب بھی حیران سی اسے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بالآخر ہمت کر کے بولی۔

"تو باجی! تسی صرف ایک سوٹ کی وجہ سے بہن سے لڑ پڑے؟" اس نے استفہامیہ انداز سے شکیلہ کی طرف دیکھا تو شکیلہ نے نگاہ چرالی اور اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"باجی! ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا آپ کو' ویسے بھی ایک ہی تو بہن ہے آپ کی۔" سعیدہ نے ہولے سے کہا۔ "اور سوٹ" وہ کہہ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی "سوٹ تو باجی پرانا بھی ہو گیا۔" اس نے اب بھی وہ قمیص ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ "بس اتنی سی معیاد ہوتی ہے کپڑوں کی جی' دو تین سال بعد پرانے ہو جاتے ہیں اور پھر گرد مٹی صاف کرنے کے کام آتے ہیں۔"

اس نے بڑے سیانے انداز میں کہا تھا۔ شکیلہ بس ہولے سے "ہوں" کہہ کے رہ گئی۔

"اس لیے تو مجھے ان کپڑوں سے کوئی پیار نہیں۔" سعیدہ نے فرنیچر صاف کرتے ہوئے دوبارہ بات کی پھر سرسری سے انداز میں شکیلہ کی طرف دیکھا۔ مگر شکیلہ کو نہ جانے اب کیا ہوا تھا۔ وہ گم صم سی کھڑی کپڑے استری کیے جا رہی تھی۔

"باجی جی! میری مانو تو صلح کر لو بہن سے' ان کپڑوں کا کیا ہے۔ آج نئے ہوتے ہیں تو کل پرانے ہو جاتے ہیں.... ہر شے ہی پرانی ہو جاتی ہے باجی۔" اس نے فون اسٹینڈ صاف کرتے ہوئے ہولے سے کہا مبادا شکیلہ برا ہی نہ مان جائے مگر شکیلہ ہنوز اپنے کام میں لگی رہی۔

کچھ دیر سعیدہ یوں ہی صفائی کرتی رہی پھر مکمل کر چکی تو دوپٹا جھاڑ کر اچھی طرح لپیٹا اور شکیلہ کو سلام کیا تھا۔

"اچھا باجی' کپڑے اور برتن تو میں نے پہلے ہی دھو دیے تھے۔ اب جھاڑ پونچھ بھی کر دی ہے۔ اب مجھے اجازت دو میں باجی صفیہ کے گھر جا رہی ہوں۔" اس نے شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ دروازہ بند کر لو۔"

وہ یہ کہہ کر رکی نہیں بلکہ تیز تیز چلتی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ شکیلہ بھی بے جان سے قدم اٹھاتی دروازے تک آئی اور چٹخنی لگا کر واپس صوفے پر جا بیٹھی۔ اب اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ باقی کپڑے استری کرے' اس لیے خاموش' کافی وقت تک وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہ بار بار فون اسٹینڈ کے پاس پڑی اس سبز قمیص کی طرف جا رہی تھی جو کبھی بے حد خوب صورت تھی مگر اب پرانی ہو چکی تھی۔

وہ آدھ' پون گھنٹہ وہیں بیٹھی' سعیدہ کی باتوں پر غور کرتی رہی پھر بالآخر کوئی خیال ذہن میں آیا تو وہاں سے اٹھی اور قمیص جا کر اسٹور میں رکھی اور خود فون اسٹینڈ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کتنی ہی دیر وہیں کھڑی رہی۔

"تین سال ہو گئے' میں نے شازیہ سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں کی۔" اس نے ندامت سے سوچا پھر صوفے پر بیٹھ کر اس نے فون گود میں رکھا اور شازیہ کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ آخر بہن سے بات بھی تو کرنی تھی.... اسے منانا تھا۔

"ایک ہی تو بہن تھی اس کی۔" اس کے ذہن میں سعیدہ کے الفاظ گونج رہے تھے اور وہ اب مطمئن سی بیٹھی فون ریسیو کیے جانے کا انتظار کر رہی تھی۔

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انھوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔

عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔
عبداللہ پابند صوم و صلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

ناولٹ

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اورِیدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اورِیدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
اورِیدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے، جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغا جی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے' جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کر لے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

ستر ہویں اور آخری قسط

ڈاکٹر جلال متوحش انداز میں اسپتال سے باہر نکلے تو پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی دھڑکنیں دنیا جہاں کی وحشتوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھیں۔

انہوں نے حواس باختہ انداز میں پارکنگ میں آکر دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور باہر کی تازہ ہوا کو اپنے اندر منتقل کرنے کی کوشش کی لیکن اندر کی کثافت کسی صورت بھی کم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

"بختاور...!" ان کے منہ سے یہ نام ایک سرگوشی کی مانند نکلا۔ وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"لیکن وہ تو مر چکی تھی..." ان کا پورا بدن یوں لرز رہا تھا جیسے تیز آندھی کی زد میں خشک گھاس کا کوئی تنکا آگیا ہو۔

"یہ اس طرح زندہ سلامت' اس حال میں' کیسے؟؟" پسینے کی بوندیں ان کی گردن سے ہوتی ہوئی کمر تک پہنچ گئیں۔

"عدینہ میری نواسی ہے اور بختاور کی اکلوتی بیٹی۔۔۔۔"
اس سوچ نے ان کے دل ودماغ میں ایک حشر برپا کردیا۔
"او میرے خدایا' یہ کون سا منظر دکھادیا مجھے۔۔۔۔"
ان کے حلق تک میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔

ڈاکٹر جلال نے پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور بمشکل اسٹارٹ کی۔ ان کے دل کی دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب تھیں اور ذہن کے پردے پر بار بار بختاور کا زندگی سے عاری' زرد چہرہ آرہا تھا اور اس چہرے پر پھیلا صدیوں کا کرب' انہیں بے چین کررہا تھا۔

"اگر بختاور زندہ تھی تو وہ کس لڑکی کی ڈیڈ باڈی تھی جس کے لیے پولیس نے ان سے رابطہ کیا تھا۔۔۔۔" یہ سوال ہتھوڑے کی طرح ان کے دماغ میں برسا۔

"کیا عدینہ کو پتا ہے کہ اس کی ماں کا میرے ساتھ کیا رشتہ ہے۔۔۔۔؟" انہیں اپنے اعصاب پر منوں وزن گرتا ہوا محسوس ہوا۔

"نہیں۔۔۔۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔" انہوں نے خود ہی اپنی بات رد کی۔

"میرے بابا کی ڈیتھ ہوچکی ہے اور میری پرورش میری والدہ نے کی ہے۔۔۔۔" عدینہ کا اپنے تعارف کے دوران کہا گیا جملہ ان کے ذہن کے دریچوں میں روشن ہوا اور انہوں نے مضطرب انداز میں گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی۔ انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کب کیسے اسپتال سے گھر پہنچے۔ پورچ میں گاڑی کھڑی کرکے انہوں نے ٹشو سے اپنا پسینے سے شرابور چہرہ صاف کیا۔ دل کا اضطراب تھا کہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔

"صاحب! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔۔۔۔" مالی جو کہ گملوں کی ترتیب بدل رہا تھا' ڈاکٹر جلال کو کافی دیر گاڑی میں بیٹھے دیکھ کر پریشان ہوا۔

"ہوں۔۔۔۔ کیا کہا تم نے۔۔۔۔؟" وہ غائب دماغی کے عالم میں بولے۔

"صاحب جی' آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا' گاڑی سے باہر کیوں نہیں آرہے؟" مالی کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرائے۔

"نن۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم جاؤ۔" انہوں نے چونک کر مالی کا چہرہ دیکھا اور ناگواری سے کہا تو وہ فوراً" پلٹ گیا۔

"کیا ہوگیا ہے مجھے۔۔۔۔؟" انہیں اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہوئے۔ شکست خوردہ انداز میں وہ باہر نکلے اور گاڑی کا دروازہ لاک کرتے ہوئے ان کے ہاتھ بری طرح کپکپارہے تھے۔

"یا اللہ میری مدد کر۔۔۔۔" شدید قسم کی بے بسی محسوس کرتے ہوئے وہ گھر کے داخلی دروازے تک پہنچے۔ ان لمحات میں وہ ایسی تھکن محسوس کررہے تھے جیسے صدیوں کی مسافت طے کرکے آئے ہوں۔ جیسے ہی انہوں نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' اندر سے آتی ہوئی تیمور کی بلند آواز نے ان کے قدم روک لیے۔ انہیں علم نہیں تھا کہ ایک اور اعصاب شکن مرحلہ ان کا منتظر تھا۔

"بینش نے ساری زندگی جو بویا اس کے کاٹنے کا وقت آچکا ہے امی۔" تیمور کا تلخ لہجہ ڈاکٹر جلال کی سماعت سے ٹکرایا اور ان کے پاؤں زمین نے جکڑ لیے۔

"وہ کیسے.....؟" شائستہ بیگم استعجابیہ لہجے میں بولیں۔

"ارصم کو اپنی ماں کی ساری حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ اس نے کس کس طرح سب کو نقصان پہنچایا اور کس طرح بابا کو ہمارے خلاف بدگمان کرتی رہیں۔ یہ سب معلوم ہونے کے بعد وہ اب اپنی ماں کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں۔" تیمور کی بات پر ڈاکٹر جلال کا تنفس تیز ہوا۔

"کاش تمہارے باپ کو بھی کچھ عقل آجائے اور پتا چلے کہ ساری زندگی جس کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتے رہے اس کے دل میں کتنا بغض بھرا ہوا ہے ان کی اولاد کے لیے....." شائستہ بیگم ناراضی سے بھرپور لہجے میں گویا ہوئیں۔

"مجھے تو آج تک اس کا وہ استہزائیہ انداز اور فاتحانہ قہقہے نہیں بھولتے' جو اس نے بختاور کے کورٹ میرج کرنے کے فیصلے کے بعد اپنے گھر میں بیٹھ کر لگائے تھے....." تیمور کی بات پر ڈاکٹر جلال کو ایسے لگا جیسے پورے گھر کی چھت ان کے اوپر آن گری ہو۔

"سب پتا ہے مجھے....." شائستہ بیگم کی آواز میں افسردگی کا عنصر نمایاں تھا۔

"اور جس دن بینش نے بابا کو طیبہ کا نکاح کرنے پر راضی کیا' اس دن تو باقاعدہ جشن منایا تھا اس نے۔ یقین مانیں اماں' میں مرجاتا لیکن بینش کے ساتھ کبھی شادی نہ کرتا۔" تیمور کی بات پر ڈاکٹر جلال کو لگا جیسے کسی نے ان کا دل مٹھی میں پکڑ کر مسل دیا ہو۔

"اسی لیے تو میں بھی مان گئی تھی تمہاری شادی بندیا کے ساتھ کرنے کو' ورنہ آج تک اس بات کی خلش ہے مجھے' کاش عزت کے ساتھ بیاہ کے لاتی اپنے گھر کی اکلوتی بہو کو۔"

شائستہ بیگم کے منہ سے نکلنے والے ان فقروں سے ڈاکٹر جلال کے من میں ایسی پھانس چبھی کہ سانس لینا محال ہو گیا۔ آج کیسے کیسے قیامت خیز راز کھل رہے تھے ان کے سامنے۔

"میں نے اور بندیا نے تو انگلینڈ جاتے ہی منشی چاچا سے معافی مانگ لی تھی۔ اللہ بخشے انہیں' جب تک زندہ رہے' ہمیشہ رابطہ رہا ان سے۔" تیمور کی بات پر ان کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔

آج کی تاریخ میں وہ اس سے زیادہ انکشافات نہیں سن سکتے تھے۔ اس لیے دل کڑا کر کے اندر چلے آئے۔ سامنے ہی تیمور اپنی والدہ کی گود میں سر رکھے صوفے پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہیں اچانک دیکھ کر دونوں ماں بیٹے کا رنگ فق ہوا۔

تیمور فوراً" بوکھلا کر اٹھ بیٹھے اور شائستہ بیگم نے جانچتی نگاہوں سے اپنے شوہر کا دھواں دھواں سا چہرہ دیکھا۔ وہ تیمور کے سامنے والے صوفے پر دھپ کر کے ایسے بیٹھے جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔

"بابا! کیا ہوا.....؟" تیمور نے آگے بڑھ کر ان کے ماتھے کو چھوا۔ وہ چوکھٹے میں جڑی تصویر کی مانند بالکل ساکت بیٹھے ہوئے تھے۔

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی دو مجھے....." ان کی آواز ایک مدھم بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ شائستہ بیگم نے جلدی سے سائیڈ میز پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں ڈال کر ان کی طرف بڑھایا' جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئے۔

"تیمور..... میرے کندھے دباؤ ذرا....." ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے دونوں ..... کو ہکابکا کر دیا' آج بیس بائیس سال کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کا نام لیا تھا۔ تیمور کا دل خوشی کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

وہ جلدی سے آگے بڑھے اور صوفے کی پشت سے آکر اپنے بوڑھے باپ کے کندھے نرمی سے دبانے لگے۔ لاؤنج میں داخل ہوتی بینش نے یہ منظر انتہائی بے یقینی سے دیکھا' انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنی آنکھوں کو مسلا لیکن اس تلخ منظر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ لاؤنج میں ڈاکٹر جلال' شائستہ بیگم اور تیمور میں سے کسی نے بھی ان کی آمد کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

انہیں تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔

"تایا ابا! ارحم تو نہیں آیا آپ کی طرف......؟"

انہوں نے ہراساں نظروں سے ڈاکٹر جلال کا چہرہ دیکھا، جس پر اجنبیت اور ناگواری کے سوا کچھ نہیں تھا۔

"نہیں......" ڈاکٹر جلال نے سپاٹ لہجے میں کہا تو انہیں دھچکا سا لگا۔

"ماہیر کے ساتھ تو نہیں گیا وہ کہیں......" انہوں نے تایا ابا کا موڈ چیک کرنے کے لیے یوں ہی پوچھا۔

"پتا نہیں......" انہوں نے ایک دفعہ پھر بے رخی سے جواب دیا۔

"آپ کے لیے چائے بنواؤں......" شائستہ بیگم نے بھی بینش کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں چلتی ہوں......" انہیں پورے گھر کی دیواریں اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

"بینش! بیٹھ جاؤ......" تیمور کو اس پر ترس آیا۔

"نہیں...... چلتی ہوں میں......" وہ پلٹیں اور شکست خوردہ قدموں سے چلتی ہوئی لاؤنج سے نکل گئیں۔

"کیسی طبیعت تھی عدینہ کی والدہ کی......؟" شائستہ بیگم نے بے دھیانی میں ایک دفعہ پھر ان کے زخموں کو ادھیڑ دیا۔

"جا کر دیکھ لینا......" انہوں نے اذیت کے گہرے احساس سے آنکھیں بند کرلیں۔

"خدانخواستہ کہیں......" شائستہ بیگم نے فقرہ ادھورا چھوڑا۔

"سرجری ٹھیک ہوگئی ہے......" انہوں نے "فوراً" جواب دیا تو شائستہ بیگم نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا۔

"توبہ ہے، آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا مجھے......" وہ لاپروائی سے گویا ہوئیں۔

"ہاں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے......" ان کے منہ سے نکلنے والی پھنسی ہوئی آواز نے شائستہ بیگم اور تیمور کو الجھن میں مبتلا کیا۔

"کیا مطلب......؟" وہ ناسمجھی کے عالم میں اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔ تیمور کے ساتھ جا کر مل آؤ اس سے، اسے تم سب کی ضرورت ہے شاید۔" انہوں نے نرمی سے تیمور کے ہاتھ پیچھے کیے اور تھکے تھکے قدموں کے ساتھ لاؤنج سے نکل گئے۔ تیمور نے الجھ کر اپنی ماں کا چہرہ دیکھا۔

"عدینہ کی وجہ سے کہہ رہے ہوں گے، اوریدا کی بہت اچھی دوست جو ہے وہ۔" انہوں نے سر جھٹک کر وضاحت کی تو ان کی الجھن بھی سلجھ گئی۔ دونوں ماں بیٹا "فوراً" ہی مطمئن ہوگئے تھے۔ بڑی اماں نے جلدی جلدی میز پر رکھی چیزیں سمیٹنا شروع کردیں۔

☆ ☆ ☆

"میں دیکھتا ہوں، کیسے نہیں جاتی ہو تم میرے ساتھ......" ارحم نے غصے سے اوریدا کا بازو پکڑا اور "تقریباً" گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ پارکنگ میں کھڑے لوگوں نے حیرانی سے یہ منظر دیکھا۔

"یہ کیا کررہے ہو تم......؟" اوریدا بوکھلا گئی۔

"جب انسانوں کی طرح بات نہیں مانو گی تو ایسے ہی کروں گا۔" اس کی آنکھوں میں خفگی کا ایک جہان آباد تھا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ خود چل رہی ہوں میں......"

اس نے جھنجلا کر زبردستی اپنا ہاتھ چھڑایا اور پاؤں پٹختی ہوئی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔ ارحم نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بہت غصے سے اپنی سائیڈ کا دروازہ بند کیا اور خفگی سے اس کا کندھا اپنی جانب موڑا۔

"پرابلم کیا ہے تمہارے ساتھ، تم نے کیا زندگی کو کوئی تین گھنٹے کی فلم سمجھ لیا ہے جو اتنے نخرے دکھا رہی ہو۔"

"اور جو تم "دیوداس" بننے کی ناکام کوشش کررہے ہو وہ کیا ہے؟" وہ بھی ایک دم پھٹ پڑی۔

"یہ سب تمہارے فضول فیصلوں کا نتیجہ ہے......"

ارصم نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا تو وہ ایک دم چڑ گئی۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ مت پڑھو اور دو سبجیکٹس میں فیل ہو جاؤ۔۔۔" اویدا نے جل کر طعنہ دیا۔ ارصم کو ایک جھٹکا لگا' اس نے غصے سے اس کی تھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔

"تم کتنے ٹیسٹوں میں فیل ہوتی رہیں وہ' اگر چاہو تو انگلیوں پر حساب کر کے بتا سکتا ہوں' لیکن کوئی ایک ایسا موقع بتاؤ' جب میں نے تمہاری ناکامی پر تمہیں اس طرح سے ٹریٹ کیا ہو' اس طرح تاک تاک کر طنز کے تیر چلائے ہوں۔" اس کے سرد لہجے پر اوریدا پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ بالکل سچ کہہ رہا تھا۔ اوریدا نے شرمندگی سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کیا کچھ نہیں تھا ارصم کے چہرے پر دکھ' غم گلے' شکوے اور دنیا جہاں کی ناراضی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اوریدا ہی نہیں ساری دنیا سے ہی خفا ہے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔۔۔" وہ بوکھلا کر بولی۔

"تمہارے باتوں کا مطلب اگر میں نہیں سمجھتا تو پھر دنیا کا کوئی شخص بھی تمہیں سمجھنے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ میں ہر شخص سے اس کم ظرفی کی توقع کر سکتا تھا لیکن تم سے نہیں۔۔۔" اس کے الفاظ زہر میں بجھی سوئیاں بن کر اس کے وجود میں گڑ گئے۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی' اتنا برا رزلٹ آسکتا ہے تمہارا۔۔۔" اویدا نے اپنی آستین سے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا۔

"اور میرے گمان کی آخری حد پر بھی نہیں تھا کہ تم اس بات کا طعنہ دو گی مجھے۔" ارصم نے رنجیدگی سے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے مین سڑک پر ڈال دی' وہ بہت تیز گاڑی چلا رہا تھا۔

"آئی ایم سوری ارصم۔۔۔" وہ سر جھکا کر خاموشی سے بیٹھ گئی لیکن ارصم کا غصہ جوں کا توں تھا۔

"یاد رکھنا' میرے برے رزلٹ کی ذمہ دار تم ہو۔ تم نے مجھے اتنی ذہنی اذیت دی کہ میں ایک لفظ نہیں پڑھ سکا۔" ارصم کے اس الزام پر وہ تڑپ اٹھی۔

"میں نہیں' تمہاری کچھ لگتی ارسلہ ذمے دار ہے اس کی۔۔۔" اس نے بھی جھٹ سے بدلہ لیا۔

"ہاں تو وہ بھی تو تمہارے انکار کی وجہ سے میری زندگی میں شامل ہوئی تھی۔" ارصم نے ناراضی سے اسے یاد دلایا۔

"میں نے کہا تھا تم سے کہ ارسلہ سے انگیجمنٹ کر لو۔۔۔" اس نے چڑ کر اس کا سرخ چہرہ دیکھا۔

"ظاہر سی بات ہے' تمہارے انکار کے بعد مجھے کہیں نہ کہیں تو انگیج ہونا ہی تھا۔" وہ ناراض لہجے میں گویا ہوا۔

"تو پھر اس کو نبھاتے نا' راستے میں کیوں چھوڑ دیا۔۔۔" اوریدا کا لہجہ تھوڑا دھیما ہوا۔

"نبھانے کے لیے تھوڑی کی تھی انگیجمنٹ' اس رشتے کو کبھی نہ کبھی تو ختم ہونا ہی تھا۔ چاہے آج ہوتا یا دس سال بعد۔" ارصم کی بات سن کر اسے اپنی سانس سینے میں اٹکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"پھر ضرورت کیا تھی یہ سب کرنے کی۔۔۔؟" اوریدا کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

"کچھ کام ضرورت کے لیے نہیں' محض خود کو اذیت دینے کے لیے کیے جاتے ہیں۔" ارصم کی آواز پست اور درد انگیز تھی۔

"تم بہت بدل گئے ہو ارصم۔۔۔" اس نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو پینے کی کوشش کی۔

"پوچھ سکتا ہوں کہ کیا بدلا ہوں؟"

"تم نے تو کبھی اس طرح ٹینشن نہیں دی تھی مجھے۔" آنسو بغاوت کر کے پلکوں کی باڑ سے باہر نکل آئے۔ وہ اس کے سامنے نہ جانے کیوں کمزور پڑ جاتی تھی۔

"اور تم نے بھی کبھی اس طرح سے انکار نہیں کیا تھا مجھے۔۔۔" اس نے بھی جھٹ سے گلہ کیا۔

"میں نے تمہیں ساری زندگی کے دکھ اور پچھتاوے سے بچایا تھا ارصم! جو فیصلے اپنے بڑوں کا دل دکھا کر کیے جائیں' وہ زندگی میں سکون کا باعث نہیں

بتے۔"

اس کی بات پر ارصم نے الجھ کر اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔ "تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو...؟"

"میرے پاپا اور ڈیزی پھپھو کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ پاپا نے بے شک ایک بہترین میرڈ لائف گزاری، لیکن میں نے انہیں خاص ایونٹس پر ہمیشہ اداس ہی دیکھا۔ اپنے والد کی دل آزاری کی خلش ساری زندگی ان کے دل سے نہیں نکلی۔" اس کی بات پر ارصم کو ایک دم چپ سی لگ گئی۔

"ڈیزی پھپھو کو بھی آج تک بڑے ابا نے معاف نہیں کیا اور نہ جانے کیوں، مجھے لگتا ہے جیسے ان کی زندگی بھی کوئی ایسی خاص خوش گوار نہیں رہی ہوگی۔" اس نے مزید اضافہ کیا۔

"ضروری نہیں محبت کی ساری کہانیوں کا انجام ایسا ہی ہو...." ارصم نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔

"محبت کا نہ سہی لیکن بغاوت اور سرکشی سے کیے جانے والے فیصلوں کا انجام زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔" اس کے سنجیدہ لہجے پر ارصم چپ ہوگیا۔ ان کی گاڑی اب گھر کے گیٹ تک پہنچ چکی تھی۔

"کیا ابھی تک ناراض ہو مجھ سے....." اوریدا نے اسٹیرنگ پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ بڑی محبت سے رکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ارصم بے چین ہوا۔

"تم سے نہیں میں خود سے خفا ہوں....." اس کے ہاتھوں کے لمس نے اسے بے بس کیا۔

"میں تم سے الگ تو نہیں ہوں ارصم....." آنسو پلکوں کی باڑ عبور کر کے اس کے گالوں تک پہنچ گئے۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں، مجھ سے الگ رہ کر کیسے خوش رہوگی؟" اس نے ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ پلیز اپنا فیصلہ بدل دو۔

"لیکن میں بڑے ابا اور سب لوگوں کو خفا کر کے بھی خوش نہیں رہ سکتی۔" اس کی بات پر ارصم پھیکے سے انداز میں مسکرایا، اوریدا کا مسئلہ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

وہ اپنی حساس طبیعت کی بنا پر کسی کو بھی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔

"میرے سامنے رویا مت کرو اوریدا، مجھے لگتا ہے جیسے کوئی میری روح بدن سے کھینچ کر نکال رہا ہو۔" ایک زخمی سا تاثر اس کی نگاہوں میں اترا۔

"تم دنیا کے واحد بندے ہو جس کے سامنے میں اپنا کوئی بھی جذبہ نہیں چھپا سکتی....." اس نے بازو سے اپنی آنکھوں کو بیدردی سے رگڑا۔

"محبت کرتی ہوں نا مجھ سے.....؟" ارصم نے پہلی دفعہ کھل کر پوچھا اس سے۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے...." دنیا جہاں کی افسردگی اس کی بھیگی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ ارصم کو یوں لگا جیسے پورا سمندر اداس ہو۔

"کچھ سوال انسان کھل کر سانس لینے کے لیے کرتا ہے اور مجھے لگتا ہے جیسے میں بہت عرصے سے حبس زدہ موسم میں جی رہا ہوں۔ ہر سانس قیامت لگتی ہے اور ہر لمحہ ایسے لگتا ہے جیسے پل صراط پر چل رہا ہوں۔" اس کی بات سن کر اوریدا کا رکا ہوا دل پھر سے دھڑکنے لگا۔

"تو میں کون سی خوش ہوں، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے پر کاٹ کر تپتی دھوپ میں پھینک دیا ہو۔" اوریدا نے اتنی دھیمی آواز میں کہا کہ وہ بمشکل سن پایا۔

"پتا نہیں کاتب تقدیر نے کیا لکھ دیا ہے ہماری قسمت کے خانوں میں....." دونوں بوجھل قدموں کے ساتھ گاڑی سے اتر آئے۔

اوریدا اب بالکل خاموش تھی۔ جیسے ہی وہ بڑے ابا کے پورشن کے پاس پہنچے اندر کا دروازہ کھلا اور دھواں دھواں چہرے کے ساتھ بینش باہر نکلیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہ ہوں۔ ارصم کو اوریدا کے ساتھ دیکھ کر وہ ایک پل کو ٹھٹکیں۔ جب کہ اوریدا نے ہراساں نظروں سے ارصم کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر دنیا جہاں کی بے زاری نے بسیرا کر لیا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی....!" اوریدا نے گھبرا کر بینش کو

سلام کیا۔

"وعلیکم السلام، کیسی ہو۔۔۔؟" بینش کے نرم انداز پر وہ کچھ بوکھلائی اور اس نے بے یقین نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا۔ جو امید بھری نگاہوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی دیکھ کر اوریدا کو خوف محسوس ہوا۔

"فائن۔۔۔ آپ کیسی ہیں۔۔۔" اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔ میرے ساتھ چلو، تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے مجھے۔" بینش کے سنجیدہ لہجے پر اوریدا گڑبڑا سی گئی۔

"مجھ سے۔۔۔؟" دنیا جہاں کا استعجاب اس کے لہجے میں سمٹ آیا۔

"لیکن اسے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔۔۔" ارصم دو قدم آگے بڑھ کر اپنی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے زاری سے بولا تو بینش کو شاک لگا۔ انہیں ساری زندگی جس لمحے کا خوف رہا تھا۔ وہ حقیقت بن کر ان کے سامنے آچکا تھا۔

"میں تم سے نہیں اوریدا سے بات کر رہی ہوں۔۔۔" بینش نے خود کو سنبھالتے ہوئے قدرے تحمل سے کہا۔

"میں بھی اسی کے متعلق بات کر رہا ہوں۔۔۔" اس کے تلخ انداز پر اوریدا نے الجھ کر ماں بیٹے کا چہرہ دیکھا۔ ارصم کے چہرے پر بغاوت اور بینش کے ہر انداز سے شکست اور پسپائی عیاں تھی۔

"کیا ہو گیا ہے ارصم تمہیں۔۔۔" اوریدا ماں، بیٹے کی بحث سے گھبرا گئی۔

"اپنی ماں پر اعتبار نہیں رہا اسے۔۔۔" ان کے بھیگے لہجے پر اوریدا بے چین ہوئی۔

"چلیں آنٹی! آپ کی طرف بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔۔۔" اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا۔ ارصم نے جھنجلا کر اوریدا کی طرف دیکھا۔

"اٹس ناٹ فیئر۔" وہ ناراض لہجے میں گویا ہوا۔

"میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔۔۔" وہ آنٹی بینش کا سرد ہاتھ پکڑ کر ان کے پورشن کی طرف بڑھ گئی جب کہ ارصم ناراضی سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اسے نہ جانے کیوں اوریدا پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر جلال پچھلے دو گھنٹے سے کڑے احتساب کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ بختاور سے اچانک ہونے والے اس سامنے نے ان کی ساری زندگی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی موت کی خبر نے بھی ان کی ناراضی کو ختم نہیں کیا تھا، لیکن آج اسے زندہ سلامت انتہائی بری حالت میں دیکھ کر ان کا سارا غم و غصہ دھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو چکا تھا۔ کچھ بھی تھا، وہ ان کی اولاد تھی، ان کا اپنا خون۔ وہ چاہ کر بھی اسے اپنے ذہن سے نہیں جھٹک پا رہے تھے۔

"وہ زندہ تھی تو اس نے ان سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" اس سوال کو سوچ سوچ کر ان کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

"وہ بھی تو تمہاری ہی بیٹی ہے، ضد اور انا والی۔۔۔ تم نے اسے دل سے نکالا اور وہ تمہاری زندگی سے نکل گئی ہمیشہ کے لیے۔" ان کے اندر سے کوئی آواز آئی تھی جسے سنتے ہی ان کے مضبوط اعصاب تڑخ سے گئے۔

"آپ نے ساری زندگی ڈکٹیٹر بن کر فیصلے کیے، کبھی تو ایک باپ کی حیثیت سے اپنی اولاد کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتے۔" تیمور کا بہت سال پہلے غصے میں کہا گیا جملہ ان کی یادداشت کی اسکرین پر ابھرا اور ان کا سارا سکون درہم برہم کر گیا۔

"آپ نے اپنی انا کی خاطر میری ساری زندگی کو داؤ پر لگا دیا۔ تیمور بھائی اور ڈیزی باجی کے فیصلوں کی سزا مجھے کیوں دی؟" طیبہ کا ناراض لہجہ ان کی سماعت سے ٹکرایا اور انہیں بے چین کر گیا۔

"کاش آپ سب لوگ ایک دوسرے کو معاف کر دیں تو کتنی زندگیاں پُرسکون اور جینا آسان ہو جائے۔ یہ بات مشکل سہی، لیکن ناممکن نہیں ہے

بڑے ابا۔" اور یدا کی بات بھی انہیں اسی ظالم لمحے میں یاد آئی۔ انہوں نے گہرے سانس بھر کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"ساری زندگی خود بھی اذیت میں گزاری اور اپنے بچوں سے بھی ان کی خوشیاں چھین لیں۔" ان کا ضمیر استہزائیہ انداز میں ان پر ہنسا۔

"میں نے تو اپنے بچوں کو غلط فیصلوں سے بچانے کی کوشش کی تھی.... " انہوں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تمہارے بچوں نے غلط فیصلوں کے ساتھ بھی خوش حال زندگی بسر کی اور تم ساری زندگی اپنی ۔۔۔ انا کے جلتے انگاروں پر کھڑے کڑھتے رہے۔" ایک اور بے باک سی آواز ان کے اندر سے ابھری اور وہ اپنا سر تھام کر مسہری پر بیٹھ گئے۔

مختلف آوازوں کے ہجوم میں وہ اکیلے لڑتے لڑتے نڈھال ہو چکے تھے۔ ضمیر کی عدالت میں ان کا ہر غلط فیصلہ ان کے سامنے آکر ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ انہیں آہستہ آہستہ وہ ساری باتیں اور چیزیں سمجھ میں آرہی تھیں جنہیں سمجھنے کی انہوں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

شائستہ بیگم آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ڈاکٹر جلال کو دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بے بس انداز میں بیٹھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

"کیا ہوا آپ کو؟ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟" انہوں نے پریشانی سے پوچھا۔

سائیڈ میز پر۔۔۔ ڈاکٹر جلال کی چائے جوں کی توں رکھی ہوئی تھی اور اس پر جمی بالائی کی تہہ بھی سیاہ ہو چکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی ارد گرد کی دنیا سے بے خبر بیٹھے ہوں۔

"کیا... کہا تم نے....؟" وہ غائب دماغی کے عالم میں اپنی بیوی کو دیکھنے لگے۔ پہلی دفعہ انہیں احساس ہوا کہ انہوں نے اپنے ساتھ ساتھ ان کی ممتا پر کتنا بڑا ظلم کیا تھا۔ ساری زندگی وہ تیمور اور ڈیزی کے لیے تڑپتی رہیں، لیکن ان کی دل آزاری کے خوف سے اپنے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔

"ہوا کیا ہے آپ کو؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں....؟" وہ گھبرا گئیں۔

"کچھ نہیں.... " انہوں نے اپنی عینک اتار کر سائیڈ میز پر رکھتے ہوئے بات بدلی۔ "تم گئیں نہیں عدینہ کی ماں کو دیکھنے....؟"

"بس جا رہی تھی، آپ نہیں چلیں گے.... " وہ فکر مندی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں، میرے اندر ہمت نہیں ہے.... " ڈاکٹر جلال کے تھکے تھکے لہجے پر وہ چونک گئیں۔

"کیا ہوا؟ تھک گئے ہیں کیا؟"

"ہاں.... بہت زیادہ.... " انہوں نے نڈھال انداز میں بیڈ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرلیں۔ ان کے چہرے پر پھیلی اذیت صاف پڑھی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ میری زندگی کے بدترین دن تھے.... "

ہاشم نے لمبی سانس لے کر اپنی بیٹی کے سامنے ماضی کا پردہ چاک کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ کمبل اٹھا کر کاؤچ پر آکر لیٹ گئے۔ جب کہ شانزے کافی کا بڑا سا مگ لے کر فلور کشن پر بیٹھ چکی تھی۔

ماہیر کے سمجھانے پر شانزے نے ہاشم کو اپنی صفائی کا موقع دے ہی دیا تھا۔ جب کہ ہاشم اس وقت آنکھیں بند کیے کسی اور ہی دنیا میں پہنچے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بھی بہت کچھ اپنے سینے میں چھپائے تھک چکے ہوں۔

"میرا سارا وجود گناہوں میں لتھڑا۔۔۔ اور ہر قدم گمراہی کی دلدل میں دھنسا ہوا تھا' ایسا لگتا تھا جیسے اللہ نے میری رسی دراز کر رکھی ہو۔" ہاشم کی بات پر شانزے کی آنکھوں میں حیرت امڈی۔

"میں ان دنوں کو سوچتا ہوں تو اپنے آپ سے گھن آنے لگتی ہے مجھے۔" اپنے باپ کی تلخ زندگی کے بارے میں سنتے ہوئے اسے کافی کی کڑواہٹ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کا سارا وجود مجسم سماعت

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد
نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی
فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم
نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق
رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

بنا ہوا تھا۔

"آپ نے یہ کیوں کہا تھا کسی کے لہجے میں چھلکتے غرور کی سزا دینے کے لیے مجھے چن لیا گیا تھا۔" شانزے کا ذہن ابھی تک اسی بات میں الجھا ہوا تھا۔ ہاشم کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"بعض دفعہ انسان دانستہ یا غیر دانستہ طور پر بڑی بڑی باتیں کر جاتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ کئی دفعہ آپ کے کہے گئے لفظوں کا تاوان آپ کی اولاد کو بھی بھرنا پڑ سکتا ہے' اللہ کے ہاں کسی کی دل آزاری کی پکڑ بہت شدید بھی ہو سکتی ہے۔" ہاشم کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔

"آپ کس کے بارے میں کہہ رہے ہیں؟" اس نے فوراً" بات کاٹی۔

"تھا ایک شخص' جس کو لگتا تھا وہ علم و فضل کا خزانہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے' جس کا یہ خیال تھا کہ کچھ لوگوں پر اللہ کا خصوصی کرم ہوتا ہے' وہ یہ بھول گیا تھا کہ اللہ جن لوگوں کو بے تحاشا نوازتا ہے۔ ان پر بھاری ذمے داری بھی عائد ہو جاتی ہے' ان کی ذرا سی لغزش پر ان سے یہ سب چھن بھی سکتا ہے۔" شانزے کو اپنے باپ کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"بتائیں نا' کون تھا وہ شخص۔۔۔؟" شانزے نے الجھن بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"میرا باپ۔۔۔" ہاشم کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ نے اسے ہکا بکا کر دیا۔

"کون۔۔۔؟ آپ کے فادر۔۔۔؟" شانزے کو اپنی سماعت پر شک ہوا۔

"کیا مطلب۔۔۔" وہ الجھن کا شکار ہوئی۔ "میرے دادا کا شمار تو اپنے شہر بلکہ ملک کے بہترین علماء کرام میں ہوتا تھا۔"

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا' لیکن علامہ اقبال کہتے ہیں "نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔" ان کی بات شانزے کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔

"تمہارے دادا نے مصر کی ایک مشہور و معروف یونیورسٹی سے فقہ اور حدیث میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی اور انہیں اس بات کا خاصا زعم تھا کہ وہ نہ صرف عالم فاضل ہیں بلکہ ان کا شجرہ نسب سادات فیملی کے ایک مشہور و معروف بزرگ سے جا ملتا ہے۔" ہاشم نے ایک لمبی سانس لے کر اپنے ماضی سے پردہ اٹھایا۔

"تو۔۔۔؟" شانزے نے ناسمجھی کے عالم میں انہیں دیکھا۔

"پھر ان سے بھی ایک ایسی غلطی ہوئی جس نے انہیں آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔" ان کی پیشانی پر گہری سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

"کیسی غلطی۔۔۔؟"

"اپنے ہم منصب اور ہم مرتبہ دوست کی دل آزاری کی۔۔۔" ہاشم نے ایک بہت پرانی گرہ کھولی۔

"وہ کیسے۔۔۔؟"

"بہت سال پرانی بات ہے۔ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو ختم القرآن کی ایک تقریب میں' میں بابا کے ساتھ زبردستی چلا گیا' جہاں ہر مکتبہ فکر کے علما کرام اکٹھے تھے۔ ایک مولانا صاحب نے مجھے پیار کرتے ہوئے بابا سے پوچھا کیا آپ کا یہ بیٹا بھی حافظ قرآن بن کر فقہ و حدیث کی تعلیم حاصل کرے گا؟ ان کے لہجے میں رشک ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"پتا ہے' بابا نے اس بات کے جواب میں کیا کہا۔۔۔؟" انہوں نے شانزے کو تجسس میں مبتلا کیا تو اس نے جھٹ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"بابا نے کہا' ظاہر سی بات ہے۔ چراغ تلے اندھیرا تو ہو نہیں سکتا۔ کم از کم مفتی ابراہیم کا بیٹا بھانڈ اور میراثی بن کر باپ کا نام تو نہیں ڈبوئے گا نا۔"

"انہوں نے ایسی بات کیوں کی۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی۔

"کیونکہ ان مولانا صاحب کا اکلوتا بیٹا میوزیکل بینڈ بنا کر شہر میں ہونے والی تقریبات میں گانے گایا کرتا تھا اور بابا کی اس بات پر اسٹیج پر بیٹھے تمام علما اکرام ہنس پڑے اور ان مولانا صاحب کا مذاق اڑانے لگے۔ ان کا

چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ تقریب کے آغاز میں ہی اسٹیج سے اتر کر اپنے گھر چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد بھی سب ہی لوگ ان پر ہنستے رہے۔" ان کی بات نے شانزے کو گڑبڑا دیا۔

"مجھے آج بھی ان مولانا صاحب کے چہرے پر پھیلی شرمندگی اور بے بسی جب کہ بابا کے لہجے میں چھپا غرور اور زعم نہیں بھولتا' شاید یہی بات اللہ کو ناگوار گزری۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ان کا بیٹا تو صرف سنگر بنا تھا جب کہ مفتی ابراہیم کے بیٹے نے تو انہیں جیتے جی سر اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔" ہاشم آج اپنی اکلوتی بیٹی کی عدالت میں ہر چیز کھول کر بیان کر رہے تھے۔ ہاشم کی آنکھوں میں نمکین پانی اکٹھا ہونے لگا۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" شانزے کو پریشانی لاحق ہوئی اور پہلی دفعہ اپنے باپ سے ہمدردی بھی۔

"میں جو قرآن پاک کے کچھ سیپارے حفظ کر چکا تھا' میرا دل ایک دم ہی اچاٹ ہو گیا۔ حفظ شدہ کلام بھولنے لگا اور ایک وقت ایسا آ گیا کہ میں نے مزید قرآن پاک حفظ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ رات قیامت کی رات تھی۔ بابا نے مجھے خوب مارا اور میں اگلے دن گھر چھوڑ کر لاہور بھاگ گیا۔۔۔" ہاشم کی بات پر اس کا منہ کھل گیا۔

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟"

"میں اپنے والد کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی اولاد تھا۔ پندرہ دن لاہور میں گھومتا رہا۔ بھوک لگتی تو کسی مزار پر لنگر کا کھانا کھا لیتا اور میری ماں میرے غم میں بیمار پڑی تو بابا اور بھائی مجھے ڈھونڈ کر گھر لے آئے' لیکن میرا دل نماز میں نہیں لگتا تھا اور بابا میرے ساتھ زبردستی کرتے' اس طرح وقت گزرتا گیا اور میں نے میٹرک کر لیا' لیکن میری آئے دن کی شکایتوں اور لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر بابا نے ایک دوست کے مشورے پر مجھے امریکا بھجوا دیا جہاں میں نے اپنی اگلی اسٹڈیز کا آغاز کر دیا۔"

"اوہ۔۔۔" شانزے تھوڑا سا ان کے اور قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"امریکا میں کچھ ایسے لڑکوں سے میری دوستی ہو گئی جو دنیا کے کسی دین یا مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ میں ان کی خوش نما' خیالی باتوں کے جال میں پھنس گیا۔ کچے ذہن میں وہ غلط عقائد پختہ ہوتے گئے اور کچھ سال بعد جب میں گریجویشن کر کے واپس آیا تو بالکل بدل چکا تھا۔"

"اوہ۔۔۔ پھر کیا ہوا۔۔۔؟" شانزے کو ایک دم اس قصے میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

"میں بابا اور اپنے بھائیوں کے عقائد اور نظریات سے اختلاف کرنے لگا اور میرے والد کے پیروں سے زمین اس دن نکلی' جب اپنے مدرسے کے باہر میرا ایک مخالف گروپ کے بندے سے ایک مذہبی بحث میں جھگڑا ہو گیا' جس نے پورے شہر میں میرے ملحد ہونے کی خبر پھیلا دی اور شہر بھر کی دیواروں پر میرے اور میرے باپ کے خلاف پوسٹرز لگا دیے گئے۔" ہاشم کی بات پر شانزے کا سانس رکا۔

"اوہ نو۔۔۔!" شانزے پریشان ہوئی۔

"والد صاحب اور میرے بڑے بھائیوں نے مجھے راہ راست پر لانے کی بہت کوشش کی' لیکن میں اپنے ملحدانہ نظریات سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ لوگوں کے تمسخرانہ جملوں اور میری وجہ سے ہونے والی رسوائی نے والد صاحب کو بیمار کر دیا' وہ کئی کئی گھنٹے تلاوت کرتے اور اللہ سے اپنے نادانستگی میں کیے گئے گناہوں پر توبہ کرتے۔" ہاشم کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی ابھری۔

"بابا سراپا بدل گئے تھے' ایک اتنا بڑا عالم دین' اسکالر بندہ اپنے بیٹے کے عقائد کی درستی کے لیے اپنے مختلف دوستوں سے رجوع کرنے لگا۔" شانزے کئی ثانیے بنا پلک جھپکے انہیں دیکھنے لگی۔

"وہاں سے کام نہیں بنا تو عالموں اور پیروں کے آستانوں پر حاضریاں دینے لگا' اور تب بھی کچھ نہ بنا تو مجھے میرا حصہ دے کر فارغ کر دیا۔ اس کے بعد بابا نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا۔ ان کا سارا طنطنہ ان کی ایک اولاد نے ختم کر دیا تھا۔ کتنا بدنصیب تھا میں۔۔۔" ہاشم کی

آواز بھرا گئی۔

"میری ذہنی پراگندگی بڑھتی ہی جا رہی تھی' دنیا کی کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں مجھے سکون ملتا۔ تنگ آکر میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور لوگوں کی خدمت کر کے اپنا اضطراب ختم کرنے کی کوشش کرتا۔ میری اپنی ہی فلاسفی تھی' کوئی دلیل اور منطق میرے دل پر اثر نہیں کرتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اللہ نے میرے دل پر مہر لگا دی ہو......"

وہ بات کرتے کرتے خلا میں گھورنے لگے اور پورے کمرے میں بوجھل سی خاموشی کا راج ہو گیا۔

☼ ☼ ☼
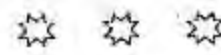
اوریدا ایک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی......

بینش کی آنکھیں متورم' چہرہ بجھا ہوا اور بال آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ ملگجے اور سلوٹوں سے بھرے ہوئے لباس میں وہ اس وقت ایک بھٹکی ہوئی روح کی مانند لگ رہی تھیں۔ اپنے گرد و پیش سے بیگانہ وہ دیوار سے ٹیک لگائے ایسے بیٹھی تھیں جیسے کوئی عورت ریلوے اسٹیشن پر لیٹ پہنچی ہو اور اس کی ٹرین اس سے چھوٹ گئی ہو اور اب اگلی ٹرین کا انتظار اسے محال لگ رہا ہو۔

اوریدا کو یقین آگیا تھا کہ وقت کے ہاتھ بہت بے رحم ہوتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے کیے کی کچھ سزا دنیا میں بھی بھگتنی پڑتی ہے۔

"تم سمجھاؤ اسے' اپنی زندگی خراب نہ کرے۔ تمہاری بات تو مانتا ہے وہ......" رت جگوں کی ماری بینش تھکن سے چور لہجے میں بولیں تو اوریدا کو کرنٹ سا لگا' وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بینش کبھی اس سے اس قسم کی بات بھی کر سکتی ہیں۔ وہ گونگوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگی۔

"خفا ہو گیا ہے وہ مجھ سے' نفرت کرنے لگا ہے وہ اپنی ماں سے۔ اسے لگتا ہے میں اس دنیا کی سب سے بری عورت ہوں۔" وہ گویا دیوانگی کے عالم میں خود کلامی کرتے ہوئے رونے لگیں۔

"اسے کہو' وہ اپنی ماں کی زندگی کا واحد اثاثہ ہے۔ اگر یونہی خفا رہا تو میرا سانس بند ہو جائے گا۔" ہچکیوں کے دوران وہ بے ربط جملے بولنے لگیں۔

"آپ پریشان نہ ہو آنٹی' میں نے کافی سمجھایا ہے اسے......" اوریدا نے محتاط انداز میں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"لوگ کیا کہیں گے بینش حماد اپنے ایک بیٹے کی پرورش بھی ڈھنگ سے نہ کر سکی' اس کے لیے میں نے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا دی' وہ مجھے کہتا ہے کہ میں سائیکو پیشنٹ ہوں اور مجھے ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے۔" اوریدا کو ان کی حالت خاصی قابل رحم لگی۔

"ٹھیک ہو جائے گا وہ آنٹی' آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں......" اوریدا لاشعوری طور پر اٹھ کر ان کے پاس آگئی۔ اس نے جیسے ہی بینش کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ بے ساختہ اس کے گلے لگ گئیں۔ اوریدا کچھ لمحوں کے لیے بالکل ہی ساکت رہ گئی۔

"اسے بتاؤ' میری زندگی کی واحد جمع پونجی ہے وہ' میں کیسے اسے برباد ہوتے ہوئے دیکھ سکتی ہوں۔" وہ اونچی آواز میں رونے لگیں۔

"کچھ نہیں ہو گا اسے' مان جائے گا وہ......" اوریدا نے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"میری زندگی میں اس کے اور آغا جی کے سوا ہے ہی کون' کیوں اذیت دے رہا ہے وہ مجھے۔" اوریدا کی آنکھیں بھی دھندلا گئیں۔ ان کی ذہنی رو ایک دفعہ پھر بھٹک گئی تھی۔

"اللہ نے سزا دی ہے مجھے' میں نے تایا ابا کا دل ان کے اکلوتے بیٹے کی نفرت سے بھر دیا تھا اور آج تقدیر نے میرے بیٹے کو مجھ سے بدگمان کر دیا۔" وہ اس وقت خود احتسابی کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھیں۔

"اللہ بہتر کرے گا' آپ ریلیکس رہیں پلیز۔" اوریدا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ انہیں کس طرح تسلی دے۔

"اللہ کیوں بہتر کرے گا' میں نے تھوڑے لوگوں کا دل دکھایا ہے۔ پتا نہیں کس کی آہ لگی ہے مجھے......" وہ

خود ترسی کا شکار ہوئیں۔

"ارصم آپ سے زیادہ دیر خفا رہ ہی نہیں سکتا' آپ میری بات کا یقین کریں۔" اوریدا نے نرمی سے ان کے بکھرے ہوئے بال سمیٹے۔

"تم مجھے معاف کردو گی تو اس کا دل بھی صاف ہو جائے گا۔" انہوں نے ایک دم ہی اس کے آگے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اوریدا کو کرنٹ سا لگا۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں آنٹی' آپ میرے لیے ماں جیسی ہیں۔ بھلا مائیں بھی اپنی بیٹیوں سے معافی مانگتی ہیں۔" اوریدا نے بے اختیار ان کے ہاتھ کا بوسا لیا۔ بینش اس کا بازو پکڑے بے یقینی سے دیکھنے لگیں۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو' میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"آپ بھی بہت اچھی ہیں۔" اوریدا نے اپنے ہاتھ سے ان کے آنسو پونچھے۔

"مجھے معلوم ہے تم محض میرا دل خوش کرنے کو ایسا کہہ رہی ہو۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائیں۔

"ایسا نہیں ہی' آپ مجھ پر ٹرسٹ کریں۔" وہ تھوڑی سی شرمندہ ہوئی۔

"تم پر اعتبار تھا تو اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے تمہارے ساتھ۔" انہوں نے تھوڑا سا خود کو سنبھالا۔

"میرا آپ سے وعدہ ہے' ارصم خود آکر آپ سے معافی مانگے گا اور وہی کرے گا جو آپ چاہیں گی۔" اوریدا کی بات پر بینش نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو نا۔؟" وہ ابھی بھی بے اعتبار تھیں۔ بیٹے کی بے رخی اور نفرت نے انہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اوریدا نے ان کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

"میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔" بینش کی بات پر اوریدا ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اوہ میرے خدا! آپ سب کچھ جانتے تھے۔"

عدینہ سخت تعجب اور بے یقینی سے عبداللہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ جو اس کی حیرانی پر مسکرا رہا تھا۔

وہ دونوں اس وقت اسپتال کے ایک کیفے ٹیریا سے اپنے لیے جوس خرید کر آپا صالحہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آپا صالحہ کی طبیعت کافی بہتر تھی اور اسی وجہ سے وہ دونوں اس طرف نکل آئے۔ راستے میں عدینہ نے اسے آپا کے ماضی کی داستان مختصراً" سنائی۔ وہ خاموشی سے کوئی بھی لقمہ دیے بغیر اس کی بات سنتا رہا' یہ اس کی عادت تھی' وہ عدینہ کی چھوٹی سے چھوٹی اور عام بات بھی بہت غور سے سنتا تھا۔

"آپ کو یہ سب جان کر حیرت نہیں ہوئی۔؟" عدینہ نے سوالیہ انداز سے اس کی جانب دیکھا۔

"نہیں۔" یک لفظی جواب نے اسے حیران کیا۔

"کیوں۔؟" وہ شرمندہ ہوئی۔

"اس لیے کہ میں یہ سب پہلے سے جانتا تھا۔" اس کے پُرسکون لہجے پر عدینہ کے قدم جہاں تھے' وہیں تھم گئے۔

"کب سے۔؟" وہ بغیر پلکیں جھپکائے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بہت سالوں سے۔" اس نے بڑے مزے سے جواب دیا۔

"تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔؟" وہ ایک دم خفا ہوئی۔

"تم تو میرے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں' ذرا یاد کرو پھر کس طرح بتاتا۔" عبداللہ کے شرارتی لہجے پر عدینہ جھینپ کر چپ ہو گئی۔ اس کے لبوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ بکھری۔

"آپ کو کس نے بتائی تھیں یہ ساری باتیں۔؟" عدینہ نے جلدی سے موضوع بدلا۔

"آپا نے خود۔" عبداللہ کے جواب پر اسے ایک دفعہ پھر کرنٹ سا لگا۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اس نے تعجب بھرے انداز سے اس شخص کی طرف دیکھا جو اسے اپنی ماں کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پیارا تھا۔

"کب اور کس وقت۔؟" عدینہ بے تابی سے گویا

ہوئی۔

"جب تمہارے اور میرے پرپوزل کی بات چلی تھی تو تمہارے بابا اور آپا نے مجھے بٹھا کر ایک ایک بات بتائی تھی تاکہ مستقبل میں، تمہیں اس حوالے سے کوئی پریشانی نہ ہو۔" عبداللہ کی وضاحت پر اس کے اعصاب پرسکون ہوئے۔

"لیکن میں یہ ہرگز نہیں جانتا تھا کہ آپا کے والد ڈاکٹر جلال ہیں اور اوریدا ان کی بھتیجی ہے۔" عبداللہ نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

"ہاں آپا بھی نہیں جانتیں، میں اس حقیقت سے واقف ہوں۔" اس نے بھی لاپروائی سے کہا۔

"ویسے ڈاکٹر جلال کے گھر سے ابھی تک کوئی آیا کیوں نہیں؟" عبداللہ کی بات نے اسے تشویش میں مبتلا کیا۔

"بڑے ابا کی خاموشی تو کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی ہے مجھے۔" عدینہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

"بات بھی تو چھوٹی نہیں ہے۔ انہیں سنبھلنے میں کچھ ٹائم تو لگے گا۔" عبداللہ نے نرم لہجے میں دلاسا دیا۔ "تم اوریدا کو فون کرو، ہوسکتا ہے انہوں نے گھر جا کر کوئی نہ کوئی بات کی ہو۔" اس نے مزید مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں کرسکتی، ڈر لگ رہا ہے مجھے۔" اس کی بات پر وہ حیران ہوا۔

"اتنی ڈرپوک لگتی تو نہیں ہو، میری سانسیں تو ہر وقت سولی پر لٹکائے رکھتی تھیں۔" عبداللہ کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔ نکاح کے بعد عبداللہ کی ہلکی پھلکی سی چھیڑ چھاڑ اسے مزا دیتی تھی۔

وہ دونوں چلتے چلتے آپا صالحہ کے کمرے تک پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے مونا اور بے بے کو دیکھ کر حیران ہوگئے۔ مونا ایک دن پہلے ہی اپنے والدین سے ملنے حویلیاں شہر گئی تھی اور آپا صالحہ کی سرجری کی اطلاع اسے بے بے نے دی تو وہ فوراً ہی ان کے ساتھ راولپنڈی پہنچ گئی۔

"بہت بری ہیں عدینہ باجی آپ، کم از کم آپا کے آپریشن کی اطلاع تو کردیتیں۔" مونا نے اس کی طرف دیکھتے ہی شکوہ کیا، وہ جو بے بے کے گلے لگی ہوئی تھی اس کی بات سن کر مسکرادی۔ آپا صالحہ کے ڈرپ لگی ہوئی تھی اور کمزوری اور نقاہت ان کے وجود سے عیاں تھی۔

"آپا کی طبیعت ہی اتنی اچانک خراب ہوئی کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔" عدینہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور وہ ہو بھی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ انکشافات کی رات تھی۔ باپ بیٹی کے درمیان فاصلے کافی حد تک سمٹ گئے تھے۔ اس میں زیادہ ہاتھ ہاشم کا تھا۔ اس وقت شانزے بے تکلفی سے باپ کے کندھے سے سر ٹکائے ان کی داستان حیات سن رہی تھی۔

"میری مدر سے آپ کا رابطہ کیسے ہوا۔" شانزے نے اپنے ذہن میں لگی بے شمار گرہوں کو کھولنے کے لیے پوچھا۔

"یونیورسٹی میں۔" وہ مبہم انداز میں مسکرائے۔

"اسے میری انسانیت کی خدمت کی باتیں اور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کیے گئے چھوٹے چھوٹے اقدامات بہت اچھے لگتے تھے۔ بہت معصوم تھی وہ، جو میری ظاہری شخصیت کو دیکھ کر متاثر ہوگئی۔" ان کی آنکھوں سے کرب چھلکا۔

"اس نے میری خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا اور میں نے نتیجے میں اس سے سب کچھ چھین لیا، اس کی خوشیاں، اس کے رشتے، اس کا اعتماد، اس کا بھروسا کوئی چیز بھی سلامت نہیں رہنے دی۔" وہ اپنی آواز میں کپکپاہٹ کو چھپا نہیں پائے۔

"لیکن جب میں نے اس سے اس کا مذہب اور اس کا اللہ چھیننا چاہا تو اس کمزور لڑکی میں پہاڑ جیسی طاقت آگئی۔ میری محبت، میری ناراضی اور میری کوئی دلیل بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں لاسکی، اس نے مجھ پر اور مجھ سے وابستہ ہر چیز پر لعنت بھیجی اور

مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔" ہاشم کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہوئے' شانزے آگے بڑھ کر اپنے باپ کا ہاتھ نرمی سے سہلانے لگی۔

"آپ کے دینی نظریات میں تبدیلی کیسے آئی؟"

"جن دنوں میں باہر تھا تو میری ایک امریکن لڑکے سیموئیل سے بہت زیادہ دوستی تھی اور مجھے اپنے مذہب سے اس طرف لانے والا بھی وہی تھا۔ وہ ایک غیر ملکی تنظیم سے وابستہ تھا جو ان ہی عقائد کا پرچار کرتی تھی۔ سیموئیل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان آگیا اور اچانک ہی اس کی مجھ سے ملاقات ہوگئی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں کے لوگوں کی ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ان کا مذہب ہے اور ہمیں لوگوں کو راہ راست پر لانا چاہیے کیونکہ یہ بھی انسانیت کی ایک بڑی خدمت ہے۔" ہاشم نے تفصیل سے بتایا۔

"پھر آپ لوگوں نے اس سلسلے میں کیا کیا؟" شانزے کو تجسس ہوا۔

"میں نے اس کے ساتھ مل کر ایک پبلشنگ ادارہ قائم کیا جہاں ہم اسلام کے خلاف لٹریچر شائع کرتے تھے اور ہمیں فنڈنگ باہر کی ایک این جی او سے ہوتی تھی۔" ہاشم کے لہجے میں پشیمانی کا ایک سمندر بہہ نکلا۔

"آپ کو میری مدر نے منع نہیں کیا...؟" شانزے کے منہ سے پھسلا۔

"اس نے تو اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ شور مچایا' جھگڑا کیا اور جب مکمل طور پر مایوس ہوگئی تو میری زندگی سے نکلنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور راستہ ہی نہیں تھا۔" ہاشم نے لاشعور طور پر بختاور کی طرف داری کی۔ شانزے کو پہلی دفعہ اپنی ماں سے ہمدردی محسوس ہوئی ورنہ وہ ہمیشہ ہی انہیں موردالزام ٹھہراتی آئی تھی۔

"لیکن یہاں پر تو مشہور تھا کہ آپ کو قتل کردیا گیا...؟" شانزے نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"اصل میں' امریکا میں ایک مسلمان سیاہ فام سے میری دینی بحث کے دوران ٹھیک ٹھاک ہاتھاپائی ہوئی تھی اور اس نے چاقو سے وار کر کے مجھے زخمی کردیا۔ اپنی طرف سے تو وہ مجھے مار کر سڑک پر پھینک کر چلا گیا۔ میرے کچھ دوست سمجھے کہ میں مرچکا ہوں' انہوں نے اسپتال لے جانے سے پہلے ہی پاکستان فون کر کے میرے مرنے کی اطلاع دے دی' لیکن اللہ نے شاید مجھ سے کوئی خاص کام لینا تھا اس لیے بچالیا۔" انہوں نے تفصیل سے اس واقعے پر روشنی ڈالی۔

"ویسے بھی بختاور کے چلے جانے کے بعد میرا سب رشتوں سے ہی اعتبار اٹھ گیا تھا۔ مجھے علم تھا کہ میرے نظریات کی بنا پر میرے خاندان والے مجھ سے نفرت کرتے ہیں اس لیے میں نے اس بات کی تردید کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔" انہوں نے مزید بتایا۔

"پھر آپ کو اس حقیقت کا ادراک کیسے ہوا کہ آپ ایک غلط راہ پر چل رہے ہیں؟" شانزے نے سانس روک کر پوچھا۔

"بہت سال کے بعد' جب تمہاری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور ہمارے پبلشنگ ادارے میں آگ لگ گئی تو میں اور سیموئیل دوبارہ امریکا چلے گئے۔ وہاں جاکر اسی تنظیم سے وابستہ ہوگئے اور دن رات اس کے لیے کام کرنے لگے۔ اسی سلسلے میں ہم لوگ انڈونیشیا گئے ہوئے تھے جب وہاں پر آنے والے ایک زلزلے نے میری ساری کائنات ہی بدل کر رکھ دی۔" ہاشم کے چہرے پر ایک ناقابل بیان تاثر ابھرا۔

"وہ کس طرح...؟" شانزے ہمہ تن گوش تھی۔

"جب زلزلہ آیا تو میں ایک پانچ منزلہ عمارت کے نیچے دب گیا' بھاری سلوں' اینٹوں اور وزن کے نیچے دب کر میری سمجھ میں وہ بات آئی جو ایک عالم دین کا بیٹا ہو کر ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر میرا دل ماننے سے انکاری تھا۔ میں پورے تین دن ملبے میں دبا رو رو کر اس ہستی کو پکارتا رہا جس کے وجود سے میں پورے سولہ سال انکاری رہا۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا' اس کائنات کو بنانے والا اللہ ہے اور انسانیت کا سب سے

بڑا مذہب تو در حقیقت اسلام ہے۔" ہاشم کی آنکھوں سے ـــــــ آنسو بہنے لگے۔ شرمندگی، پچھتاوا، تاسف کیا کچھ نہیں تھا ان کے لہجے میں۔

"وہ تین راتیں نہیں، تین صدیاں تھیں۔ میرے حلق تک مٹی ہی مٹی تھی اور میں بھوکا پیاسا، چھتیس گھنٹے لگاتار اللہ سے معافیاں مانگتا رہا۔ میرے سارے گناہ ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے اور میں نے تب اللہ سے ایک عہد کیا۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے رکے۔

"کیسا عہد۔۔۔؟" شانزے نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو اپنی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کردوں گا اور اس کے بعد وہ معجزہ ہوا جس کو آج بھی سوچوں تو میری عقل ماننے سے انکاری ہے، امدادی ٹیمیں جن لوگوں کو زندہ سلامت باہر نکالنے میں کامیاب ہوئیں ان میں سے ایک میں بھی تھا۔" ہاشم بولتے بولتے تھک گئے تو انہوں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" وہ پریشان ہوئی۔

"میرے جسم میں کئی فریکچر ہو چکے تھے، میں اگلے چھ ماہ اسپتال میں رہا، لیکن اس وقت میرے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔" ہاشم کا لہجہ نم ہوا۔

"میں نے سولہ سالہ جو گمراہی میں بسر کیے تھے اگلے سولہ سال ان کا مداوا کرنے میں گزار دیے۔ اپنے مذہب اسلام کے بارے میں جتنا علم حاصل کرتا جاتا اتنا ہی شرمندگی کے گڑھے میں گرتا جاتا۔ میں نے اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی جہاں سے میرے والد صاحب نے کی تھی۔ میں نے سولہ سال سر اٹھا کر نہیں دیکھا اور اپنی ذات کو دین کے فروغ کے لیے وقف کردیا۔ شاید میرے والد صاحب اور بختاور کی دعا قبول ہوگئی تھی جو وہ میری ہدایت کے لیے کرتے تھے۔۔۔"

"اس عرصے میں آپ کو کبھی میرا خیال نہیں آیا۔۔۔؟" شانزے نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"سچ پوچھو تو بہت دفعہ آیا اور پھر خیال آتا کہ تم مجھ سے بہتر ہاتھوں میں ہو اور شاید تم میرے ساتھ ہوتیں تو میں امریکا واپس نہ جاتا اور یہیں پاکستان میں اپنے لیے مزید جہنم کی آگ خرید تا رہتا۔۔۔" انہوں نے صاف گوئی سے جواب دیا تو شانزے لاجواب ہوگئی۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

اگلے چند دنوں میں ہاشم نے اپنے بہن بھائیوں سے بھی رابطہ کرلیا تھا۔

شانزے کو تب پتا چلا اس کے تایا اعظم بہت عرصے سے جانتے تھے کہ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنی زندگی کو دین کے لیے وقف کرچکا ہے، لیکن انہوں نے جان بوجھ کر اس سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے ہاشم خود ان سے رابطہ کرے۔ اس بات نے شانزے کو مزید حیران کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے بیٹے تیمور اور اوریدا کے ساتھ اسپتال کے اس کمرے میں جانے سے پہلے تک بڑی اماں کو گمان تک نہیں تھا کہ وہ جس سے ملنے کے لیے جارہی ہیں وہ در حقیقت ان کی سگی بیٹی بختاور عرف ڈیزی ہے۔

"کیا سوچتی ہوگی عدینہ، کسی نے مڑ کر خبر تک نہ لی۔۔۔" بڑی اماں پارکنگ سے کوریڈور تک مسلسل بولتی ہوئی آرہی تھیں۔

"بتا دیجیے گا کہ آپ گھر میں اپنے مجازی خدا کی خدمتیں کررہی تھیں۔" ماہیر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں چھیڑا۔

"میں تو چلو صبح ایک چکر لگا ہی گئی تھی، تم کہاں مصروف تھے۔ سارا دن اس لڑکی کو کندھے سے لٹکائے گھومتے ہو، سب پتا ہے مجھے۔" اپنے باپ کے سامنے اس کھنچائی پر ماہیر بوکھلا سا گیا۔ جب کہ اوریدا اور تیمور صاحب کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی۔

"کمال کرتی ہیں بڑی اماں، میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔۔۔" بڑی اماں نے اس کے احتجاج پر ناک سے

مکھی اڑائی۔
"رہنے دو میاں' بے وقوف کسی اور کو بنانا میں نے خود تمہیں کئی دفعہ اس سے گپیں ہانکتے دیکھا ہے۔" بڑی اماں اپنے مخصوص موڈ میں تھیں۔
"ہاں بھئی برخوردار' کہاں ہیں اس بچی کے پیرنٹس....؟" تیمور کو بھی چلتے چلتے اچانک یاد آیا۔
"آجائیں گے پاپا' جلدی کیا ہے۔" وہ شرارت سے کان کھجا کر بولا تو اور یدا نے اسے ناراضی سے گھورا۔ جو اتنی بڑی بات اس سے چھپائے بیٹھا تھا۔
"اب عدینہ کی ماما کے سامنے جا کر میری بے عزتی مزید خراب مت کیجئے گا۔" ماہیر نے آپا صالحہ کے کمرے کے باہر پہنچ کر شرارتی انداز سے بڑی اماں کی طرف دیکھا' جن کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی۔
"اچھا اچھا دروازہ کھولو' فضول باتیں مت کرو...." بڑی اماں کے لاپروا لہجے پر ماہیر نے منہ بناتے ہوئے دروازہ کھولا۔
عدینہ جو کہ امی آپا کی رپورٹس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر چونک کر دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے بڑی اماں کی طرف دیکھا جو بیڈ پر لیٹی ہوئی آپا صالحہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔
"ہاں بھئی عدینہ' کیسی طبیعت ہے تمہاری والدہ کی....؟"
بڑی اماں کی نظر جیسے ہی بیڈ پر پڑے وجود پر پڑی۔ انہیں شاک لگا۔ ساری کائنات چپ ہوگئی۔ سانس' دھڑکن' وقت ہر چیز تھم کر رہ گئی۔ انہوں نے اپنی دھندلی آنکھوں کو مسلا۔ دل و دماغ کسی زلزلے کی زد میں آ گئے تھے۔
انہیں ہرگز مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے سامنے تھی' اگرچہ ظالم وقت نے اس کے نقوش پر خاصا گہرا اثر چھوڑا تھا مگر اس کے بختاور عرف ڈیزی ہونے میں کوئی شک و شبہ تھا ہی نہیں۔ وہ آنکھیں بند کیے پتھر کے بت کی طرح بالکل ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی اماں اور تیمور نے خوف زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔
"بڑی اماں.... آپ....؟" عدینہ نے بمشکل تھوک نگل کر کہا اور گھبرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا' جو آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ کتنا قیامت خیز لمحہ آچکا ہے۔
"آنٹی تو شاید سو رہی ہیں...." اور یدا ان سب کی ذہنی حالت سے بے خبر اپنی دھن میں گویا ہوئی۔
"امی! آنکھیں کھولیں۔ دیکھیں ذرا' کون آیا ہے آپ سے ملنے؟" عدینہ نے لرزتی ہوئی آواز میں آپا صالحہ کو مخاطب کیا۔
"کون ہے....؟" انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر تھکن زدہ لہجے میں کہا۔
بختاور کی آواز سن کر بڑی اماں کو لگا جیسے کائنات کی گردش تھم گئی ہے۔ انہوں خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ جب کہ ماہیر اور اور یدا حیرانی سے بڑی اماں اور تیمور کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس وقت حواس باختہ انداز میں عدینہ کی والدہ کی طرف متوجہ تھے۔
"ڈیزی...." بڑی اماں کی کانپتی آواز پر آپا صالحہ کو کرنٹ سا لگا' انہوں نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے اپنی والدہ اور بھائی کو دیکھ کر انہیں لگا جیسے ان کا دل کبھی نہیں دھڑکے گا۔ پہلی دفعہ ان کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور ان کا وجود اس میں دھنس کر رہ جائے۔
"امی...." آپا صالحہ کے ہونٹ کانپے' اور چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔
"بختاور! یہ تم ہو نا...." تیمور کی آواز سن کر انہیں اپنا دل کھائی میں گرتا ہوا محسوس ہوا۔
کتنے سالوں کے بعد آپا صالحہ نے اپنے ماں جائے کی آواز سنی تھی۔ کتنی دوستی تھی ان کی اور تیمور کی' دونوں ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ وہ ہمیشہ ان کا

بڑا مذہب تو در حقیقت اسلام ہے۔" ہاشم کی آنکھوں سے ـــــ آنسو بہنے لگے۔ شرمندگی' پچھتاوا' تاسف کیا کچھ نہیں تھا ان کے لہجے میں۔

"وہ تین راتیں نہیں' تین صدیاں تھیں۔ میرے حلق تک مٹی ہی مٹی تھی اور میں بھوکا پیاسا' چھتیس گھنٹے لگاتار اللہ سے معافیاں مانگتا رہا۔ میرے سارے گناہ ایک ایک کرکے میرے سامنے آنے لگے اور میں نے تب اللہ سے ایک عہد کیا۔" وہ بات کرتے کرتے رکے۔

"کیسا عہد۔۔۔؟" شانزے نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ اگر میں زندہ بچ گیا تو اپنی ساری زندگی اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کردوں گا اور اس کے بعد وہ معجزہ ہوا جس کو آج بھی سوچوں تو میری عقل ماننے سے انکاری ہے' امدادی ٹیمیں جن لوگوں کو زندہ سلامت باہر نکالنے میں کامیاب ہوئیں ان میں سے ایک میں بھی تھا۔" ہاشم بولتے بولتے تھک گئے تو انہوں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"پھر کیا ہوا۔۔۔؟" وہ پریشان ہوئی۔

"میرے جسم میں کئی فریکچر ہوچکے تھے' میں اگلے چھ ماہ اسپتال میں رہا' لیکن اس وقت میرے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔" ہاشم کا لہجہ نم ہوا۔

"میں نے سولہ سال جو گمراہی میں بسر کیے تھے اگلے سولہ سال ان کا مداوا کرنے میں گزار دیے۔ اپنے مذہب اسلام کے بارے میں جتنا علم حاصل کرتا جاتا اتنا ہی شرمندگی کے گڑھے میں گرتا جاتا۔ میں نے اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی جہاں سے میرے والد صاحب نے کی تھی۔ میں نے سولہ سال سر اٹھا کر نہیں دیکھا اور اپنی ذات کو دین کے فروغ کے لیے وقف کردیا۔ شاید میرے والد صاحب اور بختاور کی دعا قبول ہوگئی تھی جو وہ میری ہدایت کے لیے کرتے تھے۔"

"اس عرصے میں آپ کو کبھی میرا خیال نہیں آیا۔۔۔؟" شانزے نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

"سچ پوچھو تو بہت دفعہ آیا اور پھر خیال آتا کہ تم مجھ سے بہتر ہاتھوں میں ہو اور شاید تم میرے ساتھ ہوتیں تو میں امریکا واپس نہ جاتا اور یہیں پاکستان میں اپنے لیے مزید جہنم کی آگ خریدتا رہتا۔" انہوں نے صاف گوئی سے جواب دیا تو شانزے لاجواب ہوگئی۔ ساری گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔

اگلے چند دنوں میں ہاشم نے اپنے بہن بھائیوں سے بھی رابطہ کرلیا تھا۔

شانزے کو تب پتا چلا اس کے تایا اعظم بہت عرصے سے جانتے تھے کہ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنی زندگی کو دین کے لیے وقف کرچکا ہے' لیکن انہوں نے جان بوجھ کر اس سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے ہاشم خود ان سے رابطہ کرے۔ اس بات نے شانزے کو مزید حیران کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے بیٹے تیمور اور اوریدا کے ساتھ اسپتال کے اس کمرے میں جانے سے پہلے تک بڑی اماں کو گمان تک نہیں تھا کہ وہ جس سے ملنے کے لیے جارہی ہیں وہ در حقیقت ان کی سگی بیٹی بختاور عرف ڈیزی ہے۔

"کیا سوچتی ہوگی عدینہ' کسی نے مڑ کر خبر تک نہ لی۔۔۔" بڑی اماں پارکنگ سے کوریڈور تک مسلسل بولتی ہوئی آرہی تھیں۔

"بتا دیجیے گا کہ آپ گھر میں اپنے مجازی خدا کی خدمتیں کررہی تھیں۔" ماہیر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے انہیں چھیڑا۔

"میں تو چلو صبح ایک چکر لگا ہی گئی تھی' تم کہاں مصروف تھے۔ سارا دن اس لڑکی کو کندھے سے لٹکائے گھومتے ہو' سب پتا ہے مجھے۔" اپنے باپ کے سامنے اس کھنچائی پر ماہیر بوکھلا سا گیا۔ جب کہ اوریدا اور تیمور صاحب کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی۔

"کمال کرتی ہیں بڑی اماں' میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔۔۔" بڑی اماں نے اس کے احتجاج پر ناک سے

مکھی اڑائی۔

"رہنے دو میاں، بے وقوف کسی اور کو بنانا، میں نے خود تمہیں کئی دفعہ اس سے گپیں ہانکتے دیکھا ہے۔" بڑی اماں اپنے مخصوص موڈ میں تھیں۔

"ہاں بھئی برخوردار، کہاں ہیں اس بچی کے پیرنٹس......؟" تیمور کو بھی چلتے چلتے اچانک یاد آیا۔

"آجائیں گے پاپا، جلدی کیا ہے۔" وہ شرارت سے کان کھجا کر بولا تو اوریدا نے اسے ناراضی سے گھورا۔ جو اتنی بڑی بات اس سے چھپائے بیٹھا تھا۔

"اب عدینہ کی ماما کے سامنے جا کر میری بے عزتی مزید خراب مت کیجئے گا۔" ماہیر نے آپا صالحہ کے کمرے کے باہر پہنچ کر شرارتی انداز سے بڑی اماں کی طرف دیکھا، جن کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی۔

"اچھا اچھا دروازہ کھولو، فضول باتیں مت کرو......" بڑی اماں کے لاپروا لہجے پر ماہیر نے منہ بناتے ہوئے دروازہ کھولا۔

عدینہ جو کہ اپنی آپا کی رپورٹس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر چونک کر دیکھا۔ اسے لگا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے بڑی اماں کی طرف دیکھا جو بیڈ پر لیٹی ہوئی آپا صالحہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

"ہاں بھئی عدینہ، کیسی طبیعت ہے تمہاری والدہ کی......؟"

بڑی اماں کی نظر جیسے ہی بیڈ پر پڑے وجود پر پڑی۔ انہیں شاک لگا۔ ساری کائنات چپ ہو گئی۔ سانس، دھڑکن، وقت ہر چیز تھم کر رہ گئی۔ انہوں نے اپنی دھندلی آنکھوں کو مسلا۔ دل و دماغ کسی زلزلے کی زد میں آ گئے تھے۔

انہیں ہرگز مغالطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کے سامنے تھی، اگرچہ ظالم وقت نے اس کے نقوش پر خاصا گہرا اثر چھوڑا تھا مگر اس کے بختاور عرف ڈیزی ہونے میں کوئی شک و شبہ تھا ہی نہیں۔ وہ آنکھیں بند کیے پتھر کے بت کی طرح بالکل ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بڑی اماں اور تیمور نے خوف زدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"بڑی اماں...... آپ......؟" عدینہ نے بمشکل تھوک نگل کر کہا اور گھبرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا، جو آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں۔ انہیں علم ہی نہیں تھا کہ کتنا قیامت خیز لمحہ آ چکا ہے۔

"آنٹی تو شاید سو رہی ہیں......" اوریدا ان سب کی ذہنی حالت سے بے خبر اپنی دھن میں گویا ہوئی۔

"امی! آنکھیں کھولیں۔ دیکھیں ذرا، کون آیا ہے آپ سے ملنے؟" عدینہ نے لرزتی ہوئی آواز میں آپا صالحہ کو مخاطب کیا۔

"کون ہے......؟" انہوں نے آنکھیں کھولے بغیر تھکن زدہ لہجے میں کہا۔

بختاور کی آواز سن کر بڑی اماں کو لگا جیسے کائنات کی گردش تھم گئی ہے۔ انہوں خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔ جب کہ ماہیر اور اوریدا حیرانی سے بڑی اماں اور تیمور کو دیکھ رہے تھے۔ جو اس وقت حواس باختہ انداز میں عدینہ کی والدہ کی طرف متوجہ تھے۔

"ڈیزی......" بڑی اماں کی کانپتی آواز پر آپا صالحہ کو کرنٹ سا لگا، انہوں نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں۔ سامنے اپنی والدہ اور بھائی کو دیکھ کر انہیں لگا جیسے ان کا دل کبھی نہیں دھڑکے گا۔ پہلی دفعہ ان کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور ان کا وجود اس میں دھنس کر رہ جائے۔

"امی......" آپا صالحہ کے ہونٹ کانپے، اور چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا۔

"بختاور! یہ تم ہو نا......" تیمور کی آواز سن کر انہیں اپنا دل کھائی میں گرتا ہوا محسوس ہوا۔

کتنے سالوں کے بعد آپا صالحہ نے اپنے ماں جائے کی آواز سنی تھی۔ کتنی دوستی تھی ان کی اور تیمور کی، دونوں ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ وہ ہمیشہ ان کا

ساتھ دیتا تھا۔ اس وقت تیمور تحیر کے عالم میں پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہا تھا۔

"ڈیزی..... تم..... زندہ ہو....." بڑی اماں کے حلق سے بمشکل آواز نکلی۔

آپا صالحہ ایک جھٹکے سے اٹھیں۔ ان کی آنکھوں میں سراسیمگی تھی۔ ان کے دل سے ایک ٹیس اٹھی اور سارے بدن میں پھیل گئی۔ انہیں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ انہوں نے اپنی ماں کی آواز پہچاننے میں غلطی کی ہے۔

"امی....." آپا صالحہ کو اپنی آواز کھائی میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بڑی اماں آگے بڑھیں اور دیوانہ وار ان کا منہ چومنے لگیں۔ اوریدا اور ماہیر کی تو گویا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ بڑی اماں مرتعش ہاتھوں سے آپا صالحہ کے چہرے اور گردن کو چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے انہیں یقین نہیں آرہا۔

"تم میری ڈیزی ہو ناں....." وہ بار بار ایک ہی فقرے کی گردان کیے جا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں جیسے ایک دم ہی سیلاب آگیا تھا۔

"امی! میں آپ کی ڈیزی....." آپا صالحہ کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہوئے۔

"میری بدقسمت بیٹی' میری بختو..... میری جند جان..... کہاں چھپ کر بیٹھ گئی تھیں۔ ذرا خیال نہیں آیا تمہیں میرا۔" بڑی اماں کا وجود کسی زلزلے کی زد میں آیا ہوا تھا' وہ دیوانہ وار اپنی بیٹی کا چہرہ چوم رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تم زندہ تھیں اور بتایا تک نہیں..... کیوں نہیں آئیں میرے پاس۔" وہ بے ربط انداز میں بول رہی تھیں۔

"کس منہ سے آتی آپ کے پاس.....؟" وہ رندھے ہوئے لہجے کے ساتھ گویا ہوئیں۔

"تم ایک دفعہ آتیں تو سہی' کیا اتنا پتھر دل سمجھ لیا تھا اپنے بوڑھے ماں باپ کو؟" بڑی اماں کی باتیں ان کے بدن سے روح کھینچ رہی تھیں۔

"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا امی۔ اللہ نے آپ کا دل دکھانے کی بہت بڑی سزا دی ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ شائستہ بیگم کا دل پگھل کر رہ گیا۔

"ڈیزی! تم نے تو جیتے جی مار دیا مجھے' تم تو میری سب سے زیادہ سمجھ دار بیٹی تھیں' میری آنکھوں کا نور اور دل کی دھڑکن تھیں۔ میرا غرور تھیں تم۔" وہ بھی بلند آواز میں رونے لگیں۔ تیمور نے آگے بڑھ کر ماں کو دلاسا دیا۔ ماہیر اور اوریدا اب ساری کہانی سمجھ چکے تھے۔

"میں آپ کو اپنی شکل کیسے دکھاتی' ساری دنیا میں تو رسوا کر دیا تھا آپ کو۔ کس منہ سے آتی؟ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی۔ بہت بدقسمت ہوں میں' اپنے ہاتھوں سے خود کو برباد کر دیا۔" وہ اور بھی شدت سے رونے لگیں۔ انہیں روتا دیکھ کر عدینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"بڑی اماں' پلیز ٹیک اٹ ایزی....." ماہیر نے آگے بڑھ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور انہیں سامنے رکھی کرسی پر بٹھایا۔

"کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی.....؟" تیمور کا دل خراب ہوا۔

"بہت شرمندہ ہوں میں آپ لوگوں سے....." آپا صالحہ نے بے اختیار اپنے بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ ان کے ہاتھ تھام کر خود بھی بے اختیار رونے لگے۔ پورے کمرے کا ماحول ہی ایک دم جذباتی ہو گیا تھا۔ عدینہ جس لمحے سے خوف زدہ تھی' وہ آکر آسانی سے گزر گیا تھا۔ وہ دن آپا صالحہ کی زندگی میں بے شمار خوشیاں لے کر آیا تھا۔ ماہیر نے فون کر کے طیبہ پھپھو اور سرمد کو بھی بلا لیا تھا۔ کمرے میں ایک دم ہی ہلچل مچ گئی تھی۔ بڑی اماں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ جس بیٹی کو مردہ سمجھ کر ہر سال قرآن خوانی کرواتی ہیں' وہ ان کے سامنے بالکل زندہ سلامت ہے۔ وہ پورے پانچ

گھنٹے وہاں گزار کر گھر واپس آئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک مرحلہ ابھی باقی ہے۔

☆ ☆ ☆
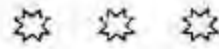
ڈاکٹر جلال کے کمرے میں حبس اور گھٹن ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔

شائستہ بیگم کی متورم آنکھیں نم لہجہ اور تھکن زدہ انداز انہیں بتانے کو کافی تھا کہ وہ کرب کے ان ہی مراحل سے گزر رہی ہیں جنہیں وہ صبح سے اکیلے جھیل رہے تھے۔ وہ جب سے اسپتال سے واپس آئی تھیں' اپنے شوہر سے دانستہ نظریں چرا رہی تھیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھ رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ان سے قوت گویائی چھن گئی ہو۔ ڈاکٹر جلال تو تھک ہار کر لیٹ گئے جب کہ شائستہ بیگم نے جائے نماز سنبھال لی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر وہ دعا مانگتے ہوئے مسلسل بے آواز رو رہی تھیں۔

"بس کرو اب...." ڈاکٹر جلال نے بھیگے لہجے میں انہیں مخاطب کیا۔

وہ اٹھیں اور جائے نماز تہہ کر کے ایک سائیڈ پر رکھی اور دوپٹے کے پلو سے اپنی سرخ ہوتی ناک کو ایک دفعہ پھر صاف کیا۔ ڈاکٹر جلال جو کہ اپنا بازو آنکھوں پر رکھے پچھلے ایک گھنٹے سے ایک ہی پوزیشن میں لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے بازو ہٹا کر اپنی شریک حیات کا مضطرب چہرہ دیکھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی تذبذب کا شکار ہیں اور ان سے کوئی بات کرنا چاہتی ہیں۔

"کیا بات ہے شائستہ بیگم....؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں...." انہوں نے کھینچ کا ایک لمبا سانس لیا۔

"کیسی طبیعت تھی عدینہ کی ماں کی....؟" ڈاکٹر جلال کی بات پر انہیں جھٹکا لگ اور انہوں نے چونک کر اپنے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"آپ ملے نہیں اس سے...." انہیں ابھی ابھی ایک خیال آیا۔

"ملا تھا...." انہوں نے سختی سے اپنی آنکھیں میچ لیں جیسے دانستہ ان کے چہرے کو دیکھنے سے گریز کر رہے ہوں۔

"عدینہ کی ماں' آپ کی بھی تو کچھ لگتی ہے۔" انہوں نے نظریں چرا کر کہا۔ ڈاکٹر جلال نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"ہو سکے تو معاف کر دیں اسے۔ اپنے حصے کی بہت سزا بھگت لی اس نے...." اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

ڈاکٹر جلال کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ انہوں نے فوراً" اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے پیچھے ہٹائے۔ ان کے کمرے کی کھڑکیاں پچھلے صحن کے برآمدے میں کھلتی تھیں۔ جہاں لکڑی کا بڑا سا جھولا رکھا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں پر ارصم اور اوریدا بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں تھوڑی سی ناگواری کا احساس ہوا۔ اوریدا کو بغاوت پر اکسانے والے اس واقعے کے بعد سے انہیں ارصم سے چڑ ہو گئی تھی' ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان کے دل سے اتر گیا ہو۔

اس وقت دونوں ان کی موجودگی سے بے خبر اپنی ہی بحث میں مگن تھے۔ ڈاکٹر جلال کے کمرے کی لائٹ بند تھی' اس لیے اندر کا منظر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پردے پیچھے کرنے سے دونوں کی گفتگو بہ آسانی ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

"عدینہ کی والدہ تمہاری پھپھو ہیں...." ارصم کے چہرے پر اشتیاق اور لہجے میں تجسس کی فراوانی تھی۔

"ہاں' یہ اس صدی کی سب سے حیران کن بات ہے' کم از کم میرے لیے۔" وہ مدھم لہجے میں گویا ہوئی۔

اور میرے لیے سب سے امیزنگ بات یہ ہو گی' اگر بڑے ابا انہیں معاف کر دیں۔" ارصم پھیکے انداز میں مسکرایا۔

"اب ایسے بھی سخت دل نہیں ہیں بڑے ابا' بختاور پھپھو ان کی بھی بیٹی ہیں' ان کا اپنا خون...." اوریدا نے منہ بنایا۔

"تم بڑے ابا کو نہیں جانتیں' انہوں نے ساری زندگی اپنے خود ساختہ اصولوں کے ساتھ بسر کی ہے۔ اپنی ضد اور انا کے غلام ہیں۔ تب ہی تو ساری زندگی نہ خود خوش رہے اور نہ کسی اور کو رہنے دیا۔" ارصم کا تلخ لہجہ اوریدا کو بالکل اچھا نہیں لگا۔

"ان کی جگہ پر میں یا تم ہوتے تو شاید ہم بھی ایسا ہی کرتے۔ ان کی اولاد نے بھی تو ساری زندگی ان کو دکھ دینے کے سوا کیا دیا ہے' کیا ایک باپ کی حیثیت سے ان کا کوئی حق نہیں بنتا تھا۔" اوریدا کی طرف داری ڈاکٹر جلال کی آنکھیں نم کرنے کا موجب بن گئی۔ انہیں پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ کسی بھی مقام پر انہیں شرمندہ نہیں ہونے دیتی تھی۔

"والدین اپنا دل بڑا کرلیں تو کئی زندگیاں خراب ہونے سے بچ جائیں۔" ارصم کے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

"اور اگر بچے اپنے والدین کا مان اور بھروسا رکھ لیں تو تقدیر بھی ان کے ساتھ برا نہیں کرتی۔" اوریدا نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔

"ہونہہ.... دیکھوں گا' کب قسمت تمہارا ہاتھ پکڑ کر خوشیوں کے دروازے تک لے جاتی ہے۔" اس کا طنزیہ انداز اوریدا کا دل دکھا گیا۔

"تم ساری باتوں کو چھوڑو' بس اپنی ممی کو معاف کردو....." پرسکون لہجے میں کہتی ہوئی وہ ارصم کا سارا سکون غارت کر گئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے' انہوں نے اس گھر کے مکینوں کے دلوں میں کتنی بڑی بڑی بدگمانی کی دیواریں کھڑی ہیں۔ یقین مانو مجھے تو یہ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ میں ان کا بیٹا ہوں....." وہ ان سے حد درجہ خفا تھا۔

"مجھے سب پتا ہے۔" اوریدا نے اسے تعجب میں مبتلا کیا تو وہ فوراً" بولا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"طیبہ آنٹی نے....." اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"ظاہر ہے' وہ تو بتائیں گی ہی تمہیں' ان کی مستقبل کی بہو جو ہوئیں۔ ان کے لاڈلے بیٹے سرمد کی دلہن....."

اس کے استہزائیہ انداز پر اوریدا نے گلہ آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نظریں چرا گیا۔

"تمہیں پتا ہے نا' مجھے سرمد میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اوریدا کا چہرہ تاریک ہوا۔

"یہ بات مجھے نہیں جا کر اپنے بڑے ابا کو بتاؤ' جو طیبہ پھپھو کی طرح تمہاری زندگی بھی غارت کردیں گے۔" وہ ہلکا سا چڑ کر بولا۔

"میں ساری دنیا سے یہ بات کہہ سکتی ہوں' لیکن بڑے ابا سے نہیں۔" افسردگی اس کے لہجے میں در آئی۔

"تو پھر طیبہ آنٹی کی طرح روتی رہنا ساری زندگی....." وہ جھنجلا گیا۔

"مجھے پھر بھی ان سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔"

اس کا مطمئن انداز ارصم کے اندر آگ لگا گیا۔

"پاگل تو نہیں ہوگئی ہو۔"

"جو بھی سمجھو....." وہ زبردستی مسکرائی۔

"تم چاہتی کیا ہو آخر.....؟" وہ برا مانتے ہوئے بولا۔

"میں چاہتی ہوں کم از کم اس گھر میں ایک فرد تو ایسا ہو' جس کی زندگی کا فیصلہ وہ اپنی خوشی سے کرسکیں۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے' مجھے بڑے ابا سے کتنی محبت ہے۔" اوریدا کی بات پر ارصم کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوگئے۔

"کیا مجھ سے بھی زیادہ....." وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔

"ہاں....." اوریدا کے جواب نے اسے ساکت کردیا۔ وہ ناراضی سے اٹھا۔ اوریدا کا سانس سینے میں اٹکنے لگا۔ اس نے فوراً" اس کا بازو پکڑ کر جانے سے روکا۔ وہ خفگی سے دوسری جانب منہ کیے کھڑا تھا۔

"تم اپنا موازنہ مت کرو بڑے ابا سے....." اوریدا نے التجائیہ انداز میں ارصم کی آنکھوں میں جھانکا' وہ بے بس انداز میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

"قطرہ قطرہ زہر دینے سے بہتر ہے' ایک دفعہ ہی گولی مار دو مجھے۔" اس کی آنکھوں میں ناراضی کا ایک جہان آباد تھا۔

"خفا ہو مجھ سے...؟" اس نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے جواباً "گلہ کیا۔

"تم ناراض ہوتے ہو تو زندگی مجھے اچھی نہیں لگتی۔" اس نے سر جھکا کر بے بسی سے اعتراف کیا۔

اس سے زیادہ دیکھنا اور اس سے زیادہ سننا بڑے ابا کی برداشت سے باہر تھا۔ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں کمرے کے پردے برابر کردیے۔ کمرے میں حبس اور گھٹن کا احساس ایک دم ہی بڑھ گیا تھا۔ شاہ بلوط کے درختوں پر اترتی شام بھی ایک دم اداس ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب تو سارے خونی رشتے مل گئے ہیں آپ کو' پھر بھی اداس بیٹھی ہیں۔" عدینہ اپنی ماں کو دوا کھلاتے ہوئے بولی تو اس کی ماں کے نقاہت زدہ چہرے پر ایک بے رنگ سی مسکراہٹ ابھری' جسے دیکھ کر عدینہ جھنجلا گئی۔

"ایسے مت مسکرایا کریں' ایسا لگتا ہے جیسے کوئی گن پوائنٹ پر ہنسنے پر مجبور کررہا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں' ابھی آنکھ کھولوں گی تو وہی تلخ حقیقتیں میری منتظر ہوں گی۔" ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

"فار گاڈ سیک آپا' اب مزید رونے کا سیشن مت لگایے گا' کل سے جتنا رو چکی ہیں آپ' میں تو حیران ہوں اس اسپتال میں ابھی تک چھوٹا موٹا سیلاب کیوں نہیں آیا۔" وہ چڑ کر ان کے بستر کی سفید چادر ٹھیک کرنے لگی۔

"ویسے ابھی تک اتنی ٹینس کیوں ہیں آپ؟" اس نے یوں ہی پوچھا۔

"اس لیے کہ بابا نے ابھی تک معاف نہیں کیا مجھے...." ان کے لہجے سے کرب چھلکا۔ عدینہ ٹھٹک گئی۔

"کردیں گے معاف' بڑی اماں بتا تو رہی تھیں' بہت ڈپریسڈ ہیں وہ...."

"میں نے ان کے ساتھ کیا بھی تو بہت برا تھا۔" احساس جرم بختاور کو کسی پل بھی سکون نہیں لینے دے رہا تھا۔

"اللہ بہتر کرے گا اور ان کے دل میں بھی رحم ڈال دے گا' باقی سب لوگوں نے بھی تو کھلے سے معاف کردیا ہے آپ کو....." عدینہ نے محبت سے ماں کے ماتھے کا بوسہ لیا۔ آج کل اسے آپا پر بے وجہ پیار آرہا تھا۔

"تمہیں پتا نہیں ہے' بابا اپنی ضد کے کتنے پکے ہیں۔" انہوں نے آنکھیں میچ کر رنجیدہ لہجے میں اسے بتایا۔

"وقت بڑوں بڑوں کو بدل دیتا ہے۔ آپ تھوڑا ٹائم تو دیں انہیں' ان شاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔" اس نے نرمی سے اپنی ماں کا ہاتھ دبا کر تسلی دی۔

"عبداللہ کہاں ہے؟" انہوں نے خود ہی گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"انہیں ماہیر اور سرمد بھائی نے زبردستی گھر بھیج دیا ہے۔ خود آپ کی دوا لینے گئے ہیں۔" عدینہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

"تیمور کے دونوں ہی بچے بہت سلجھے ہوئے اور محبت کرنے والے ہیں۔" وہ اس دفعہ دل سے مسکرائیں۔

"ظاہر ہے' بھتیجا' بھتیجی کس کے ہیں۔" عدینہ نے ماں کو چھیڑا۔

"اور بینش کا بیٹا ارصم تو بہت مختلف ہے اس سے...." ان کی بات پر عدینہ ایک دم چونکی اور اسے یاد آیا کہ ابھی ایک ضروری کام کرنا تھا اسے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کام پر غور و فکر کرتی' ماہیر بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوا۔ دونوں اس کی طرف متوجہ

ہو گئیں۔

"لڑکی! فوراً" کمرہ سیٹ کرو، بہت خاص مہمان آرہے ہیں۔" عدینہ اور آپا صالحہ نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا جو ان کی سائیڈ میز پر رکھی چیزوں کو جلدی جلدی ترتیب سے رکھنے لگا تھا۔

"یا اللہ خیر۔ کون آرہا ہے؟" عدینہ نے مسکرا کر اس کا بوکھلایا ہوا انداز دیکھا۔

"شانزے اور اس کے فادر....." اس کے چہرے پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر دونوں ماں، بیٹی چونک گئیں۔

"لگتا ہے کوئی اسپیشل گیسٹ ہیں۔" عدینہ نے اسے چھیڑا۔

"پھپھو تھوڑا سمجھائیں اسے..... کس دن عقل آئے گی اس لڑکی کو۔ ایک وہ بے وقوف اوریدا ہے' سو منتیں کیں اس کی کہ تمہاری ہونے والی بھابھی اپنے ابا کے ساتھ آرہی ہیں اسپتال میں' لیکن مجال ہے اس کے کان پر جوں تک رینگی ہو۔" وہ شرارتی لہجے میں گویا ہوا تو وہ دونوں مسکرادیں۔

"عدینہ ہے نا یہاں' یہ بھی تو تمہاری بہن ہے۔" انہوں نے اپنے بھتیجے کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ماہیر ان سے بہت جلد گھل مل گیا تھا اور وہ جیسے ہی انہیں اداس یا رنجیدہ دیکھتا تو کوئی نہ کوئی چٹکلہ چھوڑ کر فریش کردیتا۔

"یہ بھی بتادیں' ہمیں کرنا کیا ہے؟" عدینہ نے مسکرا کر اس کے لائے ہوئے پھل ایک سائیڈ پر رکھے۔

"اس کے والد بہت بڑے اسکالر ہیں اور مصر کی یونی ورسٹی سے فقہ و حدیث پر ڈاکٹریٹ کرچکے ہیں' اس لیے اپنی ساری اسلامی معلومات کو دماغ میں فریش کرلو انہیں ہر حال میں امپریس کرنا ہے۔" اس کے شوخ انداز پر وہ ہنس پڑی۔

"تو آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ایک تسبیح پکڑ کر بیٹھ جائیں جائے نماز پر' آپ کا بھی تھوڑا اچھا امپریشن پڑے گا' میں کہہ دوں گی یہ اپنی پھپھو کی صحت یابی کے لیے وظیفہ کررہے ہیں۔" عدینہ کے جوابی حملے پر اس کے حلق سے نکلنے والا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔

"میرا خیال ہے تمہارے دانش ورانہ مشوروں پر عمل کرنے کے بجائے میں پارکنگ میں جاکر ان کا استقبال کرلوں تو بہتر ہے۔" وہ شرارتی لہجے میں کہہ کر فوراً" کمرے سے نکل گیا تو بختاور نے سوالیہ نگاہوں سے عدینہ کی طرف دیکھا۔

"کون لڑکی ہے یہ شانزے.....؟"

"مجھے تو خود علم نہیں۔ اوریدا نے بتایا تھا' شاید شوبز سے تعلق ہے اس کا' ماہیر اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔" عدینہ کی بات پر انہیں ہلکی سی مایوسی ہوئی۔

"ایک اسلامک اسکالر کی بیٹی اور شوبز میں.....؟" انہوں نے ہلکی سی ناگواری کا اظہار کیا۔

"اوریدا بتارہی تھی' شادی کے بعد کام نہیں کرے گی شوبز میں....." عدینہ نے انہیں تسلی دی۔ اسی وقت راؤنڈ پر موجود ڈاکٹر کے کمرے میں آنے پر دونوں ماں بیٹی ایک دم چپ ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

شانزے اور ڈاکٹر ہاشم کے تعلقات بہت خوش گوار ہوچکے تھے۔ شانزے نے اپنی ساری زندگی کی محرومیاں کھل کر انہیں بتائیں تو ان کا دل بھی دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ انہوں نے ابھی تک اپنے بہن' بھائیوں میں سے کسی کو بھی اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ وہ ان سے ملنے سے پہلے کچھ معاملات نپٹانا چاہتے تھے۔ پندرہ دن کے اندر اندر انہوں نے ایک بنگلہ خرید کر اپنی بیٹی کے نام کردیا تھا اور اس کے اکاؤنٹ میں کافی رقم ٹرانسفر کرنے کے بعد وہ اب کچھ مطمئن تھے۔

شانزے کے توسط سے وہ سرمد سے بھی ملے تھے اور یہ پرخلوص لڑکا انہیں بہت اچھا لگا تھا۔ سرمد نے باتوں باتوں میں انہیں اشارہ دے دیا تھا کہ ماہیر اور شانزے ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ جب

انہیں سرمد کی خالہ کی بیماری کا پتا چلا تو وہ ان کی عیادت کے لیے آنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اصل میں وہ ماہیر کی فیملی سے مل کر اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ شانزے کا انتخاب کس حد تک درست ہے۔ دوسری صورت میں انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ شانزے کو لے کر دوبارہ ملک سے باہر چلے جائیں گے۔

"السلام علیکم انکل۔" ماہیر اور سرمد انہیں پارکنگ میں ہی مل گئے۔

"کیسی طبیعت ہے اب آپ کی خالہ کی۔۔۔" ڈاکٹر ہاشم نے ان دونوں سے ہاتھ ملاتے ہوئے نرم لہجے میں پوچھا۔

"الحمدللہ، سرجری ہو گئی ہے، لیکن ابھی کیموتھراپی کا مرحلہ باقی ہے۔" سرمد ان کے ساتھ چلتے ہوئے تفصیل سے بتانے لگا۔

"اللہ ان کو زندگی اور صحت دے۔" انہوں نے خلوص دل سے دعا کی۔

"میرے والد بہت بڑے فین ہیں آپ کے بہت اچھے لیکچر دیتے ہیں آپ۔" ماہیر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے ذرا جھجک کر کہا۔

"تھینک یو۔" وہ پروقار انداز میں مسکرائے۔

"ویسے آپ کے والد سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔"

"وہ بھی اسپتال میں ہی ہیں، پھپھو کے ڈاکٹرز کے ساتھ کچھ ڈسکشن چل رہی ہے ان کی۔۔۔" ماہیر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

سرمئی رنگ کے پینٹ کوٹ میں ان کی شخصیت میں ایک محسوس کی جانے والی بے نیازی اور وقار مدمقابل کو ان کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ چاروں چلتے ہوئے جیسے ہی کاریڈور میں مڑے، سامنے سے آتے تیمور صاحب کو دیکھ کر رک گئے۔ ماہیر کے تعارف کرانے پر تیمور نے بڑے پرجوش انداز میں ہاشم صاحب سے ہاتھ ملایا تھا۔ وہ دونوں ہی کوریڈور میں کھڑے تعارفی مراحل طے کر رہے تھے، جبکہ ماہیر اور سرمد، شانزے کو لے کر آپا صالحہ کے کمرے میں چلے آئے۔

"پھپھو! یہ شانزے ہے۔" ماہیر نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بلند آواز میں کہا۔ بختاور نے چونک کر شانزے کی طرف دیکھا اور ان کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے انہوں نے بل بورڈ پر دیکھا تھا۔

"السلام علیکم آنٹی!" شانزے نے ذرا جھجک کر انہیں سلام کیا، اسے دیکھ کر بختاور کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچی، وہ ٹکٹکی باندھے اس لڑکی کو دیکھنے لگیں، جو ان کی نگاہوں کے ارتکاز کی وجہ سے تھوڑی جزبز ہو رہی تھی۔

"ارے شانزے! آؤ نا، بیٹھو۔۔۔" عدینہ کے دوستانہ انداز پر وہ ہلکا سا جھجک کر بیٹھ گئی۔ اسی وقت نرس ان کی ڈرپ اتارنے آئی تو وہ سب ایک دم چپ ہو گئے۔ نرس نے جلدی جلدی اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔

"بیٹا! آکر اپنی والدہ کا بازو پکڑو، میں نیڈل اتار رہی ہوں۔" نرس نے شانزے کی طرف دیکھ کر کہا تو عدینہ اور ماہیر دونوں کو شاک لگا۔

انہوں نے بے ساختہ شانزے کی طرف دیکھا، آپا صالحہ اور اس کے نقوش میں حیرت انگیز مماثلت نے ان سب کو ہی فطری سی الجھن میں مبتلا کیا۔ عدینہ نے فوراً" اٹھ کر نرس کی مدد کی اور وہ ڈرپ اتار کر کمرے سے نکل گئی۔ آپا صالحہ کے ہاتھوں میں موجود شیشے کا گلاس لرزنے سے چھلکنے لگا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر شانزے کو دیکھ رہی تھیں۔ اس لڑکی کے وجود سے نکلنے والی لہریں انہیں بے چین کر رہی تھیں۔ اپنے خون کی کشش رنگ لا رہی تھی۔

"ارے آئیں نا ہاشم صاحب۔۔۔" اسی وقت تیمور کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر بختاور نے سر اٹھا کر دیکھا اور سامنے کھڑے ہاشم کو دیکھ کر انہیں لگا کمرے کی چھت ان کے سر پر آن گری ہے۔ ان کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر جا گرا اور کرچیاں پورے فرش پر پھیل گئیں۔ بختاور متنفر انداز سے سامنے کھڑے ہاشم رضا کو دیکھ رہی تھیں، جو خود بھی ہکا بکا تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کی محبت میں انہوں نے اپنے ہر رشتے کو ٹھوکر

مار دی تھی۔ قسمت نے انہیں ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کے مدمقابل لا پنچا تھا۔

"پھپھو! یہ ڈاکٹر ہاشم رضا ہیں' شانزے کے والد۔۔۔ بہت بڑے اسلامک اسکالر ہیں۔" ماہیر کے تعارف نے انہیں ششدر کر دیا۔ شدید صدمے نے ان کے ہونٹوں پر قفل لگا دیے۔ ایک دم ہی ان کا سکتہ ٹوٹا اور انہوں نے ہذیانی انداز میں چیخنا شروع کر دیا' سب گھبرا گئے۔

"اس دھوکے باز' کافر انسان کو میرے کمرے سے نکالو' اس کی ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔" بختاور کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور ان کا وجود کپکپانے لگا۔

"بختاور! کیا ہوا؟" تیمور صاحب بوکھلا کر ان کی جانب بھاگے۔

"آئی ایم سوری بختاور! میں تم سے شرمندہ ہوں۔" ہاشم نے بالآخر ہمت کی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے' مجھے اپنی منحوس شکل کبھی نہ دکھانا' تم نے برباد کر دیا مجھے' میری زندگی کا ہر رشتہ چھین لیا' تم انسان نہیں' شیطان ہو۔" ہذیانی انداز میں روتے ہوئے وہ ایک جیسے لفظوں کی تکرار کیے جا رہی تھیں۔ کمرے میں موجود سب ہی لوگوں پر گویا کوئی پہاڑ گر پڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

بختاور سے ملنے کے بعد ڈاکٹر ہاشم رضا کا جسم بخار کی حرارت سے جھلس رہا تھا۔ وہ کئی گھنٹوں سے کاؤچ پر ایک ہی پوزیشن میں ایسے بے سدھ لیٹے ہوئے تھے کہ شانزے کو ان پر کسی لاش کا گمان ہونے لگا' وہ گھبرا کر ان کے پاس چلی آئی اور اس نے باپ کا پسینے سے شرابور ماتھا چھو کر دیکھا تو اسے جھٹکا لگا۔ وہ فوراً" اندر سے ایک اور کمبل اٹھا کر لے آئی۔

"پاپا! کیسی طبیعت ہے اب آپ کی۔" شانزے کے چہرے پر تشویش کے سائے لہرائے۔

"اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہوں۔ اسے کہو' مجھے معاف کر دے۔" ہاشم کی بات پر شانزے کا چہرہ تاریک ہوا۔

"آپ پریشان مت ہوں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔" انہوں نے تیزی سے اپنی بیٹی کی بات کاٹی۔ "اس کی آنکھوں میں اپنے لیے جتنی نفرت دیکھی ہے' اس کی شدت کم تو ہو سکتی ہے' لیکن اس میں کمی نہیں آسکتی۔"

"ماہیر نے مجھ سے پرامس کیا ہے' وہ اپنی پھپھو کو سمجھائے گا۔" شانزے نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ ماہیر کی پھپھو بعد میں' تمہاری ماں پہلے ہے۔" انہوں نے تصحیح کی تو وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔ "اس رشتے کو تسلیم کرنے میں کچھ وقت لگے گا مجھے۔"

"تم جاؤ اس کے پاس' اسے ضرورت ہے تمہاری۔" انہوں نے اپنی پیشانی پر پھسلتی نمی کو پونچھتے ہوئے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

ہاشم کے بار بار سمجھانے پر وہ ایک دفعہ پھر سرمد کے ساتھ اپنی ماں سے ملنے کے لیے آگئی تھی۔ بختاور کی طبیعت صبح سے خراب تھی' یکے بعد دیگرے ملنے والے ان جذباتی دھچکوں نے انہیں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب کر دیا تھا۔ انہوں نے ساری رات روتے ہوئے گزاری تھی اور سب ہی لوگ ان کی دلجوئی میں مصروف تھے اور انہیں بختاور اور ہاشم کے ماضی کو جان کو بہت دکھ ہوا تھا۔ اس کے باوجود تیمور صاحب اور ان کی بہن طیبہ کا کہنا تھا کہ انہیں ہاشم کو معاف کر دینا چاہیے' لیکن وہ اس کے لیے کسی صورت بھی راضی نہیں ہو رہی تھیں۔

"میں نے بہت برا کیا تمہارے ساتھ' اسی لیے تو ساری زندگی بے سکونی میں گزار دی۔" وہ شانزے کے دونوں ہاتھ پکڑے روتے ہوئے بے ربط انداز میں بول رہی تھیں۔ شانزے کو اپنا دل موم کی طرح پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔

"تم بول کیوں نہیں رہی ہو' خاموش کیوں ہو؟"

بختاور کو اس کی شکوہ کرتی ویران آنکھوں سے خوف آیا۔

"آپ میرے بابا کو معاف کردیں۔" وہ اپنے گلے کو تر کرتے ہوئے اتنا ہی بولی۔

"تمہیں علم نہیں ہے اس شخص نے مجھے جلتے ہوئے انگاروں پر چلنے پر مجبور کردیا تھا۔" غصے کی زیادتی سے ان کی آواز ایک دفعہ پھر کانپنے لگی۔

"وہ خود بھی تو ساری زندگی اپنے ہاتھوں سے خریدے گئے جہنم میں جلتے رہے ہیں۔" شانزے نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے ماں کے آنسو چنے۔

"اس نے مجھ سے میرے سارے رشتے چھین لیے۔" انہوں نے بچوں کے سے انداز میں شکوہ کیا۔

"آپ نے اپنے سارے رشتے خود اپنی مرضی سے چھوڑے تھے۔" اس نے اپنی ماں کو یاد دلایا۔

"تو اسی کی خاطر یہ خسارے کا سودا کیا تھا میں نے، لیکن اس نے کیا کیا میرے ساتھ..." وہ پھر سے رونے لگیں۔

"محبتوں میں خسارے تو پھر دونوں فریقین کو ہی برداشت کرنے پڑتے ہیں، لیکن آپ یہ بتائیں، میرا کیا قصور تھا، مجھے کیوں دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑا آپ نے...؟" شانزے کے سوال ... نے انہیں شرمندگی کے سمندر میں لا پھینکا۔

"ایک دفعہ بھی مڑ کر نہیں دیکھا، میں جیتی ہوں یا مرگئی ہوں، مجھے میرے ددھیال والوں کے سپرد کرکے آپ کیا سمجھتی تھیں کہ آپ کا فرض پورا ہوگیا۔" شانزے کے حلق میں آنسوؤں کا ایک گولہ سا پھنس گیا۔

"اپنی اولاد کے ساتھ کوئی ایسا کرتا ہے بھلا؟ میں اپنی مرضی سے تھوڑی آئی تھی دنیا میں، پھر اپنے کیے گئے غلط فیصلوں کی سزا آپ نے کیوں دی مجھے؟ میرے باپ پر تو بس نہیں چلا اور مجھے ان کے رشتے داروں کے در پر پھینک دیا۔" شانزے نے انہیں اپنی عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔

"میں اس جرم کے لیے شرمندہ ہوں تم سے، بہت مجبور تھی میں، تم اپنی ماں کو معاف کردو بیٹا۔" ان کا لہجہ بہت ٹوٹا اور بکھرا ہوا تھا۔

"دوسروں سے رحم کی امید رکھتے ہوئے ہم اپنے ظرف کا پیمانہ کیوں محدود کرلیتے ہیں۔" شانزے نے عجیب سی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو بختاور کو ٹھیک ٹھاک ذہنی دھچکا لگا۔

"کیا مطلب...؟" ان کی زبان سے پھسلا۔

"آپ اپنے والدین اور بیٹی سے تو معافی کی طلب گار ہیں اور خود اس شخص کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں، جنہیں اللہ نے ہدایت کی روشنی دے کر پوری دنیا میں سرخرو کردیا۔"

شانزے کے طنزیہ انداز پر انہیں دھچکا لگا۔ وہ ہاشم کی بیٹی تھی اور اسے دلیل سے بات کرنے کا ہنر آتا تھا۔

"تم مجھ سے صرف اپنی بات کرو، اس شخص کو درمیان میں مت لاؤ۔" بختاور نے نظریں چرا کر کہا۔

"وہی شخص میرے اور آپ کے رشتے کا ایک مضبوط حوالہ ہے۔ آپ انہیں اپنی زندگی سے نکال سکتی ہیں ہمیں نہیں۔ میرا باپ ہے وہ اور دنیا کی کوئی چیز اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی۔" اس کی صاف گوئی نے بختاور کا دل دکھا دیا۔

"تو تم مجھے معاف نہیں کروگی۔" ان کے چہرے پر مایوسی نے ڈیرے ڈال لیے۔

"ایک شرط پر، اگر آپ میرے بابا کو معاف کردیں، ورنہ اس دنیا میں نہ سہی حشر کے میدان میں میں آپ دونوں کا گریبان ضرور پکڑوں گی۔"

وہ اپنا شولڈر بیگ اٹھا کر کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں کی زیادتی سے سرخ اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بختاور کو لگا ایک اور پل صراط ان کے سامنے ہے۔ جس ننھے وجود کے لیے وہ ساری زندگی ترسی تھیں، وہ ایک خود رو پودے سے ایک تناور درخت کی صورت ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا، لیکن وہ انہیں اپنی محبت کی چھاؤں دینے سے انکاری تھا۔ ان کے اعصاب ایک دم ٹھٹھرنے لگے اور آنکھوں کے آگے

نمی کی دھند چھا گئی۔

"میں جا رہی ہوں۔ دوبارہ کبھی نہیں آؤں گی۔" شانزے نے ماں کو جذباتی انداز میں بلیک میل کیا۔

"ایک منٹ رکو۔۔۔" بختاور کو لگا کہ جیسے یہ لمحہ ہاتھ سے نکل گیا تو ایک اور پچھتاوے کا جہنم تیار ہو جائے گا۔

"جی۔۔۔" شانزے نے پلٹ کر اپنی ماں کی طرف نہیں دیکھا' اسے ڈر تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکے گی۔

"میں نے معاف کیا اسے' لیکن اسے کہنا ایک احسان کرے مجھ پر' دوبارہ کبھی میرے راستے میں نہ آئے۔" انہوں نے ـــــ مضمحل ہو کر کہا' وہ اس وقت بے بسی کی انتہا پر تھیں۔ شانزے پلٹی اور اڑتی ہوئی ماں کے سینے سے آ لگی۔ بختاور کو لگا جیسے ان کے جلتے وجود پر کسی نے ٹھنڈی پھوار برسا دی ہو۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر جلال کرسی پر بیٹھے اجنبی نگاہوں سے اپنی اکلوتی بھتیجی کو بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے کمرے میں فلور کشن پر ان کے بالکل سامنے بدحال سی بیٹھی ہوئی تھیں۔

بینش کو جب سے آغا جی نے بتایا تھا کہ ارصم چپکے چپکے اپنے باہر جانے کے ڈاکومنٹس بنوا رہا ہے اور وہ میڈیکل چھوڑ کر کسی اور فیلڈ میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے' تب سے بینش کو ساری دنیا گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس خاتون کی طرح صدمے سے بے حال تھیں جس کی آخری پونجی لٹنے جا رہی ہو۔

"تایا ابا! صرف ایک دفعہ اپنا دل بڑا کریں' میں قسم کھاتی ہوں' دوبارہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔" بینش کا بس نہیں چل رہا تھا' اپنی کھال کی جوتیاں بنا کر انہیں پہنا دے اور کسی طرح انہیں منا لے۔

"تمہیں پتا ہے نا' اپنی اولاد سے بڑھ کر ترجیح دیتا تھا میں تمہیں' لیکن۔۔۔" انہیں بینش کی حالت پر ترس آیا اس لیے چپ ہو گئے۔

"اسی چیز کے چھن جانے کا خوف تھا مجھے' تب ہی تو آپ کو اپنی اولاد سے دور کر دیا تھا میں نے۔۔۔" انہوں نے پہلی دفعہ کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

"اب پتا چلا نا' اولاد کا دکھ کیسے ماں' باپ کا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔" ڈاکٹر جلال نے مجروح نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا' وہ آج بھی انہیں عزیز تھیں' لیکن دل کے کسی ایک گوشے میں بے اعتباری کا چراغ جل اٹھا تھا۔

"اب بتاؤ۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" انہوں نے بمشکل کھینچ کر سانس لیا۔

"آپ بختاور کو معاف کر دیں۔" اس غیر متوقع بات پر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا۔ انہوں نے الجھے سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم بختاور کو چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔" وہ اجنبی لہجے میں بولتے ہوئے ان کی آنکھیں نم کر گئے۔

"اپنا معاملہ تو میں نے اللہ کی عدالت میں چھوڑ دیا ہے۔ مجھے معلوم ہے ارصم کبھی معاف نہیں کرے گا مجھے اور کر بھی دے گا تو ویسی اہمیت اور عزت کبھی نہیں دے گا' جو میں چاہتی ہوں۔"

وہ مایوسی کی انتہا پر تھیں۔ وقت نے انہیں بری طرح سے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں سمندر کی گیلی ریت پر چلتے ہوئے اپنے اندر کی گھٹن کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اوریدا' اپنی بختاور پھپھو سے ملنے کے بعد ارصم کے ساتھ سی ویو کی طرف نکل آئی۔ اس وقت خشک ہوا میں سمندر کے کھاری پانی کی باس تھی۔

"اگلے جمعے کو شانزے اور ماہیر کا نکاح ہے۔" اوریدا نے گیلی ریت پر چلتے ہوئے ارصم کو بتایا۔

"تمہاری طرح بزدل نہیں ہے وہ۔ دیکھو کتنی بہادری سے اپنا مقدمہ لڑا ہے اس نے اور سب کو منا لیا۔" ارصم نے ایک دفعہ پھر اس سے گلہ کیا۔

"میں تو پہلے دن سے کہہ رہی ہوں' میرے جیسی

نہیں ہے وہ۔" اوریدا کے لباس میں سمندر کی نم آلود ہوا بھر گئی اور اس پر خفیف سی کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک سنسان گوشے کی طرف لے آیا۔

"آغا جی بتا رہے تھے' طیبہ آنٹی کی پوری کوشش ہے کہ ماہیر اور شانزے کے ساتھ تمہارا اور سرمد کا نکاح بھی کر دیا جائے۔" ماہیر کے افسردہ لہجے پر اس نے تڑپ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"میں نے آئرلینڈ میں گریجویشن کے لیے اپلائی کیا تھا' ہو سکتا ہے دو' چار مہینوں میں چلا جاؤں باہر۔" اوریدا کو لگا جیسے کسی نے اس کی روح کو کانٹوں پر گھسیٹ لیا ہے۔

"دلیکن کیوں....؟" وہ بوکھلا گئی۔

"یہاں رہ کر روز جینے اور روز مرنے سے اچھا ہے' دنیا کے کسی گوشے میں تنہا بیٹھ کر اپنی زندگی کے نقشے میں رنگ بھر لوں۔" وہ یوں تلخی سے ہنسا جیسے اپنا مذاق اڑا رہا ہو۔

"تم مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟" اوریدا کو لگا جیسے سمندر کی ساری ریت اس کی آنکھوں میں آ گھسی ہے۔

"جیسے تم مجھے چھوڑ کر سرمد کے ساتھ رہ سکتی ہو۔" اس کے تلخ لہجے پر اوریدا کو ایک دم چپ سی لگ گئی۔

دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی کا وقفہ طویل ہو گیا تو ارصم اس کا بازو پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لے آیا۔ اوریدا کو گویا سکتہ ہو گیا تھا' وہ سارے راستے خاموشی سے بیٹھی اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتی رہی۔ جیسے ہی وہ دونوں گھر پہنچے' ایک اور جذباتی منظر ان کا منتظر تھا۔

ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر بیٹھے ڈاکٹر جلال کا چہرہ ضبط کی انتہا پر تھا۔ ان کے قدموں میں بیٹھی بختاور اپنے حواسوں میں کہاں تھیں' وہ اپنے دونوں ہاتھ باپ کے سامنے جوڑے دیوانوں کی طرح ان سے معافی مانگ رہی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے' میری خطا بہت بڑی ہے' میں نے زندہ درگور کر دیا آپ کو' لیکن خدا کی قسم بابا! میں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا۔ رات کے اندھیرے میں دنیا جہاں کی کالک مل لی اپنے ہی چہرے پر۔ اللہ نے مجھے رسوا کر کے رکھ دیا۔" وہ اور بھی شدت سے رونے لگیں۔ ان کی ہچکیوں کی آواز وہاں بیٹھے سب ہی لوگوں کے دل کو چیر رہی تھی۔

"آپ کے سامنے بیٹھی ہوں' جوتے ماریں مجھے' اف تک نہیں کروں گی۔ لیکن خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیں' جب تک آپ مجھے معاف نہیں کریں گے۔ میرے دل کو سکون نہیں ملے گا۔" انہوں نے ہچکی بھر کر ویران نگاہوں سے اپنے باپ کو دیکھا۔ جو کسی مجسمے کی طرح بالکل ساکت بیٹھے تھے۔

"پلیز بابا... میں آپ کی وہی بیٹی ہوں جسے آپ نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کہ آپ کی نافرمانی کر کے میں اللہ کی حدود سے بھی تجاوز کر جاؤں گی۔ اتنے سالوں سے میرے دل میں پچھتاوے کی آگ جل رہی ہے۔ خدا کی قسم بابا! بہت سالوں سے نہیں سو سکی۔" وہ بے ربط جملے بولتی ہوئی سب کے آنکھوں میں نمی لے آئی تھیں۔

"جب تک آپ معاف نہیں کریں گے' اللہ بھی نہیں بخشے گا مجھے' ساری زندگی کانٹوں پر گزاری ہے میں نے' آزمائشیں کسی بلا کی طرح پیچھا کرتی رہیں میرا' بابا دعا کریں' میں مر جاؤں۔ اب اذیت برداشت نہیں ہوتی۔" ان کی آواز میں نقاہت بڑھ گئی۔

ڈاکٹر جلال کی دائیں آنکھ سے پانی کی پتلی سی لکیر نکل کر کان کی سمت میں رینگنے لگی۔ بختاور کی باتیں ان کے دل کو تکلیف پہنچا رہی تھیں۔ وہ خود بھی کرب کی بھٹی میں تنہا جلتے جلتے تھک گئے تھے۔ اب تو ان کی انا اور ضد بھی تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی۔

وہ تھوڑا سا بختاور پر جھکے اور اس کے کندھے کو نرمی سے سہلانے لگے۔ بختاور ایک جھٹکے سے اٹھیں اور ان کے سینے سے آن لگیں۔ بہت سالوں کی سرد مہری کی برف آخر کار آج پگھل ہی گئی تھی۔

تیمور ہاؤس آج برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا' ایسا لگتا تھا جیسے پورے شہر کی روشنیاں اسی گھر میں اتر آئی ہوں۔ شانزے اور ماہیر کا نکاح سادگی سے قریبی مسجد میں پڑھا دیا گیا تھا اور بختاور کی دل آزاری کے خوف سے ڈاکٹر ہاشم نے ان دونوں کے عشائیے میں شرکت کرنے سے سلیقے سے انکار کر دیا تھا۔ بختاور کی فرمائش پر ور شانزے کی رخصتی بھی نکاح کے ساتھ ہی شام میں کر دی گئی تھی۔

اس وقت ڈاکٹر ہاشم اپنے بہن 'بھائیوں کے ساتھ شانزے کے فلیٹ میں موجود تھے۔ ان کا وجود تھکا ہوا تھا' لیکن وہ ذہنی طور پر خاصے پر سکون تھے۔ اس ایمر جنسی رخصتی پر ان کے بہن 'بھائیوں نے خاصا برا منایا اور احتجاجاً" عشائیے میں شرکت سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"آخر ضرورت کیا تھی اس قدر افراتفری کی؟" ہاشم کے بڑے بھائی بے زاری سے گویا ہوئے۔

"اس کی ماں کو ضرورت تھی اس کی۔۔۔" انہوں نے افسردگی سے جواب دے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔

"اس کی ماں کے پاس پورا خاندان اکٹھا تھا اس کا۔ اگر دو چار ماہ بعد رخصتی ہو جاتی تو کیا فرق پڑ جاتا۔" شانزے کی پھپھو نے برا سا منہ بنایا۔

"دو چار ماہ بعد ہو یا دو چار گھنٹوں میں' آخر فرق کیا پڑتا ہے۔" انہوں نے پر سکون انداز میں بہن بھائیوں کے چہرے دیکھے۔

"ہمارے بھی کچھ ارمان تھے اور ہم اپنی بیٹی کو کچھ دے دلا کر رخصت کرتے۔" ان کی دوسری بہن نے ناگواری سے کہا۔

"وہ اپنی سگی ماں کے گھر گئی ہے' ان لوگوں کو سامان کی نہیں صرف اس کی ضرورت تھی اور وہ لے گئے۔" ہاشم نے تحمل سے جواب دیا۔

"پھر بھی' تمہیں ہم سے مشورہ کرنا چاہیے تھا؟" اعظم بھائی نے گلہ کیا۔

"آپ لوگوں نے مشورہ کیا تھا مجھ سے' میری بیٹی کو اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے۔ کسی نے مڑ کر خبر لی' وہ کہاں پر اور کیا کر رہی ہے' آپ میں سے کوئی اپنی اولاد کو شوبز میں بھیجے گا۔ میں نے اسے مفتی ابراہیم کی اولاد کے سپرد کیا تھا اور آپ نے اسے شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا۔" ہاشم ایک دم پھٹ پڑے۔ ان کے سب بہن بھائیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

"میں نے جو فیصلہ کیا ہے' بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور ویسے بھی یہ اس کی ماں کی خواہش تھی' اب اتنا تو حق بنتا ہے اس کا۔" ان کے دو ٹوک انداز پر سب ہی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"پھر تم نے کیا سوچا ہے' یہاں رہو گے یا واپس جاؤ گے۔" اعظم بھائی نے مصلحتاً" گفتگو کا رخ بدلا۔

"میں واپس جاؤں گا امریکہ۔۔۔" ان کی بات پر سب کو شاک لگا۔

"لیکن تم تو یہیں شفٹ ہونے کا فیصلہ کر کے آئے تھے۔" ان کے بھائی نے انہیں یاد دلایا۔

"اب میرا یہاں رہنا مناسب نہیں' میں پہلے بھی شانزے کی وجہ سے آیا تھا پاکستان اور میرے خیال میں اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور مجھے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر دینی چاہیے۔ جس کا میں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا اور ویسے بھی میں اس کی ماں سے بھی عہد کر چکا ہوں کہ اس کی اور اس کی بیٹی کی زندگی کو دوبارہ ڈسٹرب نہیں کروں گا۔" وہ پر سکون انداز میں بولتے ہوئے سب ہی کو بے چین کر گئے۔

"مرضی ہے تمہاری' پہلے بھی تو تم اپنے فیصلے خود ہی کرتے آئے ہو۔" اعظم بھائی کے لہجے میں ہلکی سی خفگی جھلکی لیکن ہاشم کے انداز میں کوئی لچک نہ پا کر انہوں نے باقی بہن' بھائیوں کو آنکھ کے اشارے سے مزید بحث کرنے سے منع کر دیا تھا۔

تیمور ہاؤس میں گویا بہاریں اتری ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر جلال کے اکلوتے پوتے کا عشائیہ تھا اور انہوں نے اس میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے سارے قریبی عزیز و اقارب یہاں اکٹھے تھے۔ شانزے' ٹی پنک۔ میکسی میں چاند سے اتری کسی حسین پری کی

مانند لگ رہی تھی اور ماہیر بلیک کلر کے تو پیس میں خاصا ہینڈ سم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی محبت کو پالینے کا خمار ہلکورے لے رہا تھا۔ جبکہ شانزے کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی، دلکش مسکراہٹ تھی۔

اس ہنستے مسکراتے ماحول میں اسے اپنے باپ کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی لیکن ماہیر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہنی مون پر اسے امریکہ اس کے پاپا کے پاس لے جائے گا اور شانزے کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ شاید آنے والے وقتوں میں بختاور کے فیصلے میں بھی کوئی نرمی آجائے۔

بختاور اس وقت ضد کر کے پنڈال میں موجود تھیں اور کئی دفعہ دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھ کر شانزے اور ماہیر پر پھونک چکی تھیں۔

"اماں! تھکی تو نہیں آپ.....؟" سفید رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس عبداللہ ان کے پاس بیٹھا فکرمندی سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں ٹھیک ہوں بیٹا۔" انہوں نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔ وہ دل ہی دل میں تہیہ کر چکی تھیں کہ اپنی صحت یابی کے فوراً بعد عدینہ کی بھی رخصتی کر دیں گی اور عدینہ ڈاکٹر بن کر اپنے اسی گاؤں میں پریکٹس کرے گی جہاں ان کا مدرسہ تھا اور اپنی بے بے اور ساس کے ساتھ رہے گی۔

سیاہ رنگ کے شیفون کے سوٹ میں اوریدا کا افسردہ حسن، دیکھنے والوں کو بار بار اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ وہ عدینہ کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کر کے اب ایک سنسان گوشے میں آن کھڑی ہوئی تھی اور اسے اکیلے دیکھ کر ارصم وہیں چلا آیا۔

سیاہ رنگ کے شلوار سوٹ میں ڈیسنٹ سی واسکٹ پہنے وہ آج خاصا مختلف لگ رہا تھا اور دونوں کو ایک ساتھ کھڑے دیکھ کر کوئی بھی سوچ سکتا تھا کہ دونوں کی ڈریسنگ شاید مشترکہ فیصلے کا نتیجہ ہے۔

"ابھی بھی وقت ہے مان جاؤ۔ میں صبح تمہارے ڈاکومنٹس بھی ایمبیسی میں دے آؤں گا۔" ارصم کی بات پر ایک ناگوار سا تاثر اوریدا کی آنکھوں میں ابھرا۔

"تم ایک ہی بات بار بار کر کے اپنا اور میرا وقت ضائع کیوں کر رہے ہو ارصم۔"

"اس لیے کہ ساری زندگی کے رونے سے بہتر ہے، ہم آج اپنی پسند کا فیصلہ کر لیں۔" وہ یک لخت سنبھل کر بولا۔

"میں اپنی پسند کا ایک فیصلہ کر کے ساری زندگی کے پچھتاوے نہیں خرید سکتی اور مجھے ابھی بھی یقین ہے، ہمارے ساتھ کچھ برا نہیں ہوگا۔" اس کے پُراعتماد لہجے پر ارصم نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک ہے تم خوش فہمیوں کے جنگل میں گھومتی رہو اور جب تھک جاؤ تو بتا دینا، میں تمہیں وہیں کھڑا ملوں گا۔" وہ ناراضی سے کہہ کر ڈاکٹر جلال کی طرف بڑھ گیا، جو بینش اور طیبہ کے ساتھ کافی دیر سے کسی بحث میں مصروف تھے۔ اوریدا کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"کیا ہوا، یہاں کیوں کھڑی ہو؟" سرمد اسے اکیلا دیکھ کر فوراً ہی چلا آیا۔

"کچھ نہیں......" اوریدا نے اپنے حلق میں اٹکا آنسوؤں کا گولہ بمشکل نگلا۔

"تم سے ایک مشورہ کرنا تھا اوریدا! امید ہے تم غیر جانب داری سے جواب دو گی۔" سرمد کی بات پر اس نے کھڑے کھڑے کوفت سے پہلو بدلا۔ وہ اس وقت جس جذباتی کیفیت کا شکار تھی اس میں کسی سے بھی بات کرنا آسان کام نہیں تھا۔

"یہ رباب کیسی لڑکی ہے؟"

سرمد کے شرارتی انداز پر وہ چونکی۔ "کیا مطلب؟"

"بھئی..... تمہاری اوٹ پٹانگ بھابھی کا کہنا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، تو میں نے سوچا امی سے بات کرنے سے پہلے تم سے مشورہ کر لوں، کہیں وہ اپنے جیسی اول جلول سی لڑکی میرے گلے نہ ڈال دے۔" سرمد کی بات پر اوریدا نے خوش گوار حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بتاتی ہوں ماہیر کو، آپ اس کی مسز کو اول جلول کہہ رہے ہیں۔" اس کے اعصاب ایک دم پرسکون ہوئے۔

"تو بتا دو، میں کون سا ڈرتا ہوں اس سے....."

سرمد قہقہہ لگا کر ہنسا اور دور کھڑے ارصم نے بے چینی سے یہ منظر دیکھا۔ وہ اوریدا کے معاملے میں خاصا شدت پسند تھا۔ اوریدا کو مسکراتے دیکھ کر سرمد نے دل ہی دل میں عدینہ کا شکریہ ادا کیا، جس نے دو دن پہلے ہی اسے ارصم اور اوریدا کی محبت کی داستان سنا کر پیچھے ہٹنے کی درخواست کی تھی۔ سرمد کے لیے یہ فیصلہ مشکل ضرور تھا، لیکن وہ اس معاملے میں خود غرض بن کر دو دلوں کے درمیان نہیں آسکتا تھا، چنانچہ اس نے شانزے کی بات ماننے کا فیصلہ کرلیا جو اسے کافی عرصے سے رباب کے لیے راضی کر رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ رباب کی محبت اس کے دل سے اوریدا کے نقوش مٹا دے گی۔

"اوریدا! تم یہاں چھپی کھڑی ہو اور بڑی اماں نے سارے پنڈال میں شور مچا رکھا ہے۔" عدینہ اچانک ہی اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچی اور اسے بازو سے گھسیٹتی ہوئی اسٹیج کی طرف لے گئی۔

"لو بھئی آگئی ایک اور دلہن، روتی بسورتی....." ماہیر اس کی طرف دیکھ کر شرارتی انداز میں ہنسا تو اس نے الجھن بھری نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا، جو بڑی دلچسپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"چلیں بھئی عبداللہ صاحب! شروع کریں نکاح۔ شکر، مولوی کی فیس تو بچی۔" ماہیر کے شرارتی جملے پر اردگرد سے مختلف قہقہے گونجے۔ اوریدا نے پریشانی سے بڑی اماں اور بڑے ابا کی طرف دیکھا جو محبت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"لو بھئی۔ آگئی میری بہو ڈاکٹر اوریدا....." بینش کا خوش گوار لہجے میں کہا گیا فقرہ سن کر اوریدا کے ساتھ ارصم بھی بوکھلا گیا۔

"ویسے بہت چالاک ہیں آپ بینش پھپھو، ہمارے خرچے میں اپنے بیٹے کو بھی نپٹا رہی ہیں۔" ماہیر کے شرارتی انداز پر وہ ایک دم ہنس پڑیں۔

بڑی اماں نے اوریدا کا بازو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور عدینہ کا سرخ دوپٹا اس پر ڈال دیا، وہ بوکھلا گئی۔ جبکہ بینش نے پریشان حال کھڑے ارصم کا ہاتھ زبردستی پکڑا اور اسے اوریدا کے بالکل برابر میں بٹھا دیا۔

ارصم کا دل ایک پل میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ اسے لگا جیسے ایک دم ہی فضا میں ایک سریلا اور مہکتا ہوا احساس رقص کرنے لگا ہے۔ سرخ دوپٹے کی اوٹ میں اوریدا کا شرم سے دہکتا ہوا چہرہ ایک دم جھک گیا۔ ان کے سچے جذبوں نے آخر کار اپنا آپ منوا ہی لیا تھا۔

بینش نے اپنے بیٹے کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا، جس نے انہیں کسی بڑے خسارے سے بچا لیا تھا۔ اس دن جب وہ ڈاکٹر جلال سے معافی مانگنے آئی تھیں تو انہوں نے اوریدا اور ارصم کے نکاح کی شرط سامنے رکھی جو انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مان لی تھی۔

نکاح کی رسم ہوتے ہی مبارک باد کا شور مچ گیا۔ آغا جی نے اپنے نواسے ارصم کو بے اختیار گلے لگا کر مٹھائی کھلائی اور دونوں نانا، نواسا ایک دوسرے کو دیکھ کر ایک دم ہنس پڑے۔ ان کا خفیہ منصوبہ کامیاب رہا تھا۔ بینش کو سدھارنے کے لیے ارصم کے بگڑنے کا منصوبہ آغا جی کے ذہن کی پیداوار تھا، جس میں ارصم اور آغا جی نے اپنی جان دار ایکٹنگ سے رنگ بھر دیے تھے۔ یہ راز صرف ارصم اور آغا جی ہی جانتے تھے اور آنے والے دنوں میں شاید اوریدا بھی جان جاتی، لیکن بینش کو ساری زندگی اس بات سے بے خبر ہی رہنا تھا۔

بڑے ابا نے آگے بڑھ کر اوریدا کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو وہ بے اختیار ان کے ساتھ لپٹ گئی، وہ جان گئی تھی اس کے اور ارصم کے ملاپ کے پیچھے بڑے ابا کی محبت اور دست شفقت تھا، اس نے اپنے والدین اور بڑوں کا مان رکھا اور نتیجے میں اللہ نے اس کی قسمت میں ان گنت خوشیوں کے رنگ بھر دیے تھے۔

اس کے ساتھ بیٹھے ارصم نے شرارت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ گڑبڑا گئی۔

"مبارک ہو، تم ٹھیک کہتی تھیں۔" ارصم کی محبت بھری آواز اس کی سماعت میں پھوار بن کر برسی اور اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔

٭

سائرہ رضا

سیدھی بات گنوا دی

"کہنے کو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ مگر میں اسے کامیابی کی سیڑھی کا پہلا قدم سمجھتا ہوں۔"

"جی ڈیڈی.....!"

"آخری اوور میں چھکے چوکے لگا کر جیتنے سے وقتی مزہ اور جوش تو ضرور پیدا ہوتا ہے مگر عقل مند اور قابل بھروسا کھلاڑی وہ ہوتا ہے۔ جو پہلی گیند سے آخری گیند تک اسٹینڈ کرے اور جم کر کھیلتے ہوئے ہر گیند کو آخری سمجھے۔"

"جی ڈیڈی.....!"

"مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں تم میری سب سے بڑی بیٹی ہو۔ تم جس راہ پر چلوگی۔ تم سے چھوٹے خود بخود اسی راستے کو اپناتے چلے جائیں گے۔"

"یس ڈیڈی! میں سمجھتی ہوں۔"

اس کا جواب حسب معمول، حسب عادت حسب منشاء تھا وہی جی کا کلمہ.....یس ڈیڈ۔

یہ کوئی صبح یا شام کی واک نہیں تھی۔ ان باپ بیٹی کو جب دل کی باتیں کہنی سننی ہوتیں وہ ایسے ہی نکل آیا کرتے تھے اور اس میں بھی کہنے سننے والی بات غلط ہو گئی۔

صرف کہنا..... والد صاحب کو کہنے کا مراق تھا۔

اور صاحبزادی نہ صرف بہترین سامع تھیں بلکہ تابعداری کے سارے درجے اسکول کے مدارج سے پہلے ہی طے کر چکی تھیں اور بچے اماں ابا تاتا پاپا کہنے سے بولنا شروع کرتے ہیں۔ اس نے پہلے اثبات میں سر ہلانا سیکھا پھر زبان کھلی تو وہی ایک لفظ۔

"جی ڈیڈی.....!" اُف

☼ ☼ ☼

"کوئی آیا تھا سجل.....؟" وہ اپنے لیے چائے کا کپ بنانے کی خاطر کمرے سے نکلی تھی۔ درمیان میں کامن کم ڈرائنگ روم کم ٹی وی لاؤنج کم ڈائننگ روم پڑتا تھا۔ ساتھ میں اوپن کچن.....

سجل کارپٹ پر بیٹھی مصنوعی پھولوں کے گلدستے میں ڈھلے ہوئے پھول سیٹ کرکے لگا رہی تھی۔ سارا

مکمل ناول

دھیان اپنے کام پر تھا۔ اس کی آواز پر بری طرح چونکی تو اسٹیل کی تار انگلی میں کھب گئی۔

"اوئی!" اس نے انگلی منہ میں دبائی۔

"خوامخواہ... زیادہ تو نہیں لگی۔"

"نہیں بس ٹھیک ہوں۔ ہمارا تو وہ حال ہے۔ جو زخم دیا۔ پھولوں نے دیا کانٹوں سے شکایت کون کرے۔" اس نے گا کر سنایا۔

"اف...!" وہ ہنس پڑی "تم بھی ناں... بس۔"

بہت تیز تازہ گلابوں کی خوشبو... ایئر فریشنر تو بالکل نہیں ہو سکتا۔ تو پھر... اس نے صوفوں کو دیکھا' ہاں بے ترتیب کشن... بیک میٹ بھی نیچے گرا ہوا تھا اور ہاں ایش ٹرے میں پڑی سگریٹ کی راکھ۔

"کون آیا تھا سجل...؟" سجل پھولوں سے تبرد آزما تھی۔ نرو ٹھے پن سے نگاہ اٹھائی۔

"نہیں کوئی نہیں..." سجل پھولوں میں الجھی ہوئی تھی۔

"ایسے کیسے نہیں... کمرے کی حالت بتا رہی ہے کہ کوئی آیا تھا اور یہ ایش ٹرے بھی۔"

"جب پتا لگ چکا ہے کہ کون آیا تھا تو پوچھنے کا مقصد؟"

"کون...؟ حسنین۔" وہ بے طرح چونکی۔

سجل بی بی نے اک بے نیاز نگاہ ڈالی اور پھر تیار شدہ بنچ کو گل دان میں سجانے کھڑی ہو گئی۔ تب ہی اس کی نگاہوں میں خوشبو کا منبع آ گیا۔ کارپٹ پر رکھا بہت سرخ کھلے گلابوں کا گلدستہ تھا۔

وہ کسی معمول کی طرح نیچے جھک گئی۔ مشام جاں کو معطر کرتے پھول کہیں اندر روح تک کو شاد کر گئے۔

اس نے گل دستہ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر لمبا سانس بھرا تو آنکھیں سرشاری کے عالم میں بند ہو گئیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

سجل اپنے کام سے فارغ ہوئی تو نگاہ اس پر ٹک گئی۔ وہ جیسے یہاں ہوتے ہوئے بھی کہیں اور پہنچ گئی تھی سجل نے کھنکھار کر متوجہ کیا۔

"آں...!" اس نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور سجل کی معنی خیزی دیکھی' تب خود پر بے نیازی اور سختی کا ملمع چڑھا دیا۔

"کیا ہوا۔ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں... لایئے' اسے مجھے دے دیں... دیسی گلاب ہیں' اماں جی سے کہہ کر گل قند بنواؤں گی۔"

"گل قند!" اس کے سر پر پہاڑ ٹوٹا... دل پر مانو' گھونسا لگا۔ جیسے پیروں سے زمین سرکی' جیسے...

"ہاں گل قند... میرے دادا کو... آپ کو تو پتا ہے قبض کی شکایت اکثر رہتی ہے۔ گل قند بہترین علاج ہے اور۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے سجل...!" وہ خود کو چیخنے سے باز نہ رکھ سکی۔ "کوئی بکے سے گل قند بناتا ہے۔"

"بکے سے نہیں... گلابوں سے..." سجل نے تصحیح کی۔

"پرے ہٹو... بڑی آئیں حکیم لقمان کی بھتیجی... فرزانہ دواخانہ... لاؤ وہ کرسٹل والا گل دان اس میں سجاؤ انہیں... پانی ڈالو اور ذرا سا نمک ملا لینا تاکہ تازہ رہیں۔" اسے تو سچ مچ فکر پڑ گئی۔ خود ہی آگے ہو کر سارے کام پلک جھپکتے میں کر لیے۔ سجل مزے سے دیکھتی رہی۔

"میں جا رہی ہوں اپنے کمرے میں... ایک کپ چائے دے جاؤ۔" وہ گل دان لیے اپنے کمرے میں جانے لگی۔

"اور بات سنو۔ تم نے بتایا نہیں حسنین آئے تھے ناں؟" اسے پھر دھیان آیا۔

سجل نے منہ پھلا رکھا تھا۔ سر کو اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔

"کب آئے تھے؟"

"آدھا گھنٹہ پہلے..." آواز سے ناراضی مترشح تھی۔

"چائے پوچھی؟"

سجل نے سر ہلایا "دو مرتبہ۔"

"اچھا!" وہ خاموش ہوئی "اماں جی کیا دوبارہ سو گئیں؟"

"وہ جاگی ہی کب تھیں؟" سجل نے الٹا سوال جڑ دیا۔

"کیا مطلب تو حسنین اتنی دیر کس کے ساتھ بیٹھے رہے؟"

"کسی کے بھی ساتھ نہیں... دو کپ چائے پی... موبائل پر فیس بک چلائی۔ پھر سگریٹ پھونکتے رہے۔ تنگ آکر چلے گئے۔ اماں جی کو اٹھانے سے منع کر دیا تھا۔"

"تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا... میں کوئی سوتو نہیں رہی تھی... اور بالفرض سو بھی رہی ہوتی تو تم جگا سکتی تھیں سجل...!" وہ بھونچکی رہ گئی تھی۔

"جگا دیتی؟ بتا دیتی۔" سجل کی تو آنکھیں ابل پڑیں۔ "بھول گئیں۔ پچھلی بار آپ نے کیا آرڈر کیا تھا۔"

"یہی کہ نہ جگایا جائے نہ بتایا جائے اور نہ ہی سمجھایا جائے کہ..."

"ہاں...!" اسے سب یاد آگیا۔ چہرے پر سختی آگئی۔ ہاں اسی نے یہ سب کہا تھا۔ بس ذہن سے نکل گیا۔

"ہاں ٹھیک کیا بالکل صحیح۔" لہجہ کچھ کھو سا گیا۔ دھیان بالکل پلٹ گیا تھا اس نے ایک نظر بے ترتیب کشنز پر ڈالی۔ پھر ایش ٹرے پر...

دل بوجھل سا ہو گیا۔ اعصاب جواب دے گئے۔ اپنے قدموں پر کھڑا رہنا مشکل لگنے لگا۔ اس پر پھولوں کا بوجھ کیسے اٹھاتی۔ غیر محسوس انداز سے گل دان ٹیبل پر رکھ دیا۔ پھولوں کی خوشبو... سگریٹ اور مخصوص مردانہ کلون کی مہک اس جگہ سے ہٹ جانے ہی میں بہتری تھی، مبادا چہرہ نیوز اسٹال پر لہراتا اخبار بن جائے اور ہر کس و ناکس پڑھتا پھرے۔

"اوں ہوں..." وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"خود ہی تو کہا تھا میں نے کون سی اپنی مرضی کی۔ حکم کی غلام ہوں جو کہا کر دیا۔" سجل پھٹ پڑی۔ شام سے جو وہ خاموش ہوئی تو رات کے کھانے، صبح کے

ناشتے سے بات دوپہر کے کھانے کو گول کرنے تک آگئی۔

"آپ بتائیں کہا تھا کہ نہیں کہا تھا؟"

"میں کچھ کہہ رہی ہوں تمہیں۔"

"تو یہی تو رونا ہے' آپ کچھ کہتی کیوں نہیں... اور کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"بھوک نہیں تھی۔"

"جھوٹ بولنے والے کا رنگ کالا ہو جاتا ہے۔"

"سچ کہہ رہی ہوں بابا..."

"دوسرا جھوٹ..."

"کیا چاہتی ہو تم...؟" اس نے ماؤس چھوڑ کر اسے توجہ سے نوازا۔

"اب یہ تو نہیں کہہ سکتی... تمہیں۔" وہ شرارت پر آمادہ ہوئی۔

"بکو مت..." اسے ہنسی آگئی۔

"اس میں بکواس کی کیا بات ہے۔ یہ تو حسنین بھائی جان کا جملہ ہونا چاہیے' ویسے انہوں نے کبھی کہا تو ہو گا۔"

"تم بہت بدتمیز ہو سجل! اور بے شرم بھی ہو گئی ہو۔"

"اس میں بدتمیزی اور بے شرمی کہاں سے آگئی۔ ویسے انہوں نے کبھی نہیں کہا۔"

اس کے لہجے میں زمانے بھر کا اشتیاق سمٹ آیا۔ منہ بھی کھل سا گیا۔

"اٹھو... فوراً" اٹھو ادھر سے..." اس نے اخبار کا رول بنا کر اس کے شانے پر مارا۔ "جاؤ یہاں سے تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم سے بات بھی کی جائے۔"

"آپ تو مار کٹائی پر اتر آئی ہیں... چلی جاتی ہوں بابا۔" وہ گرتی پڑتی اٹھی۔

"ویسے سوال کا جواب نہ آئے تو سوری کہہ دیتے ہیں سارتے ہوئے تو کبھی نہ دیکھا۔ لیکن خیر... آپ نہ بھی بتائیں تب بھی... جتنا میں حسنین بھائی جان کو جانتی ہوں کہا تو انہوں نے ہو گا ہی... کہے بغیر وہ رہ ہی نہیں سکتے۔"

"سجل...!" وہ دھاڑی مگر سجل خطرے کی حدود سے کافی دور دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ بھاگ سکتی تھی۔

"ایک ایسا لڑکا جو کالج کے زمانے سے آپ کو پسند کرتا ہے۔ اور اب ایک سمجھ دار پکا مرد ہے بقول اماں جی' ذرا سی لفٹ نہ ملنے پر بھی ہر ہفتے... نک سک سے درست ہو کر پھولوں کا گلدستہ لیے حاضر ہوتا ہے شسکارنے پر تو بلی بھی پل بھر کو ہی سہی دبک جاتی ہے۔ پر یہ میاں تو بلی سے بھی ڈھیٹ پنے میں جیتے ہوئے ہیں۔

مگر میری بیٹی کو ہی عقل نہیں... طلب گار جتنی بھی دور سے اور چاہت سے چل کر آئے' دستک دینے والے ہاتھ تھک بھی جایا کرتے ہیں۔ ناعاقبت اندیش لڑکی قدم پلٹ بھی جاتے ہیں۔ مگر یہاں سنتا کون ہے ارے صندلین تمہیں کہہ رہی ہوں بیٹا...؟"

"اف اللہ...!" اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں' سجل کے لہجے میں رقت اور منت بالکل اماں جیسی تھی۔ جملے ہو بہو... آواز ہو بہو...

اسے آنا تو غصہ چاہیے تھا مگر ہنسی آگئی۔

"میں اماں کو بتاؤں گی۔ تم ان کی نقلیں اتارتی ہو۔" اس نے بچوں کی سی لڑائی والا انداز اپنایا۔

"وہ تو خود مجھ سے فرمائشیں کر کے سب کی نقلیں سنتی ہیں۔ ہم دونوں اتنے مزے کرتے ہیں۔ آپ تو آفس میں ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ مزہ تو آتا ہی آپ کی نقل اتارنے میں ہے۔"

اسے دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے بالکل اچھی نہیں لگا صندلین... تم ایسی تو نہیں تھیں۔" امی کا غصہ... صندلین نے سجل کو گھورا جو کیا تھا اسی نے کیا تھا۔

"بس وہ اس دن... یونہی..."

"یونہی؟" امی نے خشمگیں نظروں سے اسے دیکھا "آداب میزبانی بھی کسی چیز کا نام ہے کہ نہیں۔"

صندلین نے لمبا سانس بھرا۔ وہ آج ان سے کلیئر کٹ (دو ٹوک) بات کر ہی دے گی (ہزار بار کر بھی چکی تھی)

"بات یہ ہے امی! کہ جب میں اسے صاف انکار کر چکی ہوں تو وہ کس امید پر آجاتا ہے۔" اس کا لہجہ اور انداز عاجزانہ تھے۔

"انکار۔۔۔!" امی کا لقمہ والا ہاتھ رک گیا۔ "کب کیا انکار۔۔۔؟ کیوں کیا؟ کس سے پوچھ کر کیا صندلین؟" ان کی آواز پھٹ پڑی۔

"اوہ۔۔۔ شادی نہ کرنے کا اعلان تو وہ ببانگ دہل کیا کرتی تھی۔ انکار والی بات اس طرح سے تو امی کو بتانے کی تھی نہیں۔ بس بے ارادہ ہی منہ سے نکل گئی۔

"حسنین کو انکار۔۔۔؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے یا مجھے پاگل کرنے کا ارادہ ہے۔" امی نے لقمہ واپس رکھ کر پلیٹ دور کھسکا دی۔ "کس جنم کا بدلہ لے رہی ہو تم سب مجھ سے۔۔۔؟"

"جنم۔۔۔!" وہ چونکی "امی مسلمان کا ایک ہی جنم، ایک ہی مرن ہوتا ہے۔"

"ہاں تو بس پھر میں مر جاتی ہوں۔"

"اوہ امی۔۔۔ ایسے نہیں بولیں۔" وہ اچھل پڑی۔

"تو پھر کس طرح سے بولوں کہ تمہاری سمجھ میں آجائے صندلین۔۔۔! خوش قسمتی بار بار دستک نہیں دیتی اور انتظار تو بالکل نہیں کرتی۔"

"میں آپ کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر بیاہ نہیں رچا سکتی۔" اس نے وجوہات میں سے ایک بتا ڈالی۔

"عمر خضر لکھوا کر نہیں آئی میں۔۔۔ اگلی سانس کا بھروسا نہیں، کیا کرو گی میرے مرنے کے بعد۔۔۔ میری زندگی اور میری موت کو مشکل نہ بناؤ بیٹا۔۔۔ پہلے ہی بڑے خسارے ہیں، ان کا حساب آج تک نہ ہوا۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تو میری موت پر سکون ہو گی۔ کیا سب نے قسم کھائی ہے کہ مجھ ہی کو ستائیں گے۔" ان کا لہجہ گلوگیر اور شکست خوردہ ہو گیا۔

"میں کب ستا رہی ہوں امی۔۔۔!"

"تو پھر حسنین کو کیوں منع کیا؟"

"مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔" اس کا سادہ سا جملہ قطعیت سے بھرپور تھا۔

"تو پھر کس سے کرنی ہے؟" امی کا سوال بالکل ٹھیک تھا۔

"کس سے مطلب؟ کسی سے بھی نہیں۔۔۔ بتا تو رہی ہوں کہ آپ کو تنہا چھوڑ کر۔۔۔ کبھی نہیں۔"

"تو اس کا تو ایک ہی حل ہے۔ میں ہی کچھ پھانک کر سو رہوں۔ ساری مصیبت میں جو ہوئی۔" امی کی آواز بھرا گئی۔ "پھر تو تم شادی کر لو گی ناں؟"

"امی۔۔۔!" صندلین نے دہل کر ماں کی صورت دیکھی۔ "اب مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی!" وہ کھڑی ہو گئیں۔ "اور تم سجل کھانا کھا لو تو میرے کمرے میں آنا۔"

سجل نے ایک جتاتی افسوس بھری نظر سے صندلین کو دیکھا اور کرسی سے اٹھ گئی۔

صندلین بھری ڈنر ٹیبل کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

"کھانا تو کسی نے بھی نہ کھایا۔" اس نے پانی کا گلاس بھرتے ہوئے خود سے افسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

"وہ جس روز آپ رشتے داروں کے گھر گئی تھیں۔ تب آئے تھے حسنین بھائی جان۔ باتیں کیا ہوئیں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر باجی صندلین خفا لگتی تھیں۔ حسنین بھائی کمسکرا رہے تھے۔ وہ باجی کی باتوں پر سنجیدہ نہیں تھے پھر وہ بیٹھے ہی ہوئے تھے۔ تب باجی نے ان کے سامنے ہی مجھے بلا کر کہا کہ اگر دوبارہ حسنین صاحب آئیں تو نہ انہیں بتایا جائے نہ بلایا جائے۔۔۔ اور اگر میں نے یہ بات نہ مانی تو پھر میری خیر نہیں۔ اب آج جب وہ آئے تو میری سمجھ میں نہ آیا کیا کروں جھوٹ بول کر اپنی جان بچائی اور ان کا مان کہ گھر پر ہیں ہی نہیں۔۔۔ آپ دوا کھا کر لیٹی تھیں تو انہوں نے خود منع کر دیا۔ چائے پانی پی کر چلے گئے۔ بس اتنی سی بات ہے۔" اس نے سب کچھ من و عن بتا دیا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے سجل۔۔۔ یہ بے وقوفی کی

حد ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا۔"

"وہ پاجی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو ایسے نہیں کرتی تھیں۔ ساری دنیا کی باتیں کرتے تھے دونوں مگر اب..." وہ خود بھی الجھن میں تھی۔

٭ ٭ ٭

ہاں صندلین احمد... گھنٹوں اس سے باتیں کرتی تھی۔ اتنی باتیں اتنے قصے کہ زندگی ایک نشست میں تمام ہو جائے۔ وقت قدر و قیمت کھودے... کوئی احساس ضیاع نہ ہو۔ لیکن اب جو وہ کہنے لگا تھا زبان سے... وہی سب جو آنکھیں کہتی تھیں۔

"انتظار کی حد ہوتی ہے صندلین احمد...! کتنے آرام سے کہہ دیتی ہو میں راستہ بدل لوں... راستہ قدم نہیں دل اور آنکھیں بدلتی ہیں۔ اور تم تو سالوں سے مجھے نظر بند کر چکی ہو۔"

"ہم یہ بات نہیں کریں گے حسنین...!" وہ سٹپٹائی۔ اچھی خاصی ملکی صورت حال پر گفتگو ہو رہی تھی عدلیہ مقننہ، مہنگائی کرپشن اور صبر... وہ اپنے صبر کی حد بتانے لگا۔

"میں صبر کرنے کو تیار ہوں مگر یہ گارنٹی دو، پھل میٹھا ملے گا۔"

"میں کوئی فروٹ کی ریڑھی لگاتی ہوں۔" اس نے بات اڑانی چاہی، حسنین کی آنکھوں میں شکوہ آن ٹھہرا۔

"میں سنجیدگی سے پوچھ رہا ہوں۔" وہ کیا کچھ ٹھان چکا تھا۔

"تم سنجیدہ اچھے نہیں لگتے... اس نے آڑ بنا کر نکل جانا چاہا۔

"یہی تو کب سے جاننا چاہ رہا ہوں۔ کیسے اچھا لگوں گا... ویسے ہو جاتا ہوں۔" وہ اس کی سمت خمیدہ ہوا اور گہری نگاہوں سے سوال رکھ دیا۔

"رہنے دو۔" وہ ہنسی قصداً "اب کیا بنو گے جو بننا بگڑنا تھا، ہو گیا۔ تم ناقابل تصحیح ہو چکے ہو... مسٹر حسنین!"

"نہیں... تم کہہ کر تو دیکھو... آزمائش شرط ہے۔"

"ضرورت نہیں..." وہ متبسم لہجے میں بولی اور یونہی کشنز درست کرنے شروع کر دیے۔

گمبھیر لہجہ اور گہری نظروں کا سامنا پہلو بدلنے پر مجبور کرنے لگا تھا۔ وہ ایسے اتنی شدت سے پہلے تو کبھی سوال نہیں بنا تھا۔ کچھ مجبور، کچھ جارح۔ کچھ قطعی... کچھ مشکل...

یہ اچانک حملہ... آخری معرکہ... حسنین کی آنکھوں سے عیاں تھا۔ اور ہار نہ ماننے کی قسم... اور عزم جو اسے پسپائی پر مجبور کر سکتا تھا۔ پر وہ اتنی کمزور تو نہیں...

"میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" وہ ذرا سا موقع چاہتی تھی۔ اپنی حیرت پر قابو پا لیتی اپنے جملے ترتیب دے لیتی، خود کو اس قابل بنا لیتی کہ ڈٹ کر انکار کرے۔ انکار پر ڈٹ سکے مگر... آج حیران کر دینے کی قسم کھا کر آیا تھا وہ...

اس کا آنچل اس کی مضبوط گرفت میں جا چکا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی حیرت سے اپنے آنچل کو دیکھ رہی تھی پھر اس کی اٹھی نگاہوں پر نظر ٹھہر گئی۔ مگر یہ قیام طویل نہ ہو سکا۔

محبت برساتی، اکساتی، بہلاتی پھسلاتی جذبوں سے بھری قطعیت سے بھرپور وہ آنکھیں۔

"مجھے چائے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے جواب چاہیے۔"

"وہ تو پھر میں دے چکی۔"

"مجھے انکار نہیں سننا۔"

"اقرار میں کروں گی نہیں۔"

"مجھے پسند نہیں کرتیں...؟"

اس کی نظریں بے ساختہ اٹھیں اور پلکیں لرز کر رہ گئیں۔

"جھوٹ بولنا بری بات ہوتی ہے صندلین۔"

"میرا دوپٹہ چھوڑ دو۔"

"تم جواب دو۔ گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ جائے گی۔"

مجھ سے نفرت کرتی ہو؟"

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ سر جھک گیا۔ اس کی ہتھیلی سے پسینہ بھی پھوٹتا تھا۔ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی نہیں بول سکتی تھی۔

اور وہ اس کے چہرے کی تحریر کا ہر حرف پڑھ رہا تھا۔ وہ کشمکش نجانے کیسی مجبوری.... وہ متامل تھی مگر کیوں کس لیے....

"دیکھو صندلی ....!" وہ نرمی سے گویا۔ "میں جانتا ہوں انکار کی وجہ وہ بھی نہیں ہے، جو تم کہتی ہو۔ مائیں بیٹیوں کی شادی کر کے تنہا ہوتی ہی ہیں۔ یہ کار دنیا ہے۔ مائیں اولاد کی زندگی کو آگے بڑھایا کرتی ہیں۔ سو اس بات کو رہنے دیتے ہیں۔ تم اصل وجہ دو۔ تم اپنی ماں سے محبت کرتی ہو۔ تو میں بھی اپنی ماں سے محبت کرتا ہوں اور انہیں ٹال ٹال کر اب تنگ آگیا ہوں اور انہوں نے تو اب کہنا بھی چھوڑ دیا ہے اور یہ زیادہ ظلم کیا کہ ان کی خاموشی مجھے ان کے سامنے شرم سار کرنے لگی ہے۔

ہر بار دل کو مضبوط کرتا ہوں کہ ٹھیک ہے تم کو بھول جاتا ہوں مگر میرا دل مجھ پر ہنستا ہے۔ جانتا ہے ناں یہ صرف لفاظی ہے۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔ تم فراموش کرنے والی چیز ہو ہی نہیں۔ اور تمہاری امی.... تم ان کی اکیلی اولاد تو نہیں ہو۔"

سر جھکا کر سنتی صندلین کا سر بے ساختہ اٹھا۔ وہ جتا نہیں رہا تھا ابھی اسے اور بہت کچھ کہنا تھا۔

"اور چلو.... تم نے خود سے عہد کر لیا ہے کہ تم ان کا سہارا بنوگی، انہیں تنہا نہیں چھوڑو گی تو یار! تمہیں ایسا کرنے کو کہہ کون رہا ہے۔ ہم انہیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔"

صندلین نے کسمسا کر اسے دیکھا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ ساتھ نہیں رکھیں گے میں اپنا بوریا بستر اٹھا کر ادھر آجاؤں گا۔ یہیں کہیں پڑ جاؤں گا۔ گھر داماد بننے کو بھی تیار ہوں، دنیا چاہے کوئی بھی نام دے لے۔ سب سہ لوں گا۔" حسنین نے فوراً دوسرا آپشن دیا۔

صندلین نے پلو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کی گرفت مزید کسی گئی۔

"اور میری ماں نے بھی کچھ نہیں کہنا... یقین کرو، وہ تو الٹا خوش ہوں گی، مجھے میری من پسند شریک حیات مل جانے کی خوشی... میرا گھر بس جانے کی خوشی۔"

اتنے بہترین آپشنز کے باوجود انکار عیاں تھا بس بے دھڑک بولنے میں جھجک مانع تھی۔

"بولو صندلی ... میں منتظر ہوں۔" وہ بغور سننے کی چاہ میں نشست پر آگے کو سرکا تھا۔

اس نے حلق تر کیا۔ آنچل چھڑانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے جواب سے حسنین مراد کی گرفت خود بخود ڈھیلی پڑ جانی تھی۔

"میں پھر بھی ہاں نہیں کر سکتی... آئی ایم سوری۔" اس نے معذرت دل سے کی تھی وہ واقعی شرمندہ تھی۔ اس سے بھی اور خود سے بھی....

وہ کھڑی ہو گئی۔ پائے ثبات میں لغزش نہ آجائے۔ اس کی خاموشی.... اوہ۔

صندلین کو لگا وہ نمک ہو گئی ہے۔ گھل جائے گی۔ موم بن گئی ہے۔ پگھل نہ جائے۔

اس کا آنچل یوں واپس آیا جیسے مکھن سے بال نکلتا ہے۔ اگلے پل وہ کمرے سے باہر نکل جانے والی تھی۔ مگر یہ کیا ہوا... اتنی زور کا جھٹکا... حسنین نے اسے روکا تھا اور وہ پوری کی پوری کھنچتی صوفے پر گر جانے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے حواس مختل ہو گئے۔

"میں بچہ نہیں ہوں صندلی۔ تمہیں صحیح وجہ بتانی ہوگی ورنہ میں یہاں سے جانے والا نہیں۔"

"مجھے کوئی وجہ نہیں دینی۔"

"اور میں ٹلنے والا نہیں... مان لو میں نے قسم کھالی ہے۔"

"تم مجھے دہشت زدہ نہیں کر سکتے۔" اس نے کڑک انداز اپنایا (دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا) اور وہ جو تم نے مجھے کیا ہے وہ... اسے کیا نام دوگی یہ تو وہی بات ہوئی جیسے کوئی اندھے فقیر کے عمر بھر کے سکوں کو کھوٹا کہہ

دے۔" اس کا لہجہ مدھم اور شکست خوردہ ہو گیا۔
صندلین نے اپنی ہمت مجتمع کی۔ وہ ہنوز جھکا کھڑا تھا وہ جیسے موقع پا کر سائیڈ سے نکلی۔
"میرا جواب انکار ہے اور جواز کے لیے تم زبردستی نہیں کر سکتے۔" ذرا دور کھڑے ہو کر خود کو محفوظ جان کر اس نے بڑی بہادری دکھائی۔
"کس نے کہا میں زبردستی نہیں کر سکتا جتنی محبت تم سے کی ہے ناں صندلی ... میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا بھی لے جا سکتا ہوں۔ میری محبت اتنا حق تو رکھتی ہے ناں۔ یہ تو مانو گی۔"
"مجھے کچھ نہیں سننا، مجھے کچھ نہیں جاننا۔" اس نے منہ پھیر لیا۔
"اتنی سنگ دل مت بنو میں خود پر کنٹرول کھو دوں گا۔" اس نے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دینا چاہا۔ تب ہی نگاہ ہکا بکا کھڑی سجل پر جا رکی۔ وہ حیران پریشان ساکت کھڑی تھی۔ صندلین نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اس کی نگاہوں کے تعاقب کرنے پر حسنین کو بھی خود پر پانی پڑنے کا احساس ہوا۔
نجانے وہ کب آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کیا سنا ... کیا دیکھا ... کیا سمجھا۔ صندلین کو شدید غصہ آیا۔ حسنین کی آج کی باتیں اور حرکتیں حیرت تھیں مگر اب حیرت پر طیش کا غلبہ ہونے لگا۔ اور طیش ہوش کا دشمن ہوتا ہے۔
"سنو سجل ...! آج کے بعد یہ آئیں تو تم دروازہ مت کھولنا۔"
"جی ...!" سجل کے لبوں پر سرسراہٹ سی ہوئی۔
"صندلی ؟" حسنین نے چونک کر سر اٹھایا۔
"اور پھر بھی یہ اندر آ جائیں ... تو مجھے بتانے بلانے کی ضرورت نہیں۔"
"کیا؟" سجل کا چہرہ بولنے لگا۔
"صندلی ...!" حسنین کے لہجے میں منت بھری تادیب تھی۔
اور آپ ...!" وہ حسنین کی طرف متوجہ ہوئی (محبت بڑھ جائے تو تکلفات ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ سے تو ہو جاتے ہیں۔)
"آپ دوبارہ زحمت مت کیجئے گا۔ ورنہ پھر شکایت ہو گی۔" "جتنی آپ نے آج کر دی وہ کافی ہے۔"
اس نے ارادتاً" اپنا پلو سنبھالا اور حسنین خان کا دل ٹوٹا ضرور تھا مگر خود پر غصہ آیا "ہاں آج کچھ زیادہ کر دی اور شاید غلط بھی ... مگر کیا کرتا وہ کسی بھی طرح ہاتھ نہ آتی تھی۔"
وہ جھٹکے سے پلٹا اور کمرے سے نکلنے ... ہی والا تھا۔
جب اس کی آواز پر اٹھا قدم ہوا میں معلق ہو گیا۔
"یہ پھول بھی اٹھا کر انہیں دے دو سجل ...!" وہ بے ساختہ گھوم گیا۔
سجل پنڈولم ہو گئی۔
ایک کی آنکھوں میں شکوے تھے۔ دوسرے نے بے حسی کی حد پار کر لی۔
"ایسے کیا منہ اٹھا کر دیکھ رہی ہو، میں نے فارسی تو نہیں بولی جو سمجھ میں نہ آئی ہو۔ اٹھاؤ یہ پھول ..."
اس کی دھاڑ پر سجل نے لپک کر خوشبو سے بوجھل گلدستہ اٹھا لیا۔ مگر لوٹانے میں وہ بھی متامل تھی۔ بھلا خوشبو بھی واپس کر دینے کی چیز ہوتی ہے۔ نجانے کیا ہو گیا تھا آج ان دونوں کے بیچ ... اور حسنین نے صندلین کو دیکھا۔ پتھر بے حس ظالم۔
ہونق مگر دل گرفتہ سی سجل ... اور اپنی قسمت پر دھاڑیں مار مار کے رونے کے خواہش مند ڈھیروں پھولوں کو ... وہ سرعت سے کمرے سے نکل گیا۔ دوبارہ کبھی نہ آنے کے لیے ... سجل کے دل پر گھونسا لگا۔ اس نے عزم و ہمت کا شاہکار بنی صندلین کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ سب گدھے ہیں ٹی کے۔" طویل گفتگو کے بعد بالآخر ڈیڈی نے آخری جملہ فیصلہ کن انداز سے کہا۔
"جی ڈیڈی ...!" اس نے سر ہلایا آج دونوں واک

نہیں گئے تھے۔ یہیں برآمدے میں چائے پی گئی تھی۔

"یہ کیا سمجھتے ہیں' میں ان کے اندر باہر سے واقف نہیں۔۔۔ غلط فہمی ہے نری۔۔۔ آج میری کامیابیاں اور میری بیٹی کی کامیابیاں انہیں پلٹنے پر مجبور کر رہی ہیں مگر مجھے ان کی سب چالوں کی خبر ہے۔"

"میں سمجھتی ہوں ڈیڈی!" اس نے اشارے ہی سے مزید چائے بنانے کا پوچھا اور اشارے ہی سے اثبات کا جواب ملا۔ نازک چینی کے کپ میں چمچ گھومنے سے جلترنگ سا بجنے لگا۔

"اور یہ میرے رشتے دار تو صرف گدھے ہیں۔" ڈیڈی نے چائے کا سپ بھرا "تمہاری ماں کے رشتے دار مہا گدھے۔۔۔ بلکہ ان سے آگے بھی کوئی لفظ موزوں ہو تو وہ رکھ سکتی ہو۔"

ٹی کے نے تابعداری سے سر ہلایا۔۔۔ ہاں وہ رکھ دے گی کوئی نام۔۔۔ فی الوقت تو سارا دھیان ڈیڈی کے فرمودات پر ٹکا تھا۔

آج بڑی۔۔۔ اور چھوٹی دونوں پھپھیاں ملاقات کو آئی تھیں' وجہ ٹی کے ہی کی کامیابی۔ اس نے ایف ایس سی میں ٹاپ کیا تھا۔ ساتھ ہی تقریری مقابلے میں سارے صوبے کے مقررین کو پچھاڑ کر اول انعام کی حق دار ٹھہری تھی۔

کسی مشہور کالم نگار نے جو کہ منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کی تقریر اوصاف کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا۔

"سیاست دانوں کو جو آئے دن روسٹرم کے پیچھے چنگھاڑتے ہیں انہیں اس بچی سے آداب سیکھنے چاہئیں' کہاں بولنا ہے کہاں ٹھہر جانا ہے۔ کون سا جملہ بلند آہنگ ہونا چاہیے اور کون سا اتنا دھیما کہ محض سوالیہ نشان بن کر سامعین کو دونوں بے قرار رکھے۔"

پھر تقریر اس نے لکھی بھی خود تھی۔ الفاظ کا چناؤ۔ موضوع کی گہرائی۔ بہت اعلا۔۔۔ پی ٹی وی کی شام پانچ بجے کی خبروں میں بھی تذکرہ تھا۔ رات نو بجے کے خبرنامے میں بھی وہ سارے خاندان۔۔۔ محلے گلی کوچے والوں کو دکھائی دے گئی۔ ایک ساتھ دو کامیابیاں۔۔۔ ابھی تو پوزیشن لینے والی خبر کی گرمی نہ کم ہوئی تھی کہ۔۔۔ اب آگے وہ کیا کیا نہ کرے گی۔

اس کا تو راستہ ہی الگ ہو گیا تھا۔

کوشش کرنے والے ہاتھ بڑھا کر تارے توڑ سکتے ہیں پر محنت و لگن اور ایمان داری سے کام کرنے والوں کے لیے آسمان خود جھک آتا ہے تارے پٹاپٹ جھولی میں گرنے لگتے ہیں۔

وہ فطرتاً "ایسی تھی یا پھر ڈیڈی کی محنت و توجہ نے اسے ایسا بنا دیا تھا کہ وہ خود تارہ بن کر جگمگانے لگی۔ اور اب ان جہانوں پر نگاہ تھی جو ستاروں سے کہیں آگے جا کر ملتے تھے۔

"نہیں تو یہ سب میرے بہن بھائی ٹی کے۔۔۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے میرے ہاں مسلسل بیٹیوں کی پیدائش پر مجھے تضحیک آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ وہ لوگ ہیں ٹی کے جو اپنے بیٹوں کو لاڈ تک مجھے دکھا کر کرتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔" ڈیڈی کے منہ سے جھاگ سا نکلنے لگا جوش خطابت سے۔

"اوہ۔۔۔!" اس نے اپنا کپ میز پر رکھ کے اپنا ہاتھ ان کے گھٹنے پر رکھ کر جیسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ "آپ وہ سب بھول کیوں نہیں جاتے ڈیڈی۔۔۔!" اس کی آواز متاسف تھی۔ "تکلیف دہ باتوں کو بھلا دینا چاہیے۔"

"بالکل نہیں۔۔۔" ڈیڈی اچھل پڑے۔ "تکلیف پہنچانے والی باتوں کو ہمیشہ یاد کرنا چاہیے۔ اور آج تمہیں ایک خاص بات بتاتا ہوں پلو سے گرہ لگا لو۔"

وہ اس کی سمت جھکے "دشمنی اچھی چیز نہیں۔۔۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ سامنے کوئی مدمقابل ہونا چاہیے۔ زندگی میں مقابلے کی فضا برقرار رہنی چاہیے۔ جیت کا مزہ بھی تب ہی ہے۔ جب مقابل ٹکر کا ہو۔"

"آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"تم سمجھ رہی ہو ناں۔۔۔؟" ڈیڈی کی آنکھوں میں جوش بھرا تھا۔

"یس ڈیڈی۔۔۔ میں آپ کی باتیں نہ صرف سمجھتی

ہوں بلکہ انہیں یاد بھی رکھتی ہوں۔"
"وری گڈ... ڈیڈی سرشار ہو گئے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تم میرا اثاثہ ہوٹی کے...."
اور ٹی کے کا چہرہ جگمگانے لگا۔ ڈیڈی کی محبت توجہ سب اس کے لیے تھی۔ وہ بڑی بیٹی تھی اور ماں سے زیادہ باپ کے قریب تھی۔ وہ شادی کے چھ سات برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ بقول ڈیڈی وہ بڑے انتظار کے بعد انہیں ملی تھی۔ وہ اسے صبر کا انعام کہتے۔ دعا کہتے۔ خواہش اور محبت... ایک وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ پہلے وہ ان کی شادی کے سات برس بعد دنیا میں آئی اور پھر اس کے بعد بھی مزید سات برس لگے دوسری بہن کے آنے میں... ہاں دوسری کے بعد تیسرا نمبر فوراً آیا۔ نمبر چار اور پانچ زندگی والے نہیں تھے نمبر چھوٹی کے سے اتنی چھوٹی تھی کہ بہنیں ماں بیٹی لگنے لگیں۔
اور پیار امی بھی اس سے بے پناہ کرتی تھیں۔ مگر ڈیڈی جیسا جنون نہیں تھا۔ ڈیڈی کے لیے وہ خام سونا تھی اور وہ اسے ڈھال کر اپنے سر کا تاج بنانا چاہتے تھے۔
دنیا نے بے اولادی کے طعنوں سے جگر چھلنی کیا تھا۔ اور پھر بیٹی کی پیدائش کو حقارت سے دیکھا تھا اور دنیا بھلا کون سی...
ڈیڈی کے ڈیڈی... اور ماں... اور سگے بہن بھائی۔ ماں نے عورت ہوتے ہوئے ٹی کے کی پیدائش پر ناک بھوں چڑھائی۔
بہنوں نے شکل تک نخوت سے دیکھی اور بھائیوں کی آنکھوں سے جھانکتا۔ ترحم... وہ حیران تھے۔ اور پھر بعد کی باتیں، وہ بھی کچھ نہیں بھولے۔
"میں آپ کے لیے تازہ چائے لاتی ہوں۔" ٹی کے سے ڈیڈی کے چہرے کا حزن دیکھا نہ گیا۔
"آں... ہاں... نہیں رہنے دو... اچھا لا دو... مگر پہلے یہ سب سامان اٹھواؤ یہاں سے۔" وہ میز پر پڑے تحائف کو بے زاری سے دیکھ رہے تھے۔ رسٹ واچ، چاندی کے گول بالے اور سوٹ پینٹس... اور ایک پرفیوم تھا یقیناً۔

"تحفے محبت بڑھاتے ہیں۔ مگر بعض دفعہ محبت یوں گھٹتی ہے جیسے کوئی درخت کو جڑوں سے کاٹ دے۔"

☼ ☼ ☼

سجل فریج کھولے طائرانہ جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو جھٹ پٹ لنچ بنانے میں کام آئے۔ شامی کباب تھے اور ایک پیکٹ کوفتے بھی تھے۔ مگر گندھا ہوا آٹا نہیں تھا۔ سینڈوچز کا آمیزہ تھا مگر ڈبل روٹی نہیں تھی۔
ماش کی دال کی پھلکیاں تھیں۔ مگر دہی... وہی کھٹا ہو چکا تھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔ دراصل اس کی کوئی کام کرنے کی نیت نہیں تھی۔ ورنہ وہ تو ایک انڈے سے بھی شاہی پکوان بنانے کی دعوے دار تھی اور یہ بھی تو کوئی طریقہ نہیں تھا کہ بندہ سر پر ہتھوڑے ــــ برسانے کے انداز میں بھیج دیا جائے کہ تین افراد کے لیے لنچ بھیج دو۔ (حسنین والے معاملے کی ناراضی ہنوز برقرار تھی)
"ایک فون تو کیا جا سکتا ہے ناں..."
"جی وہ کال کر رہی تھیں۔ مگر کسی نے ریسیو نہیں کی۔" بندے نے صفائی دی۔
سجل نے چونک کر سر اٹھایا "کسی کا کیا مطلب ہے، صاف میرا نام لو۔" وہ اس پر چڑھ دوڑی۔
"آپ نے خود ہی تو نام سے پکارنے سے منع کیا تھا۔" وہ بھی ادھار کا قائل نہیں تھا۔
"لیکن تم بوقت ضرورت پکار سکتے ہو۔" اس نے ترمیم کر دی خود ہی۔
"لیکن مجھے کیسے پتا چلے گا کہ یہی وہ وقت ہے۔" اسے بھی لاجواب کرنا آتا تھا۔
"یہ تم اب تک کھڑے کیوں ہو؟" سجل نے تیوری چڑھائی۔
"اس لیے کہ کسی نے بیٹھنے کے لیے کہا ہی نہیں۔"
"کسی... پھر دوبارہ کسی... صاف میرا نام لو ظاہر ہے یہاں میرے علاوہ اور کون ہے۔"

"اچھا...!" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "یعنی یہی وہ وقت ہے، جب میں نام سے پکار سکتا ہوں سجل...!"

"ہاں" یہ اعتماد تھا... یا ہٹ دھرمی یا بدتمیزی۔

"میرا نام سجیلہ بانو ہے۔ سمجھے۔" وہ تنکی۔

"جی سجیلہ بانو...!" انکار تو جیسے سرشت میں تھا ہی نہیں۔

"تو میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم تو ایسے کہتے ہو جیسے بڑے حکم کے غلام ہو۔" وہ اس سے لڑنے کو تیار ہو گئی۔

"غلام تو ہوں۔ اب تک اور آج تک آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کیا۔"

"ہائیں ہائیں... میں نے کب تم کو حکم دیے ہیں۔" وہ کمر پر ہاتھ ٹکائے کمرے کے بالکل بیچ میں عین اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔

"یہ تو آپ اپنے آپ سے پوچھیے گا۔"

"مجھے سوال و جواب کی عادت نہیں۔" اس نے گردن اکڑائی۔

"اچھا... تو اتنی دیر سے کیا ہو رہا ہے؟" وہ ادھار تو رکھتا ہی نہ تھا' اسی بات سے سجل کو اصل چڑ ہوتی تھی۔

"یہ تو میں پوچھ رہی تھی۔"

"تو میں بھی بتا رہا تھا۔"

"اچھا... اب تم جاؤ۔" اس نے رکھائی سے دروازہ دیکھا... یاد دکھایا۔

"اور وہ لنچ...؟"

"تم کہنا جب تم گھر پہنچے تو یہ بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔" اس نے ہاتھوں کو تین چار فٹ چوڑا کیا۔

"لیکن اتنا بڑا تالا تو ہوتا ہی نہیں ہے۔" وہ معصومیت سے کہنے لگا۔

"حالانکہ یہ ہونا چاہیے تم جیسوں کے منہ پر لگانے کے لیے۔"

"میں اگری کرتا ہوں واقعی بعض مونہوں پہ تالا..."

"بس...!" اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔ "تمہارے ابو کیا زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں؟" موضوع بدلا۔

"جی... جی ہاں۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"جب ہی... ویسے ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب وہ رخصت پر ہوتے ہیں اور تم ان کی جگہ پر ڈرائیونگ کے لیے آتے ہو۔ گھر کا چکر لازمی لگاتے ہو۔" اسے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ جواب تو تھا مگر کیا دینا مناسب ہوتا۔ اس نے سوال بن کر ڈٹی سجل کو دیکھا۔ موضوع بدلا۔

"تو پھر لنچ... (بیک ٹو دی ٹاپک... یہی بہتر تھا اب)

"کہا تو ہے کہہ دینا اتنا... بڑا... تا..."

"جی!" اس نے اپنے ہاتھوں سے حجم بنایا... کہہ دوں گا تالا لگا تھا۔ لیکن اگر نہ کہوں تو... یعنی سچ کہہ دوں کہ آپ نے جان بوجھ کر نہیں دیا تو؟" وہ اسے دھمکانا چاہ رہا تھا۔ پر آگے بھی وہ تھی شانے اچکا دیے۔

"تو سچ بول دینا نہیں تمہیں کب بزدل لگی ہوں۔"

"اوہ!" اس نے سر کھجایا۔ "بزدل اور وہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

☼ ☼ ☼

"امی سو گئیں؟" صندلین نے سجل کا سوجا منہ دیکھا۔

"جی ہاں...!" صندلین نے اس کا چہرہ دوبارہ دیکھا۔ امی خفا ہوتی تھیں تو وہ بھی خفا ہو کر گھومتی تھی۔ (لنچ نہ بھیج کر بدلہ بھی لیا۔ امی کو مزے لے لے کر بتایا بھی اور امی کی تادیب پر خود کو درست قرار دے کر دم لیا۔)

"نہیں۔ انہوں نے کیا کہنا تھا...؟" سجل بالوں میں لگی پنیں نکالنے لگی۔ "ان کی سنتا ہی کون ہے؟ دکھی کیا آپ نے آج انہیں۔" وہ واقعی اسے احساس دلانا چاہتی تھی۔

"انہوں نے کہا یہ..."

سجل نے اسے گھورا پھر نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کہتی نہیں ہیں مگر کیا میں بالکل بے وقوف نظر آتی ہوں کہ سمجھوں بھی ناں...؟"

اس نے نگاہ چرائی اب اس کا کیا جواب ہو۔ اس نے دھیان بٹانا چاہا نگاہیں سجل پر جار کیں' وہ سونے سے پہلے نہانے جارہی تھی۔ الماری میں سر گھسا رکھا تھا۔ کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ یونہی ادھر.... اُدھر نظر انداز کرنے کی کوشش۔

''آپ نے بہت غلطی کی؟'' وہ اسی مصروف انداز میں بولی۔

''میں نے کیا غلطی کی؟'' اسے غصہ آنے لگا۔

سجل نے پروا نہیں کی' صاف گوئی سے بولی۔ ''اپنی امی کو ناراض کیا۔ پریشان کیا دکھی کیا.... اور حسنین بھائی جان کو بھی ناراض' دکھی اور پریشان بھی۔

''حسنین کا نام مت لو۔''

''کیوں نہ لوں.... اتنے تو وہ اچھے ہیں۔ آپ نے ان کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔ کوئی ایسے بھی کرتا ہے بھلا۔'' وہ باقاعدہ مباحثہ کے لیے تیار ہوگئی۔

صندلین نے نگاہ چرائی۔ ''تم کچھ نہیں جانتیں سجل.... تم کچھ نہ پوچھو اور نہ کچھ بولو۔''

وہ جانتی تھی۔ سجل شروع جائے گی' سو سارے راستے بند کردینے مناسب سمجھے مگر آگے بھی وہ ہر امکان کو مدنظر رکھ کر بیٹھی تھی۔

''اچھا....! جیسا آپ کہیں' میں چپ ہوجاتی ہوں۔ مگر ایک بات کہے بغیر نہیں رہوں گی۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ صندلین پہلو بدل کر رہ گئی۔

پھر ایک نصیحت.... واقعہ.... کہانی اور عبرت....

اور اسے ڈرنے سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ایسا کچھ سننا نہیں چاہتی تھی جو پائے ثبات میں لغزش کا باعث ہو۔ وہ اسے روکنا چاہتی تھی۔ مگر....

''ہمارے گاؤں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ لڑکیاں نہ تو شادی کے لیے انکار کرتی ہیں نہ اقرار مگر پھر بھی شادیاں ہوجاتی ہیں۔ ادھر شہر میں آپ کے مزے ہیں نہ صرف شادی کرنے کا پوچھتے ہیں بلکہ یہ بھی پوچھتے ہیں۔ کس سے کرنی ہے۔ اس سے.... یا اس سے اور آپ کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ میں نے تو ایسا فلموں' افسانوں ہی میں دیکھا پڑھا ہے۔

وہ آپ کے بچپن کے کلاس فیلو تھے پھر کالج کے بعد پڑھنے کے لیے باہر چلے گئے۔ پھر سالوں تک کوئی خیر خبر نہیں.... اور جب واپس آتے ہیں تو پکے یقین سے کہ آپ ویسی ہی ہوں گی یعنی غیر شادی شدہ۔ وہ کہتے ہیں۔ انہیں پوری دنیا میں کوئی لڑکی آپ سے اچھی نہیں لگی۔'' وہ رکی۔

''آپ کو پتا بھی ہے۔'' اس نے آنکھیں پھیلائیں ''پوری دنیا میں کتنی لڑکیاں ہوتی ہیں۔''

صندلین کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ اور کتنے معصومیت بھرے تحیر سے پوچھ رہی تھی۔ سوال تو بنتا تھا۔ واقعی حسنین خان کو کیا کوئی نہیں ملی'

ہاں وہ بچپن کے سنگی ساتھی تھے۔ پھر اچھے ہم جماعت' اچھے پڑوسی بھی رہے۔ مگر.... حسنین خان اسے یوں یاد رکھے ہوئے تھا۔ یہ سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

''ایک بات اور بھی کہوں' بھلے آپ کو برا لگ جائے۔'' اس کی سوچوں سے پرے سجل کو ابھی بہت کچھ کہنا تھا۔

''ہمارے گاؤں میں تو آپ کی عمر کی لڑکی اول تو کنواری ہوتی نہیں اور اگر ہو تو دنیا باتیں سنا سنا کر مار دیتی ہے۔ پھر اگر کوئی کرے شادی کی بات تو ملتا کیا ہے' رنڈوے اور دوہاجو.... ایک آنکھ کے کانے' ایک ٹانگ کے لنگڑے اور اس پر لڑکی کو شکر کے ہزار نفل پڑھنے کو ماں بھی کہتی ہے۔ ساس بھی.... اور خود دولہا بھی کہ ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر اللہ سے شکرانہ کہہ کہ تجھے میں مل گیا ہوں۔

اور آپ.... آپ تو خوش نصیب ہیں۔ وہ اتنے اچھے ہیں جیسے ڈراموں کے ہیرو.... اور آپ بھی اتنی ہی پیاری ہیں جیسے....''

''ہیروئین....'' اس نے مسکرا کر اس کا جملہ مکمل کیا۔

''ہاں بالکل ہیروئین!'' اس نے سر زور سے ہلایا۔

''پھر سب سے حیران کرنے والی بات.... ادھر گاؤں میں لڑکا بھی اپنی پسند ایسے منہ پھاڑ کے نہیں بتا سکتا۔

انہوں نے آتے ہی آپ کی امی سے سب کہہ دیا۔ پھر بھی آپ مانتی کیوں نہیں؟" وہ رقیق القلبی سے بولی۔
صندلین ہنستی رہی۔
"اچھا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تو آپ کو پسند کرتے ہیں مگر آپ انہیں نہیں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔" تجل نے وہ مارا کے انداز میں اچھل کر کہا۔
"پاگل ہوئی ہو۔" وہ بزرگانہ انداز سے ہنس دی۔
"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" اس نے سر جھکا لیا' بڑی مشکل سے تو اتنا اہم خیال آیا تھا۔
"مجھے شادی ہی نہیں کرنی ہے۔"
"ہمارے ہاں تو لڑکیاں ایسے بول ہی نہیں سکتیں۔" وہ یہیں پر آکر ٹھہرتی تھی۔
"تو میں تمہارے ہاں کی لڑکی ہوں بھی نہیں۔" اس نے جیسے چڑایا۔
"مگر لڑکی تو ہیں ناں۔" اس کے جملے کی بے ساختگی.... صندلین پہلی بار چونکی اس نے کتنی سادگی سے دریا کو کوزے میں بند کیا تھا۔ آئینہ دکھایا تھا۔
"جاؤ جاکر نہاؤ.... مجھے بھی سونا ہے۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔"
صندلین نے کہتے کے ساتھ ہی تکیہ درست کرنا شروع کر دیا۔
"لائٹ آف کر دو۔" اس نے سر پہ چادر تانتے ہوئے حکیمہ انداز اپنایا۔ تجل کی شکوہ کناں نگاہیں اس پر ٹکی تھیں۔ مگر قطعی پن کے باعث ٹوک نہ سکی آگے بڑھ کر بٹن آف کر دیا۔
"ایک آخری بات بتا دیں۔" گہری خاموشی سے اس کی آخری کوشش والی آواز....
صندلین نے ٹھنڈی سانس بھری "پوچھو۔"
"کیا وہ واقعی آپ کو اچھے نہیں لگتے؟"

☼ ☼ ☼

سر تا پا تنی ہوئی چادر کے اندر سوال گونج رہا تھا اور اک جہان آباد تھا۔
کس نے کہہ دیا.... کیوں کہہ دیا۔ وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ بہت اچھا لگتا تھا اتنا کہ اس سے زیادہ اور کوئی نہیں لگا کبھی بھی۔
جب وہ بچپن کا دوست تھا۔ جب لڑکپن کا ساتھی تھا اور جب ہم جماعت تھا اور جب جب ساتھ تھا۔ سارے دوست ایک طرف' وہ ذرا ہٹ کے' احساس نہیں تھا۔ تب بھی کچھ تو تھا۔
اور اب جب اس نے آکر احساس دلایا تب بھی
وہ خصوصی توجہ دیتا تھا۔ وہ خصوصی توجہ چاہتی تھی۔
اس سے بات کرتا تھا تو آنکھیں جگمگاتی تھیں۔ اسے اچھا لگتا تھا اس جگمگ جگمگ میں اپنا عکس دیکھنا۔
وہ مسکرا کر بات کرتا تھا۔ وہ سوچتی' وہ زندگی بھر سامنے رہے۔
لیکن پھر....
بات کھلنے سے پہلے' نظر ٹکنے سے پہلے اور دل دھڑکنے سے بھی کچھ پہلے وقت بدل گیا۔ واقعات بدل گئے۔ تب خیال بھی بدل گئے۔ ارادے بدل گئے۔ ارادے بن گئے۔ اب تو بس ڈٹے رہنے کا مرحلہ تھا۔ اور یہ تھوڑا مشکل ہو رہا تھا۔
خود کو تو اس نے سمجھا لیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا اور دل کو منہ بند رکھنے کی تاکید کر دی تھی۔
مگر ان پیاروں کا کیا کرتی جو جواب حسب منشا چاہتے تھے۔
تو کہیں وہ گرتی دیوار نہ بن جائے۔ جسے بس اک دھکا اور درکار ہوتا ہے تو بس پھر ٹھیک کیا اس نے۔
سوچے ہوا' وہ منہ بند رکھے گی۔ اور گردن نفی میں ہلائے گی۔ اس نے عزم دہرایا۔
(اچھا بڑی سخت ہو صندلین خان.... تو پھر تجل کو ابھی انکار کر دینا تھا ناں کہ وہ اچھا ہی نہیں لگتا.... بے وقوف) کچی پکی نیند میں وہ ساری رات دل کو جھٹلاتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"میرے والدین کو تمہاری ماں سے میرا رشتہ کرنا پسند تھا ہی نہیں۔ امی کسی بھانجی بھتیجی کو بیاہنا چاہتی تھیں۔ تمہارے دادا کم پڑھے لکھے انسان تھے انہیں تمہارے نانا کا خود سے زیادہ تعلیم یافتہ' نپا تلا اور سلجھا ہونا پسند نہیں آیا۔

وہ میری خوشی کے لیے مان تو گئے تھے۔ میری اور تمہارے تایا کی شادیاں اکٹھی ہوئیں۔ مگر تمہاری ماں کے لیے دل میں جگہ تھی ہی نہیں.... اور بعد کے سات سال کے اولاد کے انتظار نے سارے راستے مسدود کر دیے اور بیٹی پیدا ہونے پر جو جشن میں نے منایا' اس نے آخری کیل گاڑ دی.... اور پھر بعد میں بھی بیٹیاں۔"

ڈیڈی کی ہنسی میں دوسروں کے لیے افسوس تھا۔

"سب کے بچے آس پاس کے اسکولوں میں پڑھتے تھے۔ میں نے تمہارے لیے شہر کے بہترین اسکول کا انتخاب کیا۔ جس کی ماہانہ فیس باقی سارے بچوں کی کل فیس سے بھی دگنی تھی۔ پھر وین پہ آنا جانا۔

"پھر آپ ایک اور بیٹی کے باپ بنے تھے۔" اس نے شریر انداز اپنایا۔

"تمہاری دادی کی باتیں تو میں کان دبا کر سن لیتا تھا۔" وہ حدیث و سنت اور خوف خدا کے زیر اثر آجاتی تھیں۔

"وہ گویا اپنا سر پیٹ لیتیں۔" ڈیڈی ماں کو یاد کرتے تو محبت و احترام عیاں ہوتا تھا۔ "پھر آپ نے گھر الگ کرنے کی بات کی تھی۔"

"ہاں وہ جو گھر میں ایک کچن' ایک ہانڈی والے اصول کے ہوتے ہوئے تم لوگوں سے دوسرے درجے کے شہریوں والا سلوک تھا ناں' وہ میری برداشت سے باہر تھا۔" ڈیڈی کو کچھ تلخ رویے یاد آنے لگے تھے۔ دودھ کی بوتلوں پر تنقید۔ پھل اور بوٹی کی نا منصفانہ تقسیم' خود سے کچھ کرنا چاہتے تو پھوٹ ڈلوانے والی بات احتجاج کرتے تو بھی نیا محاذ۔

پھر تربیت کا فرق.... وہ اپنی بچیوں کو بالکل الگ ڈھب سے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت پالنا چاہ رہے تھے۔

"دراصل تمہارے چچا اور ان کی آل.... باپ سر دھڑ کی بازی بھی لگائے۔ تب بھی ماحول اور تربیت ماں ہی کی بر اثر ہوتی ہے جبکہ تمہارے چچا اور تائی اور دیگر سب لوگ...."

ڈیڈی نے نپا تلا انداز اپنایا' یہ عیب جوئی نہیں تھی مگر ایک تجزیاتی رپورٹ جیسی رائے.... ٹی کے ہمہ تن گوش تھی۔

"بس کیجیے.... کیوں بچی کے دماغ میں الٹا سیدھا بھرتے رہتے ہیں۔ جو بھی تھا۔ گزر گیا اچھا برا.... وہ سب اپنے گھر میں خوش.... ہم اپنے گھر خوش.... کیا ملتا ہے آپ کو ایسے بخیے ادھیڑ کر...."

اب بھی ٹوکے بنا نہ رہ سکیں۔ کہ صبح ناشتے کے لیے دودھ نہیں تھا۔ وہ لے آتے اور لاڈلی بیٹی سے وہ رات کے برتن دھلوانا چاہتی تھیں۔ جتنی بھی قابل ہو' پڑھی لکھی ذہین.... کچھ تو ماں کا ہاتھ بٹا دے۔

ٹی کے نے احتجاج سے ڈیڈی کو دیکھا مگر وہ بے بس دکھائی دیے۔ وہ پیر پٹختی اندر گئی۔

"برتن تو ماسی بھی دھو سکتی تھی۔" بعد میں بولے۔

"جی ہاں.... میں ماسی۔ آپ مجھے بتایئے کیوں بچی کا ذہن خراب کرتے ہیں۔ وہ سب اس کے پیارے رشتے ہیں۔ وہ برتن بھی ٹکرا جاتے ہیں' انسان تو پھر نظریات و افکار رکھتا ہے' دلوں کو محبتوں سے بھرنا چاہیے' آپ نفرتوں کو ٹھونسنے لگے۔ اونہہ!" وہ اپنی کہتی چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

"امتحان پاس کر لینا سجیلہ.... بڑی امیدوں سے تمہارے دادا نے تمہیں یہاں چھوڑا ہے۔" امی نے میٹھے لہجے میں سجل کو پکارا جو پورا منہ کھولے اور آنکھیں چندھی کر کے مارننگ شو میں شادی دیکھ رہی تھی۔

"امتحان....!" میٹھے باداموں کے بیچ جیسے کڑوا بادام چبا لیا ہو اس نے۔ بصد احترام امی کو گھورا۔

"وہ تو میں پاس کرلوں گی۔ میں کبھی فیل نہیں ہوئی ہوں اماں جی۔۔۔" اس نے شان بے نیازی سے چوٹی پیچھے ڈالی۔

"کیا مطلب' سو میں سے صرف تینتیس نمبر لے کر پاس ہونا ہے۔" امی کو اس کی بے نیازی پر ہنسی آنے لگی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ میں نے پانچ سالہ پیپرز میں سے وہی سوال نکالے ہیں جو چالیس نمبر تک جائیں۔۔۔ بس۔" اس نے انہیں حیران کردیا۔

"سجیلہ۔۔۔!" امی بدقت اسے پکار سکیں۔ خود ان کی اولادیں سو نمبر کے لیے دو سو نمبر کی تیاریاں کرنے میں ہلکان رہیں ہمیشہ اور یہ۔۔۔

"اور اتنے شاندار رزلٹ کے بعد کیا کرو گی؟" امی نے دلچسپی سے پوچھا' انہیں اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ اس لیے کہ وہ بہت اچھا سامع تھی۔ یا بہت معصوم اور بے ساختہ تھی۔ کبھی بہت ہلکی لگتی تھی۔ کبھی بہت بھاری بھرکم۔

اور ہلکا ہونا اس کا اصل تھا اور بھاری بھرکم وہ سندلین کی صحبت میں رہ کر ہوئی ہو گی۔ یا پھر یہ کہ گہرائی ہر انسان کے اندر ہوتی ہے اترنے کا فن آنا چاہیے۔

"رزلٹ کا کیا کرنا ہے۔" اس کی نگاہیں اسکرین پر تھیں جہاں اشتہارات چل رہے تھے۔ "رزلٹ فریم کرواکے دیوار پر لگادوں گی تاکہ دادا کو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے نظر آتا رہے اور باقی کی زندگی وہ اس فخر کے سہارے گزار لیں کہ ایک گریجویٹ کے دادا ہو کر مرے۔"

"اف خدا۔" امی کی آنکھیں ابل پڑیں" اور وہ جو کہتے ہیں کہ تمہیں بی ایڈ کرا کے ٹیچر لگوائیں گے۔ اس کا کیا ہو گا۔"

"اف خدا!" سجیلہ کی آنکھیں بھی ابل پڑیں۔

"بی اے ہو نہیں رہا اوپر سے بی ایڈ کا تڑکا' پلیز اماں جی' آپ انہیں وہ محاورہ کیوں نہیں سنا دیتیں۔ بی اے کے بعد بیاہ ہوتا ہے۔" وہ متوحش نظر آنے لگی تھی۔

"اوہ سجیلہ بانو۔" امی نے اسے اس کے پورے نام سے پکارا تھا۔ "بی اے کے بعد ایم اے۔ ایم ایڈ پی ایچ ڈی اور۔۔۔"

"بندہ پاگل بھی ہو سکتا ہے۔" اس نے ان کی بات کو تیزی سے کاٹ کر مہر لگادی۔ امی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تمہیں پڑھائی سے اتنی بے زاری کیوں ہے۔ علم عقل دیتا ہے۔ اور آج کے زمانے میں تو علم کے بغیر ایک قدم بھی محال ہے۔ علم ہنر ہے اور ہنر کامیابی۔"

"مجھے استانی نہیں بننا۔" اس کی صدا احتجاجی تھی۔

"تو پھر کیا بننا ہے؟"

"میری تو بس اچھی جگہ شادی ہو جائے۔"

"شادی۔۔۔" امی نے یہ خواہش پہلی بار سنی تھی۔ حق دق رہ گئیں۔

"یہ کس نے کہا ہے۔؟"

"کون کہے گا۔ آپ یقین کریں اماں جی۔۔۔ وہ ان کے نزدیک آکر گھٹنے کو تھام کر لجاجت سے گویا ہوئی۔ "میرے ساتھ کی ساری لڑکیاں ادھر گاؤں میں بیاہی گئی ہیں۔ بس میرے ہی ساتھ ٹریجڈی ہو گئی۔"

اوہ۔۔۔ وہی قصہ۔۔۔ ٹوٹی منگنی' دل کا روگ۔ ازبر کہانی۔

"گھٹی چٹانے سے پہلے میری اماں نے اسے منگنی کی انگوٹھی پہنا دی کہ پیارا بھتیجا ہے۔ اس منحوس نے عین ٹائم پر اپنی خالہ کی بیٹی سے عشق کا اعلان کر دیا۔ میرا تو ہو گیا ناں بیڑا غرق۔" اسے اپنا غم جی بھر کے یاد آیا تھا۔

"ایسے رشتے زبردستی تو نہیں بنائے جاتے بیٹا! اچھا ہے۔ اس نے کہہ دیا ورنہ زندگی خوار ہی ہوتی۔ تمہاری' اس کی اور اس لڑکی کی بھی۔" امی کا لہجہ پرسکون تھا۔

"اوہ نہیں۔" وہ جھٹکے سے ان سے دور ہوئی۔ "آپ کو کچھ نہیں پتا' زندگی اب بھی خوار ہی ہے۔ میرا تو تماشا لگ گیا ناں۔۔۔ اس لیے تو دادا کے ساتھ ادھر

بھاگ آئی۔" اس کے منہ کا زاویہ بالکل بگڑ گیا تھا۔
"کیسا تماشا....؟" امی نے حلق تر کیا۔ ہر بار کیسے دل دہلاتے ذو معنی جملے بول پڑتی تھی وہ....
"حق ہا....!" اس نے کہنی صوفے پر ٹکائی اور ہاتھ پر اپنا سر گرا کر ماضی کی یادوں میں چکرانے لگی۔ ماضی جو تلخ تھا، تکلیف دہ تھا۔ افوہ ....
"ہوش سنبھالتے ہی میں اکیلی لڑکی تھی جس کا ایک عدد منگیتر تھا اور خالی منگیتر نہیں 'بانکا سجیلا منگیتر' اوپر سے پڑھا لکھا.... ہر کلاس میں فرسٹ آتا تھا مردود۔ تمیزدار، سمجھ دار...."
وہ تعریف کر رہی تھی مگر منہ یوں بنا ہوا تھا جیسے کڑوا بادام چبا رہی ہو۔
"سکھی سہیلیاں تو چھوڑیں ان کی نانیاں دادیاں تک مجھ پر رشک کرتی تھیں بلکہ رشک نہیں حسد کہیں صاف صاف.... ساری کی ساری جل ککڑیاں۔ ماموں کا پکا دس مرلے کا گھر.... موٹریں.... گیزر.... جنریٹر.... پنکھے ہائے ہائے۔ ماموں کی پکی نوکری اوپر سے اپنی زمین۔ "گاؤں کے چوہدری نہیں تھے مگر چوہدری سے کم بھی نہیں تھے۔"
"تماشا کیسے لگا؟" امی نے اسے موضوع سے ہٹتے محسوس کیا۔
"وہی تو بتا رہی ہوں۔" اس کا چہرہ پھر سے غم کی تصویر بن گیا۔
"لڑکیاں مجھ سے.... اور ان کی مائیں میری ماں سے ہوکے بھر بھر کے کہتیں۔ سجیلہ بانو کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بچپن سے رشتہ طے ہے۔ مسائل تو ان کے ہیں اوپر تلے کی چار چار لڑکیاں.... میں اکلوتی.... گاؤں میں کہاں سے ملیں اچھے رشتے۔ سارے کے سارے اوتگے بوتگے، تعلیم کے نام پر ڈنڈے کے زور پر یا پھر نقلیں مار مار کے میٹرک پاس لڑکے.... نوکریوں کا کال۔ اگر کسی کی زمین اپنی ہے تو واہی بیجی کرنے میں ناک کٹتی کہ اس دن کے لیے پڑھایا لکھوایا تھا۔
اب ایسے ویلے نکموں کو کون دے گا لڑکیاں.... اور ایسے میں میرا منگیتر۔ اف...." پینٹ شرٹ پہن کر جب کالج جاتا.... یا کالج سے آتا۔ سب کے سینوں پر سانپ لوٹ جاتے۔ میں بھی اور میری اماں بھی.... دونوں بے فکری سے لوگوں کے مسئلے اور تعریفیں سنتے۔ بھئی ہم کیا کر سکتے ہیں اگر باقی دنیا کو مسائل ہیں۔ ہمارے لیے تو دنیا چین ہی چین تھی۔ مگر آہ...."
اس نے ایک لمبا ہوکا بھرا اور سر تھام لیا۔
"جس منگیتر کا مجھے غرور تھا۔ جس کے نام پر میں شو مارتی تھی۔ اس نے مجھے ایسی مار ماری کہ کیا کوئی سانپ سوتے میں ڈنک مارتا ہوگا۔"
"کیا کیا اس نے سجیلہ بانو؟" امی بمشکل بولیں، دل توہمات میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی تمہید ہی ختم نہیں ہو رہی تھی۔
"کرنا کیا تھا...." اس نے دھاڑ لگائی۔ امی کا ہاتھ اپنے دل پر جا کر رکا آنکھیں بھی ابلیں.... سجل ہی کو اپنے لہجے کی تندی کا اندازہ ہوا، خود پر قابو پانے کے لیے لمبا سانس لیا اور آواز بالکل مدھم کرکے ڈرامائی انداز میں سر جھکا لیا۔
"مجھ سے شادی سے انکار کر دیا۔"
"وہ کیوں؟" امی نے کبھی اتنی تفصیلی گفتگو اس موضوع پر کی نہیں تھی۔
"کیوں کو چھوڑیں اماں جی! کیوں میں کیا رکھا ہے۔ کر دیتا شادی سے انکار...." اس نے لاپروائی سے فضا میں ہاتھ چلایا "مگر منگنی نہ توڑتا۔"
"ہائیں!" امی کا منہ آخری حد تک کھل گیا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟" انہیں لگا انہیں مغالطہ ہوا ہے۔
"وہی کہہ رہی ہوں جو آپ نے سنا.... شادی نہیں کرنی تھی نہ کرتا مگر منگنی۔ افوہ...."
اس کی سرد آہوں نے ماحول یخ بستہ کر دیا تھا۔ اپنے غم میں ڈولی کو ان کے تاثرات کی پرواہ نہیں تھی جو اسے پاگل سمجھنے میں حق بجانب تھیں۔
"منگنی تو میرا غرور تھی ناں اماں جی.... جو میں نے آٹھ نو سال کی عمر سے کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور میری انگوٹھی.... ہائے میرا امتیازی نشان۔ میرا غرور چھین لیا اس نے.... سارے گاؤں کو مجھ پر ہنسنے اور باتیں بنانے

کی آزادی دے دی اور وہ لڑکیاں جو بظاہر میرے غم میں برابر کی شریک تھیں۔ میرے ساتھ اجتماعی بددعاؤں میں شرکت کرتی تھیں۔"

"اجتماعی بددعائیں...؟" امی نے اپنی ستر بہتر برس کی زندگی میں یہ جملہ پہلی بار سنا تھا۔ اجتماعی دعا... نہیں اجتماعی بددعائیں... نون غنہ کو جتنا مرضی کھینچ لیں۔

"دل میں ان کے لڈو پھوٹ رہے تھے اور یہی نہیں، منگنی میری ٹوٹی تھی، حالات ان کے بدل گئے جیسے میری منگنی نے ان کی راہ میں روڑے اٹکا رکھے ہوں۔ سال سے بھی کم وقت میں...." اس نے چٹکیاں بجائیں۔

"آدھیوں کے رشتے طے ہو گئے۔ آدھیوں کے بیاہ... اور میں، جس نے سب سے پہلے بابل کی گلیوں کو چھوڑنا تھا، وہیں کی وہیں رہ کر سہیلیوں کی باراتیں دیکھتی رہ گئی۔ ہائے۔"

"لیکن اس نے منگنی کیوں توڑی؟" امی کو اصل بات کا اتنا علم نہیں تھا۔

"حق ہا!" اس کے چہرے پر استہزاء آن ٹھہرا۔ "وہی بکواس جو سب کرتے ہیں "بچپن کی منگنی کو نہیں مانتا۔ مجھے میری ہم مزاج، پڑھی لکھی شریک حیات چاہیے جو قدم سے قدم ملا کر چل سکے۔ کوئی بندہ پوچھے۔ میری کب ٹیسٹ ٹرانسمیشن لی اس نے کہ میں قدم سے قدم نہیں ملا سکتی۔ پیچھے رہ جاتی ہوں یا آگے بھاگ پڑتی ہوں، نرے فضول کے بہانے.... صاف صاف کہتا... پڑھائی کے نام پر اپنی خالہ کے گھر رہتا تھا، وہیں آنکھ مٹکا ہو گیا۔"

"اوں ہوں... اچھے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔" امی نے ٹوکا۔

"نہیں اماں جی...!" اس کا سر نفی میں ہلا۔ "جب دل پر چوٹ لگتی ہے ناں تب الفاظ بھی برے اور ننگے ہو جاتے ہیں، آپ کو نہیں پتا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ کہاں تو سارا قصہ مسکراتے چہرے اور ہنستی آواز میں کسی مزاحیہ داستان کے سے انداز میں بے پروائی سے یوں سنا رہی تھی جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور کہاں....

"اوہ سجیلہ بانو....!" امی نے آگے ہو کر اسے خود سے لگا لیا... اس کے دادا کی زبانی یہ معاملہ سن تو رکھا تھا۔ مگر اس کی زبانی سننے سے اس کرب کا اندازہ بھی ہوا، جو وہ چھپائے ہوئے تھی۔

"رو رہی ہو... تم تو بہت بہادر بچی ہو۔"

"ہو گئی اماں جی... شروع شروع میں تو سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا۔ لوگ کیا کہتے ہیں، کیوں کہتے ہیں۔ تو جواب کیسے دیتی۔"

"تمہاری ماں نے ماموں سے کچھ نہیں کہا؟"

"پہلے لڑ پڑیں... پھر رونے لگیں پھر منت بھی کر آئیں۔ اور آخر میں اعلان کیا، ٹھیک ہے بھائی، تم چڑھاؤ بیٹے کی بارات اور ڈالو بھنگڑے، میں نہیں بیاہوں گی سجیلہ بانو کو...."

"یہ کیسی بے وقوفی کی بات کی بھئی؟" امی بری طرح چونکیں۔

"جب ہی تو کہتی ہوں، مجھے پڑھانے لکھانے کا خیال دل سے نکال کر سیدھی سیدھی شادی کی بات کریں۔" وہ دوبارہ شریر انداز سے گویا ہوئی۔ امی مسکرائیں۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز اور شکستہ چہرے نے چند لمحے پہلے دل کو بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔

"شادی تو اللہ کے حکم سے وقت پر ہی ہوتی ہے۔" انہوں نے سادگی سے کہا۔

"مگر انسان کوشش تو کرتا ہے ناں۔"

"ہاں..." امی کی نظر غیر مرئی نقطے پر ٹک گئی۔ دھیان کہاں سے کہاں چلا گیا۔

"آپ کہاں کھو گئیں؟" اب شگفتگی کی تحریر وہ پڑھ رہی تھی۔

"آں، کہیں نہیں۔" وہ لوٹیں۔ "شادی تو ہو جائے گی مگر پڑھائی بھی ضروری ہے۔"

"دل نہیں کرتا۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"اور وہ جو تمہارا منگیتر تھا وہ... کیا کرتا ہے۔"

"کیا کرے گا۔ تین سال سے اسپتالوں کے چکر کاٹتا ہے۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"اللہ خیر... اسے کیا ہو گیا؟" امی کا دل کانپا۔

سجل نے چونک کر ان کی شکل دیکھی پھر ہنستی چلی گئی۔

"آپ کیا سمجھیں 'میری بد دعاؤں میں اثر آگیا۔ ہاہاہا اتنی بھی پہنچی ہوئی نہیں ہوں۔"

"تو پھر.... کیوں چکر کاٹ رہا ہے وہ اسپتال کے۔" امی کی تو سوئی اٹک گئی تھی۔

"تین سال میں تین بچے اور ایک دو ابارشن والا آدمی۔ گھر میں ٹک ہی کیسے سکتا ہے اماں جی...."

"اوہ سجیلہ....!" پہلے امی کا منہ حیرت سے اور پھر ہنسی سے کھلتا ہی چلا گیا۔

"کنواری لڑکیاں ایسے منہ پھاڑ کے بات نہیں کرتیں۔" انہوں نے تنبیہہ ضروری سمجھی۔

"میں نے تو کچھ نہیں کہا' جو ہو رہا ہے۔ وہی بتا رہی ہوں۔"

"ہاں پھر بھی...." امی مصر تھیں۔ "دیکھو ناں۔ کوئی سنے تو کیا سوچے۔"

"سوچنے دیں.... سننے دیں۔ آپ صرف سامنے ٹی وی پر دیکھیں۔ بچ ایک بار میرا رشتہ جڑ جائے۔ میں نے طے کر لیا ہے' شادی کسی مارننگ شو کے زیر انتظام ہی کرواؤں گی۔"

"کیا؟" امی کی گردن جھٹکے سے ٹی وی کی طرف گھومی۔ جہاں مہندی کے حوالے سے عجیب و غریب رسمیں متعارف کروائی جا رہی تھیں۔

"بے وقوف ہو تم.... سیدھا سیدھا محنت سے امتحان دو۔ ٹیچر بن کر علم کی روشنی پھیلاؤ۔"

"اور شادی....؟" اس کی آواز پھٹی۔

"وہ اپنے وقت پر ہو جائے گی۔"

"اور دولہا.... وہ کہاں سے آئے گا۔"

"اللہ نے کوئی نہ کوئی تو تمہارے لیے بھی رکھا ہو گا۔ ہر چیز کا جوڑا ہوتا ہے۔" وہ رسانیت سے کہہ رہی تھیں۔

"اچھا....!" اس کی آنکھیں چمکیں۔ "ہر چیز کا.... اچھا.... لیکن یہ بھی تو ہوتا ہو گا' کسی کسی کا نہیں بھی ہو۔" اس کے پرامید لہجے میں خدشہ سا کھل گیا۔ امی سختی سے تردید کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا سر انکار میں ہلا بھی.... مگر پھر خود بخود جھک سا گیا۔ ہاں بعض کا جوڑا نہیں بھی اتارا ہوتا۔

اور وہ جوان کو منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ غیر محسوس انداز سے نظریں چرا گئی "ہاں بعض کا نہیں بھی.... جیسے۔" اس نے سر جھٹکا۔

خاموشی کا شور ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔ امی کا دھیان نجانے کدھر جا کر ٹک گیا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر آواز بڑھا دی۔

"دلہن بنتی ہیں.... ہائے نصیبوں والیاں...."

"اوہ...." امی کے چہرے پر غم نمودار ہو گیا تھا۔ انہوں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ تیزی سے چینل ہی بدل ڈالا امی اٹھ رہی تھیں۔ اچھی خاصی مزے کی باتوں کا انجام....

"تھوڑا لیٹوں گی۔"

اس نے سر ہلایا۔ یہ ان کے لیٹنے کا ٹائم تو نہیں تھا۔ مزے سے ٹی وی کے سارے چینل سرچ کرتے ہوئے سجل سے باتیں کیا کرتی تھیں' خود کی بیٹھکر بیٹی تو تو سے پانچ تک غائب ہوتی تھی۔

اس نے ریموٹ اٹھا کر پھر سے ٹی وی لگا لیا۔

اب اسکرین پر مہندی کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔ وہ اشتیاق کی ماری ذرا نزدیک ہو بیٹھی جبکہ امی کی نگاہیں تو اسکرین پر جم گئیں' مگر سچ یہ تھا کہ غائب دماغی کی حالت میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

ٹی کے کی گریجویشن پارٹی اس کے کارناموں کے حوالے سے دی جانے والی سب سے بڑی پارٹی تھی۔ مہمان اتنی تعداد میں تھے کہ شادی ہال بک کروانا پڑ گیا۔

ٹی کے کا چہرہ اعتماد و خوشی سے کھلا ہوا تھا اور اس سے کہیں زیادہ روشنی ڈیڈی کے چہرے پر تھی۔ وہ جوہری ثابت ہوئے تھے جنہوں نے ہیرے کی صحیح پرکھ کی تھی۔ ان کا جگمگاتا انمول سکہ....

ڈیڈی' ٹی کے کا ہاتھ پکڑے ہر خاص و عام سے

ملاقات کر رہے تھے۔ ٹی کے تمغہ تھی جسے وہ سب کو دکھانا چاہتے تھے۔

اور ڈیڈی کے ڈیڈی کا چہرہ... یعنی دادا جان کا چہرہ... اور دیگر ددھیال والوں کا چہرہ حیرت کی تصویر تھا۔

کون بھلا یوں اپنی جوان بیٹی کو دوستوں کی محفل میں گھسائے پھرتا ہے۔ ددھیال والوں کو یہ اندازہ تو تھا کہ ٹی کے نے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے مگر ڈیڈی کی سیلبریشن نے حیرانی سے دوچار کیا۔

اتنے خرچے پر تو تو بیٹی کی بارات نبٹا دیتا۔" دادی نے کہہ ہی ڈالا۔

"بارات...!" ڈیڈی یوں اچھلے جیسے ماں نے سر پر ڈنڈا مارا ہو۔ "کس کی بارات...؟"

"ہاں ٹی کے بڑی بیٹی ہے پہلے اسی کی کرے گا ناں... نمبر دو والی سے تو بہت فرق ہے عمر میں..."

ڈیڈی کی نگاہ بیٹی پر ٹک گئی۔ با اعتماد کامیاب بے نیاز بلکہ... بلکہ...

ماں کہہ رہی تھیں۔ بارات۔ لاحول ولا... ڈیڈی نے بد مزہ ہو کر اپنے خاندان کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ سب جلوس بنا کر مجھے یہ مشورہ دینے کے لیے آئے ہیں۔" ڈیڈی کی اچھنبے سے بھری آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔

"ہاں!" دادی کی آواز صاف اور بیٹے کی ہی طرح بلند تھی۔ ان کی باقی اولادیں خاموش بیٹھی تھیں اور صاف ظاہر تھا سب ان کے طرف دار ہیں۔ دادا جی کی گہری خاموشی بھی تائید کا مظہر تھی۔

"تو پھر میں یہ کہوں گا مشورے کا شکریہ۔" ڈیڈی دادا کے مؤدب بیٹے نہیں رہے تھے وہ اب ٹی کے کے ڈیڈی تھے۔ ٹی کے جو گرد و پیش سے انجان ہاتھ میں انگریزی اخبار کھولے کسی خاص سطر کو آنکھیں چندھی کر کے دیکھتی ہوئی ڈیڈی کے سر پر آ کر کھڑی ہوئی۔

"آپ نے دیکھا ڈیڈی! آج کا نیوز پیپر... یہ ہائیر ایجوکیشن والوں کا نوٹیفکیشن ذرا دیکھیے تو... عجیب ہی بات... اوہ..."

وہ انگلی کے اشارے سے کچھ دکھا رہی تھی۔ ڈیڈی کے پاس نزدیک کا چشمہ نہیں تھا ان کے معذوری ظاہر کرنے پر وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور ساری خبر فر فر پڑھ ڈالی۔ دادا کو پہلی بار کسی انہونی کا احساس ہوا۔ یہ لہجہ و آواز ٹھہراؤ اور روانی تو سات بجے کی انگریزی خبریں پڑھنے والی شائستہ زیدی کی ہو بہو کاپی تھی۔

انگلش پڑھتے وقت اس کی بھنویں اور ہونٹوں کی حرکت بھی کسی انگریز جیسی تھی۔

وہ پتلی نہیں تھی موٹی بھی نہیں تھی۔ مگر ایک تندرست کسا ہوا جسم کھلے ہاتھ پیر گورا رنگ بہت بڑی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک تو تھی مگر اک کرختگی بھی قدرتی طور پر موجود تھی جسے بے نیازی اور غرور نے بڑھا کر پوری شخصیت پر حاوی کر دیا تھا۔ مقابل کو ٹھٹکا دینے اور ٹھہرا دینے والا تاثر اور دادی دادا دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ جو بات وہ کرنے والے تھے۔ جو ارادہ وہ باندھ کر آئے تھے۔

ڈیڈی کے جواب سے پہلے ہی انہیں اپنا سوال ہلکا لگنے لگا۔

ایسی ہی کیفیت دوسروں کی بھی تھی۔ سب سے زیادہ بے چینی بڑی بھابھی کو ہونے لگی کہ وہ اٹھ ہی جانا چاہتی تھیں۔ ادھر باپ بیٹی سب کی حالت سے بے خبر انگلش لب و لہجہ میں اس خاص خبر پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ڈیڈی فکر مند لگتے تھے اور تشفی کروا رہے تھے۔ بیٹی غصہ تھی۔ اس نے حکومت کے لتے لیے اور پھر پیر پٹختی چلی گئی جاتے جاتے وہ یقیناً" گالیاں دے رہی تھی۔ لہجے سے سب کو یہی محسوس ہوا۔

"جی اماں! آپ کچھ کہہ رہی تھیں۔" ڈیڈی نے چشمہ لگاتے ہوئے توجہ سے نوازا۔

"لڑکی بیاہ کی عمر کو پہنچ گئی ہے۔ کچھ سوچا کہ نہیں۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ گریجویشن کے گولڈ میڈل کو توا بنا دوں جس پر وہ روٹیاں تھوپے۔"

"تو کیا شادی نہیں کرنی اس کی۔۔۔" بڑا بھائی پہلی بار بولا۔

"بالکل نہیں۔۔۔ ابھی تو کم از کم ہم ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"ہم۔۔۔" دادی نے چائے کی ٹرالی لاتی بہو کو دیکھا۔ (اسی کی محبت نے بیٹے کو جسمانی و روحانی طور پر اپنے خاندان سے الگ کیا تھا)

"ہم سے مراد۔۔۔ میں اور میری بیٹی ٹی کے۔۔۔" ڈیڈی ماں کا چہرہ پڑھ رہے تھے۔

"ٹی کے۔۔۔ تو کیا اس سے پوچھے گا؟ اس کا کیا کام ان معاملات میں بولنے کا؟" دادا کو جلال آیا۔

"وہ ان معاملات میں نہیں بول رہی۔ اس کی دنیا الگ ہے۔ اس کی زمین الگ ہے۔ اس کا آسمان کوئی اور ہے ابا۔۔۔"

"تو اس کسی اور جہان میں لڑکیاں لنڈوری پھرتی ہیں، گھر بار نہیں بساتیں۔" دادا کا دماغ الٹ پڑا۔ دادی سمیت سب نے گھبرا کر دیکھا۔ "یہی مناسب عمر ہوتی ہے لڑکی کی شادی کی۔"

"اور اتفاق سے یہی عمر ہوتی ہے۔ لڑکی کی پڑھنے لکھنے، کچھ بننے کی۔۔۔" ڈیڈی نے چبا چبا کر کہا۔

"ارے تو کیا بنے گی ڈاکٹر، پائلٹ، وزیراعظم۔" دادا کے لہجے میں بے یقینی۔۔۔ جتاتا ہوا استہزا نمایاں تھا۔

"مگر یہ کیا؟" ڈیڈی نے پہلو بدلا۔ ذرا اور آرام دہ انداز نشست متانت سے مسکرائے۔

"تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ بن جائے گی۔ بلکہ آپ بتائیے کیا بنے۔ ڈاکٹر، انجینئر اس لیے کہ آپ کی نسل کے اور کسی بچے نے تو آپ کو اس فرمائش یا خواہش کا موقع دینا نہیں ہے۔ صرف ٹی کے یا میرے باقی بچے ہیں جو۔۔۔"

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ سب ہی بچے اسکول کالج جاتے ہیں۔ کوئی کم نمبر لاتا ہے کوئی زیادہ۔۔۔ ماشاء اللہ سے فیل تو کبھی کوئی ہوا نہیں۔"

کب سے برداشت کرتی تلقین کی ماری بڑی بھابھی کا صبر ختم ہو گیا۔

"آپ غلط نہیں کہہ رہی ہیں بھابھی جان۔۔۔ مگر آپ کا مسئلہ پتا ہے کیا ہے۔" آپ نے گھر کے حوض کو ہی زمین کا تین حصے پانی سمجھ لیا ہے۔ جبکہ ہماری نظر سمندر پر ہے۔ سمندر سمجھتی ہیں ناں آپ۔۔۔ ادھر کلفٹن پر۔۔۔"

بھابھی پہلے سمجھیں نہیں پھر احساس توہین سے ان کا چہرہ بدلنے لگا۔

"اس طرح سے کیوں بول رہے ہیں آپ۔۔۔" بیگم کو گڑبڑ ہونے کا احساس ہونے لگا۔

"تو کیا ساری زندگی گھر پر بٹھائے گا لڑکی کو۔۔۔؟" دادا اصل معاملے پر لوٹے۔

"اللہ نہ کرے۔" ٹی کے کی امی کو ہول اٹھا۔ ڈیڈی نے بدمزہ ہو کر اپنی بیگم کو اور پھر اپنے ڈیڈی کو دیکھا۔

"کس نے کہا ساری زندگی بٹھاؤں گا جب وقت آئے گا۔"

"ارے تو آ گیا ناں وقت۔۔۔ بیس کی ہو رہی ہے لڑکی!" دادا نے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ایک منٹ۔۔۔" ڈیڈی چونکتے ہوئے۔ "آپ۔۔۔ یہ آپ سب کا انداز مشورہ دینے والا تو لگ نہیں رہا یہ تو فیصلہ کرنے والا انداز ہے۔ ارادہ کیا ہے؟"

"کیا ارادہ ہونا ہے ہم خاندان کے بڑے ہیں۔ تو سارے خاندان سے کٹ کر الگ دنیا بسائے بیٹھا ہے تو کیا۔۔۔ ہم تو تیری فکر سے انجان نہیں اور ایک لڑکی تو ہے نہیں، پوری لائن لگی ہے پیچھے۔۔۔"

دادی نے اصل بات کہنے کے لیے تمہید باندھی۔

"تیری لڑکی کے لیے رشتہ دے رہے ہیں ہم۔۔۔"

"آپ۔۔۔" ڈیڈی یوں اچھلے جیسے کسی نے ڈنک مارا ہو۔

"ہاں، ہم سے مطلب ماشاء اللہ سے لڑکوں سے بھرا گھر ہے۔ سارے ہی تیرے بھانجے، بھتیجے ہیں۔ اپنا خاندان، اپنا خون۔۔۔"

"تیرے خیالات کو دیکھتے ہوئے ایک تو صبیحہ کا بیٹا صائب ہے اور دوسرا اس کمال کا لڑکا۔ مقیم۔ جس پر

دل چاہے ہاتھ رکھ دے۔ کوئی ناراضی شکوہ...."

"صائب.... وہ جو میڈیکل اسٹور چلاتا ہے۔ ڈیڈی چلائے۔ اور مقیم جو ہر مہینے جا کر باپ دادا کی دکانوں کا کرایہ وصول کرنے کے علاوہ اپنی کار دوڑائے پھرتا ہے۔ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ ان جیسوں کو دوں گا۔"

"اتنی حقارت سے کیوں بات کر رہے ہو۔ حق حلال کماتے ہیں اور اپنی ہی دکانوں کا کرایہ لیتا ہے کوئی فقیر تو نہیں.... نوٹوں میں کھیلتا ہے۔" مقیم کی ماں یعنی بڑی بھابھی نے ڈھلکا دوپٹا درست کیا' بس اب وہ چپ نہیں رہ سکیں تھیں۔

"تمہیں اندازہ ہے ہم کیا کہہ رہے ہو۔" بڑے بھائی نے بھی صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ جبکہ دادا پر تشنجی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔

"بکواس۔" ڈیڈی کھڑے ہو گئے۔ امی متوحش سی سب کو دیکھ رہی ہیں۔ تیزی سے سسر کے لیے پانی کا گلاس بھر کر پکڑانا چاہا۔ مگر انہوں نے نفی میں انکار کرتے ہوئے گلاس پر ہاتھ مار دیا۔ پانی ادھر گلاس ادھر۔

دادی متوقع نگاہوں سے ڈیڈی کی صورت دیکھنے لگیں کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے باپ کی دل جوئی کریں گے۔ مگر ڈیڈی کٹھور اور اجنبی ہو کر کھڑے رہے۔ بڑی امیدیں لے کر آنے والا یہ جلوس ناامید ہو کر گھر کو لوٹا۔

☆ ☆ ☆

"میں نے کہا تھا ناں ٹی کے! یہ سب فضول لوگ ہیں۔" امی کے خیال میں ان سب باتوں سے بچوں کا بے خبر رہنا ہی ضروری تھا۔ دوسرے انہیں ڈیڈی کے رویے نے بھی دکھی کیا تھا۔

"بیٹیوں کے باپ اس لہجے میں بات نہیں کرتے۔" وہ بدبدا کر رہ گئیں۔

"کیوں؟" وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ "تم بھی جہالت کی باتیں کرو گی' صد افسوس۔"

"جہالت نہیں حکمت.... مقام.... موقع.... بیٹیاں تو بادشاہوں نے بھی دے دیں۔"

"ہاں!" ڈیڈی نے سر اٹھایا۔ "بالکل.... بادشاہوں کو ہی دیں۔ یہ کیوں بھول گئیں۔"

"دنیا بھری پڑی ہے قابل لڑکیوں سے۔ ایک سے ایک ہیرا...." امی نے سر جھٹکا۔

"کیسی ماں ہو۔ اپنی بیٹی کو عام لڑکی کہہ رہی ہو۔" ڈیڈی نے طعنہ مارا۔

"لڑکیاں تو عام ہی ہوتی ہیں۔" امی کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"ٹی کے نہیں ہے۔" ڈیڈی نے دعوا کیا۔

"ایک اکیلی ٹی کے ہی آپ کی بیٹی نہیں ہے۔" امی کے چہرے سے ناگواری چھلکی۔

"انہیں ٹی کے کہنا پسند نہیں تھا۔ مگر منہ پر چڑھ گیا تھا (سن سن کر) اچھا خاصا نام بگاڑ دیا تھا۔ عجیب پاگلوں والا لاڈ۔ ہونہہ....

معلوم ہے مجھے.... ڈیڈی نے اپنی رسٹ واچ اتارنی شروع کر دی۔ یہ اشارہ تھا گفتگو لپیٹ دی جائے۔ وہ سوئیں گے۔

"یہ شادی' عمر' مناسبت' سب سطحی باتیں ہیں بیٹا.... اور تم بلندیوں کی راہی ہو۔ خبردار جو ذرا سا لڑکھڑائیں تو.... بڑی ترغیبات للچائیں گی مگر تم نے نگاہ سیدھی رکھنی ہے۔ قدم تیز' دماغ روشن.... تم عام لڑکی نہیں ہو ٹی کے!"

یہ ساری بحث چائے پیتے ہوئے ٹی کے سے شیئر کی جا رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں ڈیڈ...."

پہلے صرف فرماں برداری والی اثبات ہوتی تھی مگر اب اس میں سمجھ داری کا تڑکا لگ گیا تھا۔ اور کچھ عرصہ مزید گزرا تب اثبات اور سمجھ سے ہٹ کر فیصلہ بن گئی۔ پہنچ سے دور تو پہلے بھی لگتی تھی۔ اب ناقابل تسخیر بھی لگنے لگی۔

مگر یہ نہیں تھا کہ ہاتھ بڑھانے والے نہ ملے' مگر جھنڈا کوئی بھی گاڑ نہ سکا۔

وہ بہت آگے نکل گئی۔ ڈیڈی ہم قدم تھے پیٹھ ٹھونکنے والے۔ داد دینے والے اب اس کی جگہ عمر کے اس مقام پر دوسرے بچے آگئے۔

باقی اپنی ایک الگ شخصیت و خیالات رکھتے تھے۔ ٹی کے اور وہ باپ بیٹی دو انسان ہوتے ہوئے بھی ایک تھے۔ جبکہ باقی سب اپنے مزاج سے پلے بڑھے۔

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں آپ کیسے گزارا کرتی ہیں اس ایف ایم ریڈیو کے ساتھ..." پانی کے دو گلاس چڑھا لینے کے بعد وہ شکایت نامہ لے کر تسلی سے صندلین کے سامنے بیٹھی۔

"میں تو نہیں سنتی ایف ایم۔" وہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

"اوہ...! آپ کے ڈرائیور صاحب کی بات کر رہی ہوں۔"

"اچھا... ارمان!" صندلین نے لمبا کھینچا۔ "مگر وہ تو خاموش طبع سا لڑکا ہے۔"

"وہ اور خاموش طبع..." وہ اچھلی "خاموشی کا مطلب تک نہیں جانتا... سوتے میں بھی بولتا ہوگا۔ مجال ہے جو پل بھر کو بھی چپ رہے۔ ہر بات کا جواب لازم ہے جیسے۔"

صندلین مسکرائی۔ "باتونی ہونے کا الزام تو پھر سوال پوچھنے والے پر بھی آنا چاہیے۔" "وہ نہ پوچھے۔"

"اُفوہ... میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ اب کیسے سمجھاؤں۔" وہ بھنا کر اٹھ گئی۔

"چائے میرے لیے بھی لانا۔" صندلین نے ہانک لگائی۔

"لا رہی ہوں۔" اس کے دو لفظوں سے بھی ناراضی آمیز الجھن عیاں تھی۔

ارمان... صندلین کے ڈرائیور کا بیٹا تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ اصل ذمے داری صندلین کو بینک لانے لے جانے کی ان ہی کی تھی۔ مگر کبھی کبھار جب اسے کہیں اور بھی جانا ہوتا تو وہ آجاتے تھے مگر کچھ عرصہ سے وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ لہٰذا جب کبھی حاضر نہ ہو پاتے تو بیٹا گاڑی لے آتا۔ اور پہلے یہ آنا کم تھا۔ مگر اب اکثر ہی ہونے لگا۔ اس کے ابو زیادہ بیمار رہنے لگے تھے۔

سجل کو اس سے خاصی شکایتیں تھیں یا پھر چڑ تھی" اسے خود نہیں معلوم تھا۔

اسے دیکھتے ہی سجل کی تیوری چڑھ جاتی۔ ناک سکڑ جاتی۔ ہونٹ بھنچ جاتے یعنی سارے چہرے کی ہیئت بدل جاتی۔

وہ ہنس کر بات کرتا تو سنجیدہ ہونے کا کہہ دیتی۔ سنجیدگی اوڑھ لیتا تب پہلو بدلتی۔ وہ بھی کمال کا بندہ تھا۔ چابی والا گڈا بن جاتا۔ ادھر شروع میں اس کی تابع داری پر پرسکون ہو جانے والی کو بعد میں یہی تابع داری کھلنے لگی۔ اتنا فرماں بردار کیوں ہے یا پھر ہے نہیں بس بنتا ہے۔ کیوں بنتا ہے۔ یہ بھی دھوکے کی ایک قسم ہو گی۔

مگر سجیلہ بانو... اب سجیلہ بانو نہیں رہی "سجل" بن چکی ہے۔ (خود ہی نام بدل لیا تھا) اب فریب نہیں کھائے گی۔

اس کے منگیتر نے بھی تو آخری وقت تک خود کو منگیتر ہی شو کیا تھا۔ اپنی پھپھی یعنی سجیلہ کی امی کے ہاتھوں کا زردہ اور سجیلہ کے ہاتھوں کے پکوان اور دودھ پتی ملائی مار کے بلند آواز سے خدا حافظ کہہ کر گیا تھا اور اگلے دن ہونہہ... نمک حرام... چینی حرام "گھی پتی" پان تک حرام کر گیا۔

ذرا جو شبہ ہونے دیتا۔ تو نمک کی جگہ کچھ اور ہی گھول دیتی۔ کاش وہ پہلے سے جان جاتی... منگیتر کے دل کا حال۔ اس سے پہلے کہ وہ چھوڑتا۔ یہ انگوٹھی منہ پر مار آتی۔ مگر یہ سب تو کاش کی خواہش تھی وہ اپنی دلی کیفیت سمجھ نہیں پاتی تھی۔

اللہ جانے دل کیا چاہتا تھا۔

چولہے پر چائے کا پانی کھولتا رہا... ادھر دماغ کی کھولن بھی بڑھتی گئی۔ اور صرف یہی کیوں اسے سارے مرد برے لگتے تھے۔

پتا نہیں اسے کیا ہو جاتا تھا۔

"تمہاری شادی تو کبھی نہیں ہو سکتی **سجیلہ** پھر!"

امی نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"کیوں؟" اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"جب مردوں سے اتنی بے زاری ہے۔ تو شادی تو مرد سے ہی کرتے ہیں ناں۔

"اوہ... وہ... وہ تو میں خوب ٹھوک بجا کر کروں گی۔ اس کی آپ فکر نہ کریں۔" بڑا پر یقین جواب آیا۔

امی کو دیکھ کر رہ گئیں۔

✡ ✡ ✡

صندلین لیپ ٹاپ گود میں رکھے فیس بک پر مصروف تھی۔ جب وضو کے گیلے چہرے کو دوپٹے سے تھپتھپاتے ہوئے آستین نیچے کرتی تجل واش روم سے برآمد ہوئی۔

وہ کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ بک ریک... دراز تکیے کے نیچے... اللہ جانے کہاں چلی گئی۔

"اوہ... !" بالآخر یاد آ گیا۔ وال فکسچر پر رکھے فوٹو فریم کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی جیبی سائز کی کتاب... اس کے سکھ کے سانس پر صندلین نے چونک کر دیکھا۔ "ہائیں!"

سیاہ جلی حروف میں یہ باکمال وظیفوں کی کتاب تھی۔

"جب ہی تو سوچوں عشاء تو اس نے امی کے ساتھ ادا کی تھی۔" اگلے ہی پل اس کے ہونٹ شرارتی انداز سے سکڑ گئے۔

"اسی لیے دن رات پڑھنے کے لیے کہتے تھے کہ کتاب اٹھا کر دیکھ لو۔ کوئی حرف بھی یاد رہے گا تو امتحان میں کام آئے گا۔ مگر اس وقت سن کون رہا تھا۔ سو نصیحتوں میں سے ایک بھی سنی ہوتی تو آج امتحان میں پاس ہونے کے لیے وظیفوں کا سہارا نہ لینا پڑتا۔"

اتنا طویل طنزیہ ہنکاروں سے بھرا یہ پیراگراف دراصل صندلین بی بی کی بہ آواز بلند خود کلامی تھی۔ مگر حیرت اس پر ہوئی کہ پیاری تجل نے کوئی رسپانس نہ دیا۔

انجان بنی جائے نماز بچھاتی رہی۔

اس نے میگزین کے سرورق پر تکیہ رکھا۔ فوٹو فریم کو پلٹا دیا۔ دو رکعت نماز کے بعد دعا کرنے کا وظیفہ تھا۔

"چار بار مجھ ناچیز نے، دو بار امی نے نمبرز کا اندازہ لگا کر دیکھ لیا۔ ٹوٹل تین سوال کر کے آنے والے کے نمبر تینتیس آجائیں۔ یہی بہت ہے۔"

اس وقت آپ نے جان چھڑاتے ہوئے فرمایا تھا۔ کوئی بات نہیں اور اب یہ وظیفہ۔"

صندلین نے لیپ ٹاپ اٹھا کر سائیڈ پر رکھا۔ اتنی طویل خاموشی...

"کیا وظیفہ کی شرط ہے 'بولنا نہیں ہے۔" صندلین نے پوچھا۔

تجل نے خشوع خضوع کے لیے آنکھیں موند لیں۔

"زیادہ زور انگریزی کے لیے ڈالنا۔ اس میں تم نے سارا پرچہ حل کرنے کے باوجود کچھ نہیں کیا۔"

"اب تو پیپرز چیک ہو چکے تجل... بلکہ رزلٹ بھی آل موسٹ تیار ہو چکا ہے۔ اب وظائف سے کیا حاصل..."

صندلین نے گال بیڈ پہ ٹکا دیا شدید ترین مایوسی کی حالت... دوسری طرف تجل کی استقامت خوب تھی۔ مجال ہے۔ جو چہرے پر ایک بھی تاثر آنے دیا ہو۔

صندلین خود سے شرمندہ ہو گئی۔ وہ ہم کلام تو اللہ سے تھی۔ خواہ مخواہ اسے چھیڑنے کے چکر میں شیطان بن کر درمیان میں ٹانگ اڑاتی رہی۔ سجل بی بی نے دعا والے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ پھر اپنے گریبان میں اور دونوں شانوں پر باری باری پھونکیں ماریں۔

"کس نے کہا کہ میں اس امتحان میں پاس ہونے کے لیے رات کے تیرہ بجے وظیفے کروں گی۔" وہ دھاڑی تھی۔

"رات کو تیرہ۔۔۔" اس کا مخصوص جملہ تھا۔ بہت زیادہ رات ہو جانے پر وہ گھڑیال کی حد سے آگے اپنی خود کی گھڑی گھڑ لیتی تھی۔

"تو پھر کس لیے؟" اس کا لہجہ اور چہرہ اچنبھے کی تصویر بن گیا۔

"یہ تو شادی ہو جانے کا آزمودہ وظیفہ ہے۔" اس نے عقیدت سے کتاب کھول کر دیکھی اور پھر کتاب کو سینے سے لگا کر آنکھیں موند کر جھومنے لگی۔

"کیا۔۔۔؟" صندلین کی صدا چیخ سے مشابہ تھی۔

"شادی کا وظیفہ۔۔۔"

"جی ہاں!" وہ تسلی سے جائے نماز لپیٹنے لگی۔

"کیا کرنے لگی ہو؟" اسے تسبیح پکڑتے دیکھ کر وہ بے ساختہ بولی۔

"گیارہ ہزار مرتبہ ورد کروں گی۔" وہ تسبیح سینے سے لگا کر جھوم گئی۔

"اس سے کیا ہوگا۔" وہ ہونق پن سے بولی۔

"شادی۔۔۔" سجل نے جذب سے آنکھیں موند لیں۔

"پھر شادی۔۔۔" اس نے سر پیٹا۔

"پھر۔۔۔ کا کیا مطلب ہے۔۔۔ ایک ہی شادی۔۔۔ وہی ہو کر نہیں دے رہی اور کتنی شادی۔۔۔؟" اس نے الٹا سوال جڑ دیا۔ "اور ہاں اب آپ مجھے مخاطب مت کیجئے گا۔ بڑا جلالی وظیفہ ہے۔ جلا کر راکھ کر دے گا۔"

"کسے۔۔۔ دولہا کو۔۔۔" صندلین کو مزہ آنے لگا۔ گول تکیہ گود میں رکھ کر آگے پیچھے ہلنے لگی۔ جبکہ سجل بھونچکی رہ گئی۔

"دولہا کو آگ۔۔۔ اللہ نہ کرے۔۔۔" دل کانپ کر رہ گیا۔ صندلین کا احترام کرتی تھی۔ وہ عمر میں بڑی تھی اور رتبے میں بھی۔۔۔ کہا ہوتا نا کسی برابر والے نے ایسا بدشگونی والا جملہ۔۔۔

سجل نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے رخ پھیر لیا۔

"ویسے یہ آئیڈیا کس کا ہے؟" صندلین نے پیچھے سے پکارا۔ "وظیفے والا۔۔۔"

"میرا ہی ہے اور کس کا ہونا ہے۔" منہ ہنوز دوسری طرف تھا۔

"یہ ہی شک تھا مجھے۔۔۔" صندلین نے افسوس سے اس کی پشت کو گھورا اور دوبارہ لیپ ٹاپ سنبھال لیا۔

"ایک بار میرا کام ہو جائے نا۔ تو پھر آپ کے لیے بھی کروں گی۔"

"کیا۔۔۔؟" صندلین کا دھیان کانوں میں ہینڈز فری لگانے پر تھا۔

"یہ ہی شادی والا وظیفہ۔" وہ عقیدت و یقین کی انتہا پر تھی۔

"کیا۔۔۔؟" صندلیں زور سے دھاڑی۔ ٹھاک سے لیپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کر دیا۔

"خبردار۔۔۔ اور تم بیچ میں بولیں کیوں۔۔۔؟ بھول گئیں، بڑا جلالی وظیفہ ہے۔ دلہن کو بھی آگ لگا دے گا۔ پھر کہو گی گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے۔۔۔"

صندلیں کمرے سے نکل گئی۔ سجل کی خوف کے مارے ٹانگیں کانپنے لگیں۔ یہ کیا غلطی ہو گئی اس سے۔۔۔

☆ ☆ ☆

صبح دونوں کے موڈ سنجیدہ اور ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا لگتے تھے۔ سجل کے وظیفے نے اس کی ظاہری شخصیت پر ایک رات ہی میں اثر ڈال دیا تھا۔

وہ نماز کے انداز میں خود کو دوپٹے میں لپیٹے ہوئے تھی۔ ناشتا کرنے سے پہلے اپنے پانی کے گلاس میں بھی

کچھ پڑھ کر پھونکا۔ بے نیازی سی بن کر بیٹھی صندلین نے بے ساختہ اپنے ناشتے کو گھورا۔ اگر جو اس میں بھی چند پھونکیں ماری ہوں تو۔ اس نے غیر محسوس طریقے سے امی کا چائے کا کپ اپنے نزدیک کرلیا۔ مگر امی نے دیکھ لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو... میری چائے...؟"

"کوئی بات نہیں، میں پھیکی پی لوں گی۔"

"مگر میں میٹھی کیوں پیوں۔" امی نے اپنا کپ واپس لیا۔ صندلین نے جواب کے بجائے سجل کو گھورا۔

"اب اسے کیوں دیکھ رہی ہو... ناشتا ختم کرو، گاڑی آتی ہوگی۔" امی کی نظریں وال کلاک پر تھیں۔ صندلین نے بھی گھڑیال دیکھا۔ موڈ بری طرح خراب ہوگیا۔ صبح کی چائے کے معاملے میں وہ نشئی تھی۔ وہ بھی آج اس سجل کی وجہ سے حرام ہوئی۔ اس نے تیز آواز سے کرسی گھسیٹی اور کھڑی ہوئی۔ امی کی گردن اس کی سمت اٹھی۔

"کدھر...؟"

"آفس..."

"اور ناشتا...؟"

"مجھے نہیں کرنا پھونکوں، وظیفوں والا ناشتا..." بالآخر ضبط کا خاتمہ ہوا۔

"اوہ..." امی کی پرسکون بے نیازی سی سانس نے اس کی حیرت اور پھر طیش میں اضافہ کردیا۔

"وہ تو اس نے اپنے لیے کیا ہے بھئی..."

"تو آپ واقف ہیں؟" اس کی بھنویں مل گئیں۔

"ہاں تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور یوں بھی اپنے لیے خود دعا کرنے سے جلد قبول ہوتی ہے۔"

"یعنی اس کی ان پاگل پن والی حرکتوں کو آپ کی حمایت حاصل ہے۔" اس نے انگشت شہادت سے باری باری دونوں کو نشانہ بنایا۔

"لو... میں نے ہی تو اسے وظیفوں کی کتاب ڈھونڈ کردی ہے۔" امی نے اطمینان سے کہا۔

"اوہ..." صندلین کی پہلے آنکھیں پھٹیں، پھر اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر چھت کو دیکھا۔ تب ہی گاڑی کا ہارن بجا۔ کہنے سنانے کو بہت کچھ تھا، مگر وہ پیر پٹختی باہر کو نکلی۔

"ارے فائلز تو لے جاؤ۔" امی کی صدا پر واپس پلٹنا پڑا۔ سجل کے چہرے پر نظر پڑی۔ جان ہی جل گئی، رات ورات اس کے چہرے سے جلال و کمال ٹپکنا شروع ہوگیا تھا اور سنجیدگی و بے نیازی... اف...

صندلین کا دل سکڑا اور اگر اس کا وظیفہ صندلین کے حق میں قبول ہوگیا تو اور تو کے بعد کی بے چینی سے وہ سارا دن تڑپتی تھی۔

اللہ جانے... قبولیت کے احساس یا پھر خدشے نے دل کو ڈرا دیا تھا۔ اللہ نہ کرے جو... قبول ہو اور اللہ نہ کرے کہ قبول نہ ہو۔

☼ ☼ ☼

بازپرس کا موقع ہی نہ ملا۔ گھر پہنچی تو بے تحاشا ہنسی کی آواز نے چونکا دیا۔ اگلے پل وہ سرپٹ اندر دوڑی۔ اوہ... اتنا پیارا سرپرائز... اس کا گمان درست تھا، یہ بے تحاشا کھلکھلاتی ہنسی آپو جانی کی تھی۔ وہ کب آئیں اور یوں اچانک... وہ بھاگتی ہوئی ان تک آئی اور ان کے کھلے بازوؤں میں سماگئی۔

"گھر یاد آرہا تھا۔ ادھر لوگ..."

"آپ بہت پیاری ہوگئی ہیں۔"

"یہ پھولوں کے دیس میں رہنے کا اثر ہے۔" وہ مسکرائیں۔ سب نے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ ایبٹ آباد کے کیڈٹ اسکول کی پرنسپل تھیں۔

"تو ہمیں بھی ساتھ لے جائیں، کراچی میں رہ رہ کر تو ہم کلفٹن کی ریت کی طرح ہوگئے، سیاہ اور چپ چپ کرتے۔"

"اوہو! آپو جی ہنس پڑیں۔" بھئی۔ ساتھ لے جانے والی بات رہنے دو۔ تم اپنا ہنی مون منانے آنا۔"

"ہنی مون..." وہ چونکی اور نگاہ مسکراتی امی پر اٹھ گئی جو تائیدی انداز میں خوش گمانی سے سر ہلا رہی تھیں۔ سجل کا چہرہ بھی اس آئیڈیے پر کھل گیا تھا۔ اوہ... تو یہ کوئی سرپرائز نہیں تھا پلان تھا... اسے

پریشرائز کرنے کا۔۔۔

"میں چینج کر کے آتی ہوں۔" اس نے آپو جی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"پتا نہیں اب تک امی کیا کیا نہ کہہ چکی ہوں گی اور وہ سجل اس نے تو کسی ڈراما رائٹر کی طرح ساری اسٹوری جزئیات سے سنائی ہوگی' بلکہ کسی ڈائریکٹر کی طرح پورے کا من میں پھر پھر کے وضاحت بھی دی ہوگی۔ کاش وہ انہیں سمجھا سکتی کہ یہ سب باتیں کم از کم آپو جی کو بتانے کی تو بالکل نہیں تھیں۔"

وہ اپنے طیش پر قابو پانے کے لیے نہ جانے کتنی دیر نہاتی رہتی' مگر سب چائے پر اس کے منتظر تھے۔ باہر آنا پڑا اور آتے ہی اس اوزار کو ڈھونڈنے کی خواہش میں اس کی آنکھیں تھک گئیں' جسے وہ اپنے سر پر مار سکے یا پھر باقیوں کے۔۔۔

آپو جی سجیلہ بانو کے وظائف کو سراہ رہی تھیں اور وہ کسر نفسی سے سر جھکائے سن رہی تھی۔ امی اپنی صفات بتا رہی تھیں۔ کیسے انہیں یہ آئیڈیا آیا اور اوپر سے سجیلہ بانو جس نے فرماں برداری کی حد کر دی۔ ان شاء اللہ مراد بر آئے گی۔ صندلین نے کھنکھار کر اپنی موجودگی ظاہر کرنی چاہی۔

"اور اس پڑھائی کا کیا ہوگا' جس کے لیے اس کے دادا نے بہت اعتماد سے اسے یہاں چھوڑ رکھا ہے کہ پڑھے لکھے ماحول میں اس کا بھی کچھ بن جائے۔"

جملے سادہ تھے' مگر ہر لفظ پر دانت کچکچانے کی آواز سب کو سنائی دی۔ مگر مجال ہے' جو سجل پر رتی بھر اثر ہوا ہو۔ اس کے جواب پر جہاں امی اش اش کر اٹھیں۔ وہاں صندلین کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

"پڑھائی کا کیا ہے' وہ تو شادی کے بعد بھی پوری کی جا سکتی ہے۔ اماں جی کہتی ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ گود سے گور تک علم حاصل کر سکتے ہیں۔"

الفاظ تو واقعی امی کے تھے۔ گود سے گور تک۔۔۔ مگر انداز۔۔۔ صندلین نے مٹھیاں بھینچیں اور آپو جی کو دیکھا۔ جو ایسی متانت سے ٹھوڑی گریبان میں گھسائے ہوئے تھیں۔ جیسے اشفاق احمد کو سن رہی ہوں۔

☆ ☆ ☆

کیش کاؤنٹر پر بل بنواتے ہوئے صندلین نے سر جھٹکا اور محتاط سی سانس بھری۔ مخصوص کلون کی مہک یاد بن کر سانسوں سے الجھنے لگی تھی۔ دل عجیب سی کیفیت میں گھرنے لگا۔ یاد آنے لگی۔ دکھ ہونے لگا۔ پچھتاوا سا۔۔۔ گلہ سا اور غصہ بھی۔۔۔ کوئی ایسے بھی خفا ہوتا ہے کہ راستہ بدل لے اور نظر آنا بند کر دے۔

اس نے منہ موڑا تھا۔ اس کے پاس تو وجہ تھی نا۔۔۔ تو اس نے پیچھے آنا بھی چھوڑ دیا۔ پکارنا بھی۔۔۔ یہ تو اسلاف کی روایتوں کے خلاف ہے۔

عشق کے دعوے دار تو پتھر کھاتے ہیں۔ کتوں سے کپڑے نچواتے ہیں۔ مگر روش نہیں بدلتے کون سنگ دل خود پر پوری بوتل چھڑک کر آگیا تھا۔ وہی خوشبو جو حسنین خان کے جانے کے تین دن بعد تک درودیوار سے لپٹی رہتی تھی۔

"اف۔۔۔!" اس نے کیش کاؤنٹر کے لڑکے کو دیکھتے ہوئے سر جھٹکا۔۔۔ اوہ۔۔۔ اس کے بالکل پیچھے۔۔۔ بالکل پیچھے حسنین خان پورے کا پورا۔۔۔ اصل والا خود کھڑا تھا۔۔۔ خوشبو کا منبع بن کر۔۔۔

اس کا دل دھڑکا۔۔۔ پھر ایک مدھرلے پر تھرکنے لگا۔ وہ بل کے چکروں میں پھنسی تھی۔ جبکہ آپو جی اور سجل ذرا فاصلے پر کھڑی جوس کے مزے لوٹ رہی تھیں۔

"اللہ کرے یہ ان کو۔۔۔ اور وہ ان کو نہ دیکھے۔"

اس نے چور نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ اپنے دھیان میں گم تھیں۔ پھر اپنے پیچھے کھڑے امتحان کو۔۔۔ کیا اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ پر یہ کیسے ممکن ہے۔ انتظار کی لائن میں لگے لوگ اپنے سے آگے والے کو لازمی دیکھتے ہیں۔ لیکن آج اس نے نہیں دیکھا' ورنہ یہ کہاں ممکن ہے حسنین خان۔۔۔ صندلین کو دیکھے اور۔۔۔ مخاطب نہ کرے۔

"اوہ۔۔۔ حسنین تم۔۔۔" یہ چہکتی' بلکہ شادی مرگ

ٹھاری جیسی آواز آپو جی کی تھی۔
"اللہ حسنین بھائی جان!" خوشی سے بے حال یہ سجیلہ بانو کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔
"السلام علیکم!"
"وعلیکم السلام! آپ کب آئیں آپو جی۔۔۔ کوئی اطلاع ہی نہیں۔"
"میری اطلاع نہیں یا تم غائب ہو۔" انہوں نے اس کے غائب ہونے کی کہانی سنادی۔
"بس کبھی کبھی یوں ہی دل چاہتا ہے۔ ساری دنیا سے کٹ جائیں۔" (ہائیں)
"اوہ۔۔۔ اتنی مانتے ہو دل کی۔۔۔"
"تابع دار جی۔۔۔" وہ ادا سے سینے پر ہاتھ رکھ آپو جی کے سامنے جھکا۔ آپو جی نے ہنس کر اسے سراہا۔
اور اب یقیناً "مجھے کھوجے گا اور پانا کیا مشکل۔۔۔ گردن گھمالے بس۔۔۔ پھر نئی آزمائش۔ خوشی سے چمک اٹھنے والا چہرہ بولتی آنکھیں۔۔۔ ذو معنی جملے۔۔۔ (اتنی مثالیں خواہ مخواہ وقت کا ضیاع۔۔۔ سیدھا سیدھا کرنے والی بات۔ دل و جان سے نثار ہونے لگتا۔)
مگر وہ آج منہ پکا ہی رکھے گی۔ ذرا الفت نہ دے گی۔ مبادا وہ پھر نئی امیدیں پال لے۔ اس نے فیصلہ کیا اور پُرسکون ہو کر ان تینوں کی جانب گھوم گئی۔
"اور صندلین؟" حسنین نے جیسے اسے اب دیکھا۔ (ڈٹی رہنا صندلین، خبردار جو کسی خوش فہمی کا راستہ کھلا چھوڑا تھا۔)
"کیسی ہیں آپ۔۔۔؟"
آپ۔۔۔؟ صندلین کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔ وہ آپ کب سے ہو گئی اور ادھر وہ اتنی عزت سے پکار کے آپو جی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ یعنی نظر انداز کر دیا۔ اتنی ذلت۔۔۔ ذلت نہیں دکھ۔۔۔
دکھ مگر کیوں۔۔۔؟ تم ہی نے تو کہا تھا کہ۔۔۔ اسے تھوک نگلنا مشکل ہو گیا۔ اب وہ اسے دیکھے جاتی تھی جو جی جان سے آپو جی کی طرف متوجہ تھا۔

☼ ☼ ☼

کیسے اداس، بے بس اور ناکام سے دن تھے۔ رات اترتی تو لوٹنے کا نام نہ لیتی۔ دن چڑھتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ امی کی شوگر ہائی تھی اور اس بات کو سوچ سوچ کر بی پی ہائی ہو جاتا تھا کہ اتنے پرہیز کے باوجود۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔؟
تجل کا رزلٹ دور تھا اور اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ پروا تھی، غم تھا تو اس بات کا وظیفوں کا اثر۔۔۔ آخر کب ہو گا۔ اس نے وظیفے۔۔۔ بدل بدل کر کرنے شروع کر دیے۔
ادھر صندلین کی زندگی سے چین رخصت ہو گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے کانوں میں چند الفاظ گونجتے اور "آپ کیسی ہیں صندلین۔۔۔؟"
آپ۔۔۔ اتنا تکلف۔۔۔
کیسی۔۔۔ اسے جاننے پہچاننے کے دعوے کرتا تھا۔ پھر کیسی، کیوں پوچھا۔ اتنی اجنبیت۔۔۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھتے۔۔۔
اور ہیں۔۔۔ وہ تو ہمیشہ سے ہو۔۔۔ تھی۔۔۔ اس نے اسے کیوں اتنے ادب سے پکارا۔۔۔ اسے اس کی بے ادبی اچھی لگتی تھی۔ (یہ انکشاف بھی اب ہی ہوا۔)
اور سب کچھ بھول سکتی تھی۔ مگر اس نے اسے صندلین پکارا۔۔۔ وہ تو اسے ہمیشہ صندلی کہتا تھا۔
نون پر نقطہ کیوں لگایا۔ اسے لگا نقطہ نہیں بھالا ہے جو سینے میں عین دل کے مقام پر گر گیا۔
کیوں پکارا تم نے مجھے صندلین۔۔۔ صندلین تو میں دنیا کے لیے تھی۔ پہلے اس کا دل رو رہا تھا۔ پھر وہ خود بھی رو دی۔
اور دیکھو ذرا۔۔۔ کہاں تو اس کی نظریں۔۔۔ صندلین کے قدموں سے بے آواز بلی کی طرح بندھ جاتی تھیں اور اس دن اس نے اسے یوں نظر انداز کیا جیسے گناہ لکھے جانے کا ڈر ہو اور اس نے تازہ تازہ توبہ کی ہو۔ اور اوپر سے وہ جملہ۔۔۔ جب تجل نے پوچھا۔
"آپ کہاں سے اتنے پیارے پھول لاتے تھے۔ کتنے دنوں سے ہمارا گلدان خالی ہے۔"
"تمہیں چاہئیں تو میں لادوں گا۔" وہ شفقت سے مسکرایا۔ "مگر بالکل ویسے کی شرط مت لگاؤ۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"دراصل وہ باغ ہی اجڑ گیا جس کی شاخوں پر محبت کے سرخ گلاب اگتے تھے۔ اب تو بس ٹنڈ منڈ کانٹوں کا جھاڑ ہے۔ سوچنے ہی سے انگلیوں میں چبھن ہونے لگتی ہے اور اب سے جانے کی ہمت نہیں ہے۔"

"اتنی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہے ہو حسنین۔۔۔؟" آپو جان نے پوچھا۔

"مایوسی کی تو نہیں۔۔۔ کار دل بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ قدم چلنے سے انکاری ہیں۔ اپنی لاچاری پر خود پر ترس آتا ہے۔ عشق نے ہم کو نکما کر دیا۔ ورنہ۔۔۔ چٹکی بھر زہر پھانک کر پڑ جاتے۔"

"تو ایسی غلط جگہ پر دل لگایا کیوں؟" آپو جان نہ جانے کیا جاننا چاہتی تھیں۔

"اس وقت اندازہ نہیں تھا۔ پتھر سے سر ٹکرا رہا ہوں۔"

اور اس کے بعد اس نے ان تینوں کو آئس کریم کھلائی اور بہت سے کھلے پھولوں والا گلدستہ سجل کو لے کر دیا۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنے بہت سے رنگوں کے بیچ سرخ گلاب کہیں نہیں تھے۔

اتنی باتوں میں سے ایک بات اس سے نہیں کی تھی۔ اس کے لیے نہیں تھی۔

اتنے سارے بلند آہنگ قہقہے۔۔۔ اور اس سے مروت بھی نہیں نباہی۔ ہاہ۔۔۔ آہ۔۔۔

☆ ☆ ☆

سجل کے چہرے پر غم کی گہری تحریر تھی۔ بظاہر چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک آدھ جملہ بھی ہو جاتا مگر تینوں نفوس کا دھیان اس کی جانب تھا۔ جو چائے سے بے نیاز ٹھوڑی پر ہاتھ جمائے چھت کے ڈیزائن کو حفظ کر رہی تھی۔ تینوں خبریں ہی دل و جان پر ستم کا باعث بنی تھیں۔ منگیتر کے گھر چوتھے بچے کی پیدائش۔۔۔

"یعنی محبت پنپ رہی تھی۔ دے ثبوت پہ ثبوت۔۔۔ یہ ہی حال رہا تو گاؤں میں انسان کم رہ جائیں گے، یہ ہی نمونے گھومتے دکھائی دیں گے۔" اس نے کہہ بھی دیا اور پھر مراقبے میں چلی گئی۔

شدید فکر مندی کے عالم میں چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر غم غلط کرتے سجل کے دادا۔۔۔ پوتی ضدی کبھی نہیں رہی تھی۔ مگر اس ایک منگیتر والے معاملے پر۔ انہوں نے تو عقل پکڑنے کے لیے یوں ہی خواہ مخواہ خبر دی تھی۔ یہ نہیں معلوم تھا۔ وہ مراقبے میں چلی جائے گی۔

"اور آپ کہتی ہیں، میں منگیتر کے گناہ معاف کر کے آگے بڑھ جاؤں۔" اس کے ذہن میں نہ جانے کیا چل رہا تھا۔ یک دم امی کو مخاطب کر لیا۔

"میری ہم جولیوں میں سے یہ آخری لڑکی ہے جو بیاہی جا رہی ہے اور میں آپ کو انگلیوں پر گنوا سکتی ہوں۔ اس تین سال کے عرصے میں گاؤں کی لڑکیاں تو چھوڑیں بھیڑیں، بکریاں تک بیاہی گئیں۔ بس ایک میرے سوا۔"

"ہاں ویسے مجید صاحب! یہ سوچنے والی بات ہے ضرور۔۔۔" امی سجیلہ کے دادا کو بہت عزت سے مخاطب کرتی تھیں۔

مجید صاحب نے ایک نظر پوتی کو دیکھا، پھر نگاہ چرا لی۔ امی نے اچنبھے سے سجل کو دیکھا۔ چونکی صندلین بھی تھی۔

"بتا دیں دادا! جب اتنی باتیں بتا دیں تو یہ بھی بتا دیں۔"

"کیا واقعی کوئی وجہ ہے؟" امی چونکی ہو کر متوجہ ہوئیں۔ دادا نے پھر نگاہ اٹھائی، پھر سے جھکائی۔ سجل کے چہرے پر ایک استہزا آمیز اجنبیت در آئی۔

"دراصل۔۔۔" دادا نے لب کھولے۔ "ادھر گاؤں میں منگیتر چھوڑنے کا رواج ہی نہیں ہے۔ غیرت کا معاملہ ہوتا ہے۔"

امی نے سر ہلایا۔ "ہاں۔ یہ تو ہے۔"

"قتل و غارت ہو جاتی ہے۔ لڑکی کو ساری عمر اپنی ماں ہی کے گھر میں رہنا ہوتا ہے۔"

"تو زبردستی ہے کیا؟" امی نے منہ بنایا۔ دادا نے نگاہ سامنے ٹیبل پر جمادی۔

"اپنی بات پوری کریں دادا!" سجل کے لہجے کا طنز درودیوار تک کو اپنی لپیٹ میں لے گیا۔

"زبردستی کی بات نہیں ہے۔ پھر اس لڑکی کو کوئی بیاہتا نہیں ہے کہ اس کے نام کے ساتھ اتنے سال کسی اور کا نام جڑا رہا۔ تو یہ دوسرے مرد کی غیرت کا معاملہ بن جاتا ہے۔"

"اللہ!" امی نے سٹپٹا کر صندلین کو دیکھا جو صوفے پر آگے سرک آئی تھی۔ دونوں کی نظریں سجل کی طرف اٹھیں۔ جس کے چہرے کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھنا اب دل گردے کا کام تھا۔ وہ دوبارہ گال ہاتھ پر ٹکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ جیسے اندر موجود لوگوں سے گفتگو سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" امی نے صندلین کو دیکھا۔ "یہ وہ مطلقہ کی تو پھر مٹی پلید ہو جاتی ہوگی۔" صندلین نے نکتہ پکڑا۔

"مطلقہ...؟"

"طلاق والی عورت..." امی نے ناگواری سے وضاحت دی۔

"اوہ!" دادا نے سکون کا سانس بھرا۔ "طلاق والی بات تو کبھی ہوئی ہی نہیں اور بیوہ سے کر لیتے ہیں۔ اس کا برا نہیں مانتے۔ مگر منگنی ٹوٹنے سے لوگ لڑکی کو مجرم سمجھتے ہیں۔"

"سجیلہ نے نہیں چھوڑا اسے۔ اسی کو کوئی اور اچھی لگ گئی۔" امی کی آواز بلند ہوئی۔

"یہ کوئی نہیں سوچتا۔"

"گولی ماردینی چاہیے تھی اسے۔" امی کو قتل جائز لگنے لگا۔

"مارنی تو چاہیے تھا، مگر میں بڈھا' ہاتھوں میں جان نہیں تھی۔ پھر وہ اس کی ماں کا سگا اکلوتا بھتیجا تھا۔ اس نے بڑوں کے سامنے زندگی بھر منہ نہ دیکھنے اور نہ کھانے کی قسم کھائی اور اپنا فیصلہ اللہ کے سپرد کر دیا۔"

"تو آپ ماردیتے گولی دادا..." صندلین بولی۔

"آپ کا تو سگا اکلوتا بھتیجا نہیں تھا نا۔"

"صحیح کہہ رہی ہے..." امی بھی اس کی ہم خیال ہو گئیں۔ "اپنے علاقے کا کلچر جانتے بوجھتے ہوئے اس نے ایسا قدم اٹھا کر ایک لڑکی کو زندہ درگور کر دیا۔ اسے جتنی بھی سزا دی جائے کم ہے۔"

"غضب خدا کا اتنا ظلم... وہ بھی سب کچھ جانتے بوجھتے۔" اس نے سجل کو دیکھا۔ جو کھڑکی سے باہر دیکھنے کے بجائے چبھتی' مگر مسکراتی نگاہوں سے دادا کو دیکھنے لگی تھی۔ دادا' پوتی کی نگاہ ملی تو دادا نے نظر جھکالی۔

"بتادیں دادا... آپ یہ بھی نہیں کرسکتے۔"

"کیوں... کیوں بھلا...؟" صندلین نے تیزی سے پوچھا۔ وہ اس سے کم پر اب راضی نہ ہوتی گویا۔

"وہ صرف اس کی ماں کا اکلوتا بھتیجا نہیں ہے نا۔ میرے بھائی کا اکلوتا پوتا بھی تو ہے۔"

"یعنی یہ کہ... وہ دادا کے بڑے بھائی کے بیٹے کا بیٹا ہے۔ خاندان کا اکیلا وارث... اسے گولی ماردینے کا مطلب ہے اپنی نسل کو ختم کر دینا۔ یہ بے وقوفی بھی کوئی کرتا ہے بھلا..."

"اوہ میرے خدا!" امی بھونچکی رہ گئیں۔ الفاظ صندلین کے بھی گم ہو گئے تھے۔ دونوں کی نظریں مجرم بنے دادا سے ہوتی سجیلہ بانو پر آکر رک گئیں۔ ایسی ناانصافی... ظلم... نہیں موقع شناسی...

حرفوں اور لفظوں کی سیاہی نے اس کے صبیح چہرے کو ہولناک بنا دیا تھا۔

"بات یہاں ختم نہیں ہوتی اماں جی...!" چہرے کے برعکس اس کا لہجہ کھنکتا ہوا تھا۔ دونوں نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ پیارا سا مسکرا رہی تھی۔ مگر یہ کیسی مسکراہٹ تھی۔ جس میں آنکھیں گیلی تھیں۔ صندلین کا دل کرلایا۔ "اتنی آسانی سے معاف نہیں کیا میری اماں نے بھتیجے کو۔ اس کے نکاح کے چھوہارے بانٹنے کے بعد تھیلا جھاڑ کر رکھتے ہوئے ایک چھوہارا اپنے منہ میں رکھا۔ اور ایک دنیا کے سامنے قسم کھائی کہ وہ اب بھی اپنی بیٹی کو بیاہے گی

نہیں۔ وہ تاعمر منگیتر کے نام پر بیٹھی رہے گی۔"
"اوہ نہیں۔۔۔" امی کے سارے وجود پر رعشہ سا اتر آیا۔
امی کی ڈبڈبائی نگاہیں اس کے چہرے پر نظر پڑنے سے چھلک گئیں۔ "یہ تو بھی بتایا ہی نہیں۔"
"تم اتنا سارا ہنس کیسے لیتی تھیں؟" صندلین نے بھی پوچھا۔
"تھیں کا کیا مطلب۔۔۔ ابھی بھی تو ہنس رہی ہوں۔" وہ کھلکھلائی۔
"کس طرح؟" صندلین کی آواز پھٹ رہی تھی۔
"اس طرح کہ شادی نہ کرنے کی قسم میری ماں نے کھائی ہے۔ میں نے نہیں۔۔۔ گاؤں کے لوگ نہ پوچھیں۔ بے جرم سزا دیں' تو دیتے رہیں۔ میں اماں کے قول کی ذمہ دار نہیں۔۔۔ میں کیوں کسی کے نام پر بیٹھوں۔ وہ مر گیا ہوتا تو قبر پر جا کر بیٹھ جاتی۔ مگر اس نے مجھے جیتے جی مارنے کی کوشش کی ہے۔ شادی تو میں کر کے رہوں گی۔ آپ دیکھیے گا۔ قسم سے۔۔۔"
اس کا مخصوص پر یقین لہجہ اور شگفتگی عود کر آئی تھی۔ امی نے صندلین کو تصدیق طلب نگاہ سے دیکھا۔ تو اس نے ان کا ہاتھ دبا کر تشفی کرا دی۔
سجل کے دادا کھڑے ہو گئے۔ انہیں آج بھی ناکام لوٹنا تھا۔ دو سال پہلے وہ اسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اس کی خاموشی۔۔۔ یا اس کا شور دونوں ناقابل برداشت تھے۔ عضو معطل کی طرح گھر کے کسی کونے میں پڑی رہتی۔ دوسری طرف اس گھر کا سکون۔۔۔
اسے سب سے شکوے تھے' مگر ماں سے سب زیادہ' اس پر خوشیوں کے دروازے بند کر کے وہ اپنے بھائی اور بھتیجے سے کیسا انتقام لینا چاہتی تھیں۔ انہیں احساس ہوتا تو سب کچھ جانتے بوجھتے ایسا قدم اٹھاتی ہی کیوں۔ ہم کیوں چاہتے ہیں' دوسرے ہماری فکر کریں۔ ہماری قربانیاں دیکھیں۔ ایثار کو سراہیں یا پھر یہ ماں کی خود اذیتی تھی۔ صدمے کی انتہا نے انہیں عقل و شعور سے محروم کر دیا تھا۔
دادا کے لیے یہ بڑا مشکل وقت تھا' کسے مورد الزام ٹھہراتے۔ وہ بڑی اپیا کے پیون تھے۔ بڑی افسر' رعب دبدبہ۔۔۔ سب کی جان نکلتی تھی۔ غصہ تو ان کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ بس مجید صاحب کی بزرگی کا لحاظ کرتی تھیں جو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی روز دفتر آ جاتے۔ میڈم کا بیگ اٹھاتے' فائلز و دیگر سامان۔۔۔
"گھر رہ کر کیا کروں' حکومت پنشن تو دیتی ہے نا۔ مفت میں تو کام میں کرتا نہیں' ویسے بھی گھر میں رہوں تو اور مصیبت۔۔۔"
پھر مصیبت بھی بتا دی۔ ظاہر ہے' میڈم نے تاسف سے سر ہلایا۔ اور وہ سب کہا اور کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جو وہ کر سکتی تھیں یا کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے نزدیک اول تو منگیتر کے ہجر میں جوگ لینا ہی بے وقوفی تھی اور منگیتر کو اگر وہ چاہیں تو وہ اسے درخت سے الٹا لٹکا کر جوتے لگوا سکتی ہیں۔ بے ہودہ قسم وارادے پر وہ سجیلہ بانو کی ماں کو کفارے کے نام پر سر پر اخروٹ توڑنے کی سزا دے سکتی ہیں۔
اور سب سے اہم اور آخری بات جس پر انہوں نے فوری عمل درآمد کا نوٹیفکیشن جاری کیا۔ وہ سجل کے لیے تھا۔ "منگیتر' منگنی' رسم و رواج پر لعنت بھیج کر وہ خوابوں سے نکل کر عملی زندگی گزارے۔ بارہ جماعت پاس ہے۔ تو جوہ کرے۔ پھر ٹیچر ٹریننگ کورس کرے تو وہ خود سائن کر کے اسے گاؤں کے اسکول کی استانی بنا دیں گی۔"
سجل کی پڑھائی سے دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ مگر راہ فرار کا اس سے اچھا راستہ پھر شاید نہ ملتا۔ اس نے بوریا بستر سمیٹ لیا اور ادھر آ گئی۔ اس گھر میں صندلین' امی کے ساتھ خاموش مشینی زندگی گزار رہی تھی۔
ایک نوعمر' بھولی بھالی سی لڑکی کی آمد نے ذرا رونق کر دی۔ وہ ملازمہ بالکل بھی نہیں تھی' مگر اس نے خود بخود ایک کے بعد ایک ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں۔ سب سے بڑھ کر امی کی دل داری۔۔۔ وہ بڑھاپے کا شکار بیماریوں کا نشانہ۔۔۔ تنہائی کے گھونٹ دوائیوں کے ساتھ بھرا کرتی تھیں۔
سجل نے ان کی زندگی میں رونق لگا دی۔ گھر کا ٹی وی

چلنے لگا۔ صندلین صبح سے شام بینک میں اور رات کو لیپ ٹاپ کو گود میں لے کر بیٹھا کرتی تھی۔ امی کو توجہ بس اتنی دے پاتی کہ ان کے نزدیک بیٹھ جاتی۔ ہوں ہاں کے جواب۔۔۔ امی خود ہی خاموشی اوڑھ لیتیں۔ آرام چیئر پر جھولتی جاتیں۔ اب یہ ہوا کہ دونوں نے مل کر ڈرامے دیکھنے شروع کردیے۔ واک پر بھی جاتیں، باتیں کرتیں۔

امی نے ساری زندگی شوہر کے کھینچے دائرے کے اندر گزاری تھی۔ انہیں لگتا۔ گاؤں سے آئی سیدھی سادی سی لڑکی انہیں اصل دنیا دکھا رہی ہے، اس سے پہلے تو وہ بس۔۔۔

سجل کو پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے کتاب کھولتی۔ ہاں باقی اس نے تمام باتیں اور طریقے بڑے کم وقت میں سیکھ لیے۔ بولنے کا طریقہ۔۔۔ الفاظ کا چناؤ، نشست و برخاست۔۔۔ لباس و انداز میں کبھی وہ صندلین لگتی، کبھی امی۔۔۔

سب کچھ کہہ دینے والی باتونی نے دل کا حال تو کبھی بتایا نہیں اور آج جب۔۔۔

"اسی لیے تو وظیفہ کر رہی ہوں۔" رات اس نے دادا کو واپس بھیج دینے کے بعد اداس ترین ماحول کو اپنی چمکتی آواز سے بارونق کرتے ہوئے اعلان کیا۔ "تاکہ جلد از جلد شادی کرکے اپنے دولہا کے ساتھ گاؤں جاؤں اور سب کو دکھاؤں کہ یہ دیکھو۔۔۔" اس نے ہاتھ یوں بلند کیے جیسے ایوارڈ تھام رکھا ہو۔ مگر ان دونوں کے چہروں پر ذرا سی مسکان نہ ابھر سکی۔ "اتنی اداس شکلیں بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ کامیابی دور نہیں، عنقریب میرے ارمان پورے ہونے کا وقت آنے والا ہے۔ کیونکہ۔۔۔" اس نے ڈرامائی وقفہ دیا۔ "میں نے وظیفہ بدلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب ایک اور نیا جلالی کمالی وظیفہ ہاتھ لگا ہے۔ دیکھیے گا، کچے دھاگے سے بندھے سرکار چلے آئیں گے قسم سے۔"

امی نے سر ہلایا۔ صندلین آہ بھر کے رہ گئی۔

بہادر صرف وہ نہیں ہوتے جو میدان جنگ میں دشمن کو پچھاڑ دیں۔ بہادری تو یہ ہے کہ آپ ہار تسلیم نہ کریں اور لڑتے رہیں۔ اصل مقابلہ انسان کا خود اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ اپنے اندر ہمت ہو تو ہی ہمت بانٹی جاسکتی ہے اور۔۔۔

جو لوگ خود پر اختیار پالیں۔۔۔ پھر ساری دنیا ان کی دسترس میں آجاتی ہے۔ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہے۔ بے اختیار ہو جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

"یہ ٹھیک ہے کہ ادھر خاندان میں کسی کی چھوڑی منگیتر سے شادی مشکل سے ہوتی ہے۔ مگر گاؤں سے بہت سے رشتے آئے بھی تھے۔ مگر یہ مانتی ہی نہیں۔" سجل کے دادا نے نئی بات بتائی۔

"تو کیسے تھے وہ رشتے؟"

"اچھے تھے، بہت اچھے تھے، مگر یہ سننے کو تیار ہی نہیں ہوئی۔"

"تو آپ وجہ تو پوچھتے۔" صندلین نے کہا۔

"وجہ نہیں بتاتی۔ یا چپ رہتی ہے یا شور کرتی ہے، ورنہ رونے لگتی ہے، پھر وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔" دادا نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"اچھا۔۔۔ آپ تسلی رکھیں، میں بات کروں گی۔" اس نے تشفی کرائی اور امی کو دیکھا۔ جو گہری سوچ میں گم تھیں۔ دادا چلے گئے۔

"آپ کو کیا لگتا ہے، کیا وجہ ہوگی؟" رات امی کا بی پی چیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔۔۔" امی نے آنکھیں موندیں۔

"پھر بھی۔۔۔" وہ اس موضوع پر بحث کرلینا چاہتی تھی، تاکہ کسی سرے تک پہنچے۔

"وجہ تو مجھے تمہارے انکار کی بھی نہیں معلوم۔۔۔ وہ تو پھر پرائی لڑکی ہے۔"

"امی۔۔۔" صندلین کے ہاتھ ساکت ہوگئے۔ مگر امی اپنی بات کہہ کر کروٹ بدل گئیں۔ اس کے سوال حلق ہی میں گھٹ گئے۔ اسے کہتے ہیں بحث سمیٹنا۔۔۔ یا منہ پر مار دینا۔

اور یہی جملہ ذرا ناراض اور جھجکے انداز میں سجل

نے بھی کہہ دیا۔

"آپ بھی تو حسنین بھائی جان کو انکار کی وجہ نہیں بتاتیں۔"

"میں کہاں سے بیچ میں آگئی۔" اس کی آواز غیر ارادی طور پر مدھم ہوتی چلی گئی۔

"اور وہ جو تم وظیفے کرتی ہو۔" اسے بروقت یاد آیا۔

"ہاں..." وہ مسکرائی۔ "اس لیے کہ شادی تو مجھے کرنی ہی ہے۔"

"مگر کس سے...؟"

"یہ ہی تو پتا نہیں چلتا' سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش اللہ نے ماں' باپ' بہن' بھائی کی طرح یہ رشتہ بھی خود سے جوڑ دیا ہوتا۔ اچھا برا جیسا بھی ہوتا نہ ٹوٹتا اور محبت بھی ہو جاتی۔" اس نے عجیب و غریب خواہش کی۔

"جوڑے تو اللہ ہی بناتا ہے۔" صندلین بہت دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی۔

"تو پھر اس نے منگنی کیوں توڑی؟"

"تم اس بات کو بھول کیوں نہیں جاتیں۔" اس نے ترنت پوچھا تھا۔

سجل نے جواب نہیں دیا۔ دوپٹے کے پلو کو انگلی پر لپیٹنے لگی۔

"پتا ہے' میرا دل کیا کرتا ہے۔ میں ایک روز صبح اٹھوں اور وہ میرے سامنے آجائے۔" وہ حسرت زدہ خواب ناک انداز میں بولی۔

"وہ... وہ کون...؟" صندلین کا لہجہ بھی دھیما سا ہو گیا۔

"وہی جسے اللہ نے صرف میرے لیے بھیجا ہو۔ مجھے سب غلط لگتے ہیں۔ صحیح غلط کی تمیز بھول گئی ہوں۔ وظیفہ بھی یہ ہی کرتی ہوں' اللہ میری مشکل حل کردے۔ مجھے صحیح شخص تک... یا صحیح شخص کو مجھ تک پہنچا دے۔" صندلین دنگ رہ گئی۔ وہ کتنی کمزور و بے بس دکھائی دے رہی تھی۔ صندلین نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم نے مجھے حیران کر دیا سجل...! آج اپنا دل کھول کر رکھ دیا' مگر پھر بھی اصل وجہ ابھی تک نہیں بتائی۔ میں امید رکھوں کہ تم مجھ پر بھروسہ کرو گی؟ پتا ہے شیئر کرلینے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ الجھن سلجھ جاتی ہے۔ دو سال سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہو۔ کیا ہم پر اعتبار قائم نہیں ہوا؟"

"بات اعتبار کی نہیں ہے' بات شرمندگی کی ہے۔"

"شرمندگی..."

"ہاں میں خود سے شرمندہ ہوں۔ مجھے منگیتر سے نفرت ہے۔ اصلی والی نفرت... مگر اپنے نام کے ساتھ جوڑے جانے والے ہر شخص کو میں اس کے تقابل میں دیکھتی ہوں۔ ویسا ہی قد کاٹھ ہو' ویسی ہی آواز و انداز... جیسے سارا کا سارا وہ... اور اپنی اس کمزوری پر میں خود سے خفا رہتی ہوں۔ میں نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس سے اچھا ڈھونڈ لوں گی' مگر دل نے کہا' نہ اچھا' نہ برا... نہ کم' نہ زیادہ... بس بالکل اس جیسا... اب بتائیں میں کیا کروں... ہے کوئی اس کا حل...؟" اس نے ششدر بیٹھی صندلین سے سوال پوچھا اور خود اپنے پیر سمیٹ کر پیچھے ہو بیٹھی۔

"یہ تو بے وقوفی ہے۔"

"میں جانتی ہوں... مگر بے بس ہوں۔ انسان کی فطرت عجیب ہے۔ شاید یہ بھی نفرت کی ایک قسم ہو۔" دونوں کے درمیان طویل خاموشی حائل ہو گئی تھی۔ سجل نے بحث لپیٹنا چاہی۔

"ہاں... شاید..." صندلین نے اپنا تکیہ درست کرنا شروع کر دیا۔

"آپ اب کیا کرنے لگی ہیں۔"

"سونے کی کوشش کروں گی۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"نہیں..." سجل نے قطعیت سے انکار میں سر ہلایا۔ "اب آپ مجھے اپنی "وجہ" بتائیں گی۔"

"میں..." صندلین نے انگشت شہادت سینے پر رکھ کر استفہامیہ انداز اختیار کیا۔

"ہاں آپ..."

"رہنے دو... اس میں کچھ نہیں رکھا۔"

"اونہوں... شیئر کرلینے سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ الجھن سلجھ جاتی ہے۔ دو سال سے ہمارا ساتھ ہے کیا اتنا اعتبار بھی قائم نہیں ہوا۔"

اس نے رٹّو طوطے کی طرح اسی کے الفاظ من وعن لوٹا دیے۔

صندلین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس خلفشاری کیفیت سے قطعاً "انجان" سجل ہنوز منتظر نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ صندلین کو پتا بھی نہ چلا کب زبان بے اختیار ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"تم وہ لڑکی نہیں ہو کہ... جو مرد کی غلامی کرے۔ تمہیں اوپر والے نے کسی بڑے اہم مقصد سے دنیا میں بھیجا ہے۔ تمہاری ذہانت، تمہاری کامیابیاں، تمہاری پرسنالٹی... اوہ... مجھے نصیحت کی کیا ضرورت ہے، تم خود اپنا تجزیہ کرو... تصور کی آنکھ سے ایک منظر دیکھو... ایک شوہر ریں ریں کرتے بچے... ان کی جائز ناجائز ضروریات کو پورا کرتے تم خود کو بھلا دو گی۔ اس مقصد کو فراموش کر دو گی جس کے لیے اللہ نے تمہیں ہزاروں لڑکیوں سے ممتاز بنا کر بھیجا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھتی ہوں ڈیڈ..." ٹی کے نے بھاری لب و لہجے میں فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔ وہ اب معصوم سی ڈیڈی کا چہرہ اور قدم دیکھ کر چلنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے سی ایس ایس میں پورے پاکستان میں اول پوزیشن لی تھی۔

"اور یہ مرد... اوہ...!" ڈیڈی نے حسب عادت جھرجھری لی۔ "یہ کامیاب عورت کو برداشت کر ہی نہیں سکتے۔ آجاتے ہیں اس کی راہ میں روڑے اٹکانے کے لیے کبھی سامنے سے... کبھی چھپ کر... اور کچھ تیسرا رستہ اختیار کرتے ہیں۔ محبت کے نام کا جال پھینک کر... پسندیدگی کی سند دکھا کر عورت کو رام کرنا چاہتے ہیں۔"

"میں اتنی کمزور نہیں ہوں ڈیڈ..." گزرے وقت نے ٹی کے کی آنکھوں کی قدرتی کرختگی کو بڑھا کر دو آتشہ کر دیا تھا۔ بے نیازی اور غرور دنیا میرے نیچے جیسی پختہ سوچ نے چہرے کے پتھریلے پن اور رعب میں اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ بعض دفعہ وہ چنگیز خان کا لیڈی ورژن دکھائی دینے لگتی۔

کہانی صرف اتنی سی تھی۔ یونی ورسٹی کے زمانے کے کسی کلاس فیلو نے ایک خوب صورت، بکے کے ہمراہ پیش ہو کر ٹی کے کو پروپوز کرنے کی غلطی کر دی تھی۔ اس دوران وہ ایسے تیکھی رہی۔ جیسے ایسے فقیر کے سوال کو دیکھ رہی ہو جس کے بارے میں یقین ہو کہ وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔

بکے واپس کرنے کو اس نے اہمیت نہیں دی اور وہ بے چارہ اس قبولیت کو سارے مراحل طے ہو جانے کا گمان کر کے دوبارہ ڈیڈی کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور ڈیڈی تب بھی ایسے شاک میں نہ آتے کہ اگر وہ ڈیڈی سے اچانک اٹھ کر یہ کہہ دیتا کہ سر یہاں دستخط کر دیں۔ آج سے آپ کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد میری ہوئی۔ نہ جانے ضبط کے کن مراحل سے گزر کر اسے تشریف لے جانے کا کہا اور پھر سارے گھر کو اکٹھا کر کے اس خوش فہم کو بے نقط سناتے ہوئے اپنا وہی تاریخی لیکچر شروع کیا جو سب کو ازبر تھا، مگر ٹی کے اس پر یقین بھی رکھتی تھی۔

"اس طرح تو ہم کبھی بھی اپنی بیٹیوں کو نہیں بیاہ سکیں گے۔" امی نے بڑی مشکل سے یہ بدشگونی بھرے الفاظ ادا کیے۔ (خدا نہ کرے جو یہ گھڑی قبولیت کی ہو۔)

"اوہ..." ڈیڈی نے اپنی چند بالوں والی مانگ ہاتھوں سے اجاڑ دی۔ "تمہاری سوئی شادی پر آ کر ہی کیوں رک جاتی ہے؟؟"

"میں اس وقت سے ڈرتی ہوں جب ان کی زندگی کی گھڑی میں بارہ بج جائیں گے۔" امی نے دل پر ہاتھ رکھ کے یہ جملہ کہا۔

"نہیں بجنے بارہ... تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھ لیتی ہو کہ میری بیٹیاں عام لڑکیاں نہیں ہیں۔"

"اور میں آپ کو بتا بتا کر تھک گئی ہوں کہ لڑکیاں

ایورسٹ بھی سر کرلیں اور چاند پر بھی پہنچ جائیں تب بھی لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔"

"تمہاری یہ روایتی گھسی پٹی سوچ۔۔۔ کون کہے گا تم ایک پڑھی لکھی عورت ہو۔"

"کوئی نہیں کہے گا۔ کیا فائدہ ایسے علم کا جو ایک شخص کو جہالت سے نہ روک سکے۔" امی کے جواب نے ان کے علم والا ہونے کی تصدیق کردی تھی۔

"تم۔۔۔ مجھے جاہل کہہ رہی ہو۔"

"ہاں بالکل۔۔۔ یہ زمانہ جاہلیت ہی کے طور تھے۔ اتنی ہی بری تھی شادی، گھر بسانا تو آپ نے خود نے کیوں کی۔۔۔؟" امی نے ہاتھ نچاکر کہا اور کھڑی ہوگئیں۔

"غضب خدا کا۔۔۔ اور باپوں کی راتوں کی نیندیں اڑ چکی ہیں کہ بچیوں کو اچھے بر مل جائیں۔ جہیز جوڑنے کی تگ ودو میں دن رات کی فکریں ہیں اور یہاں۔۔۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اس لیے لڑکیاں نہیں بیاہنا چاہتا کہ ان کے جہیز پر پیسہ خرچ ہوگا۔" ڈیڈی کی آواز پھٹ گئی۔ "نامعقول عورت۔۔۔ امریکہ کی یونی ورسٹی میں پڑھنے بھیج رہا ہوں تمہاری بیٹیوں کو۔۔۔ اندازہ بھی ہے اس خرچے کا۔ اور ٹی کے کو یہاں تک لانے میں جسمانی اور ذہنی محنت کی اور جو پیسہ لگا اس کا اندازہ ہے تمہیں۔۔۔ اس نمبر تین والی نے آسٹریا جاکر میڈیکل کی ڈگری لینی ہے۔ وہ کیا مفت میں ملے گی۔ جتنے پیسے میں ایک کی پڑھائی پر خرچ کررہا ہوں، اتنے میں لوگ چار بیٹیاں بیاہ دیتے ہیں۔"

ڈیڈی کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ سب ہی چونکے، مگر سب سے پہلے پیش قدمی ٹی کے نے کی۔ اس نے کمر سلائی پانی کا گلاس لبوں سے لگایا اور سب کو کھاجانے والی نگاہوں سے گھورا بھی۔۔۔

"آپ ہمیشہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں۔ جن سے ڈیڈی اریٹیٹ ہوتے ہیں۔ بلکہ آپ جان بوجھ کر انہیں اشتعال دلانا چاہتی ہیں۔ کیا ملتا ہے آپ کو یہ سب کرکے۔" ٹی کے باقاعدہ کمر پر دونوں ہاتھ لگاکر امی سے مخاطب ہوئی۔

"ہر بار وکیل بن کر دلائل دینے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ کیا میں نے آپ سے کہا کہ میں شادی کے لیے مری جاتی ہوں یا زینو نے یا زوہی نے۔۔۔؟"

اس نے باری باری دونوں بہنوں کو دیکھا اور نظر سب سے چھوٹی والی پر ٹک گئی، جو بالکل خاموشی سے اس بحث کو دیکھ رہی تھی۔

"یا پھر سب کو چھوڑیے آپ کی اس چھوٹی کو ہی گڑیاؤں کی باراتیں چڑھانے کا شوق ہے، اسی نے فرمائش داغ دی ہو کہ چلیں کسی کی نہ کریں، میری تو کریں یا کم از کم گراونڈ ہی بنادیں۔"

امی کا ششدر رہ جانا تو لازمی تھا۔ چھوٹی بھی ہونق ہوگئی۔ اس کا کیا ذکر۔۔۔ اور وہ بھی ایسے الفاظ میں۔۔۔ مگر اسے ہونق رہنے کی بھی زیادہ دیر اجازت نہ ملی۔ ٹی کے آج سب کلیئر کرلینا چاہتی تھی۔

"تم بولو زینو۔۔۔ تم نے کرنی ہے شادی؟"

وہ جارحانہ تیور لیے خود سے چھوٹی والی بہن کی سمت گھومی اور حملہ اتنا اچانک تھا۔ وہ پہلے خالی نگاہوں سے دیکھتی رہی، اس نے سوال دہرایا اور انداز سے صاف ظاہر تھا، جواب حسب منشا ہونا چاہیے۔ زینو کا سر کسی معمول کی طرح دائیں بائیں ہل گیا۔ ساکت منظر میں گویا جان پڑ گئی۔

ڈیڈی کا گرتا مورال بلند ہونے لگا۔

"اور تم زوہی۔۔۔" ٹی کے اس معاملے کو نپٹا دینا چاہتی تھی۔

"اوہ ربش! مجھے تو اسپیشلائزیشن کے لیے باہر جانا ہے۔" وہ باہر جانے سے پہلے ہی باہر والی ہوگئی تھی۔ کٹے ہوئے باب کٹ بالوں کو جھٹکا جیسے تمام بدخیالوں پر لعنت بھیجی ہو۔

امی دم سادھ کے رہ گئیں۔ ہاں، واقعی وہ کس لیے شوہر سے منہ در منہ ہورہی تھیں، جبکہ۔۔۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے، ڈیڈی کا چہرہ پھر سے تمتمانے لگا تھا۔ بیٹیاں وہی سب تو کہہ رہی تھیں۔ جس کو کہا جاتا ہے کہ گویا۔۔۔ میرے دل میں تھا۔

امی کو شکست خوردگی سے بیٹھتے (ڈھے جاتے

ہوئے) زینو نے دیکھا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ہاں اختلاف رائے اپنی جگہ' مگر وہ ماں تو تھیں نا۔ ان کا ہاتھ تھام کر شاید وہ ڈھارس بندھانا چاہتی تھی۔ مگر امی نے ہاتھ کھینچ کر اپنی پیشانی پونچھی۔

"آپ ڈیفرنٹ قسم کی بیٹیوں کی ماں ہیں امی! آپ کو بھی ڈیفرنٹ ہونا چاہیے' ہم کوئی اوڈنری گرلز نہیں ہیں۔ جو ایسے سطحی خواب سجائیں۔ ہماری منزل کہیں اور ہے اور ڈیڈی ٹھیک کہتے ہیں۔ فضول کے خواب دکھانے والے یہ فضول لوگ۔۔۔ ہمیں راہ سے بھٹکانا چاہتے ہی اور ہم بہنیں کم از کم ان جھانسوں میں آنے والی نہیں ہیں' کیوں زینو۔۔۔"

ٹی کے کو زینو کی خاموشی اور پژمردگی محسوس ہوئی۔

"ہاں۔۔۔ آں۔۔۔ ٹھیک بالکل ٹھیک۔۔۔" اس نے کسی معمول کی طرح ہاں میں سر ہلایا۔ نگاہیں ضرور کمرے میں گردش کر رہی تھیں۔ مگر دھیان دو۔۔۔ ایک پینٹنگ میں اٹک گیا تھا۔ ایک پینٹنگ یا دوسری۔۔۔ نہیں۔۔۔ پینٹنگ بنانے والے۔۔۔ جینز کی ہزار بار کی دھلی پینٹ پر سفید شرٹ جس کے کف موڑ رکھے تھے۔ ایک کمانڈو جیکٹ۔۔۔ مگر انداز بالکل ڈھیلا ڈھالا اس کے پریشان بالوں میں سفیدی کا بڑھتا تناسب۔۔۔ سب سے نمایاں چیز اس کی حزن آمیز نگاہیں تھیں۔ جب وہ بغور سنتا تھا اور جب وہ کہیں کھو جاتا تھا اور ٹی کے کے لیے آنے والے رشتے تو اس کی ٹکر کے ہی نہ تھے۔

وہ پینٹر کا تعارف ڈیڈی سے کیسے کرواتے۔ وہ ڈیڈی کے متوقع رد عمل سے بخوبی واقف تھی۔ وہ اس سے پوچھتے کہ وہ کیوں اس فضول کام میں وقت برباد کر رہا ہے۔ تب پینٹر خفا ہو جاتا۔

اور زینو سے پوچھتے۔ "اس شخص میں ایسا کیا دیکھا کہ متعارف کروانے کی ضرورت پیش آگئی؟؟"

زینو اگر سچ بولتی۔۔۔ تو ڈیڈی خفا ہو جاتے۔ سو اس نے دونوں کو مصیبت سے بچایا اور خود کو خفا کر لیا۔ وہ باہمت نہیں تھی۔ لیکن نہ جانے کیسے اس بات کی خبر ڈیڈی کو ہو گئی جو اس نے خود سے بھی چھپا رکھی تھی۔

"خود کو دیکھو زینو۔۔۔ کہاں تم اور کہاں وہ دو کوڑی کا پینٹر۔۔۔ کیا دے سکے گا وہ تمہیں۔۔۔ اسے پالو گی۔۔۔ اتنی ہی رحم دل ہو گئی ہو تو یتیم خانے کے چار بچوں پر انویسٹمنٹ کر دو' ثواب بھی اور نقصان کا اندیشہ بھی نہیں۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" ڈیڈی نے سخت تضحیک آمیز انداز سے سرزنش کی تھی۔

"ایسے غیر عملی انسان کو تو میں دیکھنا تک پسند نہیں کروں گا اور تم گزشتہ چھ ماہ سے اس سے مل رہی ہو۔"

"وہ بہت اچھی پینٹنگ کرتا ہے ڈیڈ!"

"تو تم خریدتی جاؤ۔۔۔ قوت خرید ہے نا تمہارے پاس۔۔۔ یا میں دوں پیسے۔۔۔ تم نے مجھے زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دوچار کیا زینو۔۔۔!" ڈیڈ غرق ہو جانے والے جہاز کے ملاح کی طرح سر گرا کے بیٹھ گئے۔ "میں نے تو تم لوگوں کو بڑی شاہانہ سوچ دے کر پروان چڑھایا تھا۔ یہ غلامی کی خو کہاں سے آگئی۔ میں اس تگ و دو میں ہوں کہ تم کو ایمبیسی میں جاب مل جائے اور تم اس پینٹر کے گھر کی دھوبن' باورچن' خانسامن بننے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ اس نے تم پر دام ڈالا ہو گا۔ ورنہ میری تربیت میں جھول نہیں ہو سکتا۔"

"وہ تو جانتا بھی نہیں ڈیڈی کہ۔۔۔" اس نے پہلی بار لب کھولنے چاہے۔

"وہ نہیں تم نہیں جانتیں کہ وہ تم کو کس مہارت سے الو بنا رہا ہے۔"

"نہیں ڈیڈی!" اس نے بدقت کہا۔

"میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے زینو۔۔۔"

"آپ اس سے مل تو لیں ایک بار!" امی نے خوش گمانی کے روزن سے جھانک کر کہا۔

"میں مل چکا ہوں اس سے ایک بار۔۔۔ اور یہ زندگی بھر کے لیے کافی ہے۔ ایک دنیا کے طعنوں سے جیا ہوا میں۔۔۔ لوگوں نے بیٹیوں کو پرایا مال کہہ کر حقارت سے منہ پھیرا۔۔۔ بھلا کوئی بیٹوں پر بھی انویسٹ کرتا ہے۔

میں نے تب ہی عہد کرلیا تھا۔ میں اپنی بیٹیوں کو وہ چیز بنادوں گا کہ لوگ اپنے بیٹوں کو بھول جائیں۔ میرے خاندان میں ڈھیر... بڑا ہے لڑکوں کا... کیا اوقات ہے ان کی... معاشرے کے تیسرے درجے کے شہری ہیں وہ... چند ہزار روپلی کی تنخواہ... یا پھر تیسرے، دوسرے درجے کے کاروبار اور میری بیٹیاں... شیشے کے ٹھنڈے دفتروں کے دروازے چوکیدار دور سے آتا دیکھ کر کھڑے ہو کر کھول دیتے ہیں۔ نظر جھکا کر سلام کرتے ہیں اور وہ سب شیشے کے ٹھنڈے دروازے کے نام پر صرف باٹا... سروس کے اندر گھس سکتے ہیں میری بیٹیاں... میری ٹی کے کل اسٹیبلشمنٹ کا وہ پرزہ ہوگی جو حکومتیں گرادیتا ہے، حکومتیں بنادیتا ہے۔ میری زوہی... مستقبل کی سرجن ڈاکٹر... اور تم... تمہیں کتنی زبانوں پر عبور حاصل تھا زینو... تمہارے لیے تو میں امریکی وزارت خارجہ سے کم سوچ ہی نہیں سکتا تھا اور تم...“

”سوری ڈیڈی...“ زینو کا سر جھک گیا۔

”تو کامیاب عورتیں شادیاں نہیں کرتیں۔ یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟“ امی نے چمک کر کہا۔ بیٹی کی پژمردگی اور خواہش نے ان کی ہمت کو جوان کردیا تھا۔

”یہ اس کتاب میں لکھا ہے جس کو تم نے کبھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ تمہارے پاس وہ آنکھ ہی نہیں ہے۔“ ڈیڈی کا لہجہ استہزائیہ ہوگیا۔ امی زینو کے پیچھے پڑ گئیں۔

”اتنی آسانی سے ہار نہ مانو زینو!“

”ہار ماننے کی بات نہیں ہے۔ میں نے واقعی انہونی خواہش کرکے خود کو ڈیڈی اور بہنوں کی نظروں میں گرا دیا۔ ٹی کے اور زوہی کتنی فوکسڈ ہیں۔ بس میرا ہی پیر پھسل گیا۔“

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ امی سے مایوسی دیکھی نہ جاتی تھی۔

”ڈیڈی کے خواب ہم ہی کو تو پورے کرنے ہیں۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں، ہم عام لڑکیاں نہیں ہیں۔ مجھ سے اچھی تو میری بہنیں ہیں۔ جو پریکٹیکل ہو کر سوچتی ہیں۔ پتا نہیں میں کیسے ڈیڈی کا دل دکھانے کا باعث بن گئی۔“ وہ بات ختم کرکے کمرے ہی سے نکل گئی۔

اور امی یہ تک نہ کہہ سکیں۔ ”انسان فطرت کی طرف بڑھتا ہی ہے۔ اگر اسے کوئی اچھا لگ گیا۔ یا وہ کسی کو بھا گئی تو یہ عین فطرت ہے۔“

مگر یہاں سن کون رہا تھا۔ زینو، ڈیڈی سے سوری کرکے ان فارمز کو پر کرنے میں لگ گئی۔ جو ڈیڈی کے خوابوں کو پورا کرنے کا راستہ بتانے لگے۔ ننھے سے کنکر نے جھیل کی سطح پر دائرے بنائے تھے۔ پل بھر کی ہلچل اور پھر وہی سکون و روانی... زندگی اسی نہج پر دوڑنے لگی۔ جو ڈیڈی کو درکار تھی۔

ٹی کے کی کامیابیاں... اور زینو کی کامیابیاں... سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا۔ جیسے ڈیڈی نے سوچ رکھا تھا۔ وہ قابل فخر و قابل تقلید بے مثال بیٹیوں کے باپ تھے۔ پہلے وہ ان کی بیٹیاں تھیں۔ اب وہ ان کے باپ سے پہچانے جاتے۔ ٹی کے کے مزاج کا غرور، کرختگی، پختگی اور قطعیت وقت کے ساتھ اتنی بڑھ گئی کہ اب تو ڈیڈی بھی اس سے سوچ سمجھ کر بات کرتے۔ قدرتی چوڑا اور تندرست سراپا اب اور بھاری بھرکم ہوگیا تھا۔ اس سے نگاہ ملا کر بات کرنی مشکل تھی۔

زینو پہلے ہی ہلکے جسم کی مالک تھی۔ چار دن کے عشق سراب نے ہوا سے بھی ہلکا کردیا۔ اپنی خود کی گاڑیاں دوڑاتیں، رعب جھاڑتی فائلوں پر دستخط فرماتیں ٹھنڈے شیشوں والے کمروں میں بیٹھی عورت نما لڑکیاں... یا لڑکی نما عورت نہ جانے کیا۔

پر ڈیڈی خوش تھے۔ امی نے حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا۔ بڑی مشکل سی زندگی تھی۔ مطلق العنان شوہر کی جی حضوری... اور افسر بیٹیاں... وہ خود کی پیدا کی ہوئی سے گھبرانے لگی تھیں۔ کبھی لگتا کامیابیوں کے یہ جھنڈے ان کے دل میں گڑے تھے۔ بعض زندگیاں سوالیہ نشان کی طرح ہوجاتی ہیں۔ کامیاب یا ناکام...؟

ڈیڈی نے زندگی جیسے کسی محاذ پر کھڑے ہو کر گزاری تھی۔ اگلے والا مورچہ... کمانڈ اینڈ کنٹرول...

مگر فتح کے اعلان کے بعد جب توپ کا منہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ جب سامان سمیٹ کر پیچھے آنا پڑتا ہے۔ تب فاتح ہونے کے باوجود دل میں اک کسک تو رہتی ہے۔ جن بیٹیوں نے ہمیشہ ان کی انگلی پکڑ کر دنیا دیکھی تھی۔ قدم اٹھائے تھے۔ اب وہ خود قوت فیصلہ کی مالک ہو گئی تھیں۔

جس کہکشاں کو وہ زمین سے..... وہ دور انگلی کر کے دکھاتے تھے۔ بیٹیاں اب اس کہکشاں کا حصہ بن چکی تھیں اور اب انہیں بمشکل دکھائی دیتی تھیں۔ بڑھاپے میں گردن زیادہ دیر اوپر کو ٹک نہیں پاتی' پھر نظر کیسے ٹھہرے۔

مصروف انسان کو دنیا دو آنکھوں سے بھی پوری نظر نہیں آتی۔ مگر ان کی فارغ البالی نے سوچ کے دریچے کھول دیے۔ کچھ سوال' کچھ حیرتیں..... سب کچھ تو ویسا ہی ہو گیا تھا' جیسا کہ سوچا' مگر یہ بے قراری کیسی تھی۔ کہیں کچھ گڑبڑ تھی' کچھ کمی..... جیسے کچھ رکھ کے بھول گئے ہوں مگر کیا؟

وہ بھائی اور بہنیں جنہیں وہ کھوٹے سکے کی طرح فراموش کر چکے تھے۔ اب ان سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔ امی اور ابا تو رہے نہیں..... مگر ان کا گھر جس میں ڈیڈی کا حصہ موجود تھا۔ وہاں جا کر بیٹھنا اچھا لگنے لگا۔ وہ عام لوگ جنہیں وہ کسی گنتی میں نہیں لاتے تھے۔ اب گھر آ کر وہ صورتیں آنکھوں کے آگے سے ہٹتی نہیں تھیں۔

تب ہی ایک نئی چیز بھی ہوئی۔ انہیں بہن' بھائیوں کے گھر کی رونق بری طرح محسوس ہونے لگی۔ اپنے گھر کا سناٹا' مشینی زندگی' بے رنگ' بے آواز' جیسے دیوار پر لگی پینٹنگ جتنی مرضی خوب صورت و مکمل ہو۔ محض دیکھنے کی چیز ہوتی ہے اور ساکت منظر انسان کو جلد تھکا دیتے ہیں۔

اور ڈیڈی کے اندر کے شور اور تبدیلی کی کسی کو خبر نہیں تھی۔ بڑھاپے اور بیماریوں نے انہیں خاموش کر دیا ہے' اٹس نیچرل..... مگر ایک شور کا من سے اٹھ رہا تھا۔ یہ چہکتی آواز زوہی کی تھی۔ ساتھ ہی ایک اجنبی آواز..... امی کی آواز.....

زینو ابھی آفس سے آ کر ذرا استانے کو لیٹی تھی۔ مگر زوہی کہاں..... وہ تو وہاں آسٹریا..... اسپیشلائزیشن کے لیے گئی تھی۔ پھر کون..... مگر یہ زوہی ہی تھی۔ وہ بہت موٹی اور سرخ و سفید ہو گئی تھی۔ جینز کی پینٹ اور سفید بٹنوں والی شرٹ سے چھلکی پڑتی تھی۔ رنگین ہینڈ بیگ..... سرخ پمپ شوز اور بہت سرخ لپ اسٹک..... وہ بدلی بدلی تو لگ رہی تھی۔ انوکھی انجان اور دسترس سے دور بھی لگتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر زور سے ہنس دی۔ گھر میں ٹی کے' کے علاوہ کسی کو قہقہے لگانے کی عادت نہیں تھی۔ زوہی تو کبھی ایسا قہقہہ نہیں لگاتی تھی۔ جس سے گردن پیچھے گر جائے اور حلق کا کوا..... اور عقل داڑھ تک دکھائی دینے لگے۔ تو کیا ہو گیا تھا زوہی کو.....؟

"اور یہ تمہارے ساتھ کون ہے زوہی.....!"

"اوہ یو زینو..... ایم آئی رائٹ....." بہت بارعب خوش گوار سی آواز' یہ کون تھا جو اسے جانتا تھا۔ سوال اس کے چہرے پر تحریر ہو گیا۔

"میں نے آپ سب لوگوں کا غائبانہ تعارف کروا رکھا ہے بھئی۔"

وہ بہت بااعتماد لگ رہی تھی۔ ٹی کے سے بھی زیادہ..... مگر ایسے اچانک کیسے.....

"میں نے زارون سے کہا' میری فیملی کے سامنے شادی کا نام مت لینا۔ بڑی اینٹی میرج سوچ ہے سب کی..... ورنہ اسے تو پیور پاکستانی میرج میں انٹرسٹ تھا۔ مولوی صاحب اور گواہوں والی۔ میں نے کہا فیصلہ کر لو۔ میں چاہیے ہوں یا مولوی اور گواہ....."

"میں تو ڈر گیا جی..... مجھ کو زاہین ہی چاہیے تھی۔" اس کی اردو مشکل سے دوچار تھی۔

"پھر غلط نام پرونا ونس کیا۔" زوہی نے تادیبی انگلی اٹھائی۔

"میں بالکل سا ہی بولا زاہین۔" اس نے اپنے غلط تلفظ کو اور پکا کیا۔

"اوہ گاڈ..... میری زندگی تو اس کا تلفظ ٹھیک کرانے

میں گزر جائے گی۔" زوہی نے اوپر دیکھا۔
"یہ کون ہے زوہی؟" ٹی کے آگے بڑھی۔ ڈیڈی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ امی جو کب سے صوفے کے سہارے کھڑی تھیں۔ انہیں بھی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

"میں آپ کا برادر ان لاء ہوتا ہوں۔" لہجے میں خوشی و فخر تھا۔ "آپ ٹی کے آپ یا ہے۔ یعنی تزمین خان۔" "اور وہ زینو' تزمین خان.... اور وہ چھوٹی والی...."
"باس.... ٹی کے' چہرہ سرخ ہو گیا۔" یہ کیا بکواس کر رہا ہے' کون ہے یہ اور یہاں کیسے گھس آیا؟" ٹی کے زوہی کی طرف گھومی۔ جسے جواب کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ بیگ صوفے پر رکھ دیا۔ خود بھی بیٹھی اور زارون کو بھی آرام سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

☆ ☆ ☆
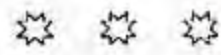
"میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکی کہ زبین بجو کی شادی دھچکا تھا۔ اسپیشلائزیشن ادھورا چھوڑنا دھچکا تھا یا ڈیڈی کا سر جھکا کر مان جانا' کچھ نہ کہنا بلکہ پورے چاؤ' رسم و رواجوں کے ساتھ دھوم دھام سے زبین بجو کو اپنے ہاتھوں رخصت کرنا۔"
صندلین بول بول کر تھک چکی تھی۔ جیسے میلوں سے بھاگتی آئی ہو۔ تجل نے تیزی سے اس کے پیچھے تکیہ لگایا تو وہ اس پر ڈھے سی گئی۔ آنکھیں اب بھی خلا میں چکرا رہی تھیں۔ بہت سالوں بعد یہ موضوع آج اس طرح سے چھڑا تھا۔ جبکہ وہ اکیلے میں بھی جب کبھی سفر ماضی اختیار کرتی تھی' یہیں آکر بے دم ہو جاتی تھی۔ کیونکہ جو کچھ اس کے بعد ہوا' وہی تو صندلین خان کے دل کا کانٹا' راہ کا کانٹا.... پیر کا چھالا بن گیا تھا۔ وہ اتنے سالوں میں ایک قدم نہیں بڑھا سکی تھی اور نہ ہی بڑھانا چاہتی تھی۔
"ان سب باتوں میں حسنین بھائی جان کا کیا قصور.... کیا آپ نے بھی بڑی آپا.... مطلب میڈم ٹی کے کی طرح شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے؟" تجل کے لیے یہ سوال کرنا ہی مشکل تھا۔ کہاں وہ دن رات شادی ہو جانے کے لیے وظیفے کر رہی تھی اور کہاں.... سوچ کا ایک رخ یہ بھی تھا۔
"نہیں تجل!" صندلین نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ "میں قسمیں کھانے پر یقین ہی نہیں رکھتی اور شادی سے انکار دراصل فطرت سے براہ راست ٹکر لینے کے مترادف ہے۔"
"تو پھر...." تجل کو آج یہ گتھی سلجھانی ہی تھی۔
"پھر....؟" صندلین نے آنکھیں موندلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے یادوں کا جہان آباد تھا۔
" امی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا' روئیں کہ ہنسیں۔ ڈیڈی کی خاموشی اور سکون حیرانی کا باعث تھا۔ صندلین نے دس بار جھانک کر دیکھا۔ وہ سفاری سوٹ پہنے سنہری فریم کی عینک لگائے۔ زارون سے گفتگو میں مصروف تھے۔ زارون موٹا گورا' سرخ اور خوش مزاج.... اس کی نگاہ صندلین پر پڑ گئی۔
"اے ہیلو.... تم چھپ چھپ کر کیا دیکھتی ہو۔" صندلین جھپاک سے اندر غائب ہو گئی۔ اس کے دیکھنے کے لیے سارا گھر تماشا بن گیا تھا۔
زبین امی کو ہنی مون اور نکاح کے فوٹوز دکھا رہی تھی۔
امی کے منہ سے ہوں ہاں کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا تھا۔ تصاویر پر عنوان نہیں لکھے ہوئے تھے۔ مگر اندھا بھی بتا تا یہ خوشی و آبادگی' آسودگی کے مناظر تھے۔ ہنستے مسکراتے چہرے اور آنکھیں....
صندلین نے سوچا۔ وہ ناخوش بھی نہیں ہے۔ ہاں وہ خوش ہے۔ اس نے البم اپنی گود میں رکھ لیا۔ انداز میں کچھ جھجک سی تھی۔ تزمین آپا اس سے اتنی بڑی تھیں کہ وہ انہیں اپنی اماں کہہ کر بھی متعارف کروا سکتی تھی۔
پھر تزمین آپو.... اور زبین بجو ہم عمر تھیں۔ بچپن سے ان کی دلچسپیاں اور باتیں ایک تھیں۔ وہ ایک دوسرے کی راز دار تھیں۔ دوست نما بہنیں.... صندلین سب سے چھوٹی تھی اور اس کا کوئی جوڑی دار نہیں تھا۔ وہ شروع سے امی سے قریب تھی۔ اس نے

دل کی شدید ترین خواہش کے تحت کسی کو ڈھونڈا' جس کے ساتھ مل کر وہ تصاویر پر تبصرہ کرسکے اور جی بھر کے دیکھے۔

سامنے تزئین آپو تھیں۔ ساکت جامد... جیسے کسی نے ان کو مجسمہ کردیا ہو۔ جب تین بار پکارنے پر بھی متوجہ نہ ہوئیں تب وہ اٹھ کر آئی۔

"آپو جی...!" اس نے انہیں چھوا۔ "کہاں کھو گئیں' آئیں البم دیکھتے ہیں۔ بڑے مزے کا ہے اور آپو جی... اس بم کی طرح تھیں جسے چھوٹے جانے پر ہی پھٹنا تھا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے اسے اتنا زور کا جھٹکا دیا کہ وہ بمشکل گرنے سے بچی اور دوسرے ہاتھ سے البم جھپٹ کر اتنی طاقت سے مارا کہ وہ دروازے سے ٹکرا کر زمین بوس ہوگیا۔ جلد تک کھل گئی۔ میں ہکابکا رہ گئی۔"

صندلین کا چہرہ یوں ہوگیا جیسے یہ سب ابھی ابھی وقوع پذیر ہوا ہو۔

"اور یہ تزئین آپو کی توڑ پھوڑ کا نقطہ آغاز تھا۔

ذہین اور زارون کی آمد... شرف قبولیت کے بعد سے شادی کے دن اور رخصت ہونے کے مرحلے تک وہ ایسی ساکت اور خاموش تھیں۔ جیسے چابی والی گڑیا۔ جس کو جو کہا جاتا وہ کرلیتی۔ امی نے اس رونق کے خواب سالہا سال دیکھے تھے۔ وہ اپنے سارے ارمان نکال لینا چاہتی تھیں۔

ایک سے ایک لباس و آرائش... تزئین آپو کو جو کہا جاتا کرلیتیں' جو پہنایا جاتا۔ پہن لیتیں۔ مگر ان کی دم سادھ خاموشی کو کوئی اور محسوس کرتا نہ کرتا' مجھے صاف پتا لگتی تھی۔

وہ عجب حسرت و غم ناکی سے ذہین بجو کو تکتیں۔ تکتی چلی جاتیں۔ گونگی تو ہو چکی تھیں۔ بہرہ پن بھی لاحق ہوگیا۔ دس بار پکارنے پر بھی متوجہ نہ ہوتیں۔ اس پر آنکھوں کا خالی پن اور اجنبیت...

"آپ کو کیا ہوگیا ہے آپو!" میں ان کے کمرے میں سونے لگی تھی۔ یوں ہی آنکھ کھلی تو دیکھا' وہ بیڈ پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ہیں۔

"اس سے کہو' دھرنا دیا کرے۔"

"کس سے...؟" میں خاک نہ سمجھی۔

"ان دونوں... دولہا' دلہن سے..."

"اوہ...!" میں چونکی۔ میرا دل تو کرتا تھا۔ ذہین بجو اور زارون بھائی ہمارے گھر پر ہی رہیں۔ کہیں نہ جائیں اور تزئین آپو کہہ رہی تھیں۔

"کیوں آپو جی...؟" میں نے نرمی سے پوچھا اور کیوں کا جواب بہت خطرناک نکلا۔ نہ جانے یہ کب کا ابلتا طوفان تھا۔

"اگر یہ ہی سب کرنا تھا تو اتنے سال ہمیں بے وقوف کیوں بنایا۔ کہاں گئے وہ بڑی کامیاب عورت کے خواب' جب وہ پڑھائی کو آگ لگا کر محبت کی پینگ جھولنے لگی۔ دھوکا کیا ہے ڈیڈی نے ہمارے ساتھ... نہیں میرے ساتھ... یا پھر میں ہی بے وقوف بن گئی۔ ڈیڈی کو برا لگے گا۔ سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ میں سب کی نظروں سے نہ گر جاؤں۔ نافرمان نہ کہلاؤں اور میں نے محبت کو چھوڑ دیا' حالانکہ وہ پوچھتا رہا سالوں تک..."

"اب آپ کو میری پینٹنگز اچھی نہیں لگتیں۔ آپ نے انہیں خریدنا کیوں چھوڑ دیا؟ اور چلیے چھوڑیے خرید و فروخت کو... وہ تو میں آپ کو ویسے بھی دے دوں گا۔ لیکن آپ نے ایگزیبشنز میں آنا بھی چھوڑ دیا۔ ایسے راتوں و رات تو آرٹ سے دلچسپی ختم نہیں ہوسکتی؟"

"میں اس سے یہ بھی نہ کہہ سکی۔" دلچسپی ختم تو کروائی جاسکتی ہے نا۔

ڈیڈی نے میری آنکھوں سے خواب نوچ ڈالے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے... اپنے سوکالڈ نظریات و افکار...

"جب یہ ہی سب کرنا تھا تو... کیوں آخر کیوں؟" آپو نے ہاتھ مار کے سائیڈ لیمپ دور گرایا۔ پانی کا جگ کرچی کرچی ہوگیا۔ ٹیبل کلاک کی سوئی بارہ پر آکر بند ہوگئی تھی اور الٹے منہ سے پڑی تھی۔

"ایسے نہ کریں آپو... ہم ایسا کرتے ہیں۔" اسے

آئیڈیا سوجھا۔ "ہم ان سے جاکر ملتے ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" آپو نے بری طرح چونک کر دیکھا۔ انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔

"نہیں کہیں گے۔ ہمیں دوبارہ سے ان کی پینٹنگز اچھی لگنے لگی ہیں۔"

میں نے اپنے تئیں سادہ سا حل پیش کرکے معاملہ نپٹادیا۔

مگر یہ کیا؟ آپو نے تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ انہیں سنبھالنا دوبھر سارا گھر اکٹھا ہوگیا۔

"ساری دنیا بھی اکٹھی ہوکر میرے دل کی دنیا کو دوبارہ نہیں بسا سکتی۔" وہ روتی جاتیں۔

"کیا فرق پڑتا ڈیڈی... ہر مہینے نوٹوں کا ڈھیر بینک میں سڑنے گلنے کے لیے پہنچ جاتا ہے۔ آپ کس چیز سے ڈراتے تھے۔ میں خرچ کردیتی۔ اپنے شوہر اور بچوں پر ہی خرچ کرتی نا۔"

آپو کا سوال اتنا سادہ تھا۔ اتنا آسان۔ جیسے کوئی مشاق گول گھوم کر بند آنکھوں سے خنجر سینے کے اندر اتار دے۔

"میری کمائی کا اس نے اچار ڈالنا تھا؟ آپ کو پتا ہے وہ کسی کاغذ پر اپنا برش بھی صاف کرتے ہوئے لکیریں ڈال دے تو وہ بھی لاکھوں کا بکتا ہے۔"

ڈیڈی کا سر جھکتے جھکتے سینے سے چپک گیا تھا اور امی کی آنکھ سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"ہم جاتے ہیں نا پینٹر کے پاس..." مجھے بس اجازت درکار تھی۔

"کیا کریں گے جاکر؟" آپو کا انداز یوں تھا جیسے میں نے انہیں گالی نکال دی ہو اور وہ میرا گریبان تھام لینا چاہتی ہوں۔ پھر اگلے ہی لمحے اشتعال کی چڑھی ندی ڈھل گئی۔ آنکھیں، گردن، سر کندھے جھک گئے۔ شکست صدمہ نارسائی۔

"اس نے منظر پینٹ کرنا چھوڑ دیے ہیں۔ وہ اب سرخ گلاب بھی پینٹ نہیں کرتا۔ ایسے گلاب جن سے خوشبو آنے لگتی تھی۔ وہ اب تصویریں بناتا ہے بچوں کی، اپنے بچوں کی۔"

"او خدا... میں تو میں... امی اور ڈیڈی تک کو یوں لگا جیسے کسی نے پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو۔

تو کہانیاں ایسے اچانک بھی ختم ہوجاتی ہیں۔ ہیپی اینڈ کے بغیر...

"اسے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔" ٹی کے نے ڈیڈی کو قطعیت سے کہا۔

"بس کرو تزئین... میری بچی پاگل نہیں ہے۔"

امی تڑپیں۔

"اسے کونسلنگ کی ضرورت ہے امی... ورنہ پاگل پن دور نہیں۔" ٹی کے کا لہجہ روکھا اور غیر جذباتی تھا۔

اس بات کو کسی نے نہیں مانا۔ مگر پھر ایک دن میں خود امی اور ڈیڈی کے سامنے روتے ہوئے یہی مشورہ لے کر پہنچ گئی۔

"آپو کو دورے سے پڑنے لگے تھے۔ وہ پاگل ہونے لگی تھیں۔ سب سے زیادہ حالت تب غیر ہوتی جب ذہین بجو آتیں۔

"آپ بجو سے کہہ دیں۔ وہ اس طرح سے یہاں نہ آیا کریں۔ بلکہ آیا ہی نہ کریں۔" میں نے امی سے کہہ دیا اور امی دھک سے رہ گئیں۔ انہیں ذہین کا آنا... اس کا بناؤ سنگھار... اور زارون اتنا اچھا لگتا تھا کہ حد نہیں...

امی تو نہ کہہ سکیں۔ یہ کام ایک روز تزئین آپو نے خود ہی کرلیا۔

"کیوں آتی ہے تو یہاں... اپنا بناؤ سنگھار دکھانے کے لیے... ہے ناں... تو اسی کو میں نوچ ڈالوں گی۔" تزئین آپو ذہین بجو پر یوں پل پڑیں کہ بچاؤ کی کوئی صورت نہ بچی۔

"شرم نہیں آتی..." وہ چلا رہی تھیں۔ "اندازہ بھی ہے کہ ان سب چیزوں کو دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ تو بھی تو ڈیڈی کے ماننے والوں، ہاں میں ہاں ملانے والوں میں شامل تھی۔ اور تو نے ہی راستہ بدل لیا۔ جب یہی کرنا تھا تو میری منزل کیوں کھوٹی کی۔ یاد نہیں اپنے الفاظ اور وہ تضحیک آمیز انداز... بول

جواب دے۔"

جواب کے جنون نے زینو کو پاگل کر دیا تھا۔ پھر زوہی کیسے بولتی اس میں تو کراہنے تک کی سکت نہیں تھی۔ امی جیسے مرگئی تھیں۔ ڈیڈی مجرموں کی طرح اور اپنی عمر سے بڑے دکھتے تھے یہاں تک کہ تی کے سرد چہرے پر بھی فکر کی لہریں گردش کرنے لگیں۔

یہ تماشا بہت دنوں تک چلا۔۔۔۔

ذہین بجو۔۔۔ اور زارون بھائی چھٹیاں ختم ہوتے ہی روانہ ہوگئے۔ اسپیشلائزیشن کو بھاڑ میں جھونک کر بجو ننھے موزے ٹوپے خریدنے میں مگن ہو گئیں اب حالات کچھ بہتر ہوسکتے تھے۔ مجھے ایسا لگنے لگا۔

آپو جی کو جو۔۔۔ ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے ان میں بھی کمی آنے لگی۔ وہ نارمل ہونے لگی تھیں۔ مگر اب وہ عجیب سی ہوگئی تھیں۔ بدتمیز اور نافرمان بھی لگتیں بالخصوص ڈیڈی کے ساتھ ان کا رویہ بہت تکلیف دہ تھا۔

کہاں کی وزارت خارجہ کی ملازمت اور زبانوں کا عبور۔۔۔ ڈیڈی ہی کو اذیت پہنچانے کے لیے آپو جی نے پہلے کسی تیسرے درجے کے پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ڈیڈی کے تڑپ جانے پر منت سماجت پر کسی خیراتی ادارے کے ورخت اسکول میں مفت پڑھانے لگیں اور رو کو مجھے۔۔۔۔

وہ ڈیڈی کو کلسانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھیں اور ڈیڈی اللہ جانے اپنی صدمے یا پھر کسی پچھتاوے سے دنوں میں گھل کر ختم ہوگئے۔ یہ تو بہت بعد میں میرے سمجھانے امی کی منتوں ترلوں پر جا کر کیڈٹ اسکول کی جاب شروع کی۔

اور سب کو لگتا تھا وہ نارمل ہو گئی ہیں۔ مگر اس میں بہت وقت لگا۔

بہت سی ایسی باتیں بھی تھیں جو صرف میں جانتی تھی۔ آپو جی چھپ چھپ کر کسی تصویر کو دیکھا کرتی تھیں۔ میں نے سوچا وہ اس پینٹر کی ہوگی۔ تالے میں رکھتی تھیں۔ محبت سے دیکھتی نہیں ہاتھ پھیرتیں جیسے دل میں اتارنا چاہتی ہوں میں نے بڑی تگ و دو سے نکال لی۔" دیکھوں تو کیسا تھا وہ پینٹر۔" اور پتا ہے سجل میں دنگ رہ گئی۔

وہ تو ذہین بجو کی سرخ جوڑے میں دلہن بنی تصویر تھی جس میں بلا کی حسین لگ رہی تھیں۔ نجانے یہ محبت کا کون سا رخ تھا یا پھر وہی کہ انسانی نفسیات بڑا مشکل مضمون ہے۔

ترمین اپیا زندگی بھر ڈیڈی کی بیٹی رہیں۔ میں امی کی۔

پھر یہ دونوں زوہی اور زینو۔۔۔ اچھی پکی والی سہیلیاں تھیں۔ اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا۔ لباس سب ایک سے۔۔۔" صندلیں کھو سی گئی۔ سجل منتظر رہی کہ وہ آگے بھی بولے۔

"پھر۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔ صندلین زخمی سا مسکرائی۔" پھر کیا بس یہی کہانی ہے۔"

"مگر اس سب کا اس بات سے کیا تعلق کہ آپ کو شادی ہی نہیں کرنی۔"

"ارے۔۔۔" صندلین سیدھی ہوئی "اب بھی نہیں سمجھیں۔ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد میں دوبارہ کیسے آپو جی کو اسی مصیبت میں مبتلا کر سکتی ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" سجل چونکی "آپ کا کہنے کا مطلب ہے انہیں تکلیف ہوگی۔"

"ہاں بہت زیادہ۔۔۔"

"تو کیا آپ ساری عمر شادی نہیں کریں گی؟"

"پتا نہیں۔۔۔ میں آپو کو اس حال میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔" صندلین نے بیڈ سے اتر کر سوفٹی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ کافی رات ہو گئی تھی۔ صبح آنکھ نہیں کھلنی تھی۔

"لیکن حسنین بھائی کی امی تو ان کی شادی کے لیے بہت زور دے رہی ہیں۔"

صندلین نے بے ساختہ سر اٹھایا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟"

"واک پر گئے تھے میں اور اماں جی۔۔۔ وہ وہیں ملیں، اس لڑکی کو جی بھر کے کوسنے دے رہی تھیں۔ جس

نے ان کے لڑکے کو پیچھے لگا کر چھوڑ دیا۔ کہتی تھیں ایک بار مل جائے ناں تو.... زبردستی نکاح پڑھا دیں مگر اس سے پہلے اپنے ہاتھوں سے پیٹیں گی بھی جی بھر کے۔"

"ان کے ساتھ کون تھا؟" صندلین کا لہجہ ٹھنڈا ٹھار ہو گیا۔

"کون ہوتا.... حسنین بھائی خود ہی تھے۔"

"کچھ بولے نہیں۔" اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"اپنی امی کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ آپ کسی کی اولاد کو کیسے پیٹ سکتی ہیں۔ آپ جہاں کہیں گی وہاں شادی کرنے کو تیار ہو تو گیا ہوں میں.... مگر آنٹی جی ایک بار ملاقات اور سبق سکھانے پر ہی زور دیتی رہیں۔"

سجل کا لہجہ اور چہرہ دونوں متبسم تھے۔

"اور امی.... امی خاموش رہیں۔" صندلین کو اہم ترین بات یاد آئی۔

"ہاں جی.... مگر رنگ اڑ گیا تھا۔ فوراً" پانی کی بوتل منہ سے لگا کر خالی کر دی۔ پھر طبیعت خراب ہونے کا کہہ کر گھر آنے کی اجازت لے لی۔ ہاں آنکھوں ہی آنکھوں میں حسنین بھائی کو کہا کہ ان کی اماں کو پتا نہ چلے کہ وہ لڑکی ان ہی کی بیٹی ہے۔"

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں...." صندلین نے کہا۔

"کیا بتاتی کہ آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہی ہیں وہ اماں جی جن سے اب انڈا بھی نہیں چھلتا.... ہاہاہا.... خنجر یا تلوار کیسے اٹھائیں گی۔ ویسے ان کی الزام لگاتی نگاہوں کے وار سہنا بھی مشکل تھا۔"

سجل کے انداز میں شوخی اور ہلکا پن نمایاں تھا۔ جیسے سرا ہاتھ لگ گیا ہو کوئی حل.... کچھ تو کیا جا ہی سکتا تھا۔

وہ اپنی سوچوں میں گم ہو گئی۔ صندلین نے واش روم کی طرف شکستگی سے قدم بڑھائے۔

"اوہ.... !" بری طرح چونک کر اپنے پیروں کو دیکھا جہاں الٹی چپلیں پھنسی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"ایک لائحہ عمل.... ایک ہلکا سا خاکہ جہاں **سجیلہ** بانو کے ذہن میں چکرانے لگا تھا وہیں صندلین خان بھی باقاعدہ پلان بنا چکی تھی۔

اس نے فیصلہ کر کے فون کان سے لگایا "ارمان کو بھیجو۔"

اگلے منٹ میں ارمان حاضر تھا۔

"بیٹھو...." اس نے کرسی کی سمت اشارہ کیا صندلین نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ خوش شکل تو تھا۔ پڑھ بھی رہا تھا۔ وہ اسے بچپن سے جانتی تھی۔ اس کے ابا ڈیڈی کے زمانے سے ان کی گاڑی چلاتے تھے۔ شرافت و کردار سامنے تھا۔ صندلین نے اسے پہلو بدلتے دیکھا تو چونکی وہ بھی حیران پریشان۔ کیا سامنے بٹھا کر دیکھنے کے لیے بلایا تھا۔

"اوں...." صندلین نے سر جھٹکا۔ "تمہاری کچھ شکایتیں موصول ہوئی ہیں۔"

"میری؟" اس نے بے یقینی سے ہاتھ سینے پر رکھا۔

"ہاں.... کافی عرصے سے.... مگر میں اگنور کرتی رہی۔ لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ وقت آ گیا ہے کہ باز پرس کر لی جائے۔"

"جی.... جی پوچھیے۔" وہ سٹپٹایا تھا۔ مگر ہمت کر کے کہہ دیا۔

اس کا ذہن صاف تھا۔ غلطی نہیں ہو سکتی غلط فہمی ہو گی۔ کیونکہ وہ سمجھ دار اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے والا انسان تھا۔ تین چھوٹی بہنیں تھیں ابا اب بڑھاپے کے باعث زیادہ محنت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پڑھنا بھی چاہتا تھا۔ ابا کی صحت کے پیش نظر اکثر ان کی جگہ گاڑی سنبھالتا اور چھوٹے موٹے کام ساتھ ساتھ کرتا۔

"**سجیلہ** کہتی ہے "تم اسے دیکھتے ہو تو دیکھتے چلے جاتے ہو۔"

"کیا....؟" (تو اسے پتا تھی یہ بات.... مگر۔)

"مسکراتے بھی ہو۔" صندلین کا چہرہ سنجیدہ تھا۔

"ہاں۔ اسے دیکھتے ہی دل میں اتنی خوشی بھر جاتی ہے کہ لب خود بخود مسکرانے گنگنانے لگتے ہیں۔" اس نے سر جھکا کر دل میں اعتراف کیا۔

"فرماں برداری ایسے کرتے ہو جیسے حکم کے غلام ہو۔"

"اسے دیکھا نہیں آپ نے .... کسی ملکہ جیسی تمکنت اور حاکمانہ مزاج کی حامل ہے۔ میں بادشاہ بھی ہو جاؤں' تب بھی فرماں برداری کرنا پڑے گی۔"

وہ اب بھی اس کی شان کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ لہٰذا غلامی کے الزام پر گردن اور نیچے کرلی۔

"مگر اس کے ساتھ ہی بولتے بہت ہو۔ ہر بات کا جواب دینا فرض ہے جیسے تم پر۔" اس نے اس الزام پر بے ساختہ سر اٹھایا تھا۔

"یہ تو میں ان ہی کی وجہ سے کرتا ہوں۔ چپ رہوں تو جواب دینے پر اکساتی ہیں۔ جواب دوں' تب بھی انہیں تپ چڑھ جاتی ہے۔ میں تو بس وہی کرتا ہوں جو وہ کہہ دیں۔ آپ یقین کریں۔"

"ہوم ....." صندلین نے ہنکارا بھرا۔ "تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں اس درجہ تابع داری کس وجہ سے ہے؟"

"جی ہاں .... میرا مطلب ہے۔ جی نہیں۔" یہ پرچے کا سب سے مشکل سوال تھا۔

"مجھے علم ہے تمہارے دل میں اس وقت کیا چل رہا ہے۔ لہٰذا اب تم منہ بند نہیں رکھ سکتے۔ شروع ہو جاؤ۔ زندگی میں ایسے موقعے قسمت والوں کو ملتے ہیں جب کوئی پوری توجہ سے آپ کا حال دل سننے کو تیار ہو۔"

صندلین کے لہجے اور انداز میں بے پناہ سنجیدگی اور ایک تنبیہہ آگئی تھی۔ ارمان نے بس ایک منٹ کا توقف کیا۔

"وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"اسے پانے کے لیے کیا کر سکتے ہو۔"

"اپنے آپ کو کھو سکتا ہوں۔" وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ گیا۔ یاد ہی نہ رہا کس کے سامنے بیٹھا ہے۔ پھر صندلین کی پھیلتی آنکھیں دیکھیں تب چونکا وہ۔

"خیر ....!" صندلین نے اپنا پین ٹیبل پر لاپروائی سے ڈال دیا۔ "یہ ایک احمقانہ جواب ہے۔"

(ارمان نے تھوک نگلا۔ خود کو بمشکل کہنے سے باز رکھا۔ محبت ایسی چیز ہے۔ جو بیک وقت حماقت اور عقل مندی کا مظہر ہوتی ہے۔ صندلین نے اسے کوئی محبت کی ماہیت پر پیراگراف لکھنے کو تھوڑی کہا تھا)

"اب اگر میں تم سے کہوں کہ تم نے مجھے جتنے سوالوں کے جواب دیے' وہ میں پہلے سے جانتی تھی تو؟"

ارمان نے بے ساختہ نگاہیں چرائیں۔

"میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں پھر ہم بات کو آگے بڑھائیں گے۔"

پھر صندلین نے منگنی' شادی' نجل کی جذباتی کیفیت اس کا غم صدمہ' غصہ' انتقام' عہد' وظیفہ سب گوش گزار کر دیے۔

وہ حیرت کی تصویر بنا سنتا رہا۔

"کوئی اعتراض؟" صندلین نے اچانک قصے کو فل اسٹاپ لگا کر پوچھا وہ بری طرح چونکا۔

"اب ہمیں یہ کرنا ہے کہ اسے اس بات کا یقین دلانا ہے کہ وہ سب جو ہوا' اس لیے ہوا کہ قدرت نے تمہارے لیے کچھ بہت ہی اچھا سوچ رکھا تھا۔ اللہ نے تو دراصل تمہاری راہیں ہموار کی ہیں۔"

"جی .... جی بالکل۔" ارمان پرسکون ہو کر پوری طرح متوجہ ہوا۔

صندلین چند لمحے کے لیے سوچ میں ڈوبی' ادھر وہ سوچنے لگا۔ روزانہ ایک بوڑھی فقیرنی کو پانچ کا سکہ دیتا تھا اور وہ بڑے جذب سے دعا دیتی تھی۔

"اللہ تیرے دل کی مراد پوری کرے جسے تو چاہے' وہ بھی تجھے چاہے۔ چاند سورج کی جوڑی کہلائے۔ دے جا سخی کوئی دو چار آنے ....."

اور وہ تو پورے پانچ آنے دیتا تھا۔ تو اللہ کے نام پر دینے سے دعائیں قبول ہو جاتی ہیں جلد یا بدیر۔ اس کے یقین پر پختگی کی ایک اور مہر لگی۔

دوسری طرف صندلین نے بولنا شروع کیا تھا۔ وہ

بہت بتا تلا بول رہی تھی جبکہ ارمان کی آنکھیں پھیل کر کانوں تک بڑی ہو گئیں۔ منہ بھی کھل گیا۔ صندلین کی نظروں سے یہ ہونق پن چھپا نہیں رہا۔ وہ جانتی تھی وہ عجیب بات کر رہی ہے۔

مگر ساتھ میں یہ بھی جانتی تھی۔ یہ پلان ہنڈرڈ پرسنٹ کام کرے گا۔ اور اسی یقین کو دیکھتے ہوئے ارمان نے سر اثبات میں ہلانا شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆
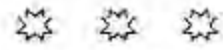
ایک ہفتے پورے ایک ہفتے یعنی سات دن سے روزانہ صندلین خان کی کلاس لگ رہی تھی۔ صبح ناشتے پر۔۔۔ (شکر لنچ کے وقت وہ آفس ہوتی تھی) تو اس کی کسر شام کی چائے پر پوری کی جاتی۔

سجل کے تعلقات سخت کشیدہ تھے صندلین نے صاف کہہ دیا تھا۔

"خبردار جو اپنی صورت بھی مجھے دکھائی تو۔۔۔" سجل نے صورت غائب کرنے کی کوشش کی مگر امی اور آپو جی راہ میں حائل ہو گئیں۔ سجل نے تو کارنامہ انجام دیا تھا۔ وہ گتھی جو کسی سے نہیں سلجھتی تھی۔ اسے حل کرنے میں مددی تھی۔ اسے تو اکیس توپوں کی سلامی دینی چاہیے تھی۔ ساتھ ہی تمغۂ شجاعت بھی۔۔۔ جبکہ صندلین کے خیال میں وہ اس قابل تھی کہ سلامی کے وقت اسے خود بھی کسی توپ کے آگے باندھ دینا چاہیے۔

رات کے کھانے کے بعد امی اور تزئین آپی اس کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ سجل بھی دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔

تزئین آپی۔۔۔ اس کے عین سامنے لیپ ٹاپ سیٹ کر کے نجانے کیا دکھانا چاہتی تھیں۔ ساتھ ساتھ خفا انداز و لہجے میں یقیناً" وہ صندلین ہی کو سخت سست سنا رہی تھیں۔ امی کی خاموشی ان کے آپو جی سے متفق ہونے کا مظہر تھی۔

تب ہی اس نے اسکرین پر ذوہین خان یعنی ذوہی بجو کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان کا مسکرانا بہت گورا اور بہت موٹا سراپا۔۔۔ اور لبوں پر لگی سرخ لپ اسٹک' منکر نکیر کی طرح ان کی دونوں بیٹیاں ایمی اور ڈیمی دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ نگاہ ملنے پر ذوق و شوق سے ہاتھ ہلانے لگیں۔

"ہائیں۔۔۔!" اس نے چونک کر آپو جی کو دیکھا۔ اس کے حساب سے تو ذوہین اور تزئین کا ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانا دس سال پہلے ختم ہو گیا تھا۔

"نانو جانی۔۔۔ خالہ جانی' زینو خالہ!" مائیک کلیئر ہونے پر کمرہ چہکتی آوازوں سے بھر گیا۔ امی اشتیاق کی ماری آگے سرک آئیں۔

صندلین نے چونک کر تصدیقی انداز سے تزئین آپی کو دیکھا۔ "زینو خالہ۔۔۔!" اور زینو خالہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ہونٹوں سے جوڑ کر بھانجیوں کے ہوائی بوسے لے رہی تھیں۔

"یہ کب ہوا؟" اس نے باری باری سب کو دیکھا تھا۔

(سجل کے چہرے پر۔۔۔ "اب کہاں جائیں گی بچ کر"۔۔۔ جیسے تاثرات تھے)

"بس وہ ڈیڈی کی سوچ تھی۔ میں انہیں غلط نہیں کہتی۔ مگر انسان فطرت سے انکار نہیں کر سکتا۔ شادی اللہ تعالیٰ کا نظام ہے۔ زندگی کو آگے بڑھنا ہے۔ دنیا کو آگے بڑھنا ہے۔ دنیا کے ہر مذہب اور معاشرے میں شادی رائج ہے اور مسلمانوں کو تو لازمی کرنی چاہیے ورنہ امت مسلمہ بڑھے گی کیسے۔۔۔؟"

ذوہین بجو نے اپنے پانچویں بچے کے منہ میں فیڈر ٹھونستے ہوئے فکر مندی کا مظاہرہ کیا۔

"اور شادی کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ آج میری بیٹیاں نو برس کی ہیں۔" ذوہی نے دائیں بائیں گردن گھما کر ایمی ڈیمی کو دیکھا۔

"یس مام۔۔۔" دونوں ہم آواز ہو کر بولیں۔

"اور آج سے ٹھیک نو برس بعد میں نے ان کی شادی کر دینی ہے۔"

"واٹ۔۔۔؟" وہ تو وہ امی اور زینو بھی اچھلیں۔۔۔ سجل تو پہلے اعلیٰ و ارفع خیالات جاننے کے بعد مرید ہو

چکی تھی۔ اور مریدوں کا کام صرف سر دھننا ہوتا ہے۔
"اور منگنی سولہ برس کی عمر میں کردوں گی۔"
"اور پڑھائی۔ کیریر..." صندلین کی آواز پھٹ گئی۔
"ارے ہٹاؤ بھی..." ذوہی نے فیڈر منہ سے نکل جانے پر رونے والے بچے کو تھپڑ لگانے کے انداز میں تھپکا۔ "ہوتی رہے گی پڑھائی بھی... اور بن جائے گا کیریئر... شادی آگے بڑھنے سے 'کام کرنے سے روکتی تو نہیں... مجھے دیکھو... پورے آسٹریا میں مجھ جیسی چائلڈ اسپشلسٹ نہیں ملے گی۔"
"ہونہہ... جس عورت کے پانچ اپنے خود کے بچے ہوں۔ اسے چائلڈ اسپیشلسٹ تو بننا ہی چاہیے۔" صندلین نے جل کر خود کلامی کی۔
"اوں! مجھے کچھ کہا۔" ذوہی بجو سے لبوں کی جنبش چھپی نہ رہی۔
سجل نے بدقت اپنی ہنسی روکی۔ امی نے تنبیہی ہنکارا بھرا 'ایسے منہ بھر کے پانچ نہیں کہتے۔
"نہیں... وہ میں کہہ رہی تھی۔ بچیوں کے سامنے ایسے بات نہیں کرتے۔" صندلین اچانک اٹھارہ سو سولہ کی خالہ بن گئی۔
"لو کیوں نہیں... میں نے تو ان کے دماغوں میں سارا پروگرام فیڈ کر دیا ہے۔ ویسے بھی میری بچیوں کو شادی کا بہت شوق ہے۔ ان کا بس چلے تو اسکول بھی شرارہ غرارہ اور ٹیکا جھومر لگا کر جایا کریں۔"
"یس خالہ... مام از رائٹ..." دونوں نے دوبارہ ہم آواز ہو کر تائید کی اوہ خدا...
"اگر اچانک لائٹ چلی جائے تو کیسا ہو... اسے شدت سے خواہش ہونے لگی۔ ذوہی بجو کے ہاں تو دن چڑھا تھا۔ اور وہ تسلی سے اسے سمجھانے کے لیے بیٹھی تھیں۔
"آپ کو ہاسپٹل نہیں جانا تھا۔ اور بچوں کو اسکول۔"
"آج سنڈے ہے۔"
"اف...!" اس نے اپنے اندر خوب ساری آکسیجن بھری۔ "یعنی رات تو کالی ہو گئی۔" تب ہی ہارن کی تیز آواز پر سب بری طرح چونکیں۔
"اللہ خیر..."
"ترمین آ گئی ہے۔" امی نے کہا۔
"ہاں۔ اس کی فلائٹ لیٹ تھی۔" امی نے وال کلاک دیکھا جہاں صبح کے پانچ بج رہے تھے۔
"وہ ایسے کیسے اچانک..." صندلین بیڈ سے اتری۔
"میں نے بلایا ہے اسے تاکہ تمہیں سمجھا سکے۔" امی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
"کیا سمجھائیں گی وہ؟" اس نے ٹھنک کر پوچھا۔
"یہی کہ ماں کو تنگ مت کرو اور شادی کر لو۔"
"ہیں... ں ں ں!" حیرت کی زیادتی نے اسے ساکت کر دیا۔
"ٹی کے اور سمجھائیں گی... وہ بھی شادی کے حق میں..."
ضرور امی کسی غلط فہمی میں جی رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"کیا شادی شادی کا شور مچا رکھا ہے۔" ترمین خان کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ "ضرورت ہی کیا ہے شادی کے جھنجٹ میں پھنسنے کی۔ اچھی جاب ہے نہ کوئی روک ٹوک ہزاروں کی سیلری ہے۔ لاکھوں عورتوں سے اچھی زندگی گزر رہی ہے۔"
اونچی 'لمبی 'بھاری بھرکم... گھنگھریالے بال گدی سے بھی اوپر چڑھے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں سے ذہانت 'کامیابی اور تنفر جھلک رہا تھا۔
ان کا رعب کمرے کی ہر جان دار و بے جان چیز پر طاری ہو گیا تھا۔
"اور کہاں ہے وہ سجیلہ بانو؟" ان کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ سجیلہ کپکپا گئی۔ ان کے بالکل پیچھے کچن میں کھڑی ان ہی کے لیے چائے بنا رہی تھی۔
"جی...!" سامنے آنا پڑا۔

"کب آرہا ہے تمہارا رزلٹ... اور دیکھا ہے میں نے تمہارا منگیتر' وہ بے وقوف آدمی' شکر نہیں کرتیں۔ اس سے بچ گئیں۔ نئی عمارت بنی ہے اسکول کی... نیا اسٹاف ہو گا۔ استانی بن کر عیش سے رہنا۔ اسے بتا دینا کہ تم اس کے بغیر مر نہیں گئیں بلکہ زیادہ اچھی زندگی گزار رہی ہو۔ کچھ آیا سمجھ میں۔"

"جی... جی ہاں... لیکن وہ شادی۔" "اوہ خدا... اس نے اپنی زبان دانتوں تلے دبائی۔ کہنا تو کچھ اور تھا۔ مگر منہ سے نکلا گیا۔

"پھر شادی..." تزمین خان نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی (بمشکل)

"عورت ایک آزاد شخصیت ہے' وہ غلامی کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ مگر مرد کب دیتا ہے برابری... میں تو سمجھتی ہوں کہ..."

آگے کی تقریر سجیلہ بانو کے لیے یقیناً "نئی" ہو سکتی تھی۔ مگر باقی سب کو ازبر تھی۔ اتنی زیادہ کہ سب جانتی تھیں۔ کہاں کوما لگے گا۔ کہاں سوالیہ نشان۔ کب وہ سانس لینے کو رکیں گی اور اگلا جملہ کیا ہو گا۔

امی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اتنی ایمرجنسی میں اسے اس لیے بلایا تھا۔

دوسری طرف صندلین ان سب باتوں کو بچپن سے پہلے ڈیڈی کی زبانی سنتی رہی تھی۔ اور پھر ٹی کے خیالات بھی جانتی تھی۔ مگر اس پر یہ عجیب سا انکشاف ہوا کہ آج یہ جملے اسے اچھے نہیں لگ رہے تھے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ان خیالات کی حمایت کرنے والوں میں سے تھی۔ مگر وہ اس طرح سے بھی تو پہلے کبھی نہیں تھے تو یہ اندر... کہیں کیا ہو رہا تھا۔ کیوں برا لگ رہا تھا۔ دل کیوں چاہ رہا تھا کہ تزمین آپا خاموش ہو جائیں پل بھر جاتا تھا کہ وہ کہہ ہی دیتی' بس کریں آپا!۔

مگر اسے تکلیف نہ کرنا پڑی۔ تزئین نے یکدم سر اٹھایا تھا آنکھوں میں ناراضی آمیز قطعیت تھی۔

"باس... میں نے تمہیں اس لیے اتنی ایمرجنسی میں بلایا تھا ٹی کے؟" ٹی کے بری طرح چونکیں۔ امی کی غصیلی نگاہیں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔

"اوہ...!" ٹی کے کو وہ سب ہدایات یاد آنے لگیں جو تزئین نے فون پر دی تھیں۔

"لیکن... میں یہ بھی سمجھتی ہوں۔" امی اور تزئین کی گھوریوں سے انہیں یاد آنے لگا کہ وہ کیوں بلائی گئی ہیں۔ "کہ اگر لائف میں کوئی اچھا مل رہا ہو تو شادی کر لینے میں کوئی حرج بھی نہیں..."

"ہائیں؟" صندلین نے چونک کر سر اٹھایا۔ سجل نے بھی بے یقینی سے پہلے میڈم ٹی کے کو دیکھا پھر صندلین کو... یہ اچانک ٹریک بدل کر گاڑی کسی اور راستے پر سے کیسے گزرنے لگی۔ چند لمحے اور گزرتے تو سجل نے تو ٹی کے کے دونوں ہاتھ تھام کر بیعت کر لینی تھی۔ شادی کے نام سے توبہ کرنی تھی۔ مگر ادھر تو مرشد ہی اپنے قول سے پھر گئے۔

"اور تم سجیلہ بانو۔" ٹی کے ترچھی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑیں۔ "میں نے سنا ہے تم اپنی شادی ہو جانے کے لیے کوئی وظیفہ وغیرہ کر رہی ہو۔"

"جی... جی ہاں... جی نہیں' بالکل نہیں۔" اس کے حواس جاتے رہے۔

"خیر... خیر اگر کر بھی رہی ہو تو کوئی حرج نہیں... آئی لائک اٹ بی کاز۔" ٹی کے وقفہ دے کر سب کو دیکھا۔ جو بے یقینی کی حد پر تھیں۔ "مجھے تمہاری یہ اسپورٹس مین اسپرٹ اچھی لگی۔ میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو اپنے لیے خود کوشش کرنی چاہیے ایسے لوگ بہت بہادر ہوتے ہیں اور بہادری مجھے ہمیشہ اٹریکٹ کرتی ہے۔ اس لیے کیپ اٹ اپ۔"

"جی...!" سجل کی جی ایسے تھی جیسے لمبی سیٹی... ای ای ای جی۔

"اچھا اب ادھر کھڑے ہو کر دانت نکالنے کے بجائے باہر جاؤ اور دیکھو' اخبار آیا کہ نہیں... صبح کے سات بجنے کو ہیں۔ کیا باسی خبریں پڑھوں گی میں۔"

ٹی کے نے اپنے مخصوص لہجے میں حکم جاری کیا۔ سجل نے فرماں برداری سے سر ہلایا۔

"جی... جی ابھی لائی۔" ایک قدم بڑھایا پھر کچھ یاد آیا "اخبار؟ باہر سے لاؤں؟" اس کے قدم زمین سے چپک گئے گویا۔

"ہاں... باہر سے باہر مطلب گھر سے باہر گیٹ پر۔" ناٹ ابروڈ ٹی کے نے اچنبھے مگر حکمیہ انداز سے کہا۔

"جی... اچھا۔" وہ گھبرا کر تیزی سے نکل گئی۔

صندلین نے غیر محسوس انداز سے ذرا سا سرک کر دروازے سے نظر آتی سجل کو دیکھا۔ وہ کمرے سے تو تیزی سے نکلی تھی۔ مگر برآمدے میں گومگو کے عالم میں کھڑی تھی۔ چہرے پر گھبراہٹ آمیز... نہیں خوف زدہ سی الجھن تھی۔ نجانے کیا امر مانع تھا۔ آگے قدم بڑھانے میں...

صندلین نے گھڑی دیکھی۔ وقت کی پابندی اور غیر حاضر نہ ہونے کا حکم تو اس نے سختی سے دیا تھا۔ اور اس نے شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ تو...

☆ ☆ ☆
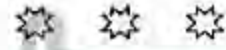
"آئی ایم سوری آپو جی!" حسنین خان کی آواز میں قطعیت' ناراضی اور اجنبی پن نمایاں تھا۔ "آپ کہتی ہیں وہ مان گئی ہے۔ یقیناً "مان گئی ہوگی۔ مگر آپ سب کے سمجھانے بجھانے پر... نصیحتوں سے' منتوں ترلوں سے..."

"ایسا نہیں ہے حسنین!" تزئین نے بہت رسانیت سے تردید کرنا چاہی۔

"ایسا ہی ہے آپو جی!" وہ اپنے بیان سے انچ بھر نہ سرکا۔

"ایسا کرتی ہوں۔" آپو جی کھڑی ہوئیں۔ "اسے بھیجتی ہوں' تم اس سے خود پوچھ لو..."

"اب بھی آپ بھیجیں گی۔ وہ خود نہیں آئے گی۔"

"ارے بابا! کب سے دروازے کے اس طرف کھڑی ہے۔ آجاؤ صندلین...!"

وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہی مخصوص بے نیاز انداز۔ وہ گردن اٹھائے بیٹھی تھی۔ نگاہیں ایکوریم میں تیرتی مچھلیوں پر جمی تھیں۔

نہ شرمندہ تھی نہ معافی کی طلب گار... مغرور حسینہ بے نیازی سے پرے... وہ ٹکٹکی باندھے سخت نگاہوں سے اسے گھورے جا تا تھا۔

"میرا خیال ہے' میں چلتا ہوں۔" اس کے ضبط کی طنابیں چھوٹ گئیں' کھڑا ہو گیا۔

"یہ کافی نہیں ہے کہ مان گئی ہوں۔" وہ یکدم بول پڑی۔ انداز روٹھا سا تھا۔

"میں جاننا چاہتا ہوں' انکار کیوں کیا تھا اور یہ کہ اب اقرار کیوں کر رہی ہو۔"

وہ شاید قسم کھا کر آیا تھا۔ اس کی مردانہ انا کو اس روز کے پر محبت اظہار پر کیے جانے والے سخت انکار سے ضرب لگی تھی۔ اور زیادتی کا احساس تو صندلین کے دل میں بھی تھا۔ ہاں اتنا حق تو وہ رکھتا تھا کہ...

"میں صرف دوسرے حصے کا جواب دوں گی۔" اس نے بہت سوچ سمجھ کر کہا۔

"ایک پھانس تھی دل میں گڑی ہوئی۔ جب وہ نکل گئی تو احساس ہوا کہ میں اب خسارے میں رہوں گی۔"

"کیسا خسارہ...؟" حسنین خان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"ایک محبت کرنے والا شخص زندگی سے چلا جائے تو پیچھے پچھتاوے کے سوا کیا بچتا ہے۔"

"کون شخص...؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"حسنین خان...!" اس نے اک نظر دیکھا بس... اور منہ موڑ لیا۔

"حس نین خا... ن...!" وہ بری طرح چونکا تھا اور اپنا نام لینے ہی میں زبان لڑکھڑا گئی۔ "دوبارہ کہو..." وہ جست بھر کے سامنے آگیا۔ اس نے انکار میں سر ہلا کر لب کچلے۔ "ایک ہی بار کہنا تھا۔"

"میں دوبارہ سننا چاہتا ہوں۔" وہ شاید اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔ اس نے کسی فوجی جوان کی طرح اپنے بازو پیچھے کس لیے۔ کٹھور ہو گئی۔ نگاہیں دیوار پر ٹکا دیں۔ اسے رونا آنے لگا تھا۔

وہ لڑکے ہوتے ہیں جو اظہار پر سینہ پھلاتے ہیں۔

لڑکیاں غلطی سے عیاں ہو بھی جائیں تو خود سے خفا ہو جاتی ہیں۔ مجھے نہیں کہنا چاہیے تھا۔

"بس اب مجھے پہلی وجہ کہتیں سننی ..." وہ شگفتگی سے بولا "ویسے بھی وہ میں جانتا ہوں۔"

"کیا...؟" وہ اچھل پڑی "کیسے؟"

"آپو جی نے خود بتائی کہ تم ان کی وجہ سے..."

"اوہ یہ انہوں نے کیا کر دیا۔" اس کا چہرہ زرد ہوا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، میں اتنا گھٹیا آدمی ہوں کہ ان کا مذاق بناؤں گا یا طعنہ دوں گا؟"

صندلین منہ سے کچھ نہیں بولی۔ مگر اس کے چہرے کی بے یقینی پر وہ مسکرا دیا۔ "منہ سے صفائی دینے اور وعدے کرنے اور خود کو بہت اچھا بتانے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ آپ ثابت کر دیں۔" اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ صندلین کو یقین آنے لگا تھا۔

"آپو جی نے آپ کو کیا بتایا؟"

"ہاں میں تمہیں بتاتا ہوں جو انہوں نے کہا۔

"ہاں وہ میری زندگی کا ایک عجیب اور ناقابل یقین فیز تھا۔ مجھے اب خود پر حیرت ہوتی ہے میں جو کہ اتنی مضبوط تھی۔ اتنی بے بس کیسے ہو گئی۔ کہ خود پر سے اختیار ہی کھو دیا دراصل وہ میرا خود پر غصہ تھا کہ میں بھی ذوہین جیسی ہمت دکھا سکتی تھی۔ میں خود سے ناراض تھی۔ مجھے پیچھے ہٹنا نہیں چاہیے تھا۔ جو رشتہ فطرت تھا۔ جو جائز تھا پسندیدہ تھا۔ میں اس کے حق میں کھڑی نہ ہو سکی۔ فیصلہ کرنے کی ہمت نہ پیدا کر سکی۔ دلیل نہیں دینی آئی۔ اور ذوہین پر غصہ بھی آیا تھا۔ اس نے کیسا تضحیک آمیز انداز اپنایا تھا۔ شاید وہ ایسا نہ کرتی تو .... میں ڈیڈی اور ٹی کے کے آگے ایک بار تو کھڑی ہوتی۔

اس نے میری پسندیدگی کا مذاق نہ اڑایا ہوتا۔ اس کا دل زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ میری خواہش تماشا، مذاق، بے وقوفی تھی۔

لیکن پھر میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کاتب تقدیر نے یونہی لکھا تھا۔ تب میں نے ذوہین کو معاف کر دیا۔ سب کو کر دیا۔"

اور صندلین بے وقوف ہے۔ اسے میں بتاؤں گی کہ تنہائی کیسا زہر ہے اور تب جب آپ کو پتا ہو کہ دنیا میں ایک شخص تھا جو آپ کی ہاں کا منتظر رہا۔ تب تو سوائے پچھتاوے کے کچھ نہیں بچتا۔"

"یہ سب آپو جی نے تمہیں کہا۔" صندلین نے اسے ٹوک دیا جو رٹو طوطے کی طرح آپو جی کے اعترافات سنائے چلا جا رہا تھا۔

"ہاں۔ میں اپنی طرف سے تو بتانے سے رہا۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے۔ بھیجوں اپنی اماں کو؟ مگر یہ بات یاد رکھنا۔۔۔ وہ سالوں سے اس لڑکی کے نام پتے کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ جس نے ان کے بیٹے کی زندگی کے قیمتی ماہ و سال تباہ کیے۔ ان کو کیسے ڈیل کرنا ہے۔ یہ تمہارا مسئلہ ہو گا۔"

وہ مزے سے ممکنہ خطرے کو بتانے گا۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں وہ نہ بھی بتاتا تب بھی صندلین خان نے ہزار بار نگاہیں چرائی تھیں۔ جب اس کی اماں دانت کچکچا کچکچا کر "مٹھیاں بھینچ کر اس نامعلوم لڑکی کو کوسا کرتی تھیں۔ یعنی کہ۔۔۔

وہ سٹ پٹائی اور تیزی سے دماغ چلایا۔

"تم ایسا کرو حسنین! اپنی اماں سے کہنا۔۔۔ اس لڑکی پر لعنت بھیج کر تم خاص ان کی خوشنودی کے لیے طوعا" کرہا" مجھ سے شادی پر آمادہ ہو گئے ہو ذرا۔۔۔" اس کا چہرہ بات مکمل کرتے ہی تمتمانے لگا۔

حسنین نے اپنی ہنسی بمشکل روکی۔

"میں ایسا کچھ نہیں کروں گا صندلی۔۔۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔"

اسے اس جواب کی قطعا" توقع نہیں تھی' وہ بھرپور احتجاج کرنا چاہتی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا اس نے اسے صندلین نہیں۔۔۔ صندلی۔۔۔ صندلی پکارا تھا۔ وہ کھل کر مسکرانا چاہتی تھی۔ تب ہی دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ دونوں چونکے۔

یہ حواس باختہ سی سجل تھی۔ جو ان دونوں کو دیکھے بغیر امی کے کمرے میں گھسی تھی۔

"نہیں' میں یہ وظیفہ پورا نہیں کر سکتی۔" وہ مسلسل انکار میں سر ہلا رہی تھی۔

"نہیں سجیلہ بانو۔" امی نے آنکھیں مقدور بھر پھیلائیں۔ "یہ نہ کرنا وظیفہ ادھورا چھوڑنے سے اچھا نہیں ہوتا ہے' الٹ ہو جاتی ہیں چیزیں۔"

"کچھ الٹ نہیں ہو گا۔۔۔ بس میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا۔" وہ ڈٹی ہوئی تھی۔

"اب اس سے زیادہ اور کیا الٹا ہو گا۔" اس نے جلے انداز میں خود کلامی کی۔

"کیا۔۔۔ کیا الٹا۔۔۔ ہو گیا؟" امی اور صندلین نے آنکھوں آنکھوں میں تیر نشانے پر لگا ہے کا پیغام سنایا۔

"بس آپ اس ارمان کو بلوائیے۔۔۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"ارمان۔۔۔" آپو جی تو کچھ نہ سمجھیں۔۔۔ البتہ صندلین اور امی کا چہرہ رنگا گیا' بمشکل خود پر قابو پا کر حیران انداز اپنایا۔

"ارمان کا کیا ذکر۔۔۔؟"

"اسی کی بات ہے۔" سجیلہ بانو نے ہاتھ مسلے۔

"تم صاف بات کیوں نہیں کرتیں سجیلہ بانو۔۔۔ مجھے نماز بھی پڑھنی ہے اور تم وظیفہ مکمل ضرور کر لینا کوئی بہانا نہیں۔۔۔ میں نے پہلے ہی سمجھایا تھا۔۔۔ سمجھایا تھا کہ نہیں۔" امی غصے میں آ گئیں۔

اور سجیلہ بانو نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ امی نے اپنے چہرے کی سختی برقرار رکھی۔ تزئین ہی نے اسے خود سے لپٹایا' پچکارا اور پوچھا۔ صندلین اجنبی رہی۔ (اسی کا تو سارا منصوبہ تھا۔ مگر نتیجہ اتنی جلدی آئے گا یہ اندازہ نہیں تھا۔)

آپو جی کے دلار کے آگے سجل کا انکار ٹک نہ سکا۔ روتی شکل۔ بے یقین آنکھوں کے ساتھ۔ اس نے آغاز لیا۔

"اتنے سارے وظیفے کر رہی تھی مگر شادی کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

پھر اماں جی نے ایک وظیفہ بتایا۔۔۔ کہ بڑا جلالی' کمالی ہے۔ گیارہ دن تک کرنا ہو گا اور کوئی گڑبڑ نہیں کی تو تیسرے دن ہی خوش خبری ملے گی۔ وہ بندہ خود

دروازے پر آجائے گا۔ بھلے خلیج فارس میں کیوں نہ رہتا ہو۔"

(صندلین نے منہ پر پرسوچ انداز سے ہاتھ رکھا۔ دراصل ہنسی روکنی تھی۔ امی بھی کمال ہیں۔ خلیج فارس سے کیا اڑ کے آئے گا۔ ویزے یا پاسپورٹ کا جھنجھٹ ہی نہیں.... ہنسی امی کو بھی آرہی تھی بلکہ پاسپورٹ کا دفتر ہی بند کردیا جائے۔ وظیفہ کے ذریعے ہی ادھر سے ادھر.... ادھر سے ادھر)

"تیسرے دن نہیں دوسرے ہی دن...." اس نے ہچکی بھری۔

"ہاں ہاں بولو....!" آپو جی اشتیاق و تجسس سے مرنے کو ہوگئیں۔ کمر سہلانے لگیں۔

"تیسرے ہی دن سے.... تیسرے ہی دن جب صبح میں اخبار اٹھانے دروازے پر گئی تو.... (صندلین کے لیے ہنسی روکنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگیا)

"ہاں تو.... آگے بولو۔" آپو جی کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔ انہیں کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا۔

"سامنے وہ کھڑا تھا نہ کوئی کام نہ مقصد.... بھلا اتنی صبح صبح کوئی کسی کے دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔"

"لیکن کون....؟"

"اور تیسرے دن ہی کیوں.... چوتھے یا پانچویں.... یہاں تک کہ آج تو دن ہونے کو آرہے ہیں۔ لاکھ کوشش کروں کہ ایسا نہ ہو مگر پھر بھی جس پہلے شخص کو صبح اٹھتے ہی دیکھتی ہوں وہ.... وہی ہوتا ہے۔"

"تو یہ تو بہت اچھی بات ہے ناں۔ تم نے ہی تو کہا تھا۔ اللہ کچھ ایسا کردیں کہ وہ بندہ خود بخود سامنے آجائے۔ ادھر امی کا بتایا وظیفہ کام کرگیا۔" صندلین آگے آئی۔ تزئین البتہ دم بخود تھیں۔

"مگر وہی کیوں....؟"

"اے سجل....!" صندلین نے تنبیہی انگلی اٹھائی "اپنی زبان سے مت پھوٹو تم نے کہا تھا ناں کہ خود سے فیصلہ کیا نہیں جاتا.... دل نہیں مانتا۔ اب تمہارا مسئلہ حل ہوگیا ہے تو...."

"بس آپ اسے بلوائیں اور پوچھیں کہ وہ کیوں ہمارے دروازے پر آکر کھڑا ہوتا ہے۔" وہ بازپرس سے کم پر تیار نہیں تھی۔

صندلین سر ہلاتے ہوئے اٹھی۔ پہلے ایک میسج سینڈ کیا (کام ہوگیا ہے آجاؤ) پھر سارے کمرے میں اس کی آواز گونجنے لگی بارعب، غصیلی۔

"نورا! آؤ...."

وہ اگلے آدھے گھنٹے میں حاضر.... واہ تیری تیزیاں.... پھرتیاں۔ سجل اس کمرے میں تھی۔ منہ البتہ پھیر رکھا تھا۔ غلطی سے بھی نظر پڑ نہ جائے کہیں۔ البتہ پورا وجود سماعت بنا ہوا تھا۔

"مجھے تو خود پتا نہیں چلتا ہے۔ نجانے کیا ہوجاتا ہے۔ اچھا بھلا گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہوں۔ اچانک رات بارہ کے بعد جیسے کوئی جھنجھوڑ کر اٹھا دیتا ہے۔ مجھے لگتا ہے، کوئی مجھے کمرے سے نکلنے کا کہہ رہا ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ یہ کیفیت کوئی سوا گھنٹہ رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ بس چل پڑنے کو کہہ رہا ہے۔ دوبارہ سونے کی کوشش میں نیند اول تو آتی نہیں۔ اگر آجائے تو میرون چادر میں کوئی لڑکی ہے، شکل مجھے نظر آتی نہیں۔" وہ سخت الجھے لہجے میں اٹک اٹک کر بتا رہا تھا۔

دوسری طرف سجل کے سر پر پہاڑ ٹوٹا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر صندلین کو دیکھا۔ سجل کی نماز کی چادر میرون تھی۔ جبکہ صندلین نے بھی ایسے ہی چونک جانے والے انداز سے سجل کو دیکھا تھا۔ یعنی.... یعنی کہ سجل پر کپکپی طاری ہوگئی۔

"پھر نجانے کیا ہوتا ہے، میرا خود پر سے اختیار کھو جاتا ہے اور ہوش آتا ہے تو آپ کے گھر کے باہر کھڑا ہوتا ہوں۔ واپس جانے کو دل ہی نہیں کرتا۔"

وہ حیرانی، بے بسی لاچاری کی اس حد پر تھا جیسے کوئی اونچی چٹان کے جڑ کھائے درخت کی سب سے کمزور شاخ پر محض اپنی شرٹ کے بٹن کے سہارے اٹکا لٹک رہا ہو۔ اف....

"کل تو حد ہوگئی۔ ابو نے مین گیٹ پر تالا ڈالا تو چابی

نجانے کہاں رکھ دی اور رات کو اسی جادوئی کیفیت میں جب مجھے چابی نہ ملی تو میں دیوار پھاند کر یہاں آنے کے لیے نکل آیا۔"

ارمان نے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال جکڑ لیے۔

"دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی۔ ایسا جلالی کمالی.... آہ اسے کیا ہوا۔"

امی جھومتے جھومتے چونکیں۔ سب نے امی کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ منہ پھیر کے بیٹھی تجل جست لگا کر اچھلی تھی اور کمرے سے بھاگی۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا یا اسے پکارتا' وہ واپس لوٹ آئی اور اس کے ہاتھ میں وہی اس کی میرون چادر تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتی' ارمان نے آگے بڑھ کر چادر جھپٹ لی۔

"یہی.... یہ ہی تو وہ چادر ہے اوہ خدا.... یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟" وہ چادر کو ہاتھوں میں دبوچے سینے سے لگائے درشتی اور حق سے پوچھ رہا تھا۔

"میرے پاس۔" تجل نے زیر لب دہرایا۔

اگلے پل وہ پورے قد سے زمین پر آرہی۔

سب کی حیران چیخیں بھی اسے بے ہوش ہونے سے نہیں بچاسکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

صندلین اور حسنین کی شادی اتنی جلدی نبٹائی گئی جیسے خدشہ ہو ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔

امی نے سارے خاندان کو اکٹھا کیا۔ ڈیڈی یونہی زندگی بھر سوچتے رہے ان کے بہن بھائی ان سے جلتے ہیں۔ وہ سب اتنے خوش تھے کہ امی اس خلوص کو دیکھ دیکھ کر روتی رہیں۔ (اختلاف رائے کا یہ مطلب تو نہیں.... ہم جلتے ہیں۔ اس لیے تنقید کرتے ہیں)

امی کی ٹانگوں میں اب بیٹی کے جہیز بنانے والا دم خم نہیں تھا مگر ان کا جوش دیدنی تھا۔ وہ واکر کے سہارے گھسٹتی زرق برق کپڑوں کی دکان میں گھسی رہتیں....

"جہیز ایک لعنت ہے" صندلین سخت ناراض تھی کہیں کھڑے ہونے کی جگہ ہی نہیں تھی۔ سارے کامن میں کارٹن ہی کارٹن.... اللہ جانے آپو جی نے کیا سوچ کر دنیا جہان کی ہر چیز اکٹھی کی تھی۔ کسی کو خبر نہیں اس وقت سارے گھر والے حیرت سے کبھی ان کو دیکھتے کبھی سامان کو۔

"ہاں تو جہیز ایک لعنت ہے اور ہم تم پر یہ لعنت بھیجتے ہیں۔ ہاہاہا۔"

"آپو جی....!" اس کے احتجاج پر وہ کہاں کان دھرنے والی تھیں۔ ٹرک بھر کے روانہ....

"یہ تحفہ ہے چھوٹی.... تم بہنا ہو اور پیاری مجھے ایسے ہو جیسے بیٹی.... اور پھر میرے پیسے پر تم سے بڑھ کر کسی کا حق ہو سکتا ہے۔ بے کار ہی جاناناں۔"

وہ بہت پیار سے کہہ رہی تھیں۔ پر صندلین کے دل کو چوٹ پہنچی۔

"یہ نہیں لیتیں تو مجھے دے دیں۔"

تجل کو نیا آئیڈیا سوجھا.... دولہا بھی شہری اور جہیز بھی شہری واہ۔

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے تمہیں بھی ملے گا۔ مگر ابھی تو تم نے بی ایڈ کرنا ہے۔ اپنے گاؤں کا اسکول آباد کرنا ہے۔ ٹی کے نے شرط رکھی ہے۔"

"ہاں ہاں' وہ تو مجھے پتا ہے۔ ایک ہی اسکول ہے بغیر استانی کا.... میرے اس منگیتر کے بچے بھی وہیں داخلہ لیں گے۔ روز مرغا بناؤں گی اور فیل تو لازمی کروں گی۔ ایک ایک کلاس میں چار چار سال نہ لگوائے تو میرا نام۔"

"ہیں....!" آپو جی اور صندلین ہکا بکا رہ گئیں۔

صندلین کی شادی کے پورے دس روز بعد **سجیلہ** بانو اور ارمان کی منگنی کی تقریب آج شام کو منعقد کی جا رہی تھی۔

دلہن سے زیادہ پرجوش و فکر مند آپو جی تھیں۔ سب نے وہی لباس استعمال کرنے تھے جو ابھی شادی پر بنے تھے مگر آپو جی خصوصی جوڑا بنوا کر لائی تھیں۔ صندلین کی شادی پر بھی ان کا جوڑا' زیور اور انداز دلہن سے کہیں بڑھ کے تھے۔ سی گرین شرارہ.... پھول اور زیور ٹیکا جھومر تک۔

ذہین بجو کے لیے... اور ان کی بیٹیوں کے لیے شرارے غرارے بھڑکیلے شوخ رنگ خریدتے ہوئے جو خوشی اور طمانیت چہرے پر تھی۔

بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئیں۔

"تم ارے تم نے اب تک کچھ نہیں پہنا...؟" نگاہ ٹی کے پر جم گئی۔ وہ اپنے بھاری بھرکم چہرے پر سٹر کے برابر ٹاپس پہنے افسر بن کر ہی بیٹھی تھیں۔ چہرے پر خشونت... بھنویں سکڑی ہوئی تھیں۔ آنکھوں سے بھی برہمی جھلکتی تھی۔

"یہ چین پہن لو..." آپو جی نے ایک موٹی چین نکالی اور انکار سے پہلے ان کے گلے میں ڈال دی۔ اب وہ کچھ اور ڈھونڈ رہی تھیں۔ "یہ ٹاپس اتار کر جھمکے پہنو اور یہ ٹیکا بھی لگالو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔" وہ اچھلی تھیں۔

"ارے خوشی کا موقع ہے ٹیکا تو لگانا پڑے گا۔" انہوں نے پن بھی ڈھونڈ نکالی۔

"کیوں یہ کوئی حفاظتی ٹیکا ہے جو لازمی لگانا ہے۔" ٹی کے جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

آپو جی کے ہاتھ اور نظر ساکت ہو گئی۔

"ٹی کے کو کیا ہو گیا تھا۔ ان کے جملے پر زور کی ہنسی آ سکتی تھی مگر وہ انداز... اور بھنا کر بہت دور جا کر الگ تھلگ بیٹھ جانا۔ وہ کیوں...

ساری تقریب کے دوران آپو جی تمام گہما گہمی کا حصہ ہونے کے باوجود اس کونے کو نظر انداز نہیں کر پا رہی تھیں۔ جہاں وہ بیٹھی تھیں۔

اور اسی کونے پر امی کی نگاہیں بھی جکڑی گئی تھیں۔

انہوں نے تو عام سی بچی پیدا کی تھی۔ تزمین خان... ہاں وہ خام سونا تھی مگر وہ تو ہر بچہ ہوتا ہے۔ توجہ' تربیت' محنت' شوق اسے سونا بناتا ہے پھر وہ کندن بن سکتا ہے۔ مگر ان کی تزمین پیتل بن گئی اور یہ اس نے خود نہیں کیا تھا۔ عام سی لڑکی کو خاص بنانے کے چکر میں ڈیڈی نے اسے فطرت سے دور کر دیا۔

امی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔ ٹی کے کا چہرہ دھندلا ہو گیا۔ وہ بہت دور بیٹھی سب سے لاتعلق اپنے سلیٹ برابر موبائل پر انگلیاں چلا رہی تھیں۔ اس کے عہدے اور تعلیم کی چمک سے پیشانی جگمگا رہی تھی۔

مگر اتنے بڑے ہجوم میں بھی اکیلے پن کی وہ تاریکی ماں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

یہ ساری رونق اس کے لیے فضول تھی۔ یا کوئی احساس زیاں...؟ نہیں... امی کا دل مٹھی میں آگیا۔

تو پھر میرے مالک... اسے بے خبر ہی رہنے دینا۔ اگر جو آگہی کے در کھل جائیں اور حقیقت کی دنیا روشن ہو جائے۔ تب جینا کتنا مشکل ہو گا تو بس پھر وہ اسی افسری کے زعم اور کامیابی کے نشے میں جھوم لے۔

تو اس سب کا قصور بھی ٹی کے 'کے ڈیڈی کے نام لگا۔

لیکن نہیں وہ سارا الزام ان پر نہیں لگا سکتیں۔ وہ بھی مجرم تھیں انہوں نے بھی ان باپ بیٹی کو ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ تو ثابت ہوا انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔

کائنات اور یہ زمین پورا ایک نظام ہے۔ ایک پلان ہے۔

اعتدال ہے۔ توازن ہے۔

کفران نعمت' ناشکری اور فطرت کے اصولوں سے انحراف کبھی بھی بابرکت نہیں ہو سکتا۔

☆

عفت سحر طاہر

خواب سلسلے کا

تیز برستی بارش اور ساعتوں میں کسی کے تیز چبھتے جملے' یہ خواب اس کی زندگی کا سب سے ڈراؤنا خواب تھا جو اسے یہ یاد دلاتا تھا کہ اس نے کسی سے ان سب کی بربادی کا وعدہ کیا تھا۔

آفندی ہاؤس میں اصول پسند آغا جان اپنے دو بیٹوں مبین آفندی اور سہیل آفندی' ان کی بیویوں اور بیٹیوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں اپنا پوتا نہ ہونے کا بہت دکھ ہے پوتیاں ان کی اس بات سے بہت چڑتی ہیں۔

وقار آفندی کو ایک گانے والی زرنگار سے محبت ہو جاتی ہے۔ وقار آفندی زرنگار کو نکاح کی آفر دیتا ہے، تو وہ غائب ہو جاتی ہے۔

طلال اور مہ ماہ یونی ورسٹی میں ایک ساتھ پڑھتے ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ طلال کے گھر والے مہ ماہ کا رشتہ لے کر آتے ہیں جو قبول کر لیا جاتا ہے۔

مبین آفندی' آغا جان سے بات کرتے ہیں کہ فاران آفندی کو معاف کر دیا جائے اور اسے اس کے بیٹے اور بیوی کے ساتھ آفندی ہاؤس بلا لیا جائے۔ فاران آفندی کو چھوٹے بھائی وقار آفندی کی حمایت اور آغا جان کی مخالفت کی وجہ سے گھر بدر کر دیا گیا تھا۔ پوتے کی خاطر آغا جان مان جاتے ہیں' تائی جان' مبین آفندی کی بیوی اس بات پر بہت ناراض ہوتی ہیں۔ فاران آفندی پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں' ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد بہت ناراض ہوتے ہیں۔

وقار آفندی آخر کار زرنگار کو تلاش کر لیتا ہے۔ اور اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ اسے باعزت طریقے سے اپنے نکاح میں لینا چاہتا ہے اور اپنے خاندان میں متعارف کرائے گا۔

آفندی ہاؤس میں بے چینی سے فاران کا انتظار ہو رہا ہوتا ہے لیکن وہ نہیں پہنچ پاتے ان کا فون بھی بند ہوتا ہے۔ تیسرے دن مبین آفندی کا فاران آفندی کے فون پر رابطہ ہوتا ہے تو وہ آغا جان کو بتاتے ہیں کہ فاران آفندی اب اس دنیا
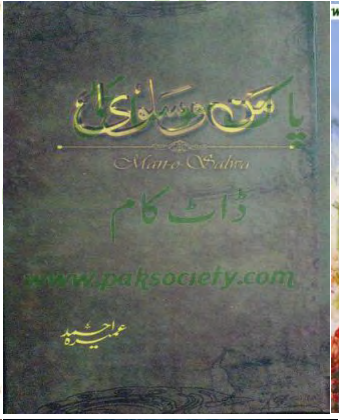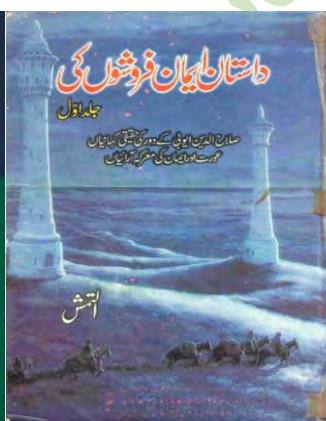
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں نہیں رہا ہے۔
آغا جان یہ خبر سن کر ٹوٹ گئے۔ فاران آفندی کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان میں کی گئی۔ ان کی بیوی ثمرہ اور بیٹا موحد پاکستان آ گئے۔ مہماہ کی منگنی طلال سے طے ہو چکی ہے جس پر تزئین حسد کرتی ہے۔ موحد اور ثمرہ آفندی ہاؤس آ جاتے ہیں۔ موحد بہت ہینڈسم اور خوبرو ہے۔ آغا جان اس سے محبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن موحد کو ان سب سے نفرت ہے۔ زرگل بائی کو قیمت دے کر وقار آفندی نے زرنگار سے شادی کر لی تھی لیکن اس شادی کو آغا جان نے قبول نہیں کیا۔ ہاں نے کہا کہ وہ زرنگار کو طلاق دے دے۔ انہوں نے دوپٹا قدموں میں رکھ دیا۔ گھر کے دیگر افراد بھی مخالف تھے۔ صرف ثمرہ بھابھی جو فاران آفندی کی بیوی تھیں۔ وہ وقار کے ساتھ تھیں۔ وقار آفندی کا بیٹا نمیر آفندی سومیہ کا دوست ہے۔ سومیہ اسے پسند کرتی ہے۔ ثمرہ اچانک یہ کہہ کر دھماکا کر دیتی ہیں کہ مہماہ اور موحد کا رشتہ آغا جان نے بچپن میں طے کر دیا تھا۔

پانچویں قسط

مہماہ بظاہر بڑے اعتماد مگر در حقیقت لرزتے دل کے ساتھ گاڑی تک آئی تو اندر ملاحہ اور فرزین کو پہلے سے براجمان اپنے ہاتھوں میں تھامے کون سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر وہ گاڑی سے دو قدم دور ہی بری طرح ٹھٹک گئی۔
موحد اسے نظر انداز کرتا ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر بیٹھ گیا تھا۔
مہماہ نے اگلی نشست کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھی۔
وہ الجھی الجھی سی پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہو گئی۔ کیا آغا جان کسی کام کی غرض سے گاڑی سے اترے تھے؟ اسے اتنی جلدی واپس پا کر ملاحہ نے حیرت سے سرگوشی کی۔
"طلال بھائی چلے گئے کیا۔۔۔؟" مگر مہماہ کی ساری توجہ گاڑی اسٹارٹ کرتے موحد پر تھی۔
"آغا جان کہاں ہیں۔۔۔؟" اس نے بھنچے ہوئے لہجے میں ملاحہ سے پوچھا تو آواز دھیمی ہی تھی۔
"آغا جان۔۔۔! مجھے کیا پتا۔۔۔ گھر پہ ہی ہوں گے۔" ملاحہ گڑبڑائی۔ اسے مہماہ کے سوال کی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی۔
مگر مہماہ کی سیٹ پر تو جیسے کیلیں اگ آئیں۔ بے وقوف بنائے جانے کے احساس پر ذلت و اہانت کی شدید کیفیت حاوی ہوئی تو رگوں میں خون کی جگہ گویا شرارے دوڑ اٹھے۔
"تم نے جھوٹ بولا مجھ سے۔۔۔۔۔؟" شرربار نگاہوں سے موحد کو دیکھتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولی تو غم و غصے کے مارے آواز پھٹ سی گئی۔
"آپی۔۔۔" ملاحہ نے برافروختہ ہو کر اس کا ہاتھ دبایا۔ فرزین بھی گھبرا گئی تھی۔ موحد گاڑی مین روڈ پر لے آیا تھا۔ اطمینان سے بولا۔
"تو کیا تم چاہتی ہو کہ سچ میں یہاں آغا جان ہوتے؟"
"تم۔۔۔ تم ایک انتہائی بیہودہ اور اول درجے کے جھوٹے شخص ہو۔ تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ تم اس طرح کی فضول سچویشن کری ایٹ کرتے۔"
تذلیل کا گہرا احساس اس کے دل کو کچل رہا تھا۔ چہرے سے تپش کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ جی تو چاہ رہا تھا تھپڑوں سے موحد آفندی کا چہرہ بگاڑ دے۔ کس قدر ذلیل کیا تھا آج اس کی بے ہودگی نے اور طلال۔۔۔ اف میرے اللہ۔ آفندی ہاؤس کے ہونے والے داماد کی کیا عزت افزائی کر کے آیا تھا وہ۔

فرزین اور ملاحہ بے چاری حواس باختہ سی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس بپھری شیرنی کے بھڑکنے کی وجہ کیا ہے اور اسے قابو کیسے کیا جائے۔ فی الحال تو چپ رہنے میں ہی بھلائی تھی۔

''یعنی تم ابھی بھی سمجھ رہی ہو کہ میں نے غلط کیا....؟'' وہ بیک مرر میں ــــ اس کا لال بھبو کا چہرہ اور نم آنکھیں دیکھ کر طمانیت محسوس کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ پھر گویا ہوا۔

''تو چلو۔ ٹھیک ہے۔ چل کے آغا جان سے ہی فیصلہ کروا لیتے ہیں۔'' مہراہ نے سختی سے لب بھینچے۔ در حقیقت اس کا زور زور سے رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

شاید اللہ تعالیٰ نے موحد آفندی نامی سزا دنیا میں ہی اس کے لیے تجویز کر دی تھی۔ گھر پہنچ کر پورچ میں گاڑی رکتے ہی وہ فوراً'' نیچے اتری اور دروازہ اس زور سے بند کیا کہ دونوں لڑکیوں نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔

''اسے ٹینشن کے دورے پڑتے ہیں کیا؟'' موحد ملاحہ سے پوچھ رہا تھا اور وہ بے چاری شرمندہ ہو رہی تھی۔ اچھی بھلی خوش مزاج سی مہراہ کو نجانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ تینوں مہراہ کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئے تھے۔

''السلام علیکم....''

اندر داخل ہو کر موحد نے خواتین کو لاؤنج میں براجمان پا کر بہ آواز بلند سلامتی بھیجی تھی۔

''موحد.... ادھر تو دیکھو۔ بھلا کون آیا ہے؟'' ثمو کی آواز میں چہکار سی تھی۔ سومیہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی۔ تو اسے دیکھ کر موحد بری طرح چونکا۔ پھر اس کے تاثرات میں خوشگواریت بھر آئی۔

''آہ.... مائی ڈیرسٹ فرینڈ....'' موحد نے آگے بڑھ کر بڑی خوش دلی سے کہتے ہوئے بے تکلفی کے ساتھ سومیہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما۔

''کب سے آئی ہوئی ہو پاکستان۔ اب یاد آئی ہماری....؟'' وہ اس کے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دے کر جتاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ سومیہ کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ چمکی۔

''کسی'' کے رویے کی بدصورتی پر وہ ذہن پر لحہ بھر کو جھلملائی تھی۔

''ایسے ہی بس....'' اس نے اپنے مرجھائے ہوئے لب و لہجے پر جیسے بشاشت کا لبادہ فوراً'' ہی اوڑھ لیا۔

''مگر اب میں نے سوچ لیا ہے کہ دنیا میں ایک اچھے دوست سے بڑھ کے اور کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اسے نبھانے میں ہمیشہ ترجیح دینی چاہیے۔'' اس نے موحد کے مسکراتے چہرے پر نظر جما کر کہا۔

''بیٹھو....'' اس نے سومیہ کو اشارہ کیا۔ اور فرزین اور ملاحہ سے اس کا تعارف کرانے لگا۔ اس کا موڈ بہت فریش لگ رہا تھا۔

تعارف کے مرحلے سے گزرتی.... موحد کے رویے کی نرمی اور توجہ کو جانچتی سومیہ دل ہی دل میں نمیر آفندی اور موحد آفندی کا تقابلی جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

ایک محبت کا رشتہ تھا تو دوسرا دوستی کا.... قدرت ہی جانتی تھی کہ سومیہ کا دل کس راہ کا مسافر ہونے والا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی تذلیل کا جتنا بھی ماتم مناتی کم تھا۔ دل تھا کہ کسی طور چین ہی نہیں پا رہا تھا۔ بیٹھتی تو تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ ٹہل ٹہل کر ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ رونا تھا کہ تھمنے میں ہی نہ آتا تھا۔

''سمجھا کیا ہے اس خبیث انسان نے مجھے.... جب جی چاہا جس کے سامنے چاہا ذلیل کر دیا اور پھر طلال کی بے عزتی.... اف....'' اس سوچ کے ساتھ اس کے دل پہ ہاتھ پڑتا تھا۔

"کیا سوچ رہا ہوگا وہ۔ اس طرح کی فیملی ہے ہماری۔ تنگ دل، تنگ نظر... اور یہ پہنچا کیسے وہاں؟ فرزین اور طلاحہ پر بھی نگاہ رکھی ہوئی تھی اور مجھ پر بھی۔ یعنی باقاعدہ پلاننگ... اچانک تو پہنچ نہیں سکتا وہاں..."

اس کا دماغ سوچ سوچ کر دکھنے لگا تھا۔ رو رو کر آنکھیں سجالیں۔ واش روم میں پانی کا نل کھولے واش بیسن پہ جھکے اس نے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ سوچ کا ایک نیا در وا ہوا تھا گویا۔

"تزئین... تزئین نے میری اور طلال کی باتیں سنی تھیں تو کیا اس نے...؟ اسے اپنی ہی سوچ پر یقین نہیں آیا۔ تولیے سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے اس کا ذہن سنسنا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
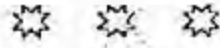
وقار آفندی اور زرنگار کی زندگی باہمی محبت اور اعتماد کے سہارے دھیرے دھیرے اپنی راہ پر گامزن تھی۔

فلیٹ کا کرایہ زیادہ تھا، سو دوستوں کے ہر تعاون کو ٹھکراتے ہوئے وہ زرنگار کو دو کمروں کے کرائے کے گھر میں لے آیا تھا۔

"یار دوست کیا صرف بھلے وقتوں کے لیے ہوتے ہیں؟" مظہر اور کاشف سخت خفا تھے۔ وقار کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ۔

"جب برا وقت آئے گا تب دیکھی جائے گی۔ ابھی تو سب بھلا ہی ہے۔" اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

مگر خوشیوں کے دھیرے دھیرے جھولتے اس ہنڈولے کو شدید جھٹکا تب لگا جب وقار آفندی کو بنا کوئی توجیہہ پیش کیے نوکری سے جواب دے دیا گیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔

"اتنا اچھا چل رہا تھا سب۔ کام بھی ٹھیک کر رہا تھا میں۔ پھر پتا نہیں کیوں... بنا نوٹس کے جواب دے دیا۔"

اس سے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا جا رہا تھا اور زرنگار کا بس نہیں چل رہا تھا اس کی ہر پریشانی خود میں سمو لے۔ اس نے اپنے اندر کی بے چینی کو دباتے ہوئے لبوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ سجا کر لقمہ بنا کر اس کے منہ میں ڈالا۔

"اللہ کے رزق کو آگے رکھ کے انتظار نہیں کرواتے۔ گناہ ملتا ہے۔ رزق کی بے حرمتی ہوتی ہے۔" وہ مسکرا رہی تھی۔ وقار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ لقمہ چباتے ہوئے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

ماما کا دلکش روپ لیے... شانوں تک پہلے ماڈرن انداز میں کٹے بالوں کو اب سیدھی چوٹی میں باندھے وہ سادگی کا پیکر تھی... مگر بہت خوب صورت... وہ مکمل ماہتاب تھی۔ ٹھنڈی روشنی دینے والا چاند... وقار آفندی کی زمین کا روشن ماہتاب۔

تھوڑے بھاری ہوتے وجود نے بھی اس کی خوب صورتی کو ماند نہ کیا تھا بلکہ ماما کا یہ روپ اسے مزید دلکشی عطا کر رہا تھا۔

"کیا ہوا... کیا دیکھ رہے ہیں؟"

وہ اس کی نظروں کے جمود سے ناواقف نہیں تھی۔ مسکرا کر پوچھا تو وہ قدرے آزردہ نظر آیا۔ زرنگار نے دوسرا نوالہ آگے بڑھایا مگر اس نے منہ نہ کھولا۔

"کیا کیا نہیں سوچا تھا میں نے زری... ہمارے مستقبل کے لیے۔ تمہیں بڑی شان سے بیاہ کے آفندی ہاؤس لے جانے کا تہیہ کر رکھا تھا میں نے... اور نصیب میں لکھا گیا یہ کرائے کا دو کمروں کا مکان۔" زرنگار نے اس کی مایوسی اور آزردگی کو ہنسی میں اڑایا۔

"ہاں... تو میں کہاں کی ملکہ تھی...."
"میرے دل کی ملکہ تو تھیں نا۔" وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔
"وہ تو اب بھی ہوں۔ باقی حالات اور موسم تو آتے جاتے رہتے ہیں وقار۔ ان کی کیا ٹینشن لینا۔" وہ بھی سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"دل میں کوستی تو ہو گی مجھے... یہ تنگ دستی... یہ کم مائیگی تمہارے تو خواب و خیال میں بھی نہ ہو گی۔"
"وقار..." اس کا دل واقعی تڑپ اٹھا تھا۔
"کیا ہو گیا ہے آپ کو... میں خوش ہوں... بہت خوش۔" وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی تو وہ اس کا نوالے ڈالا ہاتھ پرے کرتا اٹھ گیا۔ زرنگار نے نوالہ پلیٹ میں واپس رکھتے ہوئے دسترخوان سے ہاتھ صاف کیا اور بعجلت اٹھی۔
"کسے یقین دلا رہی ہو زری۔ مجھے یا خود کو...؟" وہ جانے اس پر ہنسا تھا یا خود پر۔
صحن میں سامنے لگے بیسن پر جا کر کلی کرنے لگا... ہاتھ منہ دھو کر وہ واپس آیا تو زرنگار نے سفید تولیہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پلٹ کر کمرے میں چلی گئی۔
وقار ٹھٹکا۔ وہ ناراض ہو گئی تھی۔ تولیہ ریک پر لٹکا کر وہ اس کے پیچھے کمرے میں گیا۔
وہ پلنگ کے کنارے بیٹھی سر جھکائے چادر کے ڈیزائن پر انگلی پھیر رہی تھی۔ وقار کو خود پر افسوس ہوا۔ ایسے ہی ٹینشن کا شکار ہو کر اس کا بھی موڈ خراب کیا تھا۔

اس کے سامنے کھڑے ہو کر وقار نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اوپر کیا تو نم آنکھیں اسے بے چین کر گئیں۔
"میں تو ایسے ہی... تم تو سیریس ہی ہو جاتی ہو یار۔ پتا تو ہے فضول بولتا رہتا ہوں میں۔"
"آپ ان حالات میں گزارہ کریں گے تو کیا میں نہیں کروں گی وقار؟ لاکھوں کے لالچ میں نہیں عزت کی روٹی کے لالچ میں آپ کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ پھر کیوں میرا دل دکھاتے ہیں۔ مکمل بھروسہ بھی نہیں کرتے' آدھا بھروسا تو دل توڑ دیتا ہے وقار۔" وہ بے حد آزردہ خاطر تھی۔ آنکھوں میں نمی اور لرزتے گلابی لب۔ وقار نے پشیمان ہو کر بے اختیار اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔

✲ ✲ ✲

آغا جان کا فون آیا تھا۔
سلام و دعا کے بعد انہوں نے ہنکارا بھرا اور طنز سے پوچھا۔
"کیا حال ہے برخوردار۔ عشق کا بھوت اترا یا ابھی بھی کچھ اثر باقی ہے؟"
"میں اس بھوت کے ساتھ... بہت خوش ہوں۔ آپ کام کی بات کریں۔" وقار نے رسان سے جواب دیا تو وہ تحکمانہ... رعونت سے بولے۔
"یہ ڈراما بازی چھوڑو... بہت جذباتیت دکھالی تم نے اور برداشت کر لی ہم نے۔ سیدھے گھر آؤ اب۔"
"تو پھر آپ بھی اپنی بہو کے استقبال کی تیاریاں کر لیں بابا جان۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔
"بکواس بند کرو..." وہ تپ اٹھے۔ گرج کر بولے۔
"خبردار جو اس نطفۂ ناتحقیق کو دوبارہ سے اس گھر میں لانے کی بات کی ہو تو..." ان کی زبان سے زرنگار کے لیے

گالی سن کر وقار کی رگوں میں شرارے دوڑ اٹھے۔
"بابا جان..." وہ انہیں سختی سے ٹوک گیا۔
"اس کا ماضی جو بھی رہا ہو۔ اس کی موجودہ پہچان یہی ہے کہ وہ وقار آفندی کی بیوی اور آغا ذوالفقار آفندی کی بہو ہے۔"
"الو کے پٹھے... خبردار جو ہمارا نام اس بے حمیت عورت کے ساتھ جوڑا..." وہ غیض و غضب کا شکار ہونے لگے۔
"تو پھر وقار آفندی کو بھی بھلا دیں۔ اس کا نام بھی اس عورت کے نام کے ساتھ جڑ چکا ہے بابا جان اور اب موت کے بعد ہی الگ ہوگا۔" اس کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔
بعض اوقات دل کے بہت قریب رہنے والے ہی دل دکھا جاتے ہیں۔ بس ہمیں پتا دیر سے چلتا ہے۔ اس کے اپنے بھی یہی کام کر رہے تھے... اور بار بار کر رہے تھے۔ اور ہر بار زرنگار اس کے دل میں مزید اتر جاتی تھی۔ وہ اس کے اور قریب ہو جاتا تھا۔
"بہت پچھتاؤ گے وقار۔ واپس لوٹ آؤ اس سے پہلے کہ میں بھول جاؤں تم سے ہمارا رشتہ کیا ہے۔"
"بھول تو آپ چکے ہیں بابا جان..." ان کے تند و تیز لہجے کو وقار آفندی کی ٹھہری ہوئی پرسکون آواز نے کاٹ دیا۔
"جب مجھے تین بار نوکریوں سے جواب ملا... بنا نوٹس کے نکالا گیا۔ تب ہی تھوڑی سی تحقیق کے بعد پتا چل گیا مجھے کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اتنی کہ اپنے بیٹے کو ٹکے ٹکے کی نوکریاں کرتے ہی نہیں دے رہے۔ دیکھ ہی نہیں سکتے اتنی محنت کرتے ہوئے۔" دوسری طرف ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔
شاید آغا جان کو توقع نہیں تھی کہ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا ہوگا۔ پھر وہ کھنکھار کر تنفر سے بولے۔
"محسوس کرو گے تو اس میں بھی ہمارا پیار پاؤ گے وقار آفندی۔" وہ تلخی سے مسکرا دیا۔
"تمہارا آفس... تمہارا سونا کمرہ تمہارے انتظار میں ہے وقار! لوٹ آؤ گے تو سب بنا کچھ جتائے تمہیں گلے سے لگالیں گے وقار... مگر تنہا... فقط وقار آفندی۔"
"اور وہ جو وقار آفندی اندر سے مر جائے گا بابا جان۔ اس کا کیا؟" وہ غم و اندوہ سے چور لہجے میں بولا۔
"ڈراموں، فلموں والے ڈائیلاگ مت بولو مجھ سے وقار..."
"قول دے کے پھرنے والے اندر سے مر ہی جایا کرتے ہیں بابا جان اور میں وعدہ کر کے مکرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ اللہ حافظ۔" اس نے قطعیت سے کہہ کر لائن کاٹی اور پھر موبائل ہی بند کر دیا۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو رہا تھا۔
زرنگار ایسی حالت میں تھی... اور وہ نوکری سے فارغ۔ دوستوں سے مدد لینا گوارہ نہ تھا کہ ان کے گھر والے بھی وقار سے ان کا میل جول اب خاص پسند نہیں کرتے تھے۔ کچھ آغا جان کی مہربانی۔ ان کے دوستوں کے جو بیٹے ہوئے۔
تب اس نے زرنگار کو لے کر سب کی نظروں سے روپوش ہو جانے کا سوچ لیا۔ کسی چھوٹے دور دراز محلے یا گاؤں میں... جہاں آغا جان کی سوچ کی بھی رسائی نہ ہو... مگر اب زندگی سے بدلے لینے کا وقت آن پہنچا تھا۔
زندگی سے بھی کوئی بچ سکا ہے بھلا؟
اور زندگی سے بچ کر صرف وہی بھاگ سکتا ہے... جس کی موت آجائے۔

☆ ☆ ☆

دھاڑ کی آواز سے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تو آئینے کے سامنے کھڑی تزئین کے ہاتھ سے ہیئر برش گر گیا۔
"یا اللہ..." وہ لرز کے پلٹی۔ اور پھر دروازے میں مہماہ کو دیکھ کر اسے شدید غصہ آیا۔
"یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے کمرے میں آنے کا...؟"
"میں بھی تم سے یہی سوال کرنے آئی ہوں کہ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کی "زندگی" کسی کے "پرسنلز" میں آنے کا؟" وہ سرد لہجے میں تلخی سے پوچھ رہی تھی۔
تزئین نے چند سیکنڈز لیے اس کی بات سمجھنے کے لیے پھر سر جھٹک کر وہ پلٹی اور نیچے گرا ہیئر برش اٹھانے لگی۔
مہماہ کا یقین اور پختہ ہوا... یہ آگ تزئین کی لگائی ہوئی ہی تھی۔
"مجھے کوئی شوق نہیں کسی کے پرسنلز میں گھسنے کا۔ جس سے تمہیں مسئلہ ہے اس سے جا کے نمٹو۔ مجھے اپنے معاملات میں مت گھسیٹو۔" جواب کچھ دیر بعد آیا... اور ڈھٹائی سے بھرپور تھا۔
"گھسیٹ کے تو تم لائی ہوئی میرے پرسنل افیئر میں... موحد آفندی کو..." مہماہ نے دانت پیس کر کہا تو وہ بھی بگڑی۔
"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ سمجھیں... تم جا کے طلال سے ملو یا کسی ایکس وائی زیڈ سے۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے میں موحد آفندی کو بتاتی پھروں۔"
"اوہ..." مہماہ کے تاثرات میں درحقیقت تاسف اتر آیا... بے حد تاسف۔
"جو بات میں نے کہی ہی نہیں وہ خود تم نے کردی تزئین۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اسے آئے ہوئے اور تمہیں وہ اپنا بیسٹ فرینڈ لگنے لگا؟"
تزئین زبان پھسلنے پر ذرا سا گڑبڑائی مگر اب سنبھلنے اور بات سنبھالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔
"فضول باتیں کر کے میرا دماغ مت کھاؤ مہو۔ جو موحد کی اہمیت ہے اس گھر میں وہ اب سب پر واضح ہے۔ مجھے نہیں پتا تمہیں اس سے کیا مسئلہ ہے۔ مگر میرے لیے وہ کزن ہے... اور اس گھر کا ایک اہم ترین فرد۔ وہ گھر کے کسی بھی معاملے سے الگ نہیں ہے۔"
"کسی معاملے سے ہو یا نہ ہو مگر میرے ہر معاملے سے وہ شخص الگ ہے تزئین۔" وہ غصے کے مارے اونچی آواز میں بولی۔
"اور تمہیں اس کے ساتھ مجھے ڈسکس کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر اتنا ہی عزیز کزن ہے تمہارا تو تم اپنے پرسنلز ڈسکس کر سکتی ہو اس کے ساتھ۔ وہ بھی بصد شوق... مجھے قطعاً" کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"
تزئین کا چہرہ لال پڑا۔
"مجھے چیپ لڑکیوں کی طرح "پرسنلز" رکھنے کا کوئی شوق نہیں۔" اس نے طنز کیا تھا۔
مہماہ نے لمحہ بھر کو تھم کر اسے دیکھا پھر ٹھنڈے لہجے میں بولی۔
"اور اگر... طلال تمہیں مل جاتا... تو تمہارے خیالات یقیناً" کچھ اور ہی ہوتے... پھر تمہیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا "چیپ لڑکی" بننے پر۔"
اس طنز پر تزئین کا رنگ ایکدم سے فق پڑا۔ اس نے اڑی رنگت کے ساتھ مہماہ کو دیکھا۔
وہ بات جو وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بھی نہیں کرتی تھی وہ مہماہ آفندی کے دل تک کیسے پہنچی؟
"مگر ایک بات یاد رکھ لو تزئین... ملا وہی کرتا ہے جو قسمت میں لکھا ہو۔ دوسروں سے چھین کر اپنا نصیب نہیں

بنایا جاسکتا۔"

وہ بہت سرد مگر تلخ لب و لہجے میں کہہ کر رکی نہیں تھی۔

اور تزئین اس کے جانے کے کئی لمحوں کے بعد اس کے پاؤں جنبش کرپائے۔

"لعنت ہے تم پر مہماہ آفندی.... "اس کی آنکھوں میں لالی سی اتر آئی۔

"مگر تم جانتیں نہیں تم نے کس کے دل پر ہاتھ ڈالا ہے۔ ابھی تو محض موحد آفندی کو تمہارے پیچھے لگایا ہے۔ جانتی نہیں ہو اسی کے ہاتھوں تمہیں برباد بھی کرواسکتی ہوں۔"

بعض انسان اوقات خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے.... مگر اللہ "سمجھنے" سے نہیں "ہونے" سے ہوا کرتا ہے اور یقیناً "کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا۔

☆ ☆ ☆
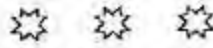
پھپھو کے بے پناہ اصرار کے باوجود وہ ان کی طرف نہیں ٹھہری تھی۔

"ماما اتنا اصرار کررہی ہیں رک جاؤ چند ایک دن"موحد نے بھی ثمرہ کا ساتھ دیا تھا۔ سومیہ مسکرادی۔

"دوریاں محبت بڑھاتی ہیں موحد.... دور رہوں گی تو پھپھو روز یاد کیا کریں گی۔ اور جب یاد کریں گی تب میں آجاؤں گی۔"

"ہاں.... یہ تو ہے۔ قریب رہنے والے کو بندہ یاد نہیں کرسکتا۔" وہ ہنسا تھا۔ گویا سومیہ کے فقرے کی داد دی۔

اور اب.... وہ ہاسٹل واپس آئی تو بستر پر بیٹھتے ہوئے جوتے اتارے اور بیگ ٹٹول کر اپنا موبائل نکالا۔ کال لاگ بیک کیا۔

نمیر آفندی کے نمبر سے ایک بھی کال نہ تھی۔

سومیہ کا دل عجیب سی کیفیت میں گھرنے لگا۔ تو کیا یہ طے تھا کہ جس اکھڑے بے نیاز شخص پہ اس کا دل آیا تھا وہ اس کے نصیب میں نہیں تھا؟

اس نے بد دلی سے موبائل بستر پر پھینکا اور آنسو پیتی وہیں دراز ہوگئی۔ نجانے اسے کتنی دیر ہوئی تھی ایسے لیٹے۔ وہ غنودگی کی کیفیت میں تھی جب اس کو موبائل بجنے لگا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اسے آواز کا منبع سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا پھر موبائل کی جگمگاتی اسکرین نے حواس ذرا بحال کیے۔

نمیر وقار آفندی.... اس نے بے یقینی سے اس جگمگاتے نام کو دیکھا دل بے اختیار ہی خوش فہمی کا شکار ہونے لگا۔ وہ چاہے اس سے لڑتا جھگڑتا یا بدزبانی کرتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس سے تعلق نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ یہ کال گواہ تھی اس بات کی۔

ہلکی سی مسکراہٹ لیے اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے موبائل کان سے لگالیا۔

"ہیلو.... کیسے ہو....؟" پچھلی لڑائی کو ہمیشہ کی طرح یکسر بھلاتے ہوئے سومیہ نے بشاشت سے پوچھا۔

"میں تمہارے ہاسٹل کے باہر موجود ہوں.... ویٹنگ فار یو۔" وہ سنجیدگی سے بتارہا تھا۔ سومیہ کے دل نے ایک دھڑکن مس کی۔

"ہاں.... تو؟" دھڑکنوں کی بے ترتیبی کو سنبھالتے ہوئے وہ شوخی سے پوچھنے لگی۔

"تو یہ کہ مجھے تمہارا تھوڑا وقت چاہیے۔ ضروری بات کرنی ہے۔"

"اگر تو اپنے رویے کی معافی مانگنی ہے تو فون پہ ہی مانگ لو۔ میں معاف کردوں گی۔" سومیہ اپنے مخصوص شوخ انداز میں بولی۔

"کم آن سومی.... آ رہی ہو یا میں جاؤں؟" قطعیت سے بھرپور بے زار لہجہ۔
"اف.... " سومیہ کا دل بے اعتنائی کے اس انداز پر سینے میں لوٹ کر رہ گیا۔
"اوکے۔ آئی ول ٹرائی۔ اگر وارڈن نے اجازت دی تو۔ دراصل ابھی باہر سے آئی ہوں میں۔" مسکرا کر کہا۔ تو اس نے بات کاٹی۔
"وارڈن سے بات کر چکا ہوں میں۔ تم بس اسے اپنی شکل دکھا کے باہر آجاؤ۔"
"اللہ رے.... اتنا کانفیڈینس؟ میں تو جیسے انکار کر ہی نہیں سکتی نا آنے سے۔"
سومیہ نے طنز سے کہا مگر نمیر نے لائن کاٹ دی تھی۔ سومیہ نے جلدی سے جھک کر دیکھتے ہوئے جوتوں میں پاؤں پھنسائے' دوپٹہ کھینچ کر شانے پہ ڈالا اور موبائل شولڈر بیگ میں ڈالتی دروازے کی طرف لپکی اور ساتھ ہی بڑبڑائی۔
"اور اس کا کانفیڈینس صحیح بھی ہے۔ کون کافر اس کے بلانے پہ جانے سے انکار کر سکتا ہے۔"
ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے وہ گاڑی میں موجود تھا۔
وہ مسکراتی ہوئی اگلا دروازہ کھول کر اس کے برابر براجمان ہو گئی۔ وہ اسے لیے قریبی پارک میں چلا آیا۔
جہاں شام ہوتے ہی لوگوں کی آمدورفت اور بچوں کی چیخ وپکار کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔
وہ قدرے ہٹ کر ایک طرف بینچ پر آبیٹھے۔
اور اس دوران اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی سومیہ خوش فہمیوں کے نجانے کون کون سے محل تعمیر کر چکی تھی۔
وہ دونوں پارک میں کچھ دور کھیلتے بچوں اور خوش گپیاں لگاتی خواتین کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے مابین اس

محسوس کن خاموشی نے سومیہ کو تھوڑا سا نروس کیا۔
"میرا نہیں خیال کہ تم نے مجھے یہاں محض پارک کی رونق دکھانے کے لیے بلایا ہے۔" وہ اس کی خاموشی پر طنز کرتے ہوئے بولی۔ نمیر نے چہرہ گھما کر اس کی طرف دیکھا۔
"تم "آفندی ہاؤس" کیوں گئی تھیں؟"
سومیہ لمحہ بھر کو چپ رہ گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ نمیر آفندی اس سے اس بارے میں بھی پوچھ سکتا ہے۔ پھر اسے جتا کر بولی۔
"وہ میری پھپھو کا بھی گھر ہے نمیر...."
"سو واٹ.... ؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم وہاں نہیں جاؤ گی اور نہ کبھی میرے متعلق کوئی بات کرو گی۔" وہ تیز لہجے میں بولا تو سومیہ کو بھی غصہ آیا۔
"تم کیا سمجھتے ہو.... میں وہاں تمہارے خلاف کوئی پروپیگنڈہ کرنے گئی تھی....؟"
"جو میں نے کہا ہے اس کا جواب دو سومیہ...."
وہ سرد لہجے میں بولا۔ سومیہ کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔
"ہاں' ہے جواب میرے پاس نمیر وقار آفندی.... اور وہ یہ کہ جیسے تم خود اکیلے ہو اپنی ذات میں' ویسے مجھے بھی اس دنیا میں اکیلا کر دینا چاہتے ہو۔ اس گھر میں میری پھپھو ہیں' میرے بچپن کا دوست ہے۔ کس کے لیے انہیں چھوڑ دوں؟ تمہارے لیے؟ تو پھر میرے ہو کے رہو نمیر آفندی۔ پھر اپنی منواؤ مجھ سے۔" وہ پھٹ پڑی تھی۔
"اب یاد آیا ہے تمہیں اپنے بچپن کا دوست؟" وہ تلخ ہوا۔

"جب جب تم میرا دل توڑو گے تب تب مجھے وہ یاد آئے گا۔ اور بھولا تو وہ کبھی بھی نہیں تھا نمیر!... مگر تمہارے رنگ اتنے گہرے آئے مجھ پر کہ اس کا عکس دھندلانے لگا...." سومیہ کی آواز لرزی تھی۔

"اور اب جب تمہاری بے اعتنائی سے گھبرا کر میں اس کی طرف لوٹی ہوں تو تم سے وہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔"

"اس گھر سے دور رہو سومیہ...." وہ بھنچے بھنچے لہجے میں سامنے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ لحہ بہ لحہ اس کی آواز کی تپش بڑھ رہی تھی۔

"اس گھر نے لوگوں کو دکھوں کے علاوہ کچھ دیا بھی ہے تو وہ ہے دربدری... یہ آفندی ہاؤس والوں کا شیوہ ہے... پہلے انہوں نے میرے باپ کو وہاں سے نکالا۔ پھر مجھے اور میری ماں کو.... ذلیل کر کے دھتکار کے.... اس کے بعد موحد اور اس کی فیملی کو۔"

"مگر اب موحد اس گھر میں ہے نمیر۔"

سومیہ نے احتجاج کیا تھا۔ نمیر نے چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ سومیہ کو اس کے تاثرات میں عجیب سی سختی دکھائی دی۔

"تمہیں کیا معلوم وہ کیا پلان لے کر اس گھر میں واپس آیا ہے۔؟" سومیہ سناٹے میں آگئی۔

"نمیر...." بے یقینی سے بے آواز اسے پکارا۔

"اس گھر سے دور رہو سومیہ۔ اور اگر پھپھو کی محبت اتنا ہی جوش مار رہی ہے تو فون پہ بات کر لیا کرو.... مگر نو مور موحد آفندی۔" وہ آخر میں دانت پیس کر بولا تو پہلی بار سومیہ کو اس کی بات پر شدید غصہ آیا۔

"کیوں نمیر وقار آفندی! کس رشتے سے تم یہ رعب مجھ پر جما رہے ہو؟" وہ پھنکاری تھی۔

"میں کسی بھی رشتے سے تم پر رعب نہیں ڈال رہا۔ بس تمہیں وارن کر رہا ہوں۔ دوستی رہی ہے تم سے۔" وہ عام سے لہجے میں بولا تو سومیہ بھیگی سی ہنسی ہنس دی۔

"ہاں.... دوستی....؟"

"وہ دوستی جس کو نبھا صرف میں رہی ہوں نمیر.... مگر اب میں وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔" وہ تلخی سے باغی انداز میں بولی۔

"ہنہہ.... اور تمہارا دل چاہ رہا ہے موحد آفندی کی دوستی؟"

"ہاں...." اس کے جتانے والے انداز پر وہ ضدی انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیونکہ موحد آفندی کے سینے میں جو دل ہے وہ نمیر وقار آفندی کا نہیں ہے...."

وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔ اس کا رخ گیٹ کی جانب تھا اور پیچھے نمیر آفندی بت بنا بیٹھا تھا۔

✲ ✲ ✲

آج وقار آفندی خوب گرج برس کر گیا تھا۔

آغا جان اسے دو کرائے کے گھروں سے نکلوا چکے تھے اور وہ اسی بات کا احتجاج کرنے آفندی ہاؤس آیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ماں جی پہلی بار دکھے دل سے آغا جان کے سامنے رو پڑیں۔

"کیا کر رہے ہیں آپ اس کے ساتھ۔ اس کی زندگی کو اور مشکل مت بنائیں۔ دردر کی ٹھوکریں تو پہلے ہی کھا رہا ہے وہ۔"

"ماؤں والے ٹسوے مت بہاؤ رابعہ خاتون۔" انہوں نے تحکم بھرے انداز میں کہتے ہوئے بے زاری دکھائی۔

"ماں کی گود میں کیسا سکون ہوتا ہے' یہ بچے کو زمین پر اترنے کے بعد ٹھوکریں کھا کے ہی پتا چلتا ہے۔ ہر ٹھوکر کھانے کے بعد وہ والدین کے پاس روتے ہوئے آتا ہے۔۔۔ اسے بھی ٹھوکریں کھلا رہا ہوں تاکہ اسے یہاں کی عیاشی کی قدروقیمت معلوم ہو۔" ان کا اپنا ہی فلسفہ تھا۔

جس میں کوئی جذباتیت نہ تھی۔ بس سفاکی اور قطعیت۔

"مگر ماں کا کلیجہ تو کٹ گیا نا اپنے لاڈلے کو ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر۔" وہ تڑپیں۔

"اب وہ وقت دور نہیں رابعہ خاتون' جب وہ خود اس غلاظت کی پوٹ کو ٹھوکر مار کر واپس لوٹے گا۔"

"وہ نہیں لوٹے گا۔۔۔ آغا صاحب۔ اس کے پیروں کی زنجیر بہت پکی ہے اب۔" وہ بلک اٹھیں۔

"جذباتی مت بنو۔ آغا ذوالفقار خان کی بیوی کو تو شیرنی ہونا چاہیے۔ میں خود ان زنجیروں کو توڑوں گا۔ تم فکر مت کرو۔ یہ سب عارضی کشش ہے اس کے لیے۔"

وہ بڑے غرور بھرے انداز میں بولے تو ماں جی نے سسکی بھری۔

"اب کی بار یہ زنجیر دائمی ہے آغا صاحب! باپ بننے والا ہے وہ۔ اولاد کی بیڑی پیروں میں ڈال کے پوری طرح سے اپنی قید میں کرلیا ہے اس جادوگرنی نے ہمارے بچے کو۔" ان کی آواز میں برسوں کے نوحے تھے۔ اولاد سے بچھڑنے کا غم تھا۔ اور دکھ کی آنچ۔

مگر آغا جان پر تو گویا صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس خبر سے۔

"اس طوائف زادی سے بچہ جنوائے گا۔۔۔ اور وراثت چلائے گا ہماری وہ!" وہ کف اڑاتے اپنی اولاد کو بھی گالیوں سے نواز رہے تھے۔

"آغا ذوالفقار خان کی وراثت ایک طوائف کا بیٹا چلائے گا۔۔۔" ان کے غیض و غضب سے آفندی ہاؤس کے درودیوار لرز اٹھے تھے اور سب نے دلوں پر مہر لگالی۔

"وقار آفندی کا بچہ اگر بیٹا بھی ہوا تو وہ وراثت کا حقدار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔"

مگر قسمت۔۔۔ بندے قسمت!

یہ قسمت ہی ہے' جو ذرے کو آفتاب بنا کر فقیروں کے سر پہ تاج سجا دیا کرتی ہے۔ وقار آفندی تو قسمت سے مار کھا گیا مگر اس کی نسل۔۔۔ اس کا نمیر وقار آفندی۔۔۔ قسمت کا سکندر بننے والا تھا۔ لیکن تقدیر کے لکھے کو کون جان پایا ہے ماسوائے اللہ کے۔

☆ ☆ ☆

"آغا جان رحم کردیں اس پر۔ مانا کہ اس نے بہت سنگین غلطی کردی ہے مگر اتنی کڑی سزا تو مت دیں اسے۔" فاران آفندی بڑی ہمت کرکے ان کے سامنے بڑی عاجزی سے التجا کررہے تھے۔ اور اسٹڈی کے دروازے کے باہر کان لگائے کھڑی ثمرہ کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا۔

"تم بھی کم بڑی غلطی نہیں کررہے فاران اس کی حمایت میں کھڑے ہوکر۔ اولاد نافرمان ہوجائے تو والدین سزا دے کر ہی سدھارا کرتے ہیں۔" وہ طنز سے گویا ہوئے۔ ساتھ ہی جتا بھی دیا۔

"سزا تو مل گئی اسے آغا جان۔ دربدر ہوگیا۔ عیاشی کرنے والا' پتا نہیں تین وقت کا کھانا بھی کھا پاتا ہے ڈھنگ سے یا نہیں۔" وہ دکھ سے بوجھل لہجے میں بولے تو آغا جان کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"بچے کو کھانا نہ ملے تو وہ ماں کی طرف دوڑتا ہے فاران۔ وہ بھی آئے گا۔"
"اس کی بیوی.... آغا جان' فیملی بننے والی ہے اس کی۔" وہ جھجکے۔
"بس...." وہ ہاتھ اٹھا کر گرجدار آواز میں بولے۔
"بند کردو اس بات کو اب۔ جہاں اس غلاظت کو رکھا ہوا ہے وہیں اس گندگی کی پوٹ کو بھی رکھے۔" ان کا انداز حقارت و تنفر سے پر تھا۔
فاران کی نوک زبان تک بہت کچھ آیا مگر.... حد ادب۔ وہ وہاں سے نکل آئے۔ جن کے دلوں پر مہریں ثابت ہو چکی ہوں انہیں کوئی دلیل متاثر نہیں کرسکتی۔ ثمرہ کے ساتھ کمرے کی طرف اٹھتے ان کے قدم بہت بوجھل تھے۔

☆ ☆ ☆

طلال کی فون کال آئی تو مہپاہ کا دل سکڑ کر پھیلا۔ وہ دل ہی دل میں وہ باتیں یاد کرنے لگی جو کل سے وہ جوڑ رہی تھی طلال کو بتانے کے لیے۔
ہیلو ہائے کے بعد وہ سیدھا اسی بات پر آیا تھا۔
"کیا ہوا تھا مہر.... آغا جان نے کچھ کہا تو نہیں تمہیں؟"
"ارے...." وہ زبردستی ہنسی۔
"میں بڑی لاڈلی پوتی ہوں آغا جان کی۔ مجھے کچھ نہیں کہتے وہ۔"
"اور وہ تمہارا کزن.... سو کالڈ کزن...." طلال کا حلق تک کڑوا ہوا تھا موحد کا کرتے ہوئے۔
"کس قدر مس بی ہیو کیا ہے اس نے۔ اسے تمیز نہیں گھر کے ہونے والے داماد سے کس طرح پیش آیا جاتا ہے۔" وہ غصے میں تھا۔
"کم آن طلال۔ دفع کرو اسے۔ اس کو بس اتنی ہی تمیز ہے۔" مہپاہ نے اس کا موڈ ٹھیک کرنا چاہا۔
"میں اس طرح کے رویے کا عادی نہیں ہوں مہر۔ میں زندگی میں دوبارہ کبھی اس شخص کے منہ نہیں لگنا چاہتا ہوں۔"
"تو میں کہاں پسند کرتی ہوں اس کے منہ لگنا۔ یہ تو آغا جان نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ بس۔"
مہپاہ جلد از جلد بات کو ختم کرنا چاہتی تھی۔
"تم آغا جان کو بتاؤ مہر.... کس طرح روڈلی بی ہیو کیا ہے اس نے مجھ سے۔ اسے مجھ سے سوری کرنا چاہیے۔"
طلال کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔
"اف...." مہپاہ کراہ کر رہ گئی۔ (وہ تو مر کے بھی سوری نہ کرے۔)
"فارگیٹ اٹ طلال۔ کسی کی بکواس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا جو رشتہ ہے وہی رہے گا۔ وہ تو آیا ہی اس گھر میں فساد پھیلانے ہے اور مجھ سے تو کچھ خاص ہی دشمنی ہے اس کی۔" مہپاہ نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔
"میں اپنی انسلٹ نہ تو بھولتا ہوں اور نہ ہی برداشت کرتا ہوں مہر! اور یہ بات اپنے اس ڈبل بلٹ کزن کو بھی سمجھا دینا' ورنہ مجھے خود بھی بہت اچھی طرح سمجھانا آتا ہے۔"
"غلطی میری بھی ہے طلال.... مجھے پتا تھا کہ ہمارے گھر کے مردوں کو یہ بات پسند نہ آتی یوں اکیلے ملنے کی۔ پھر بھی میں نے تمہاری بات مان لی۔"
مہپاہ نے آئندہ کے لیے گویا پیش بندی کی کوشش کی۔ موحد کا کیا اعتبار.... کہاں کہاں ان کی زندگی میں دخل اندازی کرنے والا تھا۔

مگر طلال سن کریوں بھڑکے گا یہ مہپاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔
"واٹ... یعنی وہ جو کر کے گیا وہ صحیح تھا۔ میری بات مان کے غلطی کی تھی تم نے؟"
"نن... نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ اس نے تو غلط ہی کیا خیر۔ لیکن آغا جان کے اصولوں کے سامنے تو میں جاوت نہیں کر سکتی نا۔" وہ ذرا دھیمی پڑی مگر جو غصہ رہ رہ کر موحد پر آرہا تھا وہ اللہ ہی جانتا تھا۔
"مجھے تو لگتا ہے تمہیں اس انسلٹ سے کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔ میرا تو اس بندے کو شوٹ کرنے کو دل کر رہا ہے۔"
"کم آن طلال۔ بس کرو اب' ایک تو میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ اوپر سے تم ٹینشن دیے جا رہے ہو۔ میری زندگی میں کون سا اس بندے نے آکے پھول کھلا دیے ہیں۔ میرے لیے بھی راستے میں بچھے کانٹوں جیسا ہے وہ۔"

وہ بھی بگڑی۔ تب کہیں جا کے طلال ذرا مدھم پڑا۔ اور پھر اگلے پانچ منٹ اس نے مہپاہ کو منانے میں لگائے۔
اس کے بعد کی گفتگو نارمل تھی۔
مگر مہپاہ کے دل میں موحد آفندی کے خلاف لاوا پکنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

سومیہ کو ہاسٹل ڈراپ کرنے کے بعد وہ کافی دیر تک منتشر ذہنی کیفیت لیے سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا رہا۔
پاگل... بے وقوف ہے یہ لڑکی۔ بھلا اتنے ستم اٹھا کر در بدر پھر کر اگر نمیر آفندی اپنا دامن خالی لیے پھر رہا ہے تو پھر موحد آفندی تمہیں کیا دے سکتا ہے بھلا... وہ بھی تو چودہ سالوں کا بن باس کاٹ کے اب لوٹا ہے۔ اس نے بھی تو وہی تکلیفیں سہی ہیں کم یا زیادہ سہی' مانو نمیر وقار آفندی اور موحد آفندی ایک ہی آئینے کے دو رخ ہیں مگر یہ جذباتی لڑکی۔ جانے کیا کھوجنا چاہتی ہے۔ نمیر آفندی اور موحد آفندی کے دلوں میں مماثلت تلاشتی ہے۔
کہیں جذباتیت میں آکر میرا کھیل نہ بگاڑ دے۔

تو پھر... اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے... موحد آفندی جانے اور سومیہ۔
تھک ہار کر یہی سوچ اس کے ذہن میں ٹھہری گئی تو دماغ کی تنی ہوئی طنابیں جیسے ڈھیلی پڑ گئیں۔
ہاں۔ جو نمیر وقار آفندی نہیں سنبھال سکا۔ اسے موحد فاران آفندی اپنے طریقے سے ہینڈل کرلے گا۔
وہ گاڑی کو گھر کے راستے پر ڈالتا قدرے پر سکون کیفیت میں تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اس کا دماغ لحہ بھر کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ اس کے آراستہ کمرے کی گویا اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔ بیڈ شیٹ گھسیٹ کر زمین پر پھینک دی گئی تھی۔ دیواروں پہ لگی تین چھوٹی فریم شدہ تصویریں زمین بوس تھیں اور لینڈ اسکیپ کا کینوس گویا کسی نے چھری یا تیز دھار آلے سے چیر ڈالا تھا۔ وہ جو کس اعصاب لیے دروازے کے قریب کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی الماری کے دونوں پٹ واتھے اور اس کے کپڑوں کا تیا پانچہ ہوا بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔
اس نے کام والی کو آوازیں دینی شروع کیں تو آفندی ہاؤس میں موحد آفندی کی بلند و بانگ آواز نے بھگدڑ سی مچادی۔
"کیا بات ہے... کیا مسئلہ ہو گیا زبیدہ اپنے کوارٹر میں ہوگی اس وقت..." تائی جان کو اس کے انداز پر غصہ تو

بہت آیا کہ انہیں اپنی نیند بہت عزیز تھی۔

"یہ... یہ ہوا ہے۔" اس نے ہاتھ مار کر پورا دروازہ وا کر دیا تاکہ وہ سارا منظر آسانی سے دیکھ سکیں۔ ایک بار تو وہ بھی تھرا کے رہ گئیں۔

"چور... چور تو نہیں آیا تھا...؟"

"کیا ہوا موحد...؟" ثمرہ گھبرائی ہوئی آئیں اور اس کا بازو تھام کر گویا یقین کرنا چاہا کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔

"میرے کمرے کا حشر دیکھیں۔ بھوت ناچ کے گئے ہیں یہاں کیا؟" وہ تپ کر بولا۔ ثمرہ آگے بڑھیں تو ان کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے۔ موحد نے اندر جا کے باتھ روم چیک کیا۔ کوئی بھی ذی نفس موجود نہ تھا۔ ماسوائے اس کے کارنامے کے۔ باتھ روم میں بھی اس کا سارا شیونگ باکس اوندھا پڑا تھا۔ آغا جان تک بات پہنچی تو رات کے اس پہر انہوں نے زبیدہ اور اس کی دونوں بیٹیوں کو لائن حاضر کر لیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگیں۔

"صاحب جی ہمارا کیا لینا دینا... ہم تو یہاں کام سنوارنے کو ہیں نہ کہ بگاڑنے کو۔"

"زبیدہ قابل اعتماد ملازمہ ہے آغا جان..." تائی جان نے دبے لفظوں کہنا چاہا تو وہ گرجے۔

"تو پھر نا قابل اعتماد کون ہے اس گھر میں۔ کس نے ادھم مچایا ہے موحد کے کمرے میں؟" تائی جان اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ہاں تیز نظروں سے مبین آفندی کو ضرور دیکھا۔ بہرحال زبیدہ اور اس کی بچیوں کی ثمرہ نے ہی جان بخشی کرائی۔

"تم میرے کمرے میں آجاؤ موحد..." ثمرہ نے اس کا بازو دبوچا۔

"زبیدہ نے کمرہ ٹھیک کر دیا ہے ماما۔ ایوری تھنگ از فائن۔" وہ نرمی سے مسکرایا۔

"نہیں موحد... پتا نہیں کیا چیز تھی، جس نے کمرے کو یوں الٹ پلٹ دیا۔ میرا دل نہیں مان رہا بچے۔" وہ خوف زدہ تھیں۔

"اُفوہ..." اس نے ان کے شانے پر ہاتھ پھیلایا اور ان کے کمرے کی طرف چل دیا۔

انہیں نیند کی گولی کھلائی۔ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی گپیں ہانکیں اور جب وہ غنودگی کی کیفیت میں گئیں تو لائٹ آف کر کے باہر نکل آیا۔ بستر پر لیٹا وہ اسی بارے، جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ پھر ایک دم سے اٹھ بیٹھا۔

"مائی گڈنیس... میں نے مہر ماہ آفندی کے بارے میں کیوں نہ سوچا...؟" اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

تو یہ ہنگامہ کسی بھوت کا نہیں بلکہ ایک چڑیل کا مچایا ہوا تھا۔ موحد کو پکا یقین تھا۔

اگلی صبح ایک اور سنگین واقعہ ہوا۔ سب ناشتے کی ٹیبل پر آکر بیٹھے تو موحد نے آتے ہی آغا جان کی کرسی گھسیٹی اور اونچی آواز میں سلام کر کے بیٹھ گیا۔

تائی جان نے بے اختیار اسے ٹوکنے کو لب کھولے مگر پھر فوراً ہی مبین صاحب کو جوس کا گلاس تھمانے لگیں۔ ان کا خیال تھا کہ اب آغا جان ہی آکر اس خود سر وارث سے نمٹیں گے۔ مگر مہر ماہ نے اسے اونچی آواز میں ٹوکا۔

"یہ تمہاری جگہ نہیں ہے۔" ڈائننگ روم میں ایک دم سے خاموشی چھا گئی سب نے مہر ماہ کو دیکھا۔ اور موحد آفندی یوں چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا کہ اگر وہ اس کا دشمن اول نہ ہوتا تو وہ اس کی اداکاری کے لیے کسی ایوارڈ کے لیے اسے ضرور نامزد کرتی۔

"کون... میں؟ میری بات کر رہی ہو تم...؟" وہ جیسے بڑی حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ وہ تپی۔

"جی ہاں۔ تم ہی سے کہہ رہی ہوں میں (بہرے) یہ جگہ آغا جان کی ہے۔"

"اچھا..." وہ اٹھا۔ آگے پیچھے سے کرسی کا جائزہ لیا اور پھر سے بیٹھتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں بولا۔
"مگر اس پہ نہ تو کسی کی نیم پلیٹ لگی ہے اور نہ ہی نمبر پلیٹ۔" تزئین نے سلگتی نظروں سے مہرماہ کو دیکھا۔ تو اس کا خفت سے تپتا چہرہ دیکھ کر دل میں ٹھنڈک سی اتر گئی۔
"تم..." وہ جلبلا کر کچھ کہنے لگی تھی کہ تائی جان نے سختی سے اس کا ہاتھ دبوچ کر اسے اس کی کرسی پر کھینچ کر بٹھا دیا۔
"چپ کر کے ناشتا کرو تم..." اسی وقت آغا جان چلے آئے تو باقی سب نے جہاں دم سادھا وہیں مہرماہ نے بھی منتظر نظروں سے آغا جان کو دیکھا۔
جیسے بچپن میں ان کی پوتیوں میں سے کوئی اگر ان کی جگہ پر بیٹھنے کی کوشش یا ضد کرتی تو اسے نہ صرف زبردست قسم کی ڈانٹ پڑتی بلکہ ان سب کو باور کرایا گیا تھا کہ یہ گھر کے سربراہ کی جگہ ہے۔ اور آج وہاں موحد آفندی بیٹھا اتنے اطمینان سے ناشتا کر رہا تھا کہ اس نے نظر اٹھا کر بھی آغا جان کو نہ دیکھا تھا۔
اور آغا جان۔
انہوں نے آتے ہی حسب عادت بہ آواز بلند سلام کیا اور پھر بنا کسی تاثر کے موحد کے دائیں طرف پڑی کرسی پر آبیٹھے۔
"اور بھئی برخوردار... کام کیسا چل رہا ہے؟" بشاشت سے پوچھا وہ موحد آفندی پر بہت ناز بھری نگاہ ڈالتے تھے۔ مہرماہ کا دل گویا کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔
"کام تو ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے... اوہ سوری۔ یہ شاید آپ کی جگہ ہے۔"
وہ بات کرتے یوں ٹھٹکا جیسے بالکل ابھی یہ بات پتا چلی ہو کہ وہ ان کی جگہ پر آبیٹھا ہے۔ ساتھ ہی ذرا سی جنبش کی گویا ابھی اٹھنے کا ارادہ ہو۔ آغا جان نے ہنستے ہوئے اس کے شانے پر پیار بھری تھپکی دی۔
"دادا کی سیٹ پر پوتا نہیں بیٹھے گا تو اور کون بیٹھے گا۔" موحد آفندی کی مہرماہ پر اٹھنے والی نظر بہت محظوظ کن تاثر لیے ہوئے تھی اور مسکراہٹ دباتے لب۔ اور دوسری طرف خفت سے لال چہرہ لیے لب کچلتی مہرو۔
"لڑکیوں کو اتنا منہ پھٹ اور خود سر نہیں ہونا چاہیے بھابی۔ ورنہ سسرال میں رہنا بسنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔" وہ کچن میں برتن دھو رہی تھی جب ثمرہ چچی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "یقیناً" وہ تائی جان کو اپنے فرمودات سنا رہی تھیں۔ اور سب سے حیران کن بات... ثمرہ کا لب و لہجہ میٹھا شہد ٹپکاتا۔ کہ آگے سے کوئی جواب

نہ دے پائے کوئی۔
"خیر۔۔۔۔ حق بات ہی کی تھی اس نے۔" وہ رکھائی سے اتنا ہی کہہ پائیں۔ مگر مہرماہ آفندی کے دل میں لگی آگے نے شعلے پکڑ لیے۔
یہ ماں بیٹا یہاں فقط آگ لگانے اور ہاتھ سینکنے آئے ہیں اور بس۔
اس کا دل سلگ رہا تھا۔۔۔۔ اور سلگنے والی شے مکمل طور پر بجھا نہیں کرتی۔ ایک دم سے کسی بھی وقت بھانبھڑ بن جاتی ہے۔

☆ ☆ ☆

زرنگار آفندی نے ایک سرکاری اسپتال کے وارڈ میں نمیر وقار آفندی جیسے پیارے بچے کو جنم دیا تو وقار نے ہنستے ہوئے اسے اٹھا کر سینے سے لگایا پھر اس کا ماتھا چوما تو آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اور اس کے دو ماہ بعد ثمرہ کے گھر موحد آفندی نے آنکھ کھولی تو آفندی ہاؤس گویا لائٹ ہاؤس بن گیا۔ آغا جان تو خوشی سے گل و گلزار ہو گئے۔ خزانوں کے منہ کھول دیے۔۔۔۔ سب کو جھولیاں بھر بھر دیا گیا۔ اناج بھی روپیہ بھی۔
مگر قسمتیں ماتھوں پہ تو نہیں لکھی ہوا کرتیں۔ انہیں کاتب تقدیر نے ہاتھوں کی لکیروں میں چھپا دیا ہے۔
ایک غربت اور ایک امارت کے زیر سایہ پلنے لگا۔ اور بے شک اللہ ہی تقدیریں بدلنے پر قادر ہے۔۔۔۔ بے شک۔

☆ ☆ ☆

وہ واش روم میں تھا جب اسے اپنے کمرے میں ہلکی سی اٹھا پٹخ سنائی دی۔ وہ آفس کے لیے نکل چکا تھا مگر پیٹ میں ہونے والی ہلکی سی گڑبڑا سے واپس آنے پر مجبور کر گئی۔ پہلے تو اس نے دھیان نہیں دیا مگر پھر اس رات والا واقعہ پورے سیاق و سباق کے ساتھ ذہن میں دوڑ گیا۔
وہ جلدی سے دبے پاؤں باہر نکلا۔ تو کمرہ اسی حالت میں تھا۔ ہر شے الٹ پلٹ۔
اور چور۔۔۔۔ وہ الماری میں گھسا ہوا تھا۔ موحد پھرتی سے آگے بڑھا اور اس کی نئی شرٹ کی آستین قینچی سے کترتے چور کا ہاتھ سختی سے دبوچ لیا۔ مہرماہ کے لبوں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔
اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موحد آفندی اس وقت گھر میں ہو سکتا ہے۔
اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے الماری سے لگایا۔
"بہت خوب مہرماہ آفندی۔۔۔۔ تو یہ تم ہو۔۔۔۔"
وہ دوسرے ہاتھ سے اس کے ماتھے کو انگشت شہادت سے اونچا کرتا تلخی سے بولا تو وہ دم سادھے سپید پڑتی رنگت لیے بے جان سی کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

بے ہنگم انداز سے دروازہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز پر زرنگار کا دل دھڑک اٹھا۔
چار سالہ نمیر کو لقمہ کھلا کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔
وقار آفندی چار آدمیوں کے سہارے آیا تھا۔
زرنگار کی چیخ نکل گئی۔ اس کے قدم بے جان ہو گئے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

شبینہ گل

گندمی رنگت اور نمکین روپ کے ساتھ معصوم کنواری سوچوں کو۔ نکھارے سنوارے ڈری سہمی حمنیٰ نے حامد کے نام پر سسرال میں قدم رکھا اور اس کی زندگی کے تنہا لحات مہکائے اور سونا کمرا سجایا۔ اگر حامد ایک روایتی مزاج دار شوہر تھا تو وہ بھی روایتی ستی ساوتری قسم کی خدمت گزار بیوی ثابت ہوئی' جو شوہر کے بلانے پر انکار کو سنگین گناہ سمجھتی تھی اور شوہر کی ناراضی سے بیوی پر پڑنے والی فرشتوں کی لعنت پر پکا ایمان رکھتی تھی۔ جب مرد روایتی حاکمیت پسند اور خود پرست ہو تو بیوی فرشتہ بھی مل جائے' پھر بھی کیڑے نکال ہی لیتا ہے۔ اندر کہیں کوئی احساس کمتری تھا یا کوئی چبھن تھی جو وہ ہر لمحہ حمنیٰ پر اس سے شادی کر لینے کا احسان جتاتا رہتا تھا اور اس کا دل کتنا بھی فگار ہوتا' وہ بس اس پہ پروانہ وار نثار ہوتی رہتی کہ یہ اس کا شوہرانہ حق تھا' لیکن وہ بجائے شکر ادا کرنے کے کچوکے لگانے کا موقع ڈھونڈتا۔ قدرت نے اسے یہ موقع بھی جلد فراہم کر دیا۔

شادی کے بعد شوہر کے نام کا شناختی کارڈ بنوانے کا مرحلہ آیا تو حمنیٰ نے لاپروائی سے پرانا کارڈ حامد کو لا تھمایا اور گلی چادر اوڑھنے۔ پرس اٹھا کر مڑی تو شناختی کارڈ کو گھورتے حامد کے تیور غضب ناک تھے۔ کھینچ کر کارڈ منہ پر دے مارا۔

"اس کارڈ کے مطابق تمہاری عمر تیس برس اور تمہارے گھر والوں نے پچیس بتائی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ..." وہ دھاڑا تو حمنیٰ بری طرح سہم گئی۔ حامد کا چہرہ اس کے آنسوؤں میں چھپ گیا اور دھند کے پار اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں پیاری ماں کی شبیہہ ابھری جو کہہ رہی تھی۔

"جی بس یہ ہی کوئی پچیس چھبیس برس کی ہے ہماری حمنیٰ!" جواب میں سامنے بیٹھی اس کی ساس

نے سرہلایا۔

"ہاں جی' مناسب ہے بر' ہمارا حامد بھی اس سال تیس کا ہوا ہے' اتنا فرق تو بالکل مناسب ہے۔" اسے گم صم خاموش دیکھ کر حامد مزید جھنجلایا اور زوردار تھپڑ

دے مارا تو وہ خرد کی دنیا میں لوٹ آئی۔ اب وہ پیر پٹختا باہر جا رہا تھا۔ وہ کہہ نہ سکی کہ شناختی کارڈ تو اس نے بھی دیکھا تھا' پر اسے واویلا کرنے کا حق حاصل نہ تھا کہ حامد کی ماں نے کیوں 35 برس میں سے 5 برس کی ہیراپھیری کی تھی۔ جیسے کو تیسا ہی ملتا ہے ناں پھر۔ میز پر پڑا شناختی کارڈ اٹھا کر اس نے واپس پرس میں ڈالا اور چادر اتار کر تہہ لگا دی۔

☼ ☼ ☼

اور اس کی نئی نویلی زندگی کا پہلا جھگڑا ہی اتنا خطرناک ثابت ہوا کہ میاں سمیت اس کے تمام سسرالیوں نے کئی دن اس کا اس "دھوکا دہی" پر سوشل بائیکاٹ کیے رکھا۔ بڑوں کی کوتاہی کے نتیجے میں ہونے والا یہ جھگڑا حمنیٰ کے لیے ایسا استاد ثابت ہوا جس نے چند لمحوں ہی میں اس کی اگلی پوری زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دے دیا۔ انسان خود کو عقل کل سمجھ کر جو بڑے بڑے فیصلے کرتا ہے وہ ایک ہی ٹھوکر پر اسے حقائق کے صحرا میں لا پٹختے ہیں' پھر جو غفلت جھٹک کر ہاتھ پاؤں مارے تو طلق تر کرنے کا وسیلہ ڈھونڈ لیتا ہے اور جو اپنی ہٹ پر ڈٹا رہے وہ موت کو گلے لگا لیتا ہے' ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتا ہے' لیکن حقائق کو قبول کرنے کی طاقت نہیں لا پاتا۔ حمنیٰ نے بھی ہاتھ پاؤں مار کر وسیلے ڈھونڈنا پسند کیا اور خود کو حقائق کے تھپیڑوں کے آگے فولادی دیوار بنا دیا۔

☼ ☼ ☼

یہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ وہ اپنی یا اپنے پیاروں کی عمر کو روک لے یا وقت کو تھام لے۔ اختیارات کو مالک ہی کے سپرد کرنے میں مطمئن رہے تو اطمینان دائمی رہتا ہے' لیکن انسان ہے نا۔ روتے

رہنا جس کی فطرت ہے۔ یہ حمنیٰ کی ماں کے اختیار میں نہ تھا کہ وہ بیٹی کی بڑھتی عمر کو روک لیتی یا کسی کا بھی ہاتھ تھام کر کم عمری میں سہاگن بنا دیتی' اس کے اختیار میں صرف انتظار تھا جو اس نے کیا۔

یہ حمنیٰ اور حامد کے بھی اختیار سے باہر تھا کہ وہ

اپنی لاڈلی بیٹی ہانیہ کی عمر کے سیل رواں کو بہنے سے روک لیتے۔ بیوی کو تا زندگی عمر کے طعنے دینے والا اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کی عمر کو انتیس سے آگے جاتا دیکھ رہا تھا اور کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا۔ لیکن مرد شاذ ہی اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے اور مرد اگر حامد جیسا ہو تو اسے تو اپنا کیا یاد بھی نہیں رہتا۔ وہ تادم مرگ خود کو "صحیح" ہی مانتا رہتا ہے۔ لیکن حمنیٰ کا لائحہ عمل ٹھوس تھا۔ اسی لیے جب ہانیہ کا مناسب سا رشتہ آیا تو مہمانوں کو اس کی عمر کا تلخ سچ ظاہر کرتے ہوئے اس نے اپنے شوہر کی برہم نگاہوں کو دل میں پیوست ہوتا محسوس کیا' لیکن اس کا دل بھلے ہی خون ہو جاتا' وہ اپنی لاڈلی کے سپنوں کا خون ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی' وہ اس کے گھر کی بنیاد سچ کے گارے پر اٹھانا چاہتی تھی' پانی پر بنے محل دیکھتے ہی دیکھتے لہروں میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور اس محل کی شہزادی گم گشتہ قصہ بن کر رہ جاتی ہے۔

اس نے ایک جتاتی ہوئی ٹھنڈی نگاہ شوہر کے سپرد کی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "لنگڑے جھوٹ کا سہارا عارضی ہوتا ہے۔ اس لیے سچ تلخ سہی' لیکن گزرتے وقت میں شیرینی گھول کر تعلق مضبوط اور زندگی سہل کر دیتا ہے۔ یہ میرا ایمان ہے۔ اور وہ مہمان جو اپنے اڑتیس سالہ بیٹے کو تیس سالہ بتانے کے ارادے سے آئے تھے' اب شرمندہ مسکان کو خوش گواریت میں بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آئینہ جتنا جلد دیکھ لیا جائے اتنا اچھا رہتا ہے۔ لڑکے کی ماں نے نیگ کے پیسے ہانیہ کے ہاتھ پر رکھ کر رشتہ پکا ہونے کا عندیہ دیا تو حامد کی پتھرائی آنکھیں سمندر ہو گئیں اور زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں سچ کی محبت جاگی۔

☼

ساری دُنیا کے غم ہمارے ہیں
اور ستم یہ کہ ہم تمہارے ہیں

دل برباد یہ خیال رہے
اس نے گیسو نہیں سنوارے ہیں

ان رفیقوں سے شرم آتی ہے
جو مرا ساتھ دے کے ہارے ہیں

اور تو ہم نے کیا کیا اب تک
یہ کیا ہے کہ دن گزارے ہیں

اس گلی سے جو ہو کے آئے ہوں
اب تو وہ راہرو بھی پیارے ہیں

جونؔ ہم زندگی کی راہوں میں
اپنی تنہا روی کے مارے ہیں

جونؔ ایلیا

مدتوں بعد شبِ ماہ اسے دیکھا تھا
پر کسی اور کے ہمراہ اسے دیکھا تھا

کیا خبر تھی کہ کہانی کوئی بن جائے گی
میں نے کل بزم میں ناگاہ اسے دیکھا تھا

وصل کی رات ستاروں نے بڑی حسرت سی
گاہ دیکھا تھا مجھے، گاہ اسے دیکھا تھا

لوگ اسے ڈھونڈنے نکلے تو یہ معلوم ہوا
جس نے دیکھا تھا سرِ راہ اسے دیکھا تھا

آج ایک عمر کے بعد اس سے ملا تھا لیکن
اپنے احوال سے آگاہ اسے دیکھا تھا

اس کا کیا ٹھیک کہ لوگوں نے بیک وقت جمالؔ
سرِ میخانہ و درگاہ اسے دیکھا تھا

جمال احسانی

موج خوشبو کی طرح بات اُڑانے والے
تجھ میں پہلے تو نہ تھے رنگ زمانے والے

کتنے ہیرے میری آنکھوں سے چُرائے تو نے
چند پتھر مری جھولی میں گرانے والے

خوں بہا اگلی بہاروں کا ترے سر تو نہیں؟
خشک ٹہنی پہ نیا پھول کھلانے والے

آ تجھے نذر کروں اپنی ہی شہ رگ کا لہو
میرے دشمن، میری توقیر بڑھانے والے

آستینوں میں چھپائے ہوئے خنجر آئے
مجھ سے یاروں کی طرح ہاتھ ملانے والے

ظلمتِ شب سے شکایت انہیں کیسی محسنؔ
وہ تو سورج کو بھی تھے آئینہ دکھانے والے

محسن نقوی

تجھ کو آتے ہی نہیں چھپنے کے انداز ابھی
میرے سینے میں ہے لرزاں تیری آواز ابھی

اس نے دیکھا ہی نہیں درد کا آغاز ابھی
عشق کو اپنی تمناؤں پہ ہے ناز ابھی

تجھ کو منزل پہ پہنچنے کا ہے دعوا ہمدم
مجھ کو انجام نظر آتا ہے آغاز ابھی

کس قدر گوش بر آواز ہے خاموشیٔ شب
کوئی نالہ کہ ہے فریاد کا در باز ابھی

میرے چہرے کی ہنسی رنگ شکستہ میرا
تیرے اشکوں میں تبسم کا ہے انداز ابھی

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

راز

نفسیات دانوں کا ایک گروپ' ایک کانفرنس میں مدعو تھا۔ ان میں سے چار واپس جانے لگے اور اتفاق سے اکٹھے ہی لفٹ میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"لوگ ہمارے پاس ہمیشہ اپنا خوف اور احساس جرم لے کر آتے ہیں' لیکن ہم اپنے مسائل کے لیے کس کے پاس جائیں۔" دوسرے نے پہلے کی بات سے اتفاق کیا۔

پھر ایک نے کہا کہ "کیوں کہ ہم سب پیشہ ور ہیں' کیوں نہ ہم کچھ بات چیت کرلیں اور وہ باتیں شیئر کریں جو ہم کسی سے نہیں کرسکتے۔"

باقی نے اس بات سے اتفاق کیا اور پھر پہلے نے اعتراف کیا۔

"میرے پاس جب بھی کوئی مریض آتا ہے' میرے دل میں اسے قتل کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوتی ہے۔"

دوسرے نفسیات دان نے کہا۔

"مجھے قیمتی اشیاء کا شوق ہے' اس کے لیے میں اپنے مریضوں سے ناجائز طریقے سے رقم اینٹھتا ہوں۔"

تیسرے کا کہنا تھا۔

"میں منشیات فروخت کرتا ہوں اور اس کے لیے اپنے مریضوں کا استعمال کرتا ہوں۔"

چوتھے نے اعتراف کیا

"میں کچھ بھی کرلوں لیکن میں کوئی بات راز میں نہیں رکھ سکتا۔"

ملائکہ کوثر ..... بسم اللہ پور

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں

اختر صاحب یہ سوچ کر تیز بارش میں ریڈی میڈ شرٹ خریدنے کے ارادے سے گھر سے نکلے کہ بارش کی وجہ سے دکانوں پر گاہک نہیں ہوں گے اور دکان دار رعایت کے ساتھ شرٹ دے دے گا۔ مگر وہ اس وقت حیران رہ گئے۔ جب دکان دار نے شرٹ کی قیمت چھ سو روپے بتائی' جب کہ ان کے اندازے کے مطابق وہ شرٹ چار سو روپے سے زیادہ کی نہیں تھی۔

"بھئی کمال ہے.....!" اختر صاحب نے غصے سے کہا۔ "میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ ایسے خراب موسم میں شرٹ رعایتی قیمت میں مل جائے گی۔"

"اسے رعایت ہی سمجھیں جناب!" دکان دار ناصحانہ انداز میں بولا۔ "ہمیں اندازہ ہے کہ جو آدمی اتنی تیز بارش میں شرٹ خریدنے نکلا ہے۔ اسے شرٹ کی کتنی شدید ضرورت ہوگی۔"

عظمیٰ شفیق..... جڑانوالہ

ڈراپ سین

ایک فرانسیسی ہواباز اپنا جہاز رن وے پر اتارتے ہوئے بہت خوش تھا۔ نیچے عملے نے بھی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک ایئرمین اس کی وردی اور ہیلمٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

ہواباز نے بڑے فخر سے کہا۔ "آج میں نے جرمنوں کا بہت نقصان کیا ہے' دو جہاز گرائے' ایک آبدوز تباہ کی اور ایک بحری جہاز اڑا دیا۔"

"لیکن سر جی! آپ سے ایک بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔"

"وہ کیا بھئی.....؟"

"دراصل سر جی! آپ غلطی سے جرمنوں کے ہوائی اڈے پر ہی لینڈ کر گئے ہیں۔"

افشاں خان، عطیہ حق نواز..... شاہ پور چاکر

تلاش گمشدہ

ایک لڑکی اپنی سہیلی کو اپنے محبوب اور اپنے ہونے والے شوہر کا خط پڑھ کر سنا رہی تھی۔

انہوں نے لکھا ہے۔ "میں ہر وقت تمہارے پانچ فٹ تین انچ قد..... تمہاری ڈیڑھ فٹ لمبی زلفوں، تمہاری اٹھائیس انچ کمر..... تمہاری بادامی آنکھوں اور تمہارے بائیں پاؤں کی ہلکی سی لنگڑاہٹ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں....."

"یہ کچھ عجیب سا محبت نامہ نہیں ہے؟" سہیلی نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں، دراصل میرے منگیتر تھانے میں ہوتے ہیں نا اور تلاش گمشدہ کی اکثر رپورٹیں وہی لکھتے ہیں۔" لڑکی نے بتایا۔

اقراء نمرہ..... کراچی

مسکراہٹیں

بحریہ کے ایک رنگروٹ کی رائفل کہیں کھو گئی اور جب انتظامیہ نے اسے اس کی قیمت ادا کرنے کو کہا تو اس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا "اگر میں بحریہ کی کسی جیپ کو چلا رہا ہوتا اور کوئی اسے چرا کر لے جاتا تو کیا مجھے اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی؟"

انتظامیہ نے کہا "گورنمنٹ کی ہر قسم کی املاک جسے وہ گم کرے گا اس کی قیمت ادا کرنا ہو گی۔"

"آج میری سمجھ میں آیا کہ ڈوبتے ہوئے جہاز کے ساتھ کپتان کیوں ڈوب جاتا ہے۔" رنگروٹ نے پر سوچ لہجے میں کہا۔

شاکرہ خاتون..... طارق روڈ، کراچی

ایک سے بڑھ کر ایک

"میرے باس کی بیوی کو تم نے پارٹی میں دیکھا تھا نا، کس قدر خوب صورت ہے۔" شوہر نے بیوی کو چڑانے کی غرض سے کہا۔ "کچھ روز سے میرے خوابوں میں آ رہی ہے۔" "اکیلی ہی دکھائی دیتی ہو گی؟" بیوی نے پریشان ہونے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"ہاں لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا" شوہر نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ آپ کے باس میرے خوابوں میں آ رہے ہیں۔" بیوی نے اٹھلا کر جواب دیا۔

فوزیہ ثمر بٹ..... گجرات

کس لیے.....؟

ہائی وے پر نہایت تیز رفتاری سے جاتے ہوئے ایک صاحب کی گاڑی کو ٹریفک سارجنٹ نے کافی دیر تک تعاقب کرنے کے بعد روکا تو وہ صاحب انجان اور معصوم بنتے ہوئے بولے۔ "مجھے کس لیے روکا گیا ہے؟ اس سے پہلے تو کبھی مجھے اس طرح نہیں روکا گیا۔"

"جی ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔" ٹریفک سارجنٹ نے دانت پیس کر کہا۔ "اس سے پہلے جس نے بھی آپ کو روکا ہو گا۔ گاڑی کے پچھلے ٹائروں پر گولی چلا کر ہی روکا ہو گا۔"

فاکہہ سہیل..... کراچی

لائسنس

آوارہ کتوں کے خلاف بلدیہ کی مہم زوروں پر تھی۔ ایک صاحب اپنے کتے کو نہلا دھلا کر ٹہلانے کے لیے نکلے تو ایک پولیس والے نے انہیں روک کر سوال کیا۔ "کیا آپ نے کتے کا لائسنس بنوا لیا ہے؟"

وہ صاحب بے نیازی سے بولے۔ "نہیں! اس نے ابھی ڈرائیونگ نہیں سیکھی ہے۔"

کہکشاں اشفاق..... فیصل آباد

شگفتہ جاہ

یادوں کے دریچوں سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں جو اپنے رشتہ داروں کی طرف سے کی گئی صلہ رحمی کے جواب میں صلہ رحمی کرے بلکہ صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس سے قطع رحمی کی جائے تو وہ (اس کے جواب میں بھی) صلہ رحمی کرے۔" (ترمذی)

حضرت علیؓ کا قول،

انسان کا فضول شوق میں وقت کھو دینا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ اس سے ناراض ہے۔

حنا سلیم اعوان۔ آخون بانڈی

پُراسرار تقدس،

نمک میں ضرور کوئی پُراسرار تقدس موجود ہے کہ یہ ہمارے آنسوؤں میں بھی ہے اور سمندر کے پانی میں بھی ہے۔

(واصف علی واصف)

ہنر،

کلاس روم میں سناٹا طاری تھا۔ استاد کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ سوال تھا ہی ایسا۔ استاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بلیک بورڈ پر ایک لکیر کھینچ دی پھر طلباء سے پوچھا۔
"تم میں سے کون ہے جو اس کو چھوئے بغیر چھوٹا کر دے؟"
"یہ ناممکن ہے۔" کلاس کے سب سے ذہین بچے نے آخر اس خاموشی کو توڑا۔
"لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا پڑے گا جبکہ آپ نے چھونے سے منع کیا ہے۔"
استاد نے کچھ کہے بغیر پہلی لکیر کے متوازی اس سے بڑی لکیر کھینچ دی۔ جس کے بعد سب نے دیکھ لیا کہ استاد نے پہلی لکیر کو چھوئے بغیر چھوٹا کر دیا تھا۔

انہوں نے دوسروں کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر آگے نکلنے کا ہنر سکھایا تھا۔

آبرو چوہدری۔ سرگودھا

وقت ضائع کرنا

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا۔ "مجھے اس آدمی پر بہت غصہ آتا ہے جو مجھے فارغ نظر آتا ہے۔ نہ آخرت کے کسی عمل میں لگا ہوتا ہے اور نہ دنیا کے کسی کام میں۔"

سحیلہ ظفر اقبال

عہد عیسیٰؑ کا ایک عجیب واقعہ،

علامہ دمیریؒ فرماتے ہیں کہ مورخین اور اصحاب سیر نے حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں ایک اسحاق نامی شخص تھا۔ اس کی چچازاد بہن حسن اور خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھی۔ یہ اپنی چچازاد بہن پر عاشق ہو گیا اور اس سے شادی کر لی۔ چند روز کے بعد اس لڑکی کا انتقال ہو گیا۔ اس پر جدائی بہت شاق گزری یہ اس کی قبر پر جا کر جمٹ گیا اور رونے لگا۔ ایک مدت تک ایسا ہی کرتا رہا۔
ایک دن حضرت عیسیٰؑ کا ادھر سے گزر ہوا تو آپؑ نے کہا۔
"اے اسحاق! کیوں رو رہا ہے؟"

اس نے کہا۔ "یا روح اللہ! یہ میری بیوی کی قبر ہے۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی۔ اس کے فراق نے مجھے ہلاک کر رکھا ہے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا۔ "تمہارا یہ ارادہ ہے کہ میں اس کو اللہ کے حکم سے زندہ کر دوں؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت عیسیٰؑ قبر کے پاس آئے اور کہا۔

"قم یا صاحب ہذا القبر باذن اللہ۔" (اللہ کے حکم سے زندہ ہو جا)

چنانچہ قبر شق ہوئی اور اس میں سے ایک حبشی غلام جس کی آنکھ، ناک اور منہ سے آگ نکل رہی تھی۔

اسحاق نے کہا۔ "یا نبی اللہ! میری بیوی کی قبر یہ نہیں ہے، بلکہ فلاں جگہ ہے۔" اس نے دوسری طرف اشارہ کر کے کہا۔

حضرت عیسیٰؑ نے اس حبشی سے کہا۔ "واپس چلے جاؤ۔" چنانچہ وہ مردہ ہو کر گر پڑا۔

پھر آپ دوسری قبر پر گئے اور کہا۔ "اے صاحب قبر! اللہ کے حکم سے کھڑا ہو جا۔"

چنانچہ ایک عورت اپنے بدن سے مٹی جھاڑتی ہوئی نکلی۔ حضرت عیسیٰؑ نے دریافت کیا۔

"یہی تمہاری زوجہ ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا تو حضرت عیسیٰؑ نے کہا۔

"اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔"

چنانچہ وہ اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تیرے فراق میں مستقل جاگتا رہا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر آرام کر لوں۔"

چنانچہ وہ تھوڑی دیر کے لیے وہاں سو گیا۔

سونے کے دوران اس لڑکی کے پاس سے ابن الملک گزرا جو حسن و جمال میں یکتائے روزگار تھا۔ لڑکی اس کو دیکھتے ہی عاشق ہو گئی۔ جب اس شخص نے لڑکی کو دیکھا تو وہ بھی اس پر فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی نے کہا۔

"مجھ کو اپنے ساتھ لے چلیے۔"

اس نے اسے اپنے گھوڑے پر سوار کر لیا اور اپنے ساتھ لے گیا۔

ادھر جب اسحاق بیدار ہوا تو اپنی بیوی کو نہ پا کر بہت پریشان ہوا اور اس کی طلب و تلاش میں نکل پڑا۔ اور گھوڑے کے آثار قدم دیکھ کر ان کے پیچھے چلتا رہا۔ ایک مقام پر پہنچ کر ان کو پکڑ لیا اور ابن الملک سے کہا۔

"میری بیوی میرے حوالے کر دو کیونکہ زوجہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ میری چچازاد بہن بھی ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میں تجھ کو نہیں جانتی۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ابن الملک کی جاریہ ہوں۔"

ابن الملک نے اسحاق سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تو میری باندی سے کیوں جھگڑتا ہے؟"

اس پر اسحاق نے جواب دیا۔ "یہ تیری باندی نہیں ہے، میری بیوی ہے، جس کو روح اللہ نے اللہ کے حکم سے زندہ کیا ہے۔"

ان کی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اچانک حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے اور کہا۔

"اے اسحاق! یہ تیری بیوی وہی ہے، جس کو میں نے اللہ کے حکم سے زندہ کیا تھا؟"

اسحاق نے جواب دیا۔ "ہاں اے اللہ کے نبی! یہ وہی ہے۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "یا روح اللہ! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں اس کی بیوی ہرگز نہیں ہوں۔ میں تو ابن الملک کی جاریہ ہوں۔"

ابن الملک نے بھی اس کی تائید کی کہ یہ میری باندی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ نے لڑکی سے کہا۔ "کیا میں نے تجھے زندہ نہیں کیا؟"

اس نے اس بات سے بھی انکار کیا۔

حضرت عیسیٰؑ نے کہا۔ "جو میں نے تجھے دیا اس کو واپس کر دے۔"

یہ سنتے ہی وہ لڑکی مردہ ہو کر گر پڑی۔ پھر حضرت عیسیٰؑ نے ارشاد فرمایا۔

"جو شخص ارادہ کرے کہ میں اس شخص کو دیکھوں جو کفر کی حالت میں مرا ہو پھر اللہ نے اس کو زندہ کر

کے ایمان کی حالت میں اُٹھایا تو وہ اس حبشی کو دیکھ لے اور جو اس کو دیکھنا چاہے جو بحالت ایمان مرا ہو پھر اس کو اللہ نے زندہ کیا ہو پھر اس کو کفر کی حالت میں اُٹھا لیا ہو تو اس لڑکی کو دیکھ لے۔ اس کے بعد اسحاق نے حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر کر کے عہد کیا کہ وہ کبھی بھی شادی نہ کرے گا۔ (حیات الحیوان)

حکمران،

حضرت قیس بن سعد عبادہؓ معروف صحابی ہیں اور ایک زمانے تک مصر کے گورنر رہے ہیں۔ موسیٰ بن عقبہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بڑھیا ان کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"مجھ کو یہ شکایت ہے کہ میرے گھر میں کیڑے مکوڑے بہت کم ہیں۔"

حضرت قیسؓ نے فرمایا۔ "کیا اچھا کنایہ ہے، اس کا گھر روٹی، گوشت اور کھجور سے بھر دو۔"

عائشہ رباب۔ کراچی

ایک روٹی،

امام ابن جوزیؒ نے اپنی کتاب عیون الحکایات میں لکھا ہے کہ حضرت سیدنا ابوہریرہؓ فرماتے ہیں۔

جب میرے والد حضرت سیدنا ابوموسیٰؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپؓ نے اپنے تمام بیٹوں کو اپنے پاس بلا کر فرمایا۔

"میں تمہیں صاحب الرغیف (یعنی روٹی والے) کا قصہ سناتا ہوں۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا، پھر فرمایا۔

"ایک عابد شخص اپنی جھونپڑی میں لوگوں سے الگ تھلگ عبادت کیا کرتا تھا۔ وہ ستر سال تک اسی جھونپڑی میں رہا۔ اس عرصے میں اس نے کبھی بھی عبادت کو ترک نہ کیا۔ اور نہ ہی کبھی اپنی جھونپڑی سے باہر آیا۔ پھر ایک دن جھونپڑی سے باہر آیا تو اسے شیطان نے ایک عورت کے فتنے میں مبتلا کر دیا اور وہ سات دن یا سات راتیں اسی عورت کے ساتھ رہا۔ سات دن کے بعد جب اس کی آنکھوں سے غفلت کا پردہ ہٹا تو وہ اپنی اس حرکت پر بہت نادم ہوا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ وہ اپنے اس فعل پر بہت نادم تھا۔ اس کی یہ حالت تھی کہ ہر ہر قدم پر نماز پڑھتا اور توبہ کرتا۔ پھر ایک رات وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں بارہ مسکین رہتے تھے۔ وہ بہت زیادہ تھکا ہوا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے وہ ان مسکینوں کے قریب گر پڑا۔

ایک راہب روزانہ ان بارہ مسکینوں کو ایک ایک روٹی دیتا تھا۔ جب وہ راہب آیا تو اس نے روٹی دینا شروع کی اور اس عابد کو بھی مسکین سمجھ کر ایک روٹی دے دی اور ان بارہ مسکینوں میں سے ایک کو نہ ملی تو اس نے راہب سے کہا۔

"آج آپ نے مجھے روٹی کیوں نہیں دی؟"

راہب نے جب یہ سنا تو کہا۔

"میں تو بارہ کی بارہ روٹیاں تقسیم کر چکا ہوں۔" پھر اس نے مسکینوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا تم میں سے کسی کو دو روٹیاں ملی ہیں؟"

سب نے کہا۔ "نہیں، ہمیں تو صرف ایک ایک ہی ملی ہے۔"

یہ سن کر راہب نے اس شخص سے کہا۔

"شاید تم دوبارہ روٹی لینا چاہتے ہو، جاؤ آج کے بعد تمہیں روٹی نہیں ملے گی۔"

جب اس عابد نے یہ سنا تو اسے اس مسکین پر بڑا افسوس ہوا۔ چنانچہ اس نے وہ روٹی اس مسکین کو دے دی اور خود بھوکا رہا۔ اور اسی بھوک کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔ جب اس کی ستر سالہ عبادت اور غفلت میں گزری ہوئی سات راتوں کا وزن کیا گیا تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں گزری ہوئی راتیں اس کی ستر سالہ عبادت پر غالب آ گئیں۔ پھر جب ان سات راتوں کا موازنہ اس روٹی سے کیا گیا، جو اس نے مسکین کو دی تھی تو وہ ان راتوں پر غالب آ گئی اور اس کی مغفرت کر دی گئی۔

(عیون الحکایات، حصہ اول صفحہ 67، مؤلف امام ابوالفرج عبدالرحمن بن علی الجوزیؒ)

لاریب، ماہ زیب ____ چونیاں

یہ میرے درد کی دولت میری متاع فراق
ان آنسوؤں کی وضاحت میں عمر بھر نہ کروں
وہ اک پل کو سہی دکھائی تو دے کہیں
میں جان گنوا کے بھی اس پل کو مختصر نہ کروں

تسلیم شہزادی ____ کوٹ مومن

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھیے زندگی کیا چیز ہے
ہم لبوں سے کہہ نہ پائے ان سے حال دل کبھی
اور وہ سمجھے نہیں یہ خاموشی کیا چیز ہے

عائشہ حسین ____ قلعہ دیدار سنگھ

نیا موسم میری بینائی کو تسلیم نہیں
میری آنکھوں کو وہی خواب پرانے لادے
جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لادے

زینب مختار ____ ملتان

کتنے مجبور ہیں ہم اپنی انا کے ہاتھوں
ریزہ ریزہ بھی ہوئے اور بکھرے بھی نہیں
لوگ جی لیتے ہیں سپنوں کے سہارے کیسے
اپنی آنکھوں میں تو اب خواب اترتے بھی نہیں

پارس فضل ____ لیہ شریف

ماتم کی فضا ہے شہر دل میں
مجھ میں کوئی شخص مر گیا ہے

مدیحہ نورین مہک ____ برنالی

صبح کے تخت نشیں شام کو مجرم ٹھہرے
ہم نے پل بھر میں نصیبوں کو بدلتے دیکھا ہے

ثمینہ کوثر، عائشہ اسلم ____ ڈوگر گجرات

فیصلہ ہے لوگوں کا
ذات تیری میری تھی

بریرہ راجپوت ____ نامعلوم

خاموش! اے دل بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

نمرہ، اقرا ____ کراچی

احساس نہ اخلاق محبت نہ تعلق
اس دور کے انسان ہیں کہ پتھر کے مجسمے

شہزیبا ____ مغلیانوالی

خیالوں کو کسی آہٹ کی آس رہتی ہے
آنکھوں کو کسی صورت کی پیاس رہتی ہے
تیرے بنا کسی چیز کی کمی تو نہیں
تیرے بنا طبیعت اداس رہتی ہے

رضوانہ شکیل راؤ ____ لودھراں

کسی کو اپنا بنانا ہنر ہی سہی
کسی کا بن کر رہنا کمال ہوتا ہے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ____ کراچی

یہ الگ بات ہے کہ خاموش کھڑے رہتے ہیں
پھر بھی جو لوگ بڑے ہیں بڑے رہتے ہیں
ایسے درویشوں سے ملتا ہے ہمارا شجرہ
جن کے قدموں میں کئی تاج پڑے رہتے ہیں

درشن مولا یام ____ بھلوال

تیری یادوں کے اس خاموش محل میں
دل تو لگ جاتا ہے پر آنکھ نہیں لگتی

الوینہ، فرینہ، فائزہ ____ حیدرآباد

چراغ لے کے لوگ ڈھونڈنے نکلے
ہمارے بعد وفاؤں کا احترام ہوا!

ثمینہ اکرم ____ کراچی

محبتوں میں خطائیں تو ہو ہی جاتی ہیں
محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا

ریحانہ چوہدری ___ مدوکے

کچھ اس انداز سے چھوڑا بہار نے دامن
خزاں نے پھول بکھیرے ہماری راہوں میں
شیشہ گروں کے شہر میں دیکھی عجیب بات
ہاتھوں میں پھول اور زباں سنگ لیے ہوئے

ریحانہ جبار ___ گدو

آپس میں بات چیت کی زحمت کیے بغیر
چل رہے ہیں ساتھ شکایت کیے بغیر
آنکھوں سے کر رہے ہیں بیاں اپنی کیفیت
ہونٹوں سے حال دل کی وضاحت کیے بغیر

انیقہ انا ___ چکوال

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری، صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

عائشہ رباب ___ کراچی

وہ مایوسی کے لمحوں میں
ذرا سا حوصلہ دیتا
ہم کاغذ کی کشتی پہ
سمندر میں اتر جاتے

فوزیہ ثمر بٹ ___ گجرات

ہم نے اپنی اداسی کا اس طرح بھرم رکھا
رابطے کم کر دیے مصروف کہلانے لگے

شہلا اسلام ___ قائم پور

یہ جو ہم ہیں نا احساس میں جلتے ہوئے لوگ
ہم اگر زمین زاد نہ ہوتے تو ستارے ہوتے

شائستہ اکبر ___ گدو کالونی

تیرے وسوسوں کے فشار میں میرا شہر رنگ اجڑ گیا
تیرے آئینے کی تلاش میں، میرے خواب چہرہ گنوا گئے

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ___ کراچی

گر چاہوں تو ایک نگاہ میں خرید لوں اس کو
جس کو ناز ہے بہت کہ بکتا نہیں ہوں میں

عروسہ کنول شہزادی ___ میانوالی

اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگماں
کتنے یقین بچھڑ گئے، کتنے گماں گزر گئے

صدف عمران ___ کے ڈی اے سوسائٹی

نہ تھا اپنا مزاج ایسا کہ ظرف کھوتے انا بچاتے
وگرنہ ایسے جواب دیتے کہ پھر نہ پیدا سوال ہوتے

سیدہ لوبا سجاد ___ کہروڑ پکا

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تسنیم شریف ___ کراچی

کوئی ستارہ نہ آ جائے پاؤں کے نیچے
قدم سنبھل کے اٹھاؤ بڑا اندھیرا ہے

نیازی سسٹرز ___ میانوالی

تیرے اختیار میں کیا نہیں
مجھے اس طرح سے نواز دے
میری سب دعائیں قبول ہوں
میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

جمیلہ ظفر ___ جڑانوالہ

رسم الفت ہی اجازت نہیں دیتی ورنہ
ہم بھی ایسا تمہیں بھولیں کہ سدا یاد کرو

سیدہ نسبت زہرا ___ کہروڑ پکا

یہ محبت بھی خطا، اظہار محبت بھی خطا
ہم تو اس عہد محبت میں یونہی مارے گئے

زاہدہ پروین ___ سرگودھا

یہ پھر سے کس نے لہو کا خراج مانگا ہے
کہ ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

ساجدہ افتخار ___ کراچی

اب کی بار ایک عجیب سی خواہش اٹھی ہے دل میں
کوئی ٹوٹ کر چاہے مجھے اور میں بے وفا نکلوں

شاکرہ خاتون ___ کراچی

بات اچھی ہو تو کانوں کے حوالے کر دو
ورنہ ہر بات ہواؤں کے حوالے کر دو

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خطوط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔
آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں
سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے درمیان محبتوں کو سلامت رکھے۔

پہلا خط کراچی سے سعدیہ ملک کا ہے، لکھتی ہیں۔

ایمل رضا نے "پیال ساز" لکھ کر چونکا دیا۔ انہوں نے ابھی لکھنے کا آغاز کیا ہے۔ جس وجہ سے میں ان سے توقع نہیں کر رہی تھی۔ ایمل کی تحریر بہت میچیور ہے، بہترین کردار نگاری، ہر کردار اپنی جگہ مکمل اور مضبوط خصوصاً "نانو کا کردار" وہ بیک وقت بہترین دوست، سمجھ دار ماں اور مشفق نانی ہیں۔ اس ناول کو پڑھنے کے بعد ایمل میری پسندیدہ مصنفین کی اس لسٹ میں شامل ہو گئی ہیں جس میں نمرہ احمد، عمیرہ احمد، سائرہ رضا اور سمیرا حمید ہیں۔

پیاری سعدیہ! ہم آپ سے متفق ہیں، ایمل اپنی عمر کے مقابلے میں بہت میچیور اور پختہ انداز میں لکھ رہی ہیں یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔

کراچی۔ سے تسنیم کوثر شریک محفل ہیں، لکھا ہے

جولائی کا عید نمبر پڑھا اچھا لگا۔ پہلی شعاع سے ابتدا کی۔ آپ کی تحریر دل کو لگتی ہے۔ بہت خوش رہیے۔ مختصر افسانے اچھے تھے۔ خاص طور پر ایمل رضا کا پیال ساز کا تو جواب نہیں۔ پیال ساز اپنے نام کی طرح منفرد اور اچھوتا ناول ہے۔ اسٹوری بالکل ڈفرنٹ اور دلچسپ ہے۔ خاص کر کرداروں کے نام باسل، زمل یشار بہت خوب اور اتنی ہنر مند نانو ویری نائس۔

"خواب شیشے کا" بہتر ہے۔ شاید آگے جا کر اچھا ہو جائے۔ لیکن ابھی اس میں زیادہ دل نہیں لگ رہا۔ صدف آصف کا ناول مسکراہٹیں اچھا کہہ سکتے ہیں۔ ایک میسج ہے اس میں مگر اس کا نام ہوم شاپ ہونا چاہیے تھا، کیا خیال ہے۔ من دیپک اور راگ محبت، امت العزیز شہزاد کا ناول بہت بہت شاہکار ناول ہے۔ کیا دماغ پایا ہے رائٹر نے کتنا مشکل اور سنسنی خیز لکھا ہے۔ بھئی جواب نہیں۔

رابعہ افتخار کا چاند دیکھ کر ایک سیدھا سادا نارمل یعنی ایک عام سا ناول لگا بس ٹھیک کہہ سکتے ہیں اور جناب سیاہ حاشیہ تو ہے ہی دلکش دلربا ناول، امید ہے اینڈ بھی بھرپور ہو گا۔ بدیع الجمال کا منار سو سو لگا۔ اسٹوری بے تکی اور فضول سی تھی۔ "دکھتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ" مجھے بہت پسند ہے۔ مگر اب اس میں ہم اشعار نہیں لکھیں گے کیونکہ خالدہ ہمیں شامل نہیں کرتی ہیں۔ باتوں سے خوشبو آئے سب سے پیارا لگتا ہے۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں شعاع کی جان ہے۔ پڑھ کر دل منور ہو جاتا ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی دلکش ہیں۔

ج: پیاری تسنیم! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کے اشعار شامل نہ ہو سکے تو یقیناً "کوئی وجہ ہو گی" آپ اچھے اشعار بھیجیں ضرور شامل ہوں گے۔ عموماً قارئین ہمیں جو اشعار بھیجتی ہیں وہ پہلے بھی کئی بار شائع ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لیے شائع نہیں ہو پاتے۔ آپ کی تعریف و تنقید

متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

عائشہ انصاری نے حیدر آباد سے لکھا ہے

سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھی پھر سروے میں ثمینہ اکرم کو پڑھا۔ ہمیں ان کے دکھ کا اندازہ ہے۔ آپ کے ساتھ ساتھ کوثر خالد صاحبہ سے میں بھی کہوں گی کہ عید کیوں نہیں مناتیں؟ عید روزے داروں کے لیے "تحفہ" تو ہے۔ اس "تحفے" کے لیے ہمیں جی بھر کے پرجوش ہونا چاہیے خواہ آپ عمر کے جس حصے میں بھی ہوں۔ میری کہانی "سچی خوشیاں" کا کیا بنا؟

ج : پیاری عائشہ! یہ کیا؟ ساری باتیں لکھ دیں اور شعاع پر تبصرہ غائب۔ آئندہ فرصت سے وقت نکال کر لکھیے گا۔ اس بات سے تو ہم بھی اتفاق کرتے ہیں کہ عید منانے کا حق صرف بچوں کا نہیں یہ تو تمام روزے داروں کے انعام کا "جزا" کا اور لطف و عنایت کا دن ہے۔ پھر خوشی منانی تو بنتی ہے۔ افسانے کے لیے معذرت۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ سوچیں اور لکھیں۔

اقصیٰ طیب الرحمان نے گاؤں مومن ضلع ہری پور سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

خط لکھنے کی صرف ایک وجہ یہ ہے ہمارے ہری پور سے کبھی کوئی خط نہیں لکھا گیا یا آپ نے شائع نہیں کیا؟؟؟
ویسے تو ہماری ساری رائٹرز بہت ہی اچھی ہیں۔ ان کی تحریریں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ سمیرا حمید اور صائمہ اکرم کا ذکر بالخصوص کرنا چاہوں گی۔ ایمل رضا کا ناول بہت اچھا جارہا ہے۔ "خواب شیشے کا" بھی اچھی اسٹوری ہے۔ امید ہے کہ آگے چل کر بہت اچھی ہوگی۔ اور عید کے حوالے سے سارے سلسلے بہت زبردست تھے۔

ج : پیاری اقصیٰ! چھ سال کی خاموشی کے بعد یاد کیا۔ بہت خوشی ہوئی۔ ہری پور سے خط بھی موصول ہوتے ہیں اور ہم نے شائع بھی کیے ہیں' شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچارہے ہیں۔

حنا علی احمد نے حافظ آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ تمام افسانے اور ناول اور ہمارے سلسلے سورج کی شعاعوں کی طرح روشنی بکھیرتے رہے۔ میں نے افسانے بھیجے تھے لیکن مجھے لگتا ہے انہوں نے ردی کی ٹوکری کا پیٹ ہی بھرا ہوگا شعاع کی محفل میں تو ہمارے لیے کوئی جگہ ہی نہیں ایک بار کے علاوہ کبھی شعاع کی محفل میں جگہ نہیں ملی شمع امید روشن ہے کہ اب کی بار ضرور ملے گی۔

ج : پیاری حنا! ہمیں احساس ہے کہ اپنے خط — نہ دیکھ کر آپ کے دل پر کیا گزری ہوگی.... یقین جانیں ہمیں بہت شان دار اور جان دار قسم کے خطوط اکثر اس وقت موصول ہوتے ہیں جب کاپی پریس جاچکی ہوتی ہے۔ اور اگلے مہینے وہ خطوط ظاہر ہے جگہ نہیں پاسکتے..... لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شائع ہونے کے لائق نہیں تھے۔ اور ہاں شکایت کے ساتھ ساتھ شعاع کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھ دیتیں۔ افسانہ ضرور بھجوائیں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

حافظہ فاطمہ عزیز نے ساہیوال سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

شعاع اور خواتین سے وابستگی بہت کم عمری میں ہوئی۔ ہمارا گھرانہ ایک مذہبی گھرانہ تھا۔ گھر میں رسالے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ مڈل کے بعد والدین نے حفظ کرنے کے لیے مدرسے میں ڈال دیا۔ وہاں پر ہماری استاد' آپا جی شعاع اور خواتین پڑھا کرتی تھیں اور ان میں سے احادیث اور اچھی باتیں ہمارے ساتھ بانٹ بھی لیتی تھیں۔ بس ان کی دیکھا دیکھی ہم دوستوں نے بھی مل کر شعاع اور خواتین پڑھنا شروع کردیا۔ تب ان کی قیمت 30 روپے ہوا کرتی تھی۔ ہم پانچ پانچ روپے سب مل کر جمع کرتیں اور پھر باری باری رسالہ پڑھتی تھیں۔ حافظہ بننے کے بعد تعلیم کا سلسلہ دوبارہ سے شروع کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد شادی پھر قرآن پاک کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا جو آج تک جاری ہے۔ اتنی مصروفیت کے باوجود ان دونوں رسالوں سے ہم نے ساتھ برقرار رکھا ہے۔
شعاع کے سارے سلسلے بہت اچھے ہیں اور میں تو کہانیوں کی طرف آنے سے پہلے دوسرے سلسلے پہلے پڑھتی ہوں۔ پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں جہاں دل کو منور کرتی ہیں۔ تو مسکراہٹیں' خط آپ کے' باتوں سے خوشبو آئے یہ

سب کچھ بھی بہت مزے کا ہوتا ہے۔

اس ماہ کا شمارہ بھی اچھا تھا۔ ٹائٹل بھی عید کے حساب سے خوب صورت تھا۔ سلسلے وار ناولز بھی بہت اچھے ہیں۔ سیاہ حاشیہ کی آخری قسط کا پڑھا تو اچھا لگا۔ دائمہ کو اب اسے ختم کر ہی دینا چاہیے‘ اس کے علاوہ عفت سحر طاہر بھی خاندانی دشمن کے ساتھ خواب شیشے کے اچھے جوڑ رہی ہیں۔ ایمل رضا اور بدیع الجمال نے بھی خوب لکھا۔ تو امت العزیز کا من دیپک تو دل چھو لینے والی تحریر تھی۔ میں یہ نہیں کہتی کہ لڑکیوں کو بے حیائی کی اجازت ملنی چاہیے۔ مگر ہمارے دین میں لڑکی کی مرضی پوچھے بغیر اس کا نکاح کرنے کا حکم نہیں ہے۔ مگر ہمارے اردگرد آپ کو ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ جہاں والدین اپنے ذات برادری کے چکر میں یا بہن بھائی سے رشتہ جوڑنے کے لیے اولاد کو قربان کرتے ہیں‘ یہ تو امت العزیز نے اس کا ہیپی اینڈ کر دیا ورنہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ مگر ہماری مصنفین بھی کیا کریں‘ انہوں نے ہمارا دل بھی تو خوش کرنا ہوتا ہے۔ افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ رابعہ افتخار کا ”چاند کو دیکھ کر“ اچھا لگا۔ بنت سحر اچھا لکھتی ہیں اور پچھلے دنوں ان کے بارے میں غالباً“ انہوں نے خود بتایا تھا کہ وہ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ اپنے ہر افسانے میں اتنا فلسفہ کیوں ڈال دیتی ہیں۔ معذرت کے ساتھ بنت سحر آپ قانتہ رابعہ کو دیکھیں۔ ایک چھوٹی سی بات کو لے کر افسانہ لکھتی ہیں۔ مگر سبق اتنا بڑا دے جاتی ہیں۔ سچ میں قانتہ رابعہ جی اللہ آپ کو جزا دے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے اچھا سلسلہ ہے مگر میں اس میں شرکت نہیں کرنا چاہتی۔ کیونکہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ میرے شوہر اور سسرال دونوں بہت اچھے ہیں۔ آخر میں آپ سے گزارش ہے کہ خودکشی کے متعلق کچھ دینی رہنمائی فرمائیں‘ یہ تو معلوم ہے کہ خودکشی کرنے والے کی مغفرت نہیں ہے۔ مگر جو لوگ اس کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی کیا سزا ہے اور اگر وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوں تو ان کے لیے کیا حکم ہے۔

ج: پیاری فاطمہ! سب سے پہلے تو خط لکھنے کا شکریہ۔ ”تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ میں ضروری نہیں کہ جن کی سسرال والوں نے بدسلوکی کی ہے‘ وہی لکھیں۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں اچھے برے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں‘ ہر طرح کے تجربے ہوتے ہیں۔ آپ بلا تکلف اپنے خوشگوار تجربات لکھ بھیجیے۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ قارئین کو ان لوگوں کے بارے میں بتایا جائے جو دوسروں کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں‘ ممکن ہے اسے پڑھ کر کچھ لوگ اپنی اصلاح بھی کر سکیں۔

خودکشی کے بارے میں ہم احادیث دے چکے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو خودکشی پر مجبور کر دیتے ہیں انہیں ان کے اس ظلم کی سزا ضرور ملے گی۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کو معاف نہیں کرتا جب تک کہ وہ توبہ نہ کرلیں۔

ایمان جلبانی گاؤں دریا خان جلبانی سے شریک محفل ہیں‘ لکھا ہے

خط لکھنے کی دو وجہیں ہیں پہلی وجہ عدینہ ابراہیم کا خط ہے جس سے میں سو فیصد متفق ہوں۔ انہوں نے جو بھی کہا ہے صحیح کہا ہے۔ تنقید برائے اصلاح پر یہ کیا کہ آپ ماڈل غریب کو بھی نہ بخشیں۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے لوگ نمرہ احمد کو بھی نہیں بخشتے کہ انہیں تفسیر اور فلسفے کا پتا نہیں چلتا (یا حیرت) بھئی بڑا حوصلہ ہے ہماری رائٹر کا جو ہمیں پھر بھی اتنی پیاری کہانیاں لکھ کے اچھی اچھی بات بتا کر ہماری اصلاح کرتی ہیں۔

دوسری وجہ بنت سحر کا افسانہ۔ میں بنت سحر‘ سمیرا احمید اور نمرہ کی بہت بڑی فین ہوں۔ یوں سمجھیں مجھے ان تینوں سے محبت ہے عقیدت بھری کیونکہ میں نے جب جب خود کو بے چین‘ الجھا ہوا پایا تو ان ہی تینوں کی تحریروں کی وجہ سے میری الجھنیں سلجھ گئیں۔ میں اگر آج خواتین یا شعاع میں خط لکھ پاتی ہوں تو ان کی وجہ ہے۔ بات الفاظ کی نہیں۔ ان میں چھپی تاثیر اور گہرائی کی ہوتی ہے۔ میں بنت سحر کا افسانہ دسمبر لوٹ جاؤ آج تک نہیں بھولی نہ وہ اپنا رونا اور پھر یہ شاد۔ یقین جانیے بنت سحر نے ایک شاد کا ذکر کیا ہے میں نے یہاں خود اپنی آنکھوں سے کئی شاد دیکھی ہیں۔

”من دیپک میں“ پا سو پا سو پڑھ کے میری بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ ہمارے ہاں بھی گوٹھ میں ایسا ہوتا ہے۔ بہت خوشی ہوئی یہ ناول پڑھ کے‘ سرخ جوڑا عائشہ رباب کی اچھی کاوش تھی۔ ”خود غرض“ افسردہ کر گیا۔ اور شعاع کی جان سیاہ حاشیہ کی تو کیا بات ہے۔ خواب شیشے کافی الحال تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ پیال ساز کا مطلب کیا ہے ”اینڈ یہ

نانو کہیں نگار تو نہیں؟ بہت ہی انٹرسٹنگ کہانی ہے۔ باقی نہیں پڑھا۔ فرصت ہی نہیں ہوئی۔ اوپر سے جنریٹر کی صور اسرافیل جیسی آواز، دماغ ہی سن ہو جاتا ہے۔

ج : پیاری ایمان! یہ محفل قارئین کے لیے ہی سجائی گئی ہے جہاں وہ بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں' اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جس طرح آپ کو کچھ مصنفین بہت اچھی لگتی ہیں اور کچھ کم اچھی لگتی ہیں۔ اسی طرح ہماری دیگر قارئین بھی اپنی ایک رائے رکھتی ہیں اور اس کا اظہار ہمیں خط لکھ کر کرتی ہیں۔ کسی کے اظہار پر پابندی لگانے کا حق نہ ہمیں ہے نہ کسی اور کو.... اور یہ نہ بھولیے کہ مثبت تنقید مصنف کو آگے بڑھاتی ہے اور جھوٹی تعریف اس کا راستہ روک دیتی ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کراچی سے مسرت الطاف احمد نے لکھا ہے

جولائی کا شمارہ خلاف توقع بہت جلدی 2 تاریخ کو ہاتھ میں آیا تو میری "پھیکی" خوشی دیدنی تھی۔ پھیکی خوشی اسی لیے آئی! کیونکہ شعاع آہستہ آہستہ مجھ سے اپنا دامن چھڑوا رہا ہے۔ نہ میرے خط شائع ہوئے سروے میں بھی میری تحریریں اب شائع نہیں ہوتیں۔

ٹائٹل خوب صورت رنگوں سے سجا بہت ہی اٹریکٹو لگا "رقص بسمل" کو بے جا طوالت کا شکار نہ کریں۔ ولید کا کردار بہت ہی انٹرسٹنگ ہے۔ اس کے ڈائیلاگز' اکس امیزنگ' ہر جملہ مزاح سے بھرپور تھا۔ "خواب شیشے کا" مائی موسٹ فیورٹ ناول' احساس کے رشتوں سے جڑی تحریر دل کو چھو رہی ہے۔ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم بہت ہی خوب صورتی سے الجھی گتھی سلجھا رہی ہیں۔ "من دیپک" اس ناول کا اسٹارٹ بہت ہی سحر انگیز تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک گرفت اور کہانی کا سحر قائم رکھا سجاول کا کردار پسند آیا۔ "منار" بہت ہی ڈفرنٹ سی اسٹوری تھی۔ تجسس سے بھرپور' انٹرسٹنگ اور قابل تعریف ہر کردار اچھا لگا۔ "مسکراہٹیں" بہت ہی سوفٹ سی اسٹوری لیکن اسٹرونگ ٹاپک تھا متاثر کن تھی۔ "پیال ساز" یہ قسط بھی آوٹ اسٹینڈنگ تھی نانو کا کردار بہت ہی سوئیٹ ہے نانو اور باسل کی گیدرنگ بہت ہی دلچسپ ہے۔

ج : پیاری مسرت! خط شائع نہ ہونے کی شکایت ضرور کریں کہ شکایت اپنوں سے ہی کی جاتی ہے لیکن یہ دامن چھڑانے والی بات بالکل غلط ہے۔ ہم اپنی پیاری قارئین سے دامن چھڑانے والی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیا آپ کو اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنی قارئین کتنی عزیز ہیں۔

مہناز یوسف کراچی سے لکھتی ہیں

سب سے اچھا خط عدینہ ابراہیم کا لگا۔ جو کہ دوسروں کو تنقید کا منع کرتے ہوئے خود بھی "یہی" کام کر رہی تھیں۔ پیاری عدینہ سے بس اتنا کہنا ہے کہ ہر بار خط میں تعریفیں کر کر کے کچھ بور ہو گئی تھی' سو سوچا اس بار کچھ "نیا" کرنا چاہیے اور کچھ نیا کرنے کے چکر میں کچھ "غلط" ہو گیا شاید۔ معذرت آپ سب سے' اگر برا لگا آپ کو تو.... میری توبہ۔ جواب تنقیدی خط لکھا۔

"خالص" شازیہ الطاف کی مختصر مگر پراثر تحریر تھی۔ شازیہ الطاف کا افسانہ "محلوں کی رانی" بہت معیاری افسانہ تھا۔ رشتے سمجھنے میں تھوڑی دقت ہوئی لیکن پھر سمجھ میں آ گئے۔ ماشاء اللہ شازیہ الطاف نے بہت اچھا لکھا۔

"خواب روپ اور زندگی" عطیہ خالد نے عام سی کہانی کو بہت خاص طرح سے لکھا۔ اس بار آٹھ افسانے شامل تھے اور ماشاء اللہ سب کے سب معیاری تھے۔ صدف آصف کا ناولٹ "مسکراہٹیں" بہت اچھا لگا۔ عفت سحر طاہر کے قلم کی کیا بات ہے۔ ماشاء اللہ بہت بہترین اسٹارٹ۔ "خواب شیشے کا" اس بار کا شعاع بہت زبردست لگا۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے۔" "ہم بولیں گے تو بولو گے کہ بولتی ہے۔ نو کمنٹس۔

ج : پیاری مہناز! یہ کیا بات ہوئی کہ آئندہ صرف تعریفی خط لکھیں گی.... کوئی کچھ بھی کہے ہمیں تو آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ بلکہ سب قارئین کی۔ یہی وجہ ہے کہ شعاع میں تعریفی خطوط کے ساتھ تنقیدی خطوط بھی شامل ہوتے ہیں۔ آپ بولیں' دل کھول کر بولیں' دل سے بولیں ہم کبھی نہیں کہیں گے کہ بولتی ہے۔

نائلہ ملغانی' سحرش ملغانی' واصفہ ملغانی اور عینی ملغانی نے ستی سوکر تحصیل تونسہ سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

عید کے حوالے سے ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے حمد و نعت پڑھنے کے بعد پیارے نبی کی پیاری باتوں نے دل کو منور کر دیا۔ ہم شعاع کے پچھلے آٹھ سال سے خاموش قاری ہیں۔ ہمارے گاؤں میں میٹرک تک اسکول ہے۔ آگے کالج پڑھنے کے لیے دوسرے شہر جانا پڑتا ہے۔ اس لیے ہمیں ہمارے گھر والوں سے آگے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے اور ڈائجسٹ پڑھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہم بہت مشکل سے منگواتے ہیں۔

مستقل سلسلوں میں سیاہ حاشیہ ٹاپ پر جا رہا ہے۔ رقص بسمل بہت سلو جا رہا ہے اور پیال ساز ابھی پڑھا نہیں۔ مکمل ناول امت العزیز کا من دیپک بہت اچھا رہا "مسکراہٹیں" دعا نے نوشین کو بہت اچھا سبق سکھایا۔ افسانے سب اچھے تھے۔ مہندی کے ڈیزائن کچھ خاص اچھے نہیں تھے۔ باقی سلسلے بھی بہت پسند آئے۔

شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع کریں۔ کیا میں "جب تجھ سے ناتا جوڑا" میں شرکت کر سکتی ہوں؟

ج : پیاری ملغانی سسٹرز! آپ نے آٹھ سال بعد خط لکھا خوش آمدید۔ تجھ سے ناتا جوڑا آپ بہنوں کے لیے ہی شروع کیا گیا ہے آپ اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔ شاہد آفریدی کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی ہے۔

فوزیہ ثمرٹ، ہانیہ عمران آمنہ میر نے گجرات سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

عید کے حوالے سے شعاع کا ٹائیٹل اچھا لگا۔ میک اپ بس سو سو ہی لگا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں دل و جان سے پیاری۔ جب سے تجھ سے ناتا جوڑا ہے، پہلی بار توجہ سے پڑھا۔ اف توبہ ہے۔ اگر یہ تمام باتیں حقیقی ہے تو سلام ان خاتون کے صبر کو۔ "خواب شیشے کا" ماضی اور حال ایک ساتھ مجھے پڑھتے ہوئے الجھن ہوتی ہے۔ لگتا ہے موحد مہرماہ کا سکون غارت کر کے ہی رہے گا۔

سیاہ حاشیہ ایک خوب صورت تحریر کا اختتام، ویسے تو سب کلیئر ہے کہ اینڈ یہی ہوگا۔

مکمل ناول "پیال ساز" اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ کیا زمل کی ماں ہی نگار ہے۔ کافی الجھاؤ والی کہانی لگی۔

باسل نے کچھ جلدی نہیں کردی زبل کو پرپوز کر کے۔ خیر کوئی گل نہیں۔ اچھا لگا۔ پتا نہیں کیوں ہماری رائٹر مزاح اور رومینس سے کترا رہی ہیں۔ کہانی بے شک سیریس ہو مگر تھوڑا سا مزاح کا تڑکا لگانے میں کیا مضائقہ ہے۔

"من دیپک اور راگ محبت" ڈھیروں دیپک جلا دیے۔ اس تحریر نے دل میں؟ ہر ماروی اور عمر کی قسمت میں جدائی نہیں ہوگی۔ منارہ یہ تحریر کچھ خاص نہیں لگی۔ معذرت کے ساتھ۔ ناولٹ مسکرائیں دل خوش ہو گیا نام پڑھ کر۔ لگا شاید یہ مزاحیہ تحریر پڑھنے کو ملے کچھ تو عید کی اداسی کم ہوگی پر ناں جی' ہاں جو رائٹر نے پیغام دیا ہے۔ وہ اچھا لگا۔

افسانے سب ہی اے ون تھے خاص کر بنت سحر کا امید دستک۔ مگر یار بنت سحر کیا ضروری ہے کہ تم رلاؤ ہی۔ کچھ تمہارے قلم کا درد کچھ پہلو میں رکھے دل کے درد نے خوب رلایا۔ تمہاری اس تحریر نے گاؤں کی زندگی کی تم بہت اچھی منظر کشی کرتی ہو۔ اب یہ کہاں لکھا ہے یہ بھی گاؤں والے دکھی ہوں ذرا ڈھونڈو تو کوئی شوخ و چنچل مہ جبیں 'مل ہی جائے گی۔

"خواب روپ اور زندگی" ایک امید کی کرن ایک سبق آموز تحریر' باتوں سے خوشبو آئے اس میں زیادہ اسلامی قصے شامل کیا کریں۔ آئینہ خانے میں واصفہ سہیل کی لفظوں کی بمباری اس بار کچھ کم سی لگی۔ بھئی کچھ لگا کے کمنٹس دیا کریں۔ اس سلسلے کی خوب صورتی یہی کمنٹس ہیں مہندی کے ڈیزائین بہت خوب صورت تھے۔

مستقل قاری کوثر خالد محفل کی جان ناتا جوڑا میں کب جلوگر ہوں گی۔ ایڈوانس میں کہہ رہی ہوں ناتا جوڑا کا یہ نمبرون رہے گا۔

1992ء میں اسکول کو خیرباد کہہ کے ڈائجسٹوں خواتین کرن۔ شعاع کا خیر مقدم کیا تھا۔ اتنی پرانی محبت کا کچھ تو لحاظ رکھا کریں۔

ج: فوزیہ اور ہانیہ! اتنی طویل مدت سے شعاع اور خواتین اور کرن سے وابستہ ہیں اور ابھی تک ہمارے مزاج اور طبیعت سے آشنا نہیں ہوئیں۔ ہمارے دل میں آپ کی محبتوں کی قدر بھی ہے اور آپ کی محبت کا پاس بھی رکھتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے ہماری قارئین کے دل نازک ہیں اور ان کو جلد ٹھیس لگ جاتی ہے اس لیے ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ مذاق میں بھی کوئی ایسی بات نہ کہی جائے پھر بھی کوئی بات دل پر گراں گزری ہے تو معذرت۔ کوثر خالد کا سلسلہ شامل ہے۔ پڑھ کر رائے دیجیے گا۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خطوط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

کوثر خالد

قارئین السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔۔۔ پہلا سروے لکھا تو امتل نے کہا مختصر ہے 'ذرا طویل لکھیں' وہ لکھا تو ان سے گم ہوگیا۔ اب تیسرا نہ جانے طویل لکھا جائے یا مختصر' خدا ہی جانے کہ بسم اللہ پڑھ کر لکھتی ہوں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
تو کیوں نہ تیری تعریف کروں

س 1 ۔ "شادی کب ہوئی؟"

ج ۔ " 8 اکتوبر 1982ء ماہ شعبان میں۔۔۔"

س 2 ۔ "شادی سے پہلے مشاغل؟"

ج ۔ "ہوش سنبھالتے ہی خود کو سنجیدہ و متین پایا۔ مگر مسئلوں کے وقت بڑوں کے درمیان بھی بول پڑتی تھی اور دوستی کے لیے وہ کام بھی کیے جو میرا شوق نہ تھے۔ اگر کوئی کام نہ آنے کا طعنہ ملا تو وہ بھی کرکے دکھایا۔ ہر فن مولا ہوں۔ پڑھائی' سلائی' کڑھائی' چھپائی' رنگائی' جوتا بنوائی سب کر لیتی ہوں ابھی بھی اور جب بھی کبھی کسی بڑے یا چھوٹے نے نصیحت کی تو اسے پلّے سے باندھ لیا۔ بنا نصیحت کے بھی دو آدمیوں کی لڑائی سے عبرت حاصل کیا کرتی۔۔۔ اگر کوئی قاری مثال سننا چاہے تو خط میں بتا دیا کروں گی۔ جیسے پہلے بتایا کرتی ہوں۔ رسالے پڑھنے کی شوقین تھی۔ گھر میں غربت تھی اور ہم ماں' باپ کے ساتھ محنت کیا کرتے۔

تمام رسالے مانگ کر پڑھے۔ ایک بار بھائی نے ہمسائے کا رسالہ جلا دیا کہ اب نہیں پڑھے گی تو ہم نے لوگوں سے مانگنا چھوڑا۔۔۔ مگر اللہ سے کہا۔۔۔ اپنے رسالے چاہئیں۔ تو بھائی ہی سبب بنا۔ اخبار کا ہاکر بنا اور لا کر رسالے میرے آگے پھینکے تو ہماری خوشی کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ یہ لکھنے کی بات نہیں' چند ایک کہانیاں اور ایک نظم ماں کے دکھوں پر شائع ہوئی تھی۔

ہر لمحے دیا ہم نے وفاؤں کا جلایا
ہم کو تو مگر پیار کبھی راس نہ آیا

بربادی دل کا گلہ کس سے کریں ہم
اجڑے ہوئے گلشن کا پتا کس نے ہے پایا

س 3 ۔ "رشتے میں مرضی؟"

ج ۔ "بھئی اگر کوئی مرضی پوچھتا تو ہم جھٹ کہتے کہ نمازی ہو۔ خوش اخلاق ہو' جو کبھی لڑائی نہ کرے۔ کیونکہ مردوں کے جو روپ ہم نے دیکھے تھے تو ہم شادی ہی کے خلاف تھے۔ مگر سہیلی ناہید کے سمجھانے پہ مان گئے۔

یہ امی کی خالہ تھیں۔ یعنی نانی کی بہن اور نانی نے ہماری پیدائش پہ کہا تھا کہ اس کی شادی خالد سے کروں گی۔ (سنا ہے) میں اپنی خالہ کے ہاں چھٹیاں گزارا کرتی تھی۔ چھوٹے بچوں کی وجہ سے 'مدد کے لیے۔۔۔ وہاں ساس آئیں تو خالہ سے کہا۔ "چھیماں (امی) نوں کہہ کر ننھی (ہم) کا رشتہ خالد کو دے دوے۔"

س 4 ۔ "جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟"

ج ۔ "تصور تو بتا چکی' نمازی' با اخلاق۔۔۔ مگر ہاں۔ کالے چور سے بھی بیاہ دیتی تو کر لیتے کہ یہ بات پھوپھی زاد عصمت نے سمجھائی تھی۔"

س 5 ۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

ج ۔ "چار' پانچ سال۔۔۔"

س 6 ۔ "شادی کے لیے قربانی؟"

ج ۔ "میں بہت پڑھنا چاہتی تھی۔ پہلے ابا نے آٹھویں میں کہا کہ خرچا نہیں اٹھا سکتا۔ بس کرو۔۔۔ میں نے رو' رو کے آسمان سر پہ اٹھا لیا۔۔۔ امی نے ساتھ دیا اور میٹرک فرسٹ ڈویژن ہوگیا' حالانکہ پہلے کبھی فرسٹ نہ آئی تھی۔ پھر چچا اور سسر ظالم سماج بن گئے۔ چچا سے کہا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایمائے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

"لا ئیے لکھ دوں کہ اگر پڑھ کر خراب ہوئی تو چور کی سزا۔" مان گئے۔ سسر سے کہا کہ.... "اگر ڈرائیور خراب ہوتے ہیں' تو کیا آپ ڈرائیور ہو آپ بھی خراب ہو' بولے۔ "ہم تو سگریٹ بھی نہیں پیتے۔"

ہم نے کہا۔ "تو چلو اگر یہ بات ہے تو ہم پیدل کالج چلے جائیں گے اور اگر یہ ذہن میں ہے کہ زیادہ پڑھ کر آپ کے بیٹے کو انکار کردوں گی تو مت ڈریں۔"

وہ بھی مان گئے۔ میں نے ماچس کی تیلیاں سانچوں میں بھر بھر کر پیسے جوڑے 70 روپے داخلہ.... مس فرحت کی سفارش کروائی۔ انہوں نے کہا کہ کتابیں فری لے دوں گی۔ تب امی مان گئیں.... پہلا.... دن کالج سے آئی.... تو اماں رو رہی تھیں۔

"بھئی اب کیا ہوا؟" بولیں۔ "گھر کے کام کون کرے گا۔ مجھ سے نہیں ہوتے۔" بھئی ہم چار' پانچ نمازوں کے ساتھ' سلائی کڑھائی اور گھر کے سارے کام سوائے ہانڈی روٹی کرتے تھے۔ وہ بھی امی کی غیر موجودگی میں پکا لیتے' محلے والوں سے طریقہ پوچھ کر.... لو جی.... ہو گئی قربان پڑھائی صالحہ کوثر ولد اللہ رکھا لاہور کی۔

س 7 ۔ "رسموں پر کوئی جھگڑا؟"

ج ۔ "ہرگز نہیں.... ہاں جب دولہا آیا.... اور بارات کی عورتوں میں سے میری نند اور جٹھانی میرے کمرے میں آنے لگیں تو پھوپھی زاد عصمت نے انہیں روکنا چاہا' مگر ہم گرج کر بولے۔ "خبردار.... آنے دو۔" اور اس نے میری بہن عالیہ جو کہ بہری ہے' اسے سکھایا کہ دولہا کے لڈو دھاگے میں پرودو' وہ مجھے بعد میں پتا چلا' ورنہ میں نے روک دینا تھا اور دودھ پلائی پر میرے چچا نے میرا کردار نبھادیا کہ وہ جتنے دیں وہی لینا۔ تین سو دیے۔"

ہاں شادی کے بعد خالد صاحب نے کہا کہ.... "تم نے کھانے سے پہلے بوتلیں نہیں پلائیں برات کو...."

ہم نے کہا.... تو اب پی لو.... پوری بارات لے آؤ دوبارہ.... دوسرے.... بوتل تو نقصان ہی کرتی ہے۔ تیسرا جمعہ تھا۔ چچا نے جاتے ہی کھانا لگوا دیا کہ وقت پر گھر پہنچ جائے بارات۔"

جب کبھی مجھے چھیڑتے تو میں یہ ہی کہتی۔ "چلیں اب پلادوں۔" پھر ہنس پڑتے۔

س 8 ۔ "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا؟"

ج ۔ "پہلے تو یہ بتانا ضروری ہے کہ میں کیا سوچ کر آئی تھی۔ ظاہر ہے سسرال اور مردوں کے اطوار جو دیکھ' سن چکی تھی۔ ان میں ماں' خالہ' چچا بھی عبرت انگیز لگتے تھے۔ خالو کیسے تھے؟ اللہ ہی ان کو بخشے.... چچا کو تو میں نے بھی روکا۔ چچی کو مارنے یا لڑنے سے.... اور ابا کی تو معمولی لڑائی مثلاً".... اگر کبھی ڈاک خانہ جانے میں ذرا دو منٹ دیر ہوئی تو بولے۔" بھلیے لوکے توں کدی ٹائم تے روٹی نہ پکائی۔" اور ہم جھٹ بولتے۔ "ابا جھوٹ نہ بولو۔"

ایک تو ہم ڈرے ہوئے تھے کہ دولہا حسین تو بہت ہے۔ لڑاکو بھی نہیں لگتا۔ (کیونکہ بچپن میں دوبار دیکھ چکی تھی۔) پھر بھی کیا پتا' کیا بولے کیسا ہو؟ یہ آئے اور کانوں میں آواز آئی۔ "السلام علیکم!" ہم نے "وعلیکم السلام کہا۔"

پھر بولے.... "تمہارا نام کیا ہے؟"

ہماری تو ہنسی چھوٹ گئی.... اور ہم نے کہا۔ "آپ کو پتا نہیں۔"

کہنے لگے۔ "بس تمہارے منہ سے سننا ہے۔"

ہم بولے.... "صالحہ کوثر...."

پھر گویا ہوئے.... "اگر ہم صرف کوثر کہیں تو اعتراض تو نہ ہو گا؟"

ہم نے کہا۔ "ہرگز نہیں۔" پھر کچھ پیسے پکڑائے اور ہم نے نا میں سر ہلایا۔ مطلب ہم نے پیسے کیا کرنے تھے بھلا۔ (کوثر کو روٹی مل جائے کافی ہے۔)

تب بولے۔ "کیا تھوڑے ہیں؟" ہم نے جھٹ پکڑ لیے۔ تین سو تھے۔ پھر کہنے لگے۔ "جس طرح میں اپنے ماں' باپ کی عزت کروں گا' اسی طرح کرنا اور بڑے بھیا اور بھابھی ذرا غصے والے ہیں' بچ کر رہنا۔"

ہم نے کہا۔ "ایک ہاتھ دو اور دوسرے لو...."

یہ بھی کہا کہ سارے کام تم کروں گی۔ مثلاً" رشتہ داریاں نبھانا۔ بچوں کی تربیت' میں صرف کما کر لاؤں گا اور

بدلے میں ملے گا پیار ہی پیار.....

قارئین ان کی وفات کو چھ سال ہو گئے' یقین جانیے اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ کاش سب میاں' بیوی میں ایسا ہی پیار ہو۔ (آمین)

س 9 ۔ "شادی کے بعد خاص تبدیلی؟"

ج ۔ "میرے اصولوں میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی' میری خدمتوں اور جوش و جذبہ میں بھی زیادہ کمی نہیں ہوئی۔ ہمارے گھر کھانا سادہ تھا' صحت اچھی تھی۔ میں جو چار یا پانچ نمازیں پڑھتی۔ وہ کبھی کبھار ہو گئیں.... مگر میں تبدیل ہو کر ان کو بھی تبدیل کرتی گئی اور آخری وقت پانچوں نمازیں

س 10 ۔ "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج ۔ "پہلے آٹھ دن میکے کے رہ کے آئی' تو میٹھے چاول پکوائے گئے اور جب میں نے پہلی روٹی پکائی تو اس میں دو سوراخ تھے۔" نند بولی۔ "ہائے بھائی! بھابھی نے روٹی پہ عینک بنا دی ابی۔" سب ہنس پڑے۔ ہم نے کہا۔ تو کیا ہوا۔ توڑ کر ہی تو کھانی ہے۔"

س 11 ۔ میکے اور سسرال کے کھانے میں فرق؟

ج ۔ میکے کا سادہ ترین اور زیادہ تر شوربے والا اور یہاں بھنا ہوا ہر سالن تقریباً" ..... اسی لیے نند مجھے ہانڈی نہیں پکانے دیتی تھی۔ کہ کریلے گلتے ہی کچے پکے اتار لیتی ہو..... اور میں کہتی "تم سارے وٹامن جلا کر کھاتی ہو۔ اب وہ بھی میری ساری باتوں کو مانتی ہے کیونکہ وہ میری بھابھی بنی ہے (وٹہ سٹہ) اور یہ رشتہ کھٹے میٹھے سے اب صرف میٹھا ہی ہوتا جا رہا ہے۔

س 12 ۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف یا تنقید ہوئی؟

ج ۔ سسرال کے ایک ایک فرد نے شروع سے لے کر اب تک ہزاروں بار تعریفیں کیں مگر اپنے حساب سے۔ اگر میری ذات کی صحیح قدر کی تو وہ صرف اور صرف خالد صاحب نے.... جو اک بار تعریف کر کے مکر جاتے ہیں' ان کے کام تو میں قیامت تک آؤں گی کہ میں خدا گواہ سب سے مخلص ہوں بقول کسے۔

مخلص ہوں میں دشمن کو بھی دیتا ہوں دعائیں
تا عمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

جب سارے نئے رشتے پہلے تعریف اور پھر مطلب پرستی پہ اترے تو جس کو میں نے خود سے اچھا کہا تھا۔ وہ دیورانی مکر گئی کہ وہ اپنی بچی کو اٹھانے کی اجازت نہ دیتی تھی۔

غصہ کبھار کا کھوتے پہ اترنے والا حساب تھا' رکاوٹ تو ساس تھیں جو چاہتی تھیں سب میری خدمت کریں مگر نہ آپس میں نہ ان کے سگے رشتوں سے بولیں' نہ ان کی مدد کریں۔ سوچیں جو کسی کو اپنے خون کے خلاف کرے..... وہ گھر میں امن کی فضا قائم کر سکتا ہے؟ امن قائم تو وہ "بڑا" کر سکتا ہے' وہ بزرگ جو اپنے بچوں کو ساری دنیا سے مروت اور خدمت کا سبق دیتا ہو۔ ساری بہویں ان کے خلاف بھی ہوئیں اور ان کے حق میں بھی ہوئیں مگر ہمیں کوئی ٹس سے مس نہ کر سکا۔ راہ حق سے..... جو حق پہ ہوتا۔ دوست یا دشمن' ہم اسی کے حق میں فیصلہ کر دیتے۔

قطع نظر اس سب کے ساس ضرورت سے زیادہ محنتی تھیں اور سب سے اس بات کی توقع کرتیں اور مجھے اکساتیں کہ ان کی بھانجی (میری جٹھانی) سے کہوں کہ وہ بھی اسی طرح کام کرے جیسے میں میری نند...... ہے تو صحیح کہ ہر لڑکی کو شادی سے پہلے ہر فن مولا ہونا ضروری ہے ورنہ انجام تو ضرور غلط ہو گا...... وہ عورت ہی کیا جو اپنے منصب پر پوری نہ اترے...... مگر پانچوں انگلیاں برابر نہیں۔ الغرض ایسی بہو آپ اپنی مرضی سے ہی لائے۔ کیوں لائے۔ اگر لائے تو اسے بھگتیں..... میں اور میری نند' جٹھانی کے چار بچوں تک ان کے بچوں کے کپڑے درست کر کے رکھتی رہیں.... مگر آج بھی حال وہی ہے' مگر اعتراف کر لیتی ہے۔ اور میں ساتھ ہوں ساس کے..... باقی اسی محلے میں الگ۔ اور میں نے اپنی دعاؤں سے قطع تعلقی ہونے سے بچا رکھا ہے۔

اکٹھے رہنے کے لیے گھر کے سربراہ کو دماغ کی طرح ہونا چاہیے کہ وہ اپنے جسم کو اپنی مرضی سے چلاتا ہے اگر تو بزرگ کا دماغ عقلمند ہے تو وہ صحیح طریقے سے تمام بچوں کو

یوں ساتھ رکھے کہ سب کو اپنی غلطی سمجھ میں آجائے اور مل کر رہیں۔ ورنہ علیحدگیاں تو مقدر رہیں جلد یا بدیر..... جب تک حصہ نہ ملے اکٹھے رہنے پہ مجبور ہوتے ہیں سب۔ تعریف تو جیٹھ دیور ساس سسر، نند اور خاوند نے ہماری کی تو مسئلہ کیا تھا۔ ہم نے کہا کہ ہم حق نا حق پر بولتے تھے

جب میری ساس کہتیں کہ جب تک تم میرے کہنے پر لوگوں اور رشتے داروں کو نہیں برتو گی۔ اوندھے منہ گرو گی۔ تمہاری سیڑھی چکنا چور ہوگی۔ بھلائی۔ وی کے پروگرامز کا کہ جس نے سنا۔ کہ اگر آپ سیدھے رستے پر ہیں تو دوسروں کو چھوڑ دیں، اپنے راستے پر چلتے رہیں منزل نہ بھی ملے تو نیک لوگوں کا ساتھ ملے گا۔ اور امجد صاحب کی آج والی نعت جب یہ شعر پڑھا۔

جو بھی جس رستے سے آئے ہر رستے کی منزل تو۔

تو ہم نے ٹھان لی۔ ہم اپنے علم والے رستے سے جائیں گے نہ کہ بزرگوں کی اندھی تقلید کرکے..... اور سدا علامہ اقبال کے شعروں نے رہنمائی کی۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

واقعی ہم اپنے جیسوں کو نہ صرف آنکھوں سے بلکہ پیچھے رائٹر کو نام سے بھی پہچان لیتے ہیں اکثر..... دل سے گواہی آتی ہے۔ نام کا اثر شخصیت پر ضرور ہوتا ہے اور میں آزما چکی ہوں لہٰذا میرا یقین متزلزل ہونے والا نہیں..... اب تو میں دشمنوں کو بھی دوست بنا چکی ہوں اور پورا محلہ مسرت نگر بنانے والی ہوں۔ یہاں تک کہ ایک بار خالد صاحب نے کہا کہ جاؤ اور امی ابا کے تمام سمدھی رشتوں کے نام والی نعت بناؤ۔ ہم حیران..... اور نیچے آکر قلم پکڑا تو چند منٹ میں نعت لکھی گئی..... ارے یہ وہی خالد ہیں جو میری نعتیں سن کر کان پکڑ لیتے۔ کہ کوثر اب بس کرو سنانا میں تھک گیا ہوں۔"

اور میں چپ ہوتی تو سمجھ میں نہ آتا اب ان سے کیا بات کروں..... میں آج بھی کسی سے رابطہ کرنا ہو تو پہلے

میرے شوہر نے مجھے سدا دل کا سکون دیا۔ اگر کسی کو بتاؤ کہ پیسہ نہ مانگا نہ دیا مگر صرف پیار..... تو لوگ کہتے۔ پیسے کے بغیر یہ کون سا پیار..... بھئی جو بندہ پیٹ بھر کے روٹی کھالے تو اسے اور کیا چاہیے کہ ڈھیروں محنت کر کے سارا دن کے تھکے مارنے کے لیے دو آنکھیں، دو بانہیں منتظر ہوں تو ساری دنیا کی خوشیاں ہیچ ہیں اس سکون کے آگے۔

منصب صرف خدا عطا کرتا ہے اسی سے مانگ۔ اور مانگنے کی چیز صرف شمع ہدایت ہے..... آپ کبھی دیکھیں گے میری تو کیا ہر شاعر کی نعتوں میں میرے بچوں کے نام آتے ہیں۔ ثمر۔ صبا۔ شمع۔ رضا۔

شادی پر ماں نے کہا..... اگر..... کوئی "خوش خبری" کی بات ہو تو فوراً" ساس کو بتانا..... اور شادی کے دوسرے ہفتے جب انہیں بتایا تو بولیں" کوئی بات نہیں۔" اور ہم سوچیں..... ہائیں رسالوں میں تو ساس بہت خوش ہوتی دعاؤں سے اسے اپنے حق میں کرتی ہوں پھر بات کرتی ہوں..... ورنہ آنکھوں کی منفی شعاعوں سے بہت ڈرتی ہوں..... اور اب تو دل یہ کہتا ہے۔

راہ خدا کے راہی نے
ستائش کی تمنا کیا کرنی

س 13- سسرال سے وابستہ توقعات کہاں تک پوری ہوئیں؟

ج بھئی ہم تو ٹھان کر آئے تھے..... سسرال والے مارتے ہیں تو مار کھا کر بھی ان کی خدمت کریں گے اور ایک دن وہ میرے ہوں گے..... ایسا ہوگیا..... نیت کو مراد ہے..... رہے خالد وہ تو اسی دن سے مجھے خط میں القاب لکھنے لگے..... "ثمر کی والدہ"

بس میں نے تو اللہ سے اتنا کہا تھا کہ اللہ تو جانتا ہے اگر اولاد نہ ہوئی تو میں پھر بھی راضی رہوں گی لیکن اگر انہوں نے راضی نہیں رہنا تو پھر دے دے۔ اور ہاں میں تو بیٹی کا شوق رکھتی تھی کہ پہلے وہ، رحمت ہے۔ لیکن اگر انہوں نے منہ بسورنا ہے تو ان کو بیٹا دے دینا..... اور نام یوں رکھا کہ یہ لوگ پیچھے ٹی۔ وی دیکھتے۔ میں اکیلی اوپر قرآن پڑھتی..... ایک دن اثمار کے لفظ پر اٹک ہی گئی اور

دل سے آواز آئی۔ ثمر نام رکھوں گی...... جب ٹی۔وی پہ ثمر قند کا اشتہار آتا تو میں اور نند ہنس پڑتے۔

ساس نے کہا..... کیوں ہنس رہی ہو...... تو بتایا گیا آپ کے پوتے کا نام ثمر رکھنا ہے۔ بولیں۔ اتنا مشکل۔ میں نے کہا۔ "سکھا دوں.... "ہائے اللہ ایسی ہزار خوشی کی باتیں اور ہزار مباحثے اور ہزار جھگڑے ہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے۔

ساس کہتی ہیں..... کوئی شخص 32 گھڑیاں ایک موڈ سے نہیں رہ سکتا۔

"میں کہتی ہوں۔" ایسا وقت لا کے چھوڑوں گی۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ تب تک یہی کہا کرو۔

دل کے وسدے سجناں دے وچہ بول بلارے ہندے نیں
جیویں گلاب دے کنڈیاں دے نال دل گزارے ہندے نیں

کسی شاعر کے اس مصرعے پر فرمائشی نظم بنائی تھی جو فیصل آباد مقابلے میں جٹھانی کی بیٹی ثوبیہ (ڈاکٹر) نے پڑھی اور داد پائی۔

یاداں دا سرمایہ سجنو سانجھ کے رکھنا چاہیدا۔
بھلے ویلے چنگیاں گلاں پھول کے تینال چاہیدا

یہ خاص میری لکھی نظم...... اس بار رسالہ سات سنگ لیہ میں آگئی ہے...... دیکھو شعاع میری غزلوں کو پذیرائی کبھی دیتا ہے کہ نہیں.....

س 14۔ پہلے بچے کی پیدائش؟

ج ماں کے گھر بھیج دیا ...... ذرا مسئلہ ہوا۔ ایک ماہ اسپتال رہا۔ میری ماں اکیلی 'بچے کے ساتھ رہی

دوسرے دن خالد صاحب آئے دیکھنے۔ انہوں نے جا کر یہ سب بتایا تو نسرین (نند) کو بھیجا گیا۔ وہ مدد کرتی رہی 'جو دائی بتاتی وہ بنا دیتی... اگر وہ نہیں آتی تو میں کبھی نہ بلاتی نہ شکوہ کرتی..... یہی تو ہے خودی کا راز۔ نسرین نے زبردستی مجھ سے دوستی کی۔ مجھ سے گانے سنے۔ اس نے وعدے لیے کہ ہر جگہ ساتھ دینا۔

دیا بالکل دیا..... پانچ جماعتیں پڑھی تھی۔ اس نے کہا پڑھنا ہے۔ میں نے دیور سے پنگا لے کر اسے پڑھایا دسویں میں۔ پانچ سو نمبر لیے میرے ثمر کے ساتھ پڑھا۔

ہاں البتہ دوسری بچی پر جھگڑا ہو جاتا تھا جو میں نے روکا۔ میری حالت خراب تھی۔ کچھ امی کہتیں کہ ثمر کی بار تم وہاں تھیں تو علاج بروقت ہوا۔ اگر اب بھی مسئلہ ہوا تو یہاں..... یہ ساس بضد تھیں کہ پہلا چھلا ماں کے گھر دوسرا اور اگلے سسرال میں ہوتے ہیں (بھئی کیا یہ قرآن میں لکھا ہے) ہم نے کہا ماں جا۔ اللہ وارث بیٹی بخ دسمبر میں ہوئی۔ اسی وقت ماں کو خط لکھا۔ اگلے دن ماں حاضر... خالد صاحب مارے شرم کے بیٹی کو دیکھے بنا باہر سے چلے گئے کیونکہ ساس کی بہن نے کہا تھا۔ "ہائے تم بیٹی کے باپ بن گئے۔" خیر ماں باپ کا کچھ اثر تو اولاد کو جاتا ہے۔ بیٹے کے لڈو بانٹے اور صبا کی جلیبیاں 'وہ بھی خالد نے میرے کہنے پر بانٹیں۔ البتہ بڑا دیور بڑے شوق سے صبا دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ طارق اس کا رنگ پیلا ہے۔ بولا "لو پیلے بلب میں پیلا ہی لگے گا۔ ویسے بھی بچے رنگ بدلتے ہیں۔ ادھر (ساتھ جٹھانی کا) عدیل تو نیلا لال ہو جاتا ہے۔"

میری اماں آئیں تو صبا کو دیکھ کے تڑپ اٹھیں..... "ارے خالہ! اسے تو یرقان ہے..... ڈاکٹر بلاؤ....."

ساس بولیں۔ "دائی کو بلاؤ۔" میں نے خالد سے کہا ڈاکٹر بلاؤ۔

پھر فیصلہ ہوا کہ آج رات گلی سے یسین ڈاکٹر سے نیند کی دوا لے لیتے ہیں۔ صبح کار میں لے جائیں گے 'اس وقت میسر نہیں۔ حالانکہ اپنی بس باہر کھڑی تھی۔ میرا بس چلتا یا میں خالد ہوتی تو اپنی بس میں لے جاتی فوراً" بہرحال بچی کو تیسری تیز ترین پڑیا سے بھی نیند نہ آئی۔ ایک پلنگ پہ ساس اپنی پولیو زدہ بیٹی کو لیے بیٹھی تھی دوسری پر میری صبا کو لیے میری ماں اور میں نے اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ صبح خالد اور میری ماں بچی کو لاہور لے گئے۔ اور مجھے چند دن بعد کا آرڈر ہوا۔ چلی جانا۔

س 15۔ سسرال میں مقام؟

ج ہر طرح سے سرخرو ہوں۔ میری بیٹی کے رشتے کے لیے پھپھی روتی ہے 'پریشان ہے۔ مگر ہم وہی پتھر دل۔ بچے ہر کام پھپھو سے شیئر کرتے ہیں مگر جب کسی کو بڑا مہنگا تحفہ دینا چاہیں تو نانی اور پھپھو سے پوچھتے ہیں بعد میں بتا دیتے

ہیں اور میری طرف سے ہر بات کی اجازت ہے سوائے بُرے کام کے لڑائی جھگڑے کے۔۔۔۔

اتنے فون میری بہن کے نہیں آتے جتنے پھپھو کے۔ ہر اتوار۔ بڑا بیٹا تو پھپھو کے پاس ہی رہتا ہے۔ امی نے شادی کی ' ساری بری اپنے ہاتھوں سے سی۔ اپنا زیور میری بہو کو دیا۔ جبکہ میرے ثمر نے ابھی پھپھو سے لیا ہی ہے لوٹایا نہیں۔۔۔۔ میرے بھائیوں اور ابا کی طرح معمولی تنخواہ ہے اس کی۔

میری دونوں دیورانیاں میرے اوکھے ویلے کام آئیں ہیں نہ آسکی۔۔۔۔ اس لیے کہ میں اپنے سے کم ہمت کے

کل رضا نے فریج دھلوایا میں نے باورچی خانہ صاف کرلیا۔۔۔ آج پنکھے' سوئچ اور چھت صاف کرنی تھی' رہ گئی۔۔۔۔ کل ٹیوشن کے بچے نہیں آئیں گے تو میں اور شمع کرلیں گے۔۔۔۔ یہ ہے عید نامہ۔۔۔۔ بھئی خود تو عید منائیں نہ منائیں گھر تو صاف کرنا ہے اور سب سے اچھی والی نئی بیڈ شیٹ بچھاتے ہیں۔ آج کل تو رضا کو "مل" فیکٹری سے فری مل رہی ہیں مگر میں بانٹ دیتی ہوں کہ رکھوں کہاں اور کیا کرنی ہیں اتنی۔۔۔۔ اگلی نکالوں گی تو ایک کے بدلے ایک رکھ لوں گی۔۔۔۔ وہی باسی سالن کی طرح۔ پہلا ختم کریں گے

تو ہی دوسرا پکاؤں گی یا پھر کسی کو دے آیا کریں۔ نئی سبزی لایا کریں پھر کو ٹریکا دے گی۔ آج نہ صرف سسرال میں ہر جگہ مقام مل گیا ہے بلکہ رسالوں میں بھی۔۔۔۔ بھئی چالیس سال خوشی سے رسالے چھوڑے مگر لکھنا نہیں چھوڑا۔ جب عید پر دوستوں کو خود سے بنا کر شعر لکھ رہی ہوتی تو ماں کہتی۔۔۔۔ "چھوڑو" مت کہو۔۔۔۔ اتنے کام کرتی ہوں۔ معذور بچی۔ اپنے بچوں کو پڑھانا' گھر کے کام۔۔۔۔ "ہم ہنستے تو بھلا لکھنے میں کوئی زور لگتا ہے۔۔۔۔ مگر ہاں بھئی شاعری میں زور نہیں لگتا۔۔۔۔ ناول' افسانے' طویل سروے میں زور نہ سہی وقت اتنا لگتا ہے کہ رات بھی نہیں سوئی۔ صبح بھی بچے پڑھا کر' ساس کو صاف کر کے بیٹھی ہوں۔ روزہ کھلنے والا ہے۔ اور شمع اپنے لیے پکوڑے بنا رہی ہے۔ میں نے دہی جما کر دودھ میں چینی حل کر رکھی ہے۔ بوتل شاگرد لے آئے ہیں۔ شملہ گوشت تیسرے دن کا پڑا ہے۔ خوشی سے

ہیں اور ساس کھائیں گے۔

ان کے رنگ میں رنگ کے ان کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

ساس مجھے پنکھے سے ہوا دے رہی ہیں۔ میں سروے میں اتنی محو کہ روک بھی نہ سکی۔ ورنہ ہم کہا کرتے ہیں بس خود کو دو۔۔۔۔ ہمیں نہیں چاہیے آپ کی۔۔۔۔ ہوا۔

س 16۔ میکے اور سسرال میں فرق؟

ج۔ باپ درویش ہر وقت عبادت میں مصروف۔ ماں محنتی' سگھڑ' کفایت شعار' بڑا بھائی۔ بالکل چپ' ہر بات پہ۔۔۔۔ اور کبھی بولے تو غصے سے۔۔۔۔ ہم سے تو کبھی اس سے بات ہی نہیں کی۔ ہاں کام بیوی (بیوی نند) کے کہنے پر سارے کرجاتا ہے۔ میرے کہنے پر تو ایک تار نہ باندھا۔۔۔۔ بہن کا دل کبھی مجھے جج کا خطاب دے دے۔ کبھی بلاوجہ ناراض ہو جائے۔ دل چاہے تو میرے سارے کام بنا کے کر جائے۔۔۔۔ اور کبھی کہنے پر بھی نہ کرے۔ چھوٹا بھائی بھی آج کل حصہ مانگ رہا ہے۔ کبھی خود اور۔ کبھی بچوں کے ذریعے' اسے سمجھاتی ہوں۔ اب طے کروایا ہے کہ 5 لاکھ لے لو۔ 3 لاکھ امی دیں گی ابا کی پینشن والا۔ (ماں حج کرسکتی تھی بیٹی کے لیے نہ گئی) باقی نند سے کہا ہے کہ دونوں بھائی جوڑیں۔۔۔۔ بھائی تو ایسے کہ بلی کے گلے گھنٹی

کون باندھے۔ نند ہی منائے گی..... چھوٹی بھابھی کے والدین امیر مگروہ کہتی ہے میں نے حصہ نہیں لینا۔ یہ بھی نہ لے..... اور بہن کا شوہر کہتا ہے ہم نے اپنی بہن کو دیا۔ یہ بھی لے۔ توبہ ہے۔ کوئی کرے تو کیا کرے۔ شکر ہے ہم نے تو اللہ سے مانگا اور اس کی رضا پہ راضی رہے۔

خالد کو دس سال سے ہیپاٹائٹس تھا..... پنڈی گئے تو خون کی الٹی ہوئی۔ لوگ اسپتال لے گئے۔ تین دن بعد واپس آئے اور ہم نے کسی کو بتایا نہیں..... کیونکہ بھائی اسلم جیٹھ کی "دل" کی بیماری پر آباجی نے کہا میرا دل کرتا ہے گلی گلی پیسہ مانگوں اور علاج کرواؤں..... تو کیا ملا؟..... ہم نے سوچا تھا کہ ہم ایسے نہ کریں گے۔ کسی سے مدد نہیں مانگی سوائے اللہ کے۔ تو نند نے لاہور گئے خالد کو دس ہزار دے کر چیک اپ کروایا..... ورنہ مجھ خالی ہاتھ کو پتا ہی نہ چلتا کہ خالد کو کیا بیماری ہے۔

اور سسرال والوں کی عادت کیا بتاؤں۔ خالد۔ اخلاق و ادب کا نمونہ..... وہ سرخرو ہو گئے۔

جیٹھ۔ اپنوں اور بیگانوں سب پر پیسہ لٹانے والا اور جب جیب خالی ہوتی تو سسر سے مانگے اور وہ ڈانٹتے تو میں کہتی۔ بھائی مت ڈانٹ کھاؤ۔ صرف اتنا خرچا کرو جتنا پاس ہو۔ مگر..... انہوں نے اسی وجہ سے شہادت کی موت پائی۔ ایک چور جس نے دوبارہ ان کی دکان سے چوری کی۔ پولیس نے منوالیا۔ پیسے ادا کروا لیے مگر چور نے کہا۔ مار سے ڈر کر دیے ہیں تو بھائی نے واپس کر دیے۔

ساس، سسر۔ جوانی میں حد سے زیادہ محنتی۔ دیور طارق گھر میں واحد تھا جو روز قرآن پڑھتا دکان پر۔ اور بہت ساری حدیثیں یاد ہیں اسے۔ چھوٹا دیور۔ بالکل چپ۔ میرے بڑے بھائی جیسا..... جوائنٹ فیملی میں تمام سودے وہ لاتا تو میں خالد سے کہتی۔ آپ بھی لایا کرو۔ وہ کہتے ہم اس سے پہلے لاچکے اب اسی کی باری ہے خالد پھل لاتے تھے بہر حال آج بھی میرا دیور سب سے صابر ہے۔ خالد اور اس نے ماں باپ کا پورا کہنا مانا۔ اپنے پاس کبھی پیسہ رکھا نہ چیزیں خریدیں۔ بلکہ دوست تک نہ بنایا۔ جبکہ بڑے بھائی اور بڑے دیور نے ہر مرضی کی اور گھر کی چیزیں خریدیں۔ جن میں سے لڑائی کر کے میں نے ابا کا پلنگ اور واشنگ مشین ارشد کو دلوا دی ہے مگر دو سونے کے کڑے، پیٹی اور پلنگ بستر ساس کے ابھی بھی میرے گلے کا طوق ہیں۔ اب بھی میں نے کہا کہ اگر کسی کو ٹائم پر نہیں دیے تو پھر کیا فائدہ، جب کسی کو ضرورت ہی نہ رہی۔ اس پیار کی طرح جو وقت پہ نہ ملے۔ جب میں اور میرے بچے ساس کی ہر ضرورت پوری کر رہے ہیں تو..... یہ بھی کہا کہ بیچ کر نلکا لگوا دو۔ امی کی بیماری ختم ہو۔ شعاع سے ہی حدیث پڑھی۔ ہاں کر کے چپ ہیں۔ صدقہ بلائیں ٹالتا ہے۔

س 17۔ جوائنٹ فیملی پسند ہے یا علیحدہ؟

ج ۔ سو فیصد جوائنٹ۔ نہ صرف مجھے بلکہ میرے بچوں کو بھی۔ مگر ہم ایسے ہیں کہ اکیلے بھی رہ کر جوائنٹ ہی ہوں گے (بھئی سالی آدھی گھر والی کی طرح ہمسائے جو ہیں..... جس کے حقوق اتنے کہ بس وراثت کے قریب چلے گئے۔ لہٰذا میں اکیلی کبھی ہو ہی نہیں سکتی..... اگر میں نمبر بڑھانے کے لیے کام کرتی ہوں پھر تو میں سب سے ہی نمبر بڑھوانا چاہوں گی۔ حتیٰ کہ غیر مذاہب سے اور فقیروں سے بھی بڑے رابطے ہیں میرے۔ بے تکلفی ہے میری۔ وہ جاننے والے ہوں یا انجان۔ میری بات اکثر مان لیتے ہیں۔

نکلے جو بات دل سے اثر رکھتی ہے

ہائے، سچی کتنا مزا آتا ہے۔ جب رضا حیران ہوتا ہے پتا نہیں۔ کیسے آپ انجان دکاندار سے ادھار کپڑا تک لے آتی ہیں۔ درویش درویش کو پہچان لیتے ہیں اور جو غلط پیش آئیں تو بھی نہ کبھی ان سے بنا ہی لیتی ہوں۔ البتہ جس پل اللہ کو بھول جاؤں، خطا ضرور کرتی ہوں مگر وہ بس مجھے ہی پتا ہوتا ہے۔ یہ ہوتے ہیں راز..... اور رضا سمجھتا ہے میں گھر کی باتیں بتا کر لوگوں سے گھر کے راز فشا کرتی ہوں..... اسے نہیں پتا میں اسی طرح سب کو اپنا بناتی ہوں۔ شیئر کر کے ہمت کر کے۔ تو ثابت ہوا۔

جو پل غافل وہ پل کافر

اور نیت صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ ہمیں دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو کرتا ہے۔

امت الصبور

قلعہ بہت اونچا تھا۔ فصیل پر ہزار ہا ہندو کھڑے چیخنے کے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"ہمارا دیوتا تم لوگوں کو یہاں کھینچ لایا ہے تاکہ تم سب کو ایک ساتھ ختم کر دیا جائے اور تم سب سے ان تمام بتوں کا بدلہ لے جن کو تم نے پاش پاش کر دیا۔"

اور قلعہ تھا سومنات کا۔ یہ قلعہ ہندوؤں کا سب سے بڑا مندر ہے۔ اس کو سومنات کا مندر کہا جاتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے حملے سے اس کو بچانے کے لیے لاکھوں ہندو چاروں طرف آکر جمع ہوئے تھے۔ ان میں ہندوؤں کا راجا پریم دیو سب سے آگے تھا۔ ہندوؤں کے لشکر کے مقابلے میں سلطان محمود غزنوی کے لشکر کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی' اس کے باوجود سلطان نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر سومنات پر حملہ کر دیا' اس کی فوج نے سومنات پر تیروں اور پتھروں کی بارش کر دی۔

شہر کی فصیل پر جتنے ہندو موجود تھے وہ ان تیروں اور پتھروں سے بچنے کے لیے نیچے اتر گئے۔ مسلمان مجاہد سیڑھیاں لگا کر قلعے پر چڑھ گئے اور نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ہندوؤں پر حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین شام تک بے شمار ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔

رات کے آثار شروع ہوئے تو سلطان نے مجاہدین کو واپس بلا لیا۔ دوسری صبح پھر پہلے دن کی طرح حملہ کیا گیا۔ آج بھی وہ سیڑھیوں کے ذریعے قلعے کی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ادھر ہندو اپنے بت سومنات سے چمٹ چمٹ کر دعائیں کر رہے تھے۔ آخر ہندوؤں نے تیسرے دن باہر نکل کر سلطان پر حملہ کر دیا۔ شہر کے چاروں طرف ہندوؤں کا ایک سمندر نظر آ رہا تھا۔

ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر سلطان ایک کونے میں گیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا کرنے لگا کہ مسلمانوں کو فتح مبین نصیب ہو۔

دعا سے فارغ ہو کر اس نے مسلمانوں کو جوش دلایا اور پوری قوت سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس روز بہت خونریز جنگ ہوئی۔ آخر اللہ تعالیٰ نے فتح عطا فرمائی۔ ہندو شکست کھا کر بھاگے اور مسلمان قلعے میں داخل ہو گئے۔

سومنات کا مندر بہت بڑا تھا۔ اس کی چھت بھی بہت اونچی تھی۔ سلطان مندر میں داخل ہوا۔ وہ اتنے بڑے بت کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ بت کو توڑ دیا جائے۔ اس وقت ہندوؤں کے بڑے بڑے سردار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔

"ہم سارے ہندوستان کی دولت آپ کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں' آپ ہمارے بت کو نہ توڑیں۔"

یہ سن کر سلطان محمود غزنوی نے اس وقت یہ تاریخی جواب دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن بت شکن کے نام سے پکارا جاؤں' نہ کہ بت فروش کے نام سے۔" پھر جب بت توڑا گیا تو اس کے اندر سے ہیرے' جواہرات اور سونا ہاتھ آیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر تمام بتوں کو توڑنے کا حکم دیا تھا اور جو بت دور دراز فاصلوں پر تھے ان کو توڑنے کے لیے صحابہ اکرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھیجا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے۔ ان میں سب سے بڑا حملہ سومنات پر تھا۔ سومنات کا یہ مندر ہزاروں سال پرانا تھا۔ اس کی عمارت چھپن ستونوں پر کھڑی تھی۔ یہ ستون ساگوان کی لکڑی کے تھے۔ اس میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ مندر کی عمارت کے اوپر سونے کے چودہ لٹو تھے' اور یہ لٹو دور سے چمکتے نظر آتے تھے۔ سومنات بت کی اونچائی پانچ گز تھی' اس میں سے دو گز زمین کے اندر تھا۔ یہ سیاہ پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس میں ان گنت ہیرے' جواہرات جڑے ہوئے تھے۔

ہندوؤں کا یہ عقیدہ تھا کہ سارے ہندوستان کے بت اس بڑے بت کے ماتحت ہیں' اور یہ کہ تمام روحیں انسانوں سے جدا ہو کر سومنات میں آتی ہیں۔ چاند گرہن کے دن دو لاکھ کے لگ بھگ ہندو اس مندر میں جمع ہوتے تھے۔ سلطان محمود 63 سال کی عمر میں 421 ہجری میں اس دنیا سے رخصت ہوا لیکن تاریخ میں بت شکن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

فراست

ایسی ہی ایک حکایت کتاب "الفرج بعد الشدۃ" میں بھی لکھی ہے۔ کوفے کے ایک شخص کا بیان ہے کہ میں مسلمہ بن عبدالملک کے ساتھ بلاد روم کی جنگوں میں شریک تھا۔

ایک مرتبہ مال غنیمت میں بہت سے قیدی بھی آئے۔ مسلمہ نے حکم دیا کہ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں کو بانٹ لیا جائے۔

جب مردوں کو قتل کیا جانے لگا تو ایک بوڑھے کی بھی باری آئی۔ اسے قتل کرنے لگے تو اس نے کہا۔ "تمہیں میرے خون میں ہاتھ رنگنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بوڑھا آدمی ہوں۔ آپ ہی مر رہا ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ میں اس کے بدلے میں دو مسلمان نوجوانوں کو جو میرے قیدی ہیں' تمہارے حوالے کر دوں گا۔"

مسلمہ بن عبدالملک بولا۔ "مجھے تیری بات کا اعتبار نہیں۔ اگر میں تجھے چھوڑ دوں گا تو اس امر کی ضمانت کون دے گا کہ تو ان مسلمانوں کو ہم تک پہنچا دے گا۔"

بوڑھے نے جواب دیا "اجازت دیجیے کہ میں آپ کے لشکر میں گھوم آؤں' شاید کوئی ضامن مل جائے۔"

یہ سن کر مسلمہ نے حکم دیا کہ بوڑھے کو لشکر میں گھمایا جائے۔ چنانچہ ایک دو مسلمان سپاہیوں کے ساتھ بوڑھے نے لشکر کا چکر کاٹنا شروع کیا۔

اس دوران میں وہ ایک ایک سپاہی کے منہ کی طرف غور سے دیکھتا جاتا تھا۔ آخر اس کی نظر ایک ایسے سپاہی پر پڑی جس کے چہرے سے حیا اور وقار کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ بوڑھے نے اس کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے نوجوان! میری اس بات کی ضمانت دے کہ اگر آج مجھے جانے دیا جائے تو کل میں دو مسلمان نوجوان قیدیوں کو لا کر حاضر کر دوں گا۔"

نوجوان سپاہی نے جواب دیا۔ "میں ضمانت دینے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں کل حاضر نہ کروں تو امیر المومنین میرے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں۔"

یہ کہہ کر وہ بوڑھے کے ساتھ ہو لیا اور سب مل کر مسلمہ کی خدمت میں پہنچے۔

مسلمہ نے اس نوجوان سے پوچھا۔ "اس بوڑھے کو جانتے ہو؟"

سپاہی نے جواب دیا۔ "نہیں۔"

مسلمہ نے پوچھا۔ "پھر تم نے اس کی ضمانت کیوں دی؟"

سپاہی نے جواب دیا۔ "اس لیے کہ اس نے اتنے ہزار آدمیوں میں مجھ پہ بھروسا کیا اور میرے پاس اپنی حاجت لے کر آیا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میرے پاس پناہ لینے آیا۔ اس حالت میں میری مروت اور ہمت برداشت نہیں کر سکتی کہ میں انکار کر دوں اور اسے مایوس جانے دوں۔"

دوسرے دن وہ بوڑھا اپنے وعدے کے مطابق مسلمان نوجوانوں کو لیے ہوئے حاضر ہوا اور ان کو مسلمہ کے حوالے کیا۔ پھر بولا۔ "اس نوجوان کو جس نے میری ضمانت دی تھی' اجازت دیجیے کہ قلعے تک میرے ساتھ جائے۔ میں اس کی تھوڑی بہت خدمت کرنا چاہتا ہوں۔"

مسلمہ نے اجازت دی تو بوڑھا اس کو ساتھ لے کر قلعے کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں بولا "اے جوان! مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ تو میرا نواسہ ہے۔"

نوجوان نے جواب دیا۔ "یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ میں عرب اور مسلمان! اور تو رومی اور عیسائی۔ میں تیرا فرزند کیوں کر ہو سکتا ہوں؟"

بوڑھے نے کہا۔ "اچھا مجھے اپنی ماں کے متعلق بتا۔"

نوجوان بولا "میری ماں ایک رومی کنیز تھی۔"
بوڑھے نے کہا۔ "اگر میں تیری ماں کی صورت اور سیرت کا حال بیان کروں تو تصدیق کرے گا؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "بے شک۔"
اس بوڑھے نے اس کی ماں کی شکل و شباہت اور عادات و خصائل بیان کرنی شروع کی۔
قلعے کے اندر پہنچ کر بوڑھا اسے اپنے مکان میں لے گیا۔ ایک عورت سامنے آئی۔ اس کی شکل دیکھ کر سپاہی کو شبہ ہوا کہ اس کی ماں ہے۔
بوڑھا اس کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہ تیری نانی ہے اور یہ تیرا مکان ہے۔"
تھوڑی دیر میں اور بہت سے عزیز رشتے دار جمع ہو گئے اور نوجوان سے اس کے حالات پوچھنے اور اس کی ماں کو یاد کر کے رونے لگے۔
بوڑھے نے بہت سا سامان، قیمتی کپڑوں، زیورات اور روپوں کا ڈھیر لگا دیا اور بولا۔ "یہ سب تیری ماں کی ملکیت ہیں۔ اس کے پاس لے جا۔"
نوجوان نے پوچھا۔ "یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے مجھے پہچانا کیوں کر؟"
بوڑھے نے جواب دیا "عقل کی درستی، روح کے تعلق اور مشابہت کی زیادتی سے۔"
الغرض بوڑھے نے اسے مال و دولت سے لاد کر اس کے لشکر تک پہنچایا۔
مہم ختم ہونے کے بعد جب یہ نوجوان اپنے گھر پہنچا اور وہ تمام مال و اسباب اپنی ماں کی خدمت میں پیش کیا تو بے چاری بہت روئی اور بیٹے سے اپنے بچھڑے ہوئے رشتے داروں کا حال پوچھنے لگی۔

دوست نوازی

اکبر بادشاہ کا اتالیق بیرم خان ایک شاعر اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سردار بھی تھا۔ صرف سولہ برس کی عمر میں وہ اکبر کے باپ ہمایوں کا ملازم ہو گیا تھا۔ اپنی استعداد اور صلاحیت کی بدولت وہ بہت جلد ترقی کر گیا۔ اسے اپنے ساتھیوں میں خاص امتیاز حاصل ہوا۔ قنوج کی لڑائی کا واقعہ ہے۔ ہمایوں کی فوجیں شکست کھا کے تتر بتر ہو گئیں۔ بیرم خان کو سنبھل کے راجا متراسین کے پاس جا کر پناہ لینی پڑی۔

ہمایوں کے حریف، شیر شاہ سوری کو معلوم ہوا تو اس نے راجا سے مطالبہ کیا۔
"بیرم خان کو ہمارے حوالے کر دیا جائے۔" راجا نے بیرم خان کو شیر شاہ کے حوالے کر دیا۔
شیر شاہ کی جوہر شناس نگاہ نے بیرم خان کی اعلا صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا وہ بیرم خان کے ساتھ لطف و مروت سے پیش آیا۔ اس نے یہ کوشش بھی کہ بیرم خان، ہمایوں کی ملازمت چھوڑ کے اس کی ملازمت میں آجائے، بیرم خان رضامند نہیں ہوا۔
گوالیار کا حاکم ابو القاسم اور بیرم خان گہرے دوست تھے۔ ایک روز بیرم خان موقع پا کر ابو القاسم کے ساتھ بھاگ نکلا۔
شیر شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سپاہی پیچھے دوڑائے۔ سپاہیوں نے بیرم خان اور ابو القاسم کو راستے میں جا لیا وہ بیرم کو پہچانتے نہیں تھے، انہوں نے اس کے دھوکے میں ابو القاسم کو حراست میں لے لیا۔ بیرم خان مردانہ وار سامنے آگیا۔
"ٹھہرو۔ بیرم خان میں ہوں۔"
ابو القاسم نے مداخلت کی۔ "یہ جھوٹا ہے، بیرم خان میں ہوں۔ یہ میرا نمک خوار ہے۔ مجھ پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ بیرم خان میں ہوں۔" سپاہی ابو القاسم کو لے گئے، بیرم خان کو چھوڑ گئے۔
ابو القاسم کو شیر شاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ شیر شاہ نے تعجب سے کہا۔
"ابو القاسم! تم، بیرم خان کہاں ہے؟" اس سے پہلے کہ ابو القاسم کچھ کہتا، شیر شاہ خود واقعے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ انگارے کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے ابو القاسم کی طرف اشارہ کر کے حکم دیا۔ "اس غدار کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔" ابو القاسم کو قتل کر دیا گیا۔ (تاریخ اکبری۔ نظام الدین احمد)

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

انار

ماہرین اب یہ دعوا کر رہے ہیں کہ انار میں طویل عرصے تک صحت مند رکھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انار میں ایک کرشماتی جزو ہوتا ہے جو بڑھتی ہوئی عمر میں کمزور ہونے والے پٹھوں کو توانا کرتا ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ انار ہمارے عضلات کو فراہم کرنے والی بیٹری "میٹوکونڈریا" کو چارج رکھتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس بیٹری کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں اور وہ کم مؤثر ہو کر زہریلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں انار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کو کھانے سے بلڈ پریشر کم ہو جاتا ہے۔

محنت

صنم بلوچ اب جہاز اڑائیں گی (کاغذ کے ....؟) نہیں بھئی فائٹر جہاز (صنم! آپ گاڑی چلالیتی ہیں کراچی کی سڑکوں پر....؟) ہے ناں حیران کن بات.... لیکن یہ حقیقت ہے کہ صنم بلوچ ان دنوں پاکستان کی پہلی خاتون پائلٹ مریم مختیار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے بننے والی مختصر دورانیے کی فلم میں مریم مختیار کا کردار کر رہی ہیں۔ جس کے لیے وہ جہاز اڑانا نہ سہی لیکن ایک ماہر پائلٹ کی طرح چلنا پھرنا ضرور سیکھ رہی ہیں۔ (اچھا ہمارے یہاں بھی سیکھ کر کام کرتے ہیں...؟ بھئی فلم میں۔) کیونکہ مختصر دورانیے کی اس فلم کو ہدایت کار سرمد کھوسٹ (ہم سفر والے۔) بنا رہے ہیں اس کا اسکرپٹ عمیرہ احمد نے لکھا ہے (جن کا ناول آب حیات ان دنوں خواتین میں چھپ رہا ہے۔)
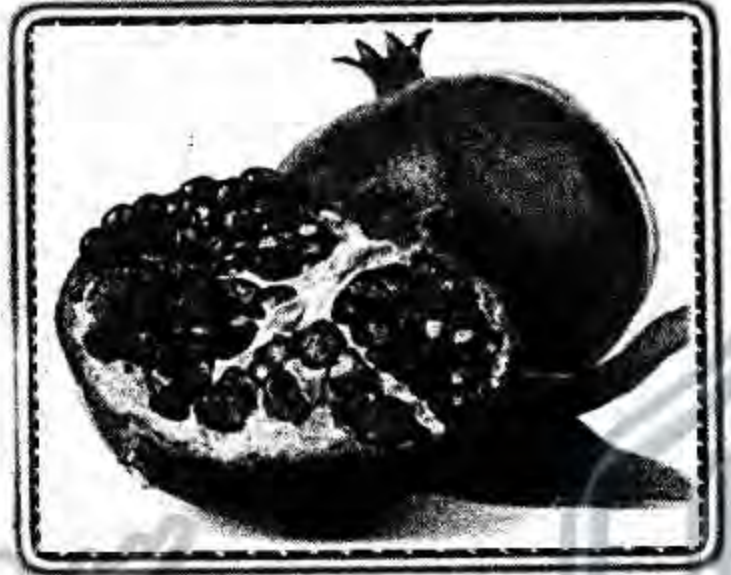
صنم بلوچ کہتی ہیں کہ میں ان دنوں بہت محنت کر رہی ہوں۔ میری کوشش ہے کہ دیکھنے والوں کو کہیں سے بھی یہ اندازہ نہ ہو کہ میں اداکاری کر رہی ہوں بلکہ ایسا لگے کہ وہ دراصل ہیں ہی فائٹر پائلٹ۔

تبدیلی

عارف لوہار کے ساتھ کوک اسٹوڈیو میں جگنی گا کر شہرت حاصل کرنے والی میشا شفیع کہتی ہیں کہ میری امی نے ہمیشہ مظلوم عورت کے کردار کیے ہیں اور انہیں دیکھ کر ہی میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسکرین پر امی سے بالکل مختلف نظر آکر دکھاؤں گی۔

میشا کہتی ہیں کہ رائٹرز اور ڈائریکٹر عورت کو مظلوم ضرور دکھائیں (ہائیں یہ تو کھلا تضاد ہے....؟) مگر ایسی عورتوں کے کرداروں کو بھی نمایاں کریں جو ہمارے اردگرد بڑی ہمت سے مردانہ معاشرے میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں اور کئی مقامات پر مردوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ (میشا عورت مظلوم ہے تو بہت اور اگر آزاد ہے تو اپنی حدوں سے آگے.... عورت ہی عورت کو رلا کر خوش ہوتی ہے۔) میشا نے مزید کہا کہ جو اداکارائیں مظلوم عورت کا کردار کرنے سے کتراتی ہیں انہیں کام بھی کم ملتا ہے۔ (جی اس کی مثال صبا پرویز کا ہر دوسرے ڈرامے میں ہونا ہے۔) یہ حقیقت ہے کہ ناظرین عورت کو مظلوم اور نازو انداز کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں اس سوچ کو بدلنا ہوگا ہمیں اپنے ناظرین کو یکسانیت سے بھرپور کرداروں کے بجائے تبدیلی کی طرف لے جانا ہوگا۔

اخلاقی جرأت

کینیڈا میں پیدا ہونے والی ارمینا خان نے اپنا فنی سفر کینیڈا ہی سے شروع کیا پھر پاکستانی ڈراموں اور فلموں میں بھی اپنی اداکاری دکھانے لگیں۔ اگرچہ ارمینا خان کو ابھی پاکستان میں ماڈلنگ اور ایکٹنگ کرنے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ مگر ارمینا خان بہت سوچ سمجھ کر آفرز قبول کر رہی ہیں بلکہ کچھ آفرز مسترد کرنے کا حوصلہ بھی رکھتی ہیں۔ ان دنوں ارمینا خان نے ایک بہت بڑے برانڈ کی رنگ گورا کرنے والی کریم کا برانڈ ایمبیسڈر بننے سے انکار کر دیا۔ (ارے واہ! اتنا حوصلہ؟) ان کا کہنا ہے کہ اگر میں یہ آفر قبول کر لیتی تو سانولی یا گہری رنگت والی لڑکیوں کی حوصلہ شکنی ہوتی (بلے بھئی بلے) اخلاقی طور پر رنگ گورا کرنے والی کاسمیٹک مصنوعات کا جواز ہی غلط ہے۔ قدرت نے جسے جیسا بنایا ہے۔ ویسا ہی رہنا چاہیے۔ (اور ان کے بارے میں کیا کہیں جو انجکشن لگوا کر گورا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔) ایسی مصنوعات ہماری بعض خواتین میں احساس کمتری پیدا کرتی ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر میں نے ایسے اشتہارات میں کام کیا اور کسی لڑکی کی جلد اگر اس کریم کی وجہ سے مزید خراب ہو گئی تو اس کا ذمہ دار میں اخلاقی طور پر اپنے آپ کو سمجھوں گی۔ (ارمینا کی اس اخلاقی جرأت پر ان مارننگ شوز کی میزبانوں کو بھی غور کرنا چاہیے جو اپنے پروگرام میں رنگ گورا کرنے کے انتہائی فضول طریقے بتاتی ہیں۔)

ولیمہ

پینسٹھ سالہ عمران خان کی شادی کی خبریں اس طرح سے آتی ہیں جس طرح کسی نوجوان ہیرو کے افیئر کی خبریں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ بارہ جولائی کو تمام ٹی وی چینلز عمران خان کی شادی کی خبر چلا رہے تھے۔ کچھ نے تو عمران کا ولیمہ بھی دکھا دیا۔ (عمران لندن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔) کہا گیا کہ ان کی بیگم کا تعلق پاک پتن کی بشریٰ بی بی جو کہ ایک روحانی شخصیت ہیں سے ہے اور وہ دبئی میں یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں اس سے پہلے ان کی ایک شادی ختم ہو چکی ہے۔ عمران خان کی بہن نے اس بات کی تردید کی، لیکن چینلز مصر رہے کہ ریحام خان سے شادی کے موقع پر بھی یہی سب ہوا تھا۔ پھر عمران خان سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ میری شادی نہیں ہوئی جب ہو گی تو سب کو بتا کر کروں گا۔ (جیسے ریحام خان سے کی تھی....؟)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چکن وائٹ قورمہ

ضروری اشیاء :

مرغی	ایک کلو
دہی	آدھا کلو
لہسن ٗادرک پیسٹ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسی سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک کپ
سبز الائچی	چار عدد
لونگیں	چھ عدد
سیاہ مرچ	آٹھ عدد
کیوڑا	حسب ضرورت
تیل	ایک کپ
بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کرکے الائچی ' لونگیں اور سیاہ مرچ ڈال کر کڑکڑائیں۔ اس میں ۔۔۔ لہسن ادرک ' پیاز کو پیس لیں اور گوشت ڈال کر بھونیں۔ پیاز کا کچا پن ختم ہو جائے تو دہی ' سفید مرچ اور نمک ڈال کر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور مرغی گل جائے تو بھون کر کیوڑا شامل کرکے آہستہ سے ملائیں اور چولہے سے اتار لیں۔ ڈش میں نکال کر باداموں سے گارنش کریں اور گرم گرم نان کے ساتھ سرو کریں۔ (چاہیں تو اس میں کریم بھی ملا سکتی ہیں کیوڑا شامل کرتے وقت)

جھٹ پٹ تیار چکن کڑاہی

ضروری اشیاء :

مرغی	آدھا کلو
ٹماٹر	آدھا کپ
دہی	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد
ادرک ' لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچیں	پانچ سے چھ عدد
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کرکے پیاز کو ہلکا گلابی کرنے کے بعد اس میں گوشت ڈال کر بھون لیں۔ اب اس میں پسا ہوا ادرک ' لہسن ' دہی ' پسے ہوئے ٹماٹر کٹی لال مرچ ' اور نمک ڈال کر ملائیں ۔۔۔ اور پانچ منٹ کے لیے ڈھک کر پکائیں۔ جب دہی اور ٹماٹر کا پانی خشک ہو جائے تو اس میں سفید زیرہ اور ثابت دھنیا ڈال کر بھون لیں۔ تیل اوپر آجائے تو ہری مرچیں ڈال دیں اور حسب پسند گریوی رکھ کر گوشت کے گلنے تک پکائیں۔ ڈش میں نکال کر گرم گرم پیش کریں۔

مکس دال اچاری تڑکے والی

ضروری اشیاء :

دال چنا	آدھا کپ
دال مسور	آدھا کپ
دال مونگ	آدھا کپ
دال ماش	آدھا کپ
دال ارہر	آدھا کپ
پیاز	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو چائے کا چمچہ

نمک	حسب ضرورت
پسی لال مرچ	دو کھانے کے چمچے
پسی ہلدی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پانی	حسب ضرورت

تڑکے کے لیے :

تیل	حسب ضرورت
کڑی پتہ	ایک سے دو عدد
پیاز (چھوٹی)	ایک عدد
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
لال اور ہری مرچیں	دو دو عدد

ترکیب :

تمام دالیں دو سے تین گھنٹے کے لیے بھگودیں پھر اچھی طرح دالیں دھو کر دیگچی میں ڈالیں اور پانی، نمک، پسی لال مرچ، ہلدی لہسن، ادرک پیا ہوا اور پیاز ڈال کر درمیانی آنچ پر ڈھکن ڈھک کر پکائیں جب دال گل جائے تو۔ فرائی پین میں تیل گرم کر کے پیاز، لال مرچیں، کڑی پتہ، ہری مرچیں، زیرہ اور کلونجی ڈال کر دال پر بگھار لگا دیں۔ ڈش میں نکال کر ابلے چاول یا نان چٹنی اور اچار کے ساتھ تناول فرمائیں۔

قیمہ فرائی میکرونی

ضروری اشیاء :

قیمہ	دو سو گرام
دہی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسی سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
پسی سیاہ مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک چائے کا چمچہ
چلی ساس	ایک چائے کا چمچہ
میکرونی	آدھا پیکٹ
تیل	حسب ضرورت
لہسن کے جوے	تین سے چار عدد (چوپ کرلیں)

ترکیب :

کڑاہی میں تیل گرم کر کے لہسن ہلکا سا تل لیں قیمہ، دہی، نمک اور سیاہ مرچ ڈال کر قیمے کو بھون لیں۔ جب قیمہ گل جائے تو اس میں ابلی ہوئی میکرونی، پسی سفید مرچ، سویا ساس اور چلی ساس ڈال کر اچھی طرح ملا لیں پھر دو منٹ پکا کر ڈش میں نکال لیں اور کیچپ اور مایونیز کے ساتھ تناول فرمائیں۔

گلاب جامن

سوکھا دودھ	دو کپ
انڈے	دو عدد
میدہ	ایک چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
گھی	دو کھانے کے چمچے

شیرہ بنانے کے لیے اجزاء :

چینی	دو کپ
پانی	تین کپ
سبز الائچی	چار عدد

ایک پیالے میں سوکھا دودھ، آدھا چائے کا چمچہ بیکنگ پاؤڈر، میدہ اور گھی اچھی طرح ملا کر اس میں دو عدد انڈے شامل کریں اور گوندھ لیں۔ ضرورت ہو تو اس میں ایک سے دو چائے کا چمچہ دودھ بھی شامل کرلیں۔

اب اس کے چھوٹے گول پیڑے بنائیں اور گرم تیل میں ہلکی آنچ پر تل لیں۔ تلتے ہوئے چمچے سے مسلسل چلاتے رہیں۔

شیرہ بنانے کے لیے :

ایک برتن میں چینی، پانی اور سبز الائچی ڈال کر دس منٹ تک پکائیں، یہاں تک کہ شیرہ گاڑھا ہو جائے۔ اب اس میں تلی ہوئی گلاب جامن شامل کریں اور کچھ دیر تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پستے بادام سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

گو دیکھنے میں لیموں ننھا منا سا ہوتا ہے لیکن اس سستے سے سنہرے رنگ کے پھل میں آپ کے حسن کو نکھار اور آپ کی شخصیت کو دلکشی عطا کرنے کی شان دار خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

لیموں سے کئی نسخے آپ اپنے کچن میں تیار کر سکتی ہیں جو کہ یقینی طور پر آپ کے حسن کی بحالی میں ایک ڈرامائی تبدیلی لے آئیں گے۔

خشک جلد کے لیے لیموں اور شہد کا فیس پیک

تین چائے کے چمچے لیمن جوس اور آدھا چائے کا چمچہ بند گوبھی (ابال کر چھلی ہوئی) کو مکس کر کے پیسٹ بنالیں اور اسے اپنے چہرے اور گردن پر لگائیں۔ دس منٹ کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ آپ خود ہی اپنے آپ کو سراہیں گی۔

لیموں اور بادام کا فیس پیک

داغ، چھائیاں دور کرنے کے لیے بادام کے چھلکے اتار کر گرائنڈ کرلیں اس میں انڈے کی سفیدی اور نصف چائے کا چمچہ لیموں کا رس شامل کر کے مکس کرلیں۔ چہرے پر پھیلا دیں اور بیس منٹ بعد دھولیں۔

چکنی جلد کے لیے لیموں اور پپیتے کا فیس پیک

آدھا چائے کا چمچہ ہلدی پاؤڈر، دو چائے کے چمچے لیمن جوس، تین چائے کے چمچے پپیتے کا گودا مکس کر کے ملائم پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر یکساں لگائیں، البتہ آنکھوں سے دور رکھیں۔ اس پیک کو بیس منٹ تک لگا رہنے دیں اور پھر دھو ڈالیں۔ یہ فیس پیک گو تیار کرنے میں نہایت آسان ہیں لیکن ایک جاندار اور بے کیف رنگت صاف کرنے میں نہایت موثر ہوتے ہیں۔

لیموں برائے باڈی پیک

لیموں میں بلیچنگ صلاحیت ہوتی ہے۔ اسپیشل باڈی پیک جو مسام دار میل کچیل کو صاف کرتا ہے اور زیادہ یکساں کلر ٹون لاتا ہے، گھر پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ باڈی پیک مردہ سطحی خلیات کو دور کرنے میں مدد دیتے ہیں اور مردہ خلیات کی جگہ صحت مند خلیات کو لانے میں جلد کو متحرک کرتے ہیں۔ اگر باقاعدگی سے استعمال کیے جائیں تو جلد ـــ یقینی طور پر اور بھی شفاف ہوجائے گی۔ ہلدی کو جب لیموں اور اسٹارچ (ابلے چاول کا پانی) کے ساتھ مکس کیا جاتا ہے تو یہ بطور موثر کلینزر کام کرتی ہے اور ـــ جلد اور کلورین آمیز پانی کے خشک کرنے والے اثر کے درمیان رکاوٹ قائم کردیتی ہے۔

ذیل میں ایک شان دار باڈی پیک کی ترکیب پیش کی جارہی ہے۔

لیموں اور دہی کی پری باتھ جیل

آٹھ چائے کے چمچے دہی، تین چائے کے چمچے لیمن جوس، ایک چائے کا چمچہ عرق گلاب اور ایک چائے کا چمچہ کوئی بھی ویجی ٹیبل آئل مکس کرلیں۔ اس باڈی پیک کو اوپر کی جانب حرکت سے لگائیں۔ 10 منٹ کے بعد دھو ڈالیں۔ یہ جلد کو دل کشی بخشنے والی قدیم ترین ترکیبوں میں سے ایک ہے۔ ریشمی ملائم جلد کے لیے اس نسخے کو ہفتے میں کم از کم تین مرتبہ استعمال کریں۔

خوب صورت ہاتھوں کے لیے لیموں

آپ کے ہاتھ بھی اتنے ہی نمایاں رہتے ہیں جتنا کہ آپ کا چہرہ۔ اسی لیے جسم کے دیگر حصوں کے مقابلے میں عمر رسیدگی کے آثار زیادہ تیزی سے ہاتھوں پر ظاہر ہوتے ہیں۔

لیموں اور بادام کے تیل کا ہینڈ لوشن

تین چائے کے چمچے لیمن جوس، چھ چائے کے چمچے شہد اور آٹھ چائے کے چمچے بادام کا تیل ایک ڈش میں مکس کرلیں۔ اس سے دس سے بارہ منٹ تک ہاتھوں کی اچھی طرح مالش کریں۔ پھر یکساں مقدار میں پانی اور سرکہ کے آمیزے سے اسے دھو ڈالیں۔ اس لوشن کو آئندہ بھی ہاتھوں پر استعمال کرنے کے لیے کسی شیشی، بوتل میں محفوظ کرلیں۔ یہ لوشن دو ہفتوں تک قابل استعمال رہتا ہے۔